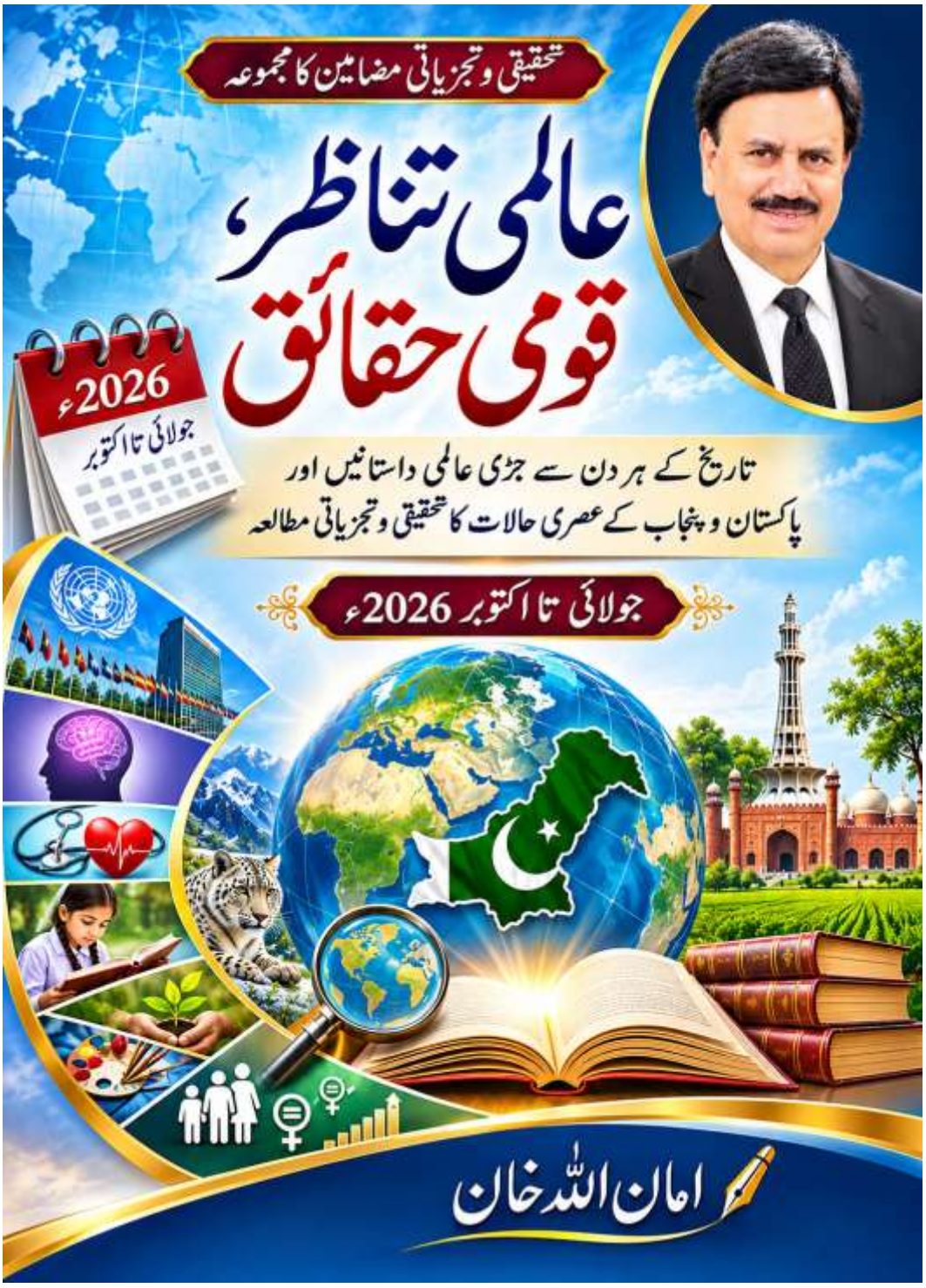
تحقیقی و تجزیاتی مضامین کا مجموعہ
عالمی تناظر،
قومی حقائق
2026ء
جولائی تا اکتوبر
تاریخ کے ہر دن سے جڑی عالمی داستانیں اور
پاکستان و پنجاب کے عصری حالات کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ
جولائی تا اکتوبر 2026ء
امان اللہ خان

"پیش لفظ — "علم و آگہی کے مسلسل سفر کی پانچویں منزل"

(تاریخ کے ہر دن سے جڑی عالمی داستانیں اور پاکستان و پنجاب کے عصری حالات کا تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ)

قارئینِ محترم!

علم کی حقیقی قدر اس کے حصول ہی میں نہیں بلکہ اسے دوسروں تک پہنچانے، اجتماعی شعور کو بیدار کرنے اور معاشرے میں غور و فکر کی نئی راہیں کھولنے میں مضمر ہے۔ اسی سوچ اور جذبے کے تحت میں نے جنوری 2026ء میں سوشل میڈیا، بالخصوص فیس بک، کو محض اظہارِ خیال یا تفریح کے بجائے علم و آگہی کے فروغ کا ذریعہ بنانے کی ایک ادنیٰ سی کوشش کا آغاز کیا۔ اس سلسلے میں میری توجہ تاریخ کے مختلف ایام سے وابستہ اہم عالمی واقعات، قومی و بین الاقوامی دنوں کے تاریخی پس منظر، ان کی اہمیت اور بالخصوص پاکستان اور پنجاب کے موجودہ سماجی، معاشی، تعلیمی، طبی اور انتظامی حالات پر مرکوز رہی۔ میری کوشش رہی کہ ہر موضوع کو محض معلومات کی حد تک محدود رکھنے کے بجائے اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا جائے، تاکہ قاری ماضی کے واقعات کو حال کے حقائق سے جوڑ کر مستقبل کے امکانات پر بھی غور کر سکے۔

جولائی 2026ء میں جب جنوری سے وسط جولائی تک فیس بک پر شائع ہونے والے میرے مضامین کو یکجا کر کے Global Echoes (عالمی واقعات کی گونج) کے عنوان سے پی ڈی ایف کتاب کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ کی محبت، حوصلہ افزائی اور غیر معمولی پذیرائی نے میرے اس علمی سفر کو ایک نئی توانائی بخشی۔ چونکہ ابتدا ہی سے میرا مقصد علم و معلومات کو تجارتی مفادات سے بالاتر رکھ کر زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا تھا، اس لیے قارئین کی درخواست پر اس کتاب کی نقول بذریعہ ای میل اور واٹس ایپ بلا معاوضہ فراہم کی گئیں۔ میرا ہمیشہ سے یہ یقین رہا ہے کہ علم ایک اجتماعی امانت ہے اور اس کی حقیقی افادیت اسی وقت سامنے آتی ہے جب اسے دوسروں کے ساتھ بانٹا جائے۔

اس حوصلہ افزا تجربے کے بعد مزید تین کتابیں بھی اسی جذبے کے تحت مرتب کر کے قارئین تک پہنچائی گئیں۔ یوں اب تک میری چار تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں:

1. Global Echoes — عالمی واقعات کی گونج
2. آئینۂ خیال و عکسِ زمانہ
3. اوراقِ ماضی — نصف صدی پر محیط فکر و قلم کا آئینہ
4. اخباری تراشوں نے کھولے ماضی کے بند دریچے

یہ امر میرے لیے باعثِ مسرت اور اطمینان ہے کہ اس تحریر کے وقت تک اس سلسلے کی کتابیں 2872 قارئین تک ای میل اور واٹس ایپ کے ذریعے پہنچ چکی ہیں اور ان کی مفت ترسیل کا سلسلہ بدستور جاری ہے۔ میں اس پذیرائی کو اپنی کسی غیر معمولی علمی یا ادبی صلاحیت کا اعتراف نہیں بلکہ قارئین کی علم دوستی، محبت اور حوصلہ افزائی کا مظہر سمجھتا ہوں۔

اور اب اسی علمی و تحقیقی سفر کی پانچویں کڑی، "عالمی تناظر، قومی حقائق"، آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ یہ کتاب جولائی سے اکتوبر 2026ء کے دوران تحریر کردہ مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کی بنیادی انفرادیت یہ ہے کہ ہر مضمون کسی مخصوص تاریخ، اس روز پیش آنے والے اہم تاریخی واقعے یا منائے جانے والے قومی و بین الاقوامی دن سے وابستہ ہے۔ ان موضوعات کے تاریخی پس منظر، عالمی اہمیت اور متعلقہ حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے پاکستان، بالخصوص پنجاب، کی موجودہ صورتِ حال، حکومتی اقدامات، درپیش مسائل اور ممکنہ اصلاحی پہلوؤں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مضامین کو موضوعاتی تقسیم کے بجائے تاریخ وار ترتیب دیا گیا ہے، تاکہ اس مسلسل علمی سفر کی اصل روح اور تاریخی تسلسل برقرار رہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، یہ مضامین افسانے، ناول، شاعری یا کسی دوسری صنفِ تخلیقی ادب کی طرح خالصتاً تخیلاتی کاوشیں نہیں ہیں۔ ان کی بنیاد مختلف تاریخی دستاویزات، دستیاب معلومات، تحقیقی مواد، اخباری و علمی حوالوں اور دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والے حقائق پر استوار ہے۔ میری کوشش ان منتشر معلومات کو تلاش کرنے، ان کا تقابلی مطالعہ کرنے، انہیں ایک مربوط صورت دینے اور پھر اپنے فہم، مشاہدے اور تجزیاتی نقطۂ نظر کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کرنے کی رہی ہے۔ میں اس علمی کاوش کو کسی حتمی یا حرفِ آخر تحقیق کا درجہ نہیں دیتا، بلکہ اسے معلومات کی فراہمی، سوال اٹھانے، غور و فکر کی دعوت دینے اور اجتماعی شعور میں اضافے کی ایک مخلصانہ کوشش سمجھتا ہوں۔ تحقیق کی دنیا میں اصلاح، اختلاف اور مزید دریافت کی گنجائش ہمیشہ باقی رہتی ہے۔ ہر مضمون اس کے مواد سے متعلقہ رنگین تصویر یا پوسٹر سے بھی مزین ہے۔ یہ تصاویر محض تمثیلی ہیں؛ انہیں گوگل سے لیا گیا ہے یا مصنوعی ذہانت (AI) کی مدد سے تیار کیا گیا ہے، اور ان پر میری ملکیت کا کوئی دعویٰ نہیں۔ اسی طرح معلومات کی تلاش، ترتیب اور زبان کی درستی میں بھی مصنوعی ذہانت سے مدد لی گئی ہے، تاہم موضوعات کا انتخاب، پاکستان کے تناظر میں تجزیہ اور حتمی متن کی ذمہ داری میری ہے۔ کسی غلطی کی نشان دہی پر آئندہ ایڈیشن میں تصحیح کی جائے گی۔

اس کتاب میں شامل تمام مضامین آپ پہلے ہی فیس بک پر پڑھ چکے ہیں۔ انہیں تقریباً اسی صورت، انہی عنوانات اور اسی ترتیب سے شامل کیا گیا ہے جس میں وہ فیس بک پر شائع ہوئے، یعنی تازہ ترین مضمون پہلے؛ البتہ املا کی عام غلطیاں درست کر دی گئی

ہیں۔ انہیں کتابی صورت میں یکجا کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ روزانہ کی بنیاد پر شائع ہونے والی تحریریں سوشل میڈیا کی تیز رفتار گردش میں گم ہونے کے بجائے ایک مستقل، منظم اور قابلِ رجوع علمی مجموعے کی صورت اختیار کر سکیں۔ اسی مقصد کے تحت اپنی تمام کتابوں کو انٹرنیٹ، بالخصوص گوگل کے ذریعے، عوام کے لیے مفت دستیاب بنانے کی کوشش بھی جاری ہے، تاکہ علم و آگہی کا یہ سلسلہ وقت، فاصلے اور مالی وسائل کی پابندیوں سے حتی الامکان آزاد رہ سکے۔

اس موقع پر میں اپنے محترم ساتھی، علم دوست اور معروف قلمکار جناب محمد احمد خان بھٹی کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے اپنی علمی مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا تنقیدی جائزہ لیا اور اس پر ایک فکر انگیز تبصرہ تحریر کیا، جسے اس مجموعے میں شامل کیا گیا ہے۔ ان کی محبت، حوصلہ افزائی اور علمی رہنمائی میرے لیے نہایت قابلِ قدر رہے۔

میرے عزیز قارئین! یہ کتاب آپ ہی کے لیے مرتب کی گئی ہے اور آپ کی رائے ہی اس کی حقیقی قدر و قیمت متعین کرے گی۔ میں نہ اپنی تحریروں کو غلطیوں سے مبرا سمجھتا ہوں اور نہ اپنے تجزیوں کو حرفِ آخر۔ آپ کی تعمیری تنقید، علمی اختلاف، اصلاحی تجاویز اور حوصلہ افزائی میرے لیے ہمیشہ باعثِ رہنمائی رہیں گی۔ میری خواہش ہے کہ یہ کتاب محض پڑھی نہ جائے بلکہ سوچنے، سوال اٹھانے، حقائق کو پرکھنے اور اپنے معاشرے کی بہتری کے لیے مثبت کردار ادا کرنے کی تحریک بھی پیدا کرے۔

اگر میری اس معمولی سی کوشش سے کسی ایک قاری کے علم میں اضافہ ہو، کسی ذہن میں تحقیق کی جستجو پیدا ہو یا کسی دل میں اپنے وطن اور انسانیت کی خدمت کا جذبہ مزید بیدار ہو جائے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

آپ سب کی محبتوں، اعتماد اور مسلسل حوصلہ افزائی کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔

دعا ہے کہ علم و آگہی کا یہ سفر جاری رہے اور قلم کی روشنی معاشرے میں شعور، رواداری اور مثبت تبدیلی کا ذریعہ بنتی رہے۔

خیر اندیش

امان اللہ خان

بحریہ آرچرڈ، لاہور، پاکستان



عالمی تناظر، قومی حقائق

ایک تنقیدی جائزہ

تمہید

سوشل میڈیا کے اس تیز رفتار دور میں، جہاں تحریر کی عمر اکثر چند گھنٹوں سے زیادہ نہیں ہوتی اور صبح کی پوسٹ شام تک ٹائم لائن کے انبار تلے دب جاتی ہے، کسی لکھنے والے کا تقریباً روزانہ ایک سنجیدہ، معلوماتی اور مربوط مضمون لکھنا، اور پھر اس سلسلے کو کتابی صورت میں محفوظ کر دینا، بجائے خود ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے۔ جناب امان اللہ خان کی زیرِ نظر کتاب ”عالمی تناظر، قومی حقائق“ اسی مسلسل ریاضت کا ثمر ہے، اور خوش گوار حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ایک ہی برس کے اندر منظرِ عام پر آنے والی ان کی پانچویں تصنیف ہے۔

جب انہوں نے اس کا مسودہ مجھے پڑھنے اور اس پر اپنی رائے دینے کے لیے بھیجا تو میں نے فیصلہ کیا کہ اسے رسمی تقریظ کی عینک سے نہیں بلکہ ایک سنجیدہ قاری اور ناقد کی نظر سے پڑھوں گا۔ میرا یقین ہے کہ کسی علمی کاوش کی سب سے سچی قدر دانی یہی ہے کہ اسے اسی سنجیدگی سے پرکھا جائے جس سنجیدگی سے وہ لکھی گئی ہے

۔خود مصنف نے پیش لفظ میں یہ کہہ کر اس کا دروازہ کھول دیا ہے کہ وہ نہ اپنی تحریروں کو غلطیوں سے مبرا سمجھتے ہیں اور نہ اپنے تجزیوں کو حرفِ آخر۔ چنانچہ یہ سطور تعریف و توصیف کا گلدستہ نہیں بلکہ ایک دیانت دارانہ مطالعے کا حاصل ہیں، جن میں کتاب کی خوبیوں کے اعتراف کے ساتھ ان پہلوؤں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے جن پر توجہ اس علمی سلسلے کو آئندہ مزید معتبر اور پائیدار بنا سکتی ہے۔

قلم سے ڈنڈے تک، اور پھر قلم تک

امان اللہ خان کا قلم سے رشتہ نیا نہیں۔ ان کی اپنی گواہی کے مطابق انہوں نے 1976ء میں لکھنے کا آغاز کیا اور نوائے وقت، جنگ، پاکستان، وفاق اور سیاست جیسے موقر اخبارات کے ادارتی صفحات پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ پھر سرکاری ملازمت اور انتظامی ذمہ داریوں کا طویل دور آیا، جس کے بارے میں ان کا یہ بے ساختہ جملہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے کہ ”سول سروس میں آ کر قلم بند کر دیا اور پھر ڈنڈا پکڑ لیا، اور پھر یہ ڈنڈا ہی پہچان بن کر رہ گیا۔“ برسوں کی انتظامی خدمات اور بعد ازاں دیہی ترقی اور تعلیم کے میدان میں عملی وابستگی کے بعد جب انہوں نے جنوری 2026ء میں فیس بک کو علم و آگہی کا ذریعہ بنانے کا ارادہ کیا تو گویا نصف صدی پہلے شروع ہونے والا سفر ایک نئے وسیلے کے ساتھ پھر سے رواں ہو گیا۔

یہ پس منظر اس کتاب کو سمجھنے کی کلید ہے۔ ان مضامین میں ایک صحافی کی جستجو، ایک منتظم کا عملی تجربہ اور ایک استاد کا سا سمجھانے کا انداز، تینوں بیک وقت دکھائی دیتے ہیں۔ یہی امتزاج ان کی تحریر کو محض معلومات کے ذخیرے سے بلند کر کے ایک ایسے شخص کی گواہی بنا دیتا ہے جس نے ریاست کے نظام کو اندر سے بھی دیکھا ہے اور عوام کے مسائل کو قریب سے بھی۔

کتاب کا خاکہ اور منہج

یہ مجموعہ جولائی سے اکتوبر 2026ء کے دوران فیس بک پر شائع ہونے والے سو سے زائد مضامین پر مشتمل ہے، جن کا مجموعی حجم تقریباً ڈیڑھ لاکھ الفاظ بنتا ہے۔ ہر مضمون کسی مخصوص تاریخ سے وابستہ ہے: کبھی وہ کوئی عالمی دن ہے، جیسے اساتذہ کا عالمی دن، یومِ جمہوریت یا عالمی یومِ ذہنی صحت؛ کبھی کوئی تاریخی واقعہ، جیسے سقوطِ روم، لندن کی آتش زدگی، پومپئی کی تباہی یا ہیروشیما کا سانحہ؛ اور کبھی کوئی قومی یادگار یا سانحہ، جیسے لیاقت علی خان کی شہادت، قائدِ اعظم کی وفات، جنگِ ستمبر یا معرکۂ کارگل۔ ان کے درمیان ”آئینۂ خیال و عکسِ زمانہ“ کے عنوان سے مختصر فکری و ترغیبی شذرات بھی جگہ جگہ شامل ہیں۔

مضامین کی بنت میں ایک واضح منہج نظر آتا ہے جسے مصنف نے تقریباً ہر جگہ نبھایا ہے۔ پہلے دن یا واقعے کا تاریخی پس منظر بیان ہوتا ہے، پھر اس کی عالمی اہمیت اور متعلقہ حقائق و اعداد و شمار، اس کے بعد پاکستان اور بالخصوص پنجاب کی موجودہ صورتِ حال اور حکومتی اقدامات کا جائزہ، اور آخر میں اصلاحی تجاویز یا قاری کے لیے کوئی فکر انگیز سوال۔ یہی چار قدمی ترتیب کتاب کے عنوان "عالمی تناظر، قومی حقائق" کی صحیح تعبیر بھی ہے اور اس کی سب سے نمایاں پہچان بھی۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ کتاب کوئی نئی تصنیف نہیں بلکہ ان تحریروں کا مجموعہ ہے جو پہلے ہی فیس بک پر شائع ہو کر قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ مصنف نے انہیں بڑی حد تک اسی صورت، انہی عنوانات اور اسی ترتیب کے ساتھ یکجا کیا ہے جس میں وہ ٹائم لائن پر شائع ہوئیں۔ مقصد یہ ہے کہ جو قاری سال بھر کی پوسٹیں فیس بک کے صفحات پر تلاش کرنے کی فرصت یا سہولت نہیں رکھتا، وہ انہیں ایک جگہ اور بلا معاوضہ پڑھ سکے۔ یہ حقیقت اس کتاب کو پرکھنے کا پیمانہ بھی متعین کرتی ہے: اسے ایک باقاعدہ مرتب کی گئی تحقیقی کتاب کے بجائے ایک فکری روزنامچے کے طور پر پڑھنا چاہیے، جس میں روزانہ کی تحریر کی تازگی بھی ہے اور اس کی عجلت بھی۔ آگے آنے والی میری گزارشات بھی اسی تناظر میں دیکھی جائیں۔

موضوعات کی وسعت حیران کن ہے۔ تقریباً ایک چوتھائی مضامین صحتِ عامہ سے متعلق ہیں؛ ہیپاٹائٹس، دل، پھیپھڑوں، ریبیز اور جوڑوں کے درد جیسے معروف موضوعات کے ساتھ ساتھ شوگرن سنڈروم، سیلیک، چنبل، ڈسلیکسیا، ہکلاہٹ اور بچوں میں زبان کی نشوونما کے عارضے (DLD) جیسے کم زیرِ بحث آنے والے امراض پر بھی تفصیلی تحریریں موجود ہیں۔ تاریخ کے باب میں عرابی تحریک سے فرمانِ الحمراء تک، اور امریکی خواتین کے حقِ رائے دہی سے آسٹریلیا کی "چوری شدہ نسلوں" اور ایمٹ ٹل کے قتل تک ایک وسیع منظر نامہ ملتا ہے۔ قومی و سیاسی موضوعات میں کشمیر، جمہوریت، لاپتہ افراد، ایٹمی تجربات، اقلیتوں کے حقوق اور پانی کا مسئلہ شامل ہیں، جبکہ معاشرتی و معاشی موضوعات میں غربت، بچت، خواندگی، کپاس، صنفی مساوات، انسانی اسمگلنگ اور جدید غلامی زیرِ بحث آتے ہیں۔ ادب کے قاری کے لیے میکبتھ، مولانا ابوالکلام آزاد کی India Wins Freedom اور این کارسن کی شاعری پر مطالعے ہیں، اور ہلکے پھلکے ذائقے کے لیے کدو، لیموں، لپ اسٹک اور "سستی کے قومی دن" جیسے موضوعات بھی۔ یہ تنوع بیک وقت کتاب کی طاقت بھی ہے اور، جیسا کہ آگے عرض کروں گا، اس کی ایک آزمائش بھی۔

قومی بیانیے سے آگے دیکھنے کی جرأت

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی، میری نظر میں، وہ فکری دیانت ہے جو حساس قومی موضوعات پر بھی مصنف کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہمارے ہاں قومی دنوں پر لکھی جانے والی تحریریں بالعموم جذباتی خطابت اور سرکاری بیانیے کی تکرار تک محدود رہتی ہیں

۔اس کے برعکس 6 ستمبر کے مضمون میں مصنف نے جنگِ ستمبر 1965ء کو رَن آف کچھ، آپریشن جبرالٹر اور آپریشن گرینڈ سلیم کی زمانی ترتیب میں رکھ کر دیکھا ہے، دونوں ملکوں کی کامیابیوں اور ناکامیوں کو ایک ہی ترازو میں تولا ہے، اور یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہچکچاہٹ نہیں دکھائی کہ جدید تاریخی اصطلاح میں یہ ایک "غیر فیصلہ کن جنگ" تھی جس کا انجام جنگ سے پہلے کی پوزیشنوں پر واپسی کی صورت میں نکلا۔ یہ وہ بات ہے جسے کہنے کے لیے ہمارے ہاں حوصلہ درکار ہوتا ہے۔

یہی رویہ دیگر مقامات پر بھی ملتا ہے۔ کارگل کے مضمون میں دونوں ملکوں کے متضاد بیانیے پیش کرنے کے بعد فیصلہ قاری پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ اس معرکے میں زیادہ خسارے میں کون رہا۔ لیاقت علی خان کی شہادت پر مضمون محض تعزیتی تحریر نہیں بلکہ ان سوالات کا مجموعہ ہے جو پون صدی بعد بھی جواب طلب ہیں: قاتل کو زندہ گرفتار کرنے کے بجائے موقع پر ہلاک کیوں کر دیا گیا، اور تفتیشی ریکارڈ کیسے ضائع ہوا؟ مولانا آزاد کی India Wins Freedom کو نہ تعصب کے ساتھ رد کیا گیا ہے اور نہ آنکھیں بند کر کے قبول؛ بلکہ اسے ایک بڑے کانگریسی رہنما کی عینی شہادت اور ایک مخصوص نظریاتی زاویے کے طور پر پڑھنے کی دعوت دی گئی ہے، اور یہ قیمتی بات کہی گئی ہے کہ نئی نسل جو بات بھی تسلیم کرے وہ دلیل اور صحتِ معلومات کے ساتھ ہو۔ لاپتہ افراد جیسے نازک موضوع پر انسانی حقوق کے علمبرداروں اور ریاستی اداروں، دونوں کا موقف پوری دیانت سے بیان کیا گیا ہے، اور یومِ جمہوریت کا مضمون اس چبھتے ہوئے سوال پر ختم ہوتا ہے کہ "ہم نے جمہوریت کو صرف نظامِ حکومت بنایا ہے یا واقعی طرزِ زندگی بھی؟"

یہ توازن اس لیے بھی قابلِ تحسین ہے کہ مصنف کہیں بھی قومی موقف سے دست بردار نہیں ہوتے۔ کشمیر پر ان کا قلم پوری وضاحت سے کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت کا مقدمہ لڑتا ہے، مگر ساتھ ہی بھارت کا موقف بھی بیان کر دیتا ہے تاکہ قاری جان سکے کہ دلیل کا سامنا کس دلیل سے ہے۔ یہی وہ رویہ ہے جو حب الوطنی کو جذباتیت سے اور تجزیے کو پروپیگنڈے سے الگ کرتا ہے۔

ایک منتظم کی نظر: نعروں کے بجائے حل

امان اللہ خان کی تحریر کا دوسرا امتیاز وہ عملی بصیرت ہے جو برسوں کے انتظامی تجربے سے آتی ہے۔ وہ مسئلے کو صرف بیان نہیں کرتے بلکہ اس کی جڑ تک پہنچ کر قابلِ عمل تجاویز بھی پیش کرتے ہیں۔ اساتذہ کے عالمی دن پر ان کا مضمون، جس کا عنوان ہی ”تعظیم کے پھول، فاقے کی تنخواہ“ ہے، 1966ء کے عالمی سفارش نامے کو کسوٹی بنا کر پنجاب کے کم تنخواہ پانے والے استاد کی حالت پرکھتا ہے اور اس جملے پر ختم ہوتا ہے: ”جب تک استاد خود عزت کی روٹی نہیں کمائے گا، وہ کلاس روم میں عزتِ نفس کا سبق کیسے پڑھائے گا؟“ غربت پر مضمون میں امدادی پروگراموں کو مسترد کیے بغیر یہ نتیجہ نکالا گیا ہے کہ ”امداد زخم پر مرہم ہے، علاج نہیں۔“ خواندگی کے عالمی دن پر یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ کیا شرحِ خواندگی بجٹ کے بغیر بڑھ سکتی ہے، اور پانی کی کہانی اس ایک عدد پر آ کر رکتی ہے جو پوری قوم کو جگانے کے لیے کافی ہے: پاکستان اپنے دریاؤں کا صرف تقریباً تیس دن کا پانی ذخیرہ کر سکتا ہے۔

ان مضامین میں حکومتِ پنجاب کے اقدامات کا ذکر بھی ملتا ہے اور ان کی کمزوریوں کی نشان دہی بھی۔ یہ وہ متوازن تنقید ہے جو کسی ایسے شخص کے قلم سے ہی نکل سکتی ہے جو جانتا ہو کہ پالیسی کاغذ پر کیسے بنتی ہے اور زمین پر کیسے بگڑتی ہے۔

صحتِ عامہ کی آگاہی: ایک خاموش عوامی خدمت

کتاب کا وہ حصہ جو شاید سب سے کم داد پائے مگر سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے، صحت سے متعلق مضامین ہیں۔ ڈسلیکسیا کو ”کمزوری نہیں، سیکھنے کا ایک مختلف انداز“ قرار دینا، دیر سے بولنے والے بچوں کے والدین سے یہ کہنا کہ ”انتظار نہیں، توجہ دیجیے“، سیر یبرل پالسی کے شکار افراد کے لیے ”ہمدردی نہیں، ہمقدمی“ کا مطالبہ کرنا، ہکلاہٹ کے بارے میں یہ لکھنا کہ ”لفظ اٹکتے ہیں، حوصلے نہیں“، اور ذہنی صحت کے بارے میں یہ واضح پیغام دینا کہ ذہنی بیماری کمزوری نہیں بلکہ ایک قابلِ علاج طبی کیفیت ہے؛ یہ سب محض معلومات نہیں بلکہ ان سماجی رویوں کے خلاف ایک خاموش جہاد ہے جو ہمارے معاشرے میں بیماری کو شرمندگی اور معذوری کو بوجھ بنا دیتے ہیں۔ ایک عام گھرانے کے لیے، جہاں ماہرِ نفسیات یا اسپیچ تھراپسٹ تک رسائی آسان نہیں، یہ مضامین بروقت تشخیص کی پہلی سیڑھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

یہاں اس ذمہ دارانہ رویے کا ذکر بھی ضروری ہے جو مصنف نے حساس موضوعات پر اپنایا ہے۔ مثلاً بچت کے عالمی دن پر مضمون کے آغاز ہی میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ اسے سرمایہ کاری کا مشورہ یا شرعی فتویٰ نہ سمجھا جائے اور قاری مستند ماہرین سے رجوع کرے۔ یہ چھوٹی سی احتیاط ایک سنجیدہ لکھاری کی پہچان ہے۔

اسلوب: سادگی، روانی اور قصہ گوئی

امان اللہ خان کی نثر صاف، رواں اور بے تکلف ہے۔ وہ ثقیل اصطلاحات سے گریز کرتے ہیں، اور جہاں انگریزی اصطلاح ناگزیر ہو وہاں اسے قوسین میں درج کر دیتے ہیں، جو بالخصوص طلبہ کے لیے مفید ہے۔ ان کے مضامین کے آغاز اکثر افسانوی کشش رکھتے ہیں: لیاقت علی خان کا مضمون کمپنی باغ کے مجمع اور ادھورے رہ جانے والے الفاظ ”برادرانِ ملت“ سے شروع ہوتا ہے، اور یومِ سیاہ کشمیر کا مضمون 27 اکتوبر 1947ء کی صبح سری نگر کی فضاؤں میں ڈکوٹا طیاروں کی گھن گرج سے۔ مضامین کے عنوانات بھی اپنی جگہ ایک فن ہیں: ”دریا بٹ گئے، حوصلے نہیں“، ”آدھی آبادی، پورا حق“ اور ”بصارت سے محروم مگر بصیرت سے بھرپور“۔

ذاتی یادوں کی آمیزش ان کی تحریر کو خشک معلوماتی مواد بننے سے بچاتی ہے۔ کدو کے قومی دن جیسا بظاہر غیر سنجیدہ موضوع ان کے ہاں قصبہ نارنگ کے سبزی فروش جیدے کھوکھر اور جامع مسجد کے خطیب کے دلچسپ واقعے سے شروع ہو کر سنتِ نبوی ﷺ، غذائیت اور زرعی معیشت تک جا پہنچتا ہے۔ میکبتھ پر مضمون کی تحریک برطانیہ سے چھٹیوں پر آئے ہوئے نواسے کی نصابی کتاب بنی، اور قاری 1606ء اور 2026ء کے درمیان مصنف کے ہم سفر ہو جاتا ہے۔ ظرافت کی ایک ہلکی سی لہر بھی جا بجا ملتی ہے؛ ”سستی کے قومی دن“ پر یہ جملہ کہ سرکاری اداروں میں تو ہر روز قومی کاہلی کا دن منایا جاتا ہے، جب ایک ایسے قلم کار کے ہاتھ سے نکلتا ہے جو خود برسوں سرکاری نظام کا حصہ رہا ہو، تو اس میں طنز کے ساتھ خود احتسابی کا لطف بھی شامل ہو جاتا ہے۔

علم بطور امانت

اس جذبے کا ذکر بھی لازم ہے جس کے تحت یہ کتابیں لکھی اور بانٹی جا رہی ہیں۔ مصنف نے اپنی تمام کتابیں کسی تجارتی مفاد کے بغیر ای میل اور واٹس ایپ کے ذریعے ہزاروں قارئین تک مفت پہنچائی ہیں۔ ان کے بعض مضامین، مثلاً پانی کے مسئلے پر تحریر، قارئین کی فرمائش پر اس لیے لکھے گئے کہ یہ سوال مقابلے کے امتحانات میں پوچھا جاتا ہے۔ یوں یہ کتاب ان نوجوانوں کے لیے بھی ایک قابلِ رجوع ذریعہ بن گئی ہے جو مہنگی حوالہ جاتی کتابیں نہیں خرید سکتے۔ علم کو اجتماعی امانت سمجھنے کا یہ رویہ ہمارے عہد میں کمیاب ہو چلا ہے۔

تنقیدی پہلو اور گزارشات

کتاب کی ان خوبیوں کے اعتراف کے بعد اب چند گزارشات۔ چونکہ یہ مجموعہ فیس بک پر شائع شدہ تحریروں کو ان کی اصل صورت میں محفوظ کرنے کے لیے مرتب کیا گیا ہے، اس لیے ان میں سے بعض باتوں کا تعلق اس کتاب سے زیادہ اس سلسلے کی آئندہ تحریروں اور کسی ممکنہ منتخب و مرتب ایڈیشن سے ہے۔ انہیں کمزوریوں کی فہرست کے بجائے ایک ہم سفر کے دوستانہ مشورے سمجھا جائے۔

حوالہ جات اور ماخذ

مصنف نے پیش لفظ میں بجا طور پر لکھا ہے کہ یہ مضامین تخیلاتی نہیں بلکہ تاریخی دستاویزات، تحقیقی مواد اور اخباری و علمی حوالوں پر مبنی ہیں، اور یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ معلومات کی تلاش اور ترتیب میں مصنوعی ذہانت سے مدد لی گئی ہے۔ یہ دیانت دارانہ وضاحت قابلِ قدر ہے اور ہمارے ہاں کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔ تاہم فیس بک کی تحریروں کی عام روایت کے مطابق ان مضامین میں حوالے درج نہیں کیے گئے۔ اکا دکا مقامات پر "وکی پیڈیا کے مطابق" یا "عالمی اداروں کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق" جیسے الفاظ ملتے ہیں، مگر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کس ادارے کی، کس سال کی، کون سی رپورٹ۔ کئی جگہ اعداد و شمار ایک حد سے دوسری حد تک کی صورت میں دیے گئے ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ مختلف ذرائع میں فرق موجود ہے؛ ایسی صورت میں ذرائع کا نام دے دینا قاری کے اعتماد میں اضافہ کرتا ہے

۔اسی طرح تاریخی شخصیات سے منسوب بعض مشہور اقوال اور روایات، جو برسوں سے زبان زدِ عام ہیں، اپنے بنیادی ماخذ کے ساتھ پیش کی جائیں تو ان کا وزن کئی گنا بڑھ جاتا ہے، کیونکہ ہمارے ہاں بہت سی "مشہور باتیں" تحقیق کی کسوٹی پر پوری نہیں اترتیں۔ وکی پیڈیا تحقیق کا نقطۂ آغاز ضرور ہے، نقطۂ انجام نہیں۔ مصنوعی ذہانت کے اس دور میں یہ احتیاط اور بھی اہم ہو گئی ہے، کیونکہ ایسے آلات بعض اوقات تاریخیں، اعداد اور اقوال غلط بھی بیان کر دیتے ہیں؛ اس لیے حتمی تصدیق ہمیشہ اصل ماخذ سے ہونی چاہیے۔

جن مقامات پر مصنف اپنے ذاتی یا ادارہ جاتی تجربے کا حوالہ دیتے ہیں، وہاں چند ٹھوس اعداد و شمار اس تجربے کی گواہی کو اور مضبوط کر دیں گے۔ میری تجویز ہے کہ آئندہ فیس بک پر ہر مضمون کے ساتھ دو تین بنیادی ماخذ کے روابط پہلے تبصرے میں دے دیے جائیں، اور کتابی صورت میں یہی ماخذ ہر مضمون کے آخر میں درج کر دیے جائیں؛ نیز ہر عدد کے ساتھ اس کا سال اور ذریعہ لکھا جائے۔ وہ "مستقل، منظم اور قابلِ رجوع علمی مجموعہ"، جس کا خواب مصنف نے پیش لفظ میں دیکھا ہے، اسی صورت میں پوری طرح حقیقت بن سکتا ہے۔

تحقیقی معیار میں یکسانیت

جس توازن کی میں نے اوپر تعریف کی ہے، وہ ہر جگہ ایک سا نہیں رہتا۔ اس کی واضح مثال جنگِ ستمبر ہی کے دو مضامین ہیں۔ 6 ستمبر کا مضمون جنگ کو "غیر فیصلہ کن" قرار دیتا ہے، مگر اگلے ہی روز یومِ فضائیہ کا مضمون "جب عددی برتری ایمان کے جذبوں سے ہار گئی" کے عنوان سے ایک خالص جشن کا رنگ اختیار کر لیتا ہے، اور بعض متنازع دعوے یوں بیان ہوتے ہیں گویا وہ طے شدہ حقائق ہوں۔ خود 6 ستمبر کے مضمون میں بھی متوازن تجزیے کے بیچ ایک پیراگراف ایسا آ جاتا ہے جو دشمن کی فضائی قوت کو "مفلوج" کر دینے اور دفاعی نظام کے "ناقابلِ تسخیر" ثابت ہونے کی بات کرتا ہے، جو اسی مضمون کے نتیجے سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں۔

یہ درست ہے کہ اپنے شہیدوں اور غازیوں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ایک قومی فریضہ ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ یومِ فضائیہ کے مضمون میں پاکستانی، بھارتی اور غیر جانبدار، تینوں طرح کے اعداد و شمار دیے گئے ہیں؛ مگر بہتر ہو گا کہ ایسی تحریروں کو واضح طور پر "خراجِ عقیدت" کے طور پر پیش کیا جائے، یا ان پر بھی وہی تحقیقی کسوٹی لاگو کی جائے جو ایک دن پہلے برتی گئی تھی۔ حب الوطنی اور سچائی ایک دوسرے کی ضد نہیں، اور اس کا سب سے اچھا ثبوت خود مصنف کا 6 ستمبر والا مضمون ہے۔

موضوعات کا انتخاب اور حجم کا توازن

عالمی دنوں کی تقویم کو بنیاد بنانے کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ موضوع کا انتخاب کسی حد تک کیلنڈر کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے۔ چنانچہ کشمیر، لیاقت علی خان اور قائدِ اعظم جیسے سنجیدہ موضوعات کے پہلو بہ پہلو لپ اسٹک، لیموں کے رس، کدو اور "سستی" کے وہ دن بھی آ گئے ہیں جو بنیادی طور پر امریکہ میں غیر رسمی یا تجارتی نوعیت کے ہیں اور جن کی کوئی باضابطہ بین الاقوامی یا قومی حیثیت نہیں۔ مصنف نے ان موضوعات کو بھی بڑی مہارت سے پاکستانی تناظر میں ڈھالا ہے، اور یہ مضامین قاری کو سنجیدہ مباحث کے درمیان سانس لینے کا موقع بھی دیتے ہیں۔ ایک روزنامچے میں یہ تنوع فطری ہے ،

اسی طرح مضامین کے حجم میں بھی خاصا فرق ہے، جو روزانہ لکھنے کی ایک فطری مجبوری ہے۔ بعض نسبتاً ہلکے موضوعات پر طویل تحریریں موجود ہیں، جبکہ جنرل ضیاء الحق کے طیارے کے حادثے جیسا اہم قومی واقعہ، جس کے اثرات آج تک ملکی سیاست پر محسوس کیے جاتے ہیں، ایک مختصر سی تحریر میں سمیٹ دیا گیا ہے۔ اگر کبھی ان مضامین کا کوئی منتخب ایڈیشن تیار ہو تو ہلکے پھلکے مضامین کو ایک الگ حصے میں یکجا کیا جا سکتا ہے اور اہم قومی موضوعات کو ان کے شایانِ شان تفصیل دی جا سکتی ہے۔

ترتیب و تدوین

مصنف نے شعوری طور پر مضامین کو اسی ترتیب سے رکھا ہے جس ترتیب سے وہ فیس بک کی ٹائم لائن پر نظر آتے ہیں، یعنی تازہ ترین پہلے؛ چنانچہ کتاب 31 اکتوبر سے شروع ہو کر 18 جولائی پر ختم ہوتی ہے۔ فیس بک کے قاری کے لیے یہ ترتیب مانوس ہے اور اصل اشاعت سے وفاداری کا تقاضا بھی یہی تھا۔ البتہ کتاب کا عام قاری تقویم کو آگے کی طرف پلٹنے کا عادی ہے، اس لیے آئندہ مجموعوں میں جولائی سے اکتوبر کی سیدھی ترتیب پر بھی غور کیا جا سکتا ہے، جس سے مصنف کے فکری سفر کا ارتقا بھی زیادہ واضح ہو گا۔ اسی طرح "آئینۂ خیال و عکسِ زمانہ" کے ترغیبی شذرات اور سابقہ کتابوں کے تعارفی نوٹ، جو فیس بک کی ترتیب کے مطابق مضامین کے درمیان آ گئے ہیں، کسی آئندہ ایڈیشن میں الگ حصے کی صورت اختیار کر سکتے ہیں

۔ سب سے مفید اضافہ ایک موضوعاتی اشاریہ ہو گا، جس میں صحت، تاریخ، سیاست، معاشرت اور ادب کے مضامین الگ الگ درج ہوں، اس کتاب کو حقیقی معنوں میں حوالہ جاتی کتاب بنا دے گا، کیونکہ طالب علم یا محقق اکثر تاریخ کے حوالے سے نہیں بلکہ موضوع کے حوالے سے تلاش کرتا ہے۔

عنوانات بھی فیس بک والے ہی بر قرار رکھے گئے ہیں، اور ان کے بارے میں بھی ایک گزارش ہے۔ بعض عنوانات تین تین سطروں پر پھیلے ہوئے ہیں اور ان میں عنوان، ذیلی عنوان اور خلاصہ ایک ساتھ آ گئے ہیں۔ فیس بک پر یہ طوالت شاید توجہ کھینچنے کے لیے مفید ہو، مگر کتابی صورت میں ایک مختصر عنوان اور اس کے نیچے ایک ذیلی سطر زیادہ باوقار لگے گی۔ نیز چونکہ کئی مضامین وقتی واقعات، بیانات اور سیاسی بحثوں سے جڑے ہیں، اس لیے ہر مضمون کے ساتھ اس کی اصل تاریخِ اشاعت درج کر دینا آئندہ برسوں کے قاری کے لیے سیاق وسباق سمجھنے میں مددگار ہو گا۔

تصاویر

مصنف نے پیش لفظ میں دیانت داری سے واضح کر دیا ہے کہ مضامین کے ساتھ شامل تصاویر محض تمثیلی ہیں، اور یہ کہ وہ گوگل سے لی گئی ہیں یا مصنوعی ذہانت کی مدد سے تیار کی گئی ہیں۔ یہ وضاحت قابلِ تعریف ہے۔ آئندہ کے لیے دو باتیں مزید مفید ہوں گی۔ اول، تاریخی شخصیات یا واقعات کی جو تصاویر مصنوعی ذہانت سے تخلیق کی گئی ہوں، ان کے نیچے بھی یہ صراحت ہو کہ یہ تمثیلی تصویر ہے، تاکہ آنے والے برسوں میں کوئی قاری انہیں اصل تاریخی تصویر نہ سمجھ بیٹھے۔ دوم، انٹرنیٹ سے لی گئی تصاویر پر اکثر ان کے تخلیق کاروں کے حقوق ہوتے ہیں؛ اس لیے بہتر ہے کہ آئندہ ایسی تصاویر وکی میڈیا کامنز جیسے آزادانہ استعمال کے ذرائع سے لی جائیں اور ان کا ماخذ درج کیا جائے، یا مصنف اپنی تیار کردہ تصاویر ہی استعمال کریں۔

مجموعی تاثر

یہ تمام گزارشات اپنی جگہ، مگر ان میں سے بیشتر کا تعلق آئندہ تحریروں اور ایڈیشنوں سے ہے، اور ان سے اس مجموعے کی بنیادی قدر و قیمت میں کوئی کمی نہیں آتی۔ ”عالمی تناظر، قومی حقائق“ اپنے مقصد میں پوری طرح کامیاب ہے: فیس بک کے بکھرے ہوئے اوراق کو ایک ایسی کتاب میں سمیٹ دینا جو ہر اس قاری کے لیے بلا معاوضہ دستیاب ہو جو انہیں ٹائم لائن پر تلاش نہیں کر سکتا.

۔یہ کوئی خالص تحقیقی مقالہ نہیں، اور مصنف نے کبھی اس کے "حرفِ آخر" ہونے کا دعویٰ بھی نہیں کیا۔ یہ دراصل معلومات اور آگہی کے درمیان، عالمی تقویم اور مقامی حقیقت کے درمیان، اور ماضی کے سبق اور حال کے سوال کے درمیان ایک پل ہے۔ اس پل سے گزرنے والا قاری محض یہ نہیں جانتا کہ کون سا دن کیوں منایا جاتا ہے، بلکہ یہ سوچنے پر بھی مجبور ہوتا ہے کہ اس دن کے آئینے میں پاکستان کہاں کھڑا ہے۔

مقابلے کے امتحانات کی تیاری کرنے والے طلبہ کے لیے یہ ایک آسان اور جامع حوالہ ہے، اساتذہ اور صحافیوں کے لیے موضوعات کا ایک ذخیرہ، پالیسی سازوں اور منتظمین کے لیے ایک آئینہ، اور عام قاری کے لیے ایک ایسا روزنامچہ جس میں دنیا کی تاریخ اور اپنے وطن کے حالات ایک ساتھ پڑھے جا سکتے ہیں۔ امان اللہ خان نے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ فیس بک، جسے ہم عموماً وقت کے زیاں کا ذریعہ سمجھتے ہیں، ایک سنجیدہ قلم کار کے ہاتھ میں کتاب کا پیش خیمہ بھی بن سکتی ہے۔

میں انہیں اس پانچویں کڑی پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور امید رکھتا ہوں کہ اس سلسلے کی اگلی کتابیں حوالہ جات، موضوعاتی اشاریے اور ادارتی نکھار کے ساتھ اس معیار کو چھوئیں گی جس کا خواب مصنف نے خود دیکھا ہے۔ علم کا یہ چراغ جس خلوص سے جلایا گیا ہے، اسی خلوص سے روشن رہے، یہی دعا ہے۔

محمد احمد خان بھٹی۔

سابق جوائنٹ ڈائریکٹر

اسٹیٹ بینک آف پاکستان

کراچی پاکستان

نومبر 2026ء

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ— "علم و آگہی کے مسلسل سفر کی پانچویں منزل	2
2	عالمی تناظر، قومی حقائق-ایک تنقیدی جائزہ	5
3	خاتونِ اوّل- آئینی منصب نہیں، ایک باوقار سماجی وسفارتی روایت(ایک اعزازی خطاب کی تاریخ، ارتقا، قانونی حیثیت اور پاکستان میں اس کا سفر)	24
4	31اکتوبر-بچت کا عالمی دن-پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ:صورتِ حال، اسباب اور قابلِ عمل حل۔ قومی بچت سکیموں پر مختلف ادا کا جائزہ	31
5	بچوں سے سیکھیں-زندگی کے تین اہم اصول(پائیلو کوہلو)	40
6	—29اکتوبر-عالمی یومِ چنبل(سوریاسس) آگاہی، حقائق اور پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ	41
7	ہارمان لینا ناکامی کی بڑی وجہ ہے	47
8	27اکتوبر—یومِ سیاہ کشمیر-جبری قبضے کے 79برس-کشمیر، اقوامِ متحدہ کا ادھورا وعدہ اور حقِ خودارادیت کی جدوجہد	48
9	26اکتوبر: کدو کا قومی دن۔(نیشنل پمپکن ڈے)--غذائیت اور اسلام کے تناظر میں	56
10	25اکتوبر—انٹرنیشنل آرٹسٹ ڈے- فن، فنکار اور انسانی تہذیب کے تخلیقی سفر کا دن	62
11	خوف کو تقدیر کا فیصلہ نہ کرنے دیں (آئینہ خیال وعکس زمانہ "کا ایک ورق)	65
12	24اکتوبر -یومِ اقوامِ متحدہ-کامیابیوں اور ناکامیوں کا اکیاسی سالہ سفر:پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ	66
13	23اکتوبر—عالمی یومِ برفانی چیتا-برف پوش پہاڑوں کے خاموش محافظ کی بقا، ہماری مشترکہ ذمہ داری	70
14	لفظ اٹکتے ہیں، حوصلے نہیں 22-اکتوبر—ہکلاہٹ(لکنت) سے آگاہی کا عالمی دن-پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ80	72
15	آئینہ خیال وعکس زمانہ "کا ایک ورق " خود کو سب سے بڑا تحفہ۔خوش رہنے کی اجازت	80

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
16	21اکتوبر-عالمی یوم آگاہی برائے آیوڈین کی کمی-آیوڈین کی کمی سے بچاؤ، صحت مند نسلوں کی تعمیر—آج کی آگاہی، کل کا روشن مستقبل!.پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ	81
17	20اکتوبر " -ہڈیوں کے بھربھرے ہن اور کمزوری "کا عالمی دن-(ہڈیاں مضبوط-زندگی توانا-خاموش بیماری کے خلاف جاگنے کا دن)	89
18	19اکتوبر—بچوں کی ہڈیوں، جوڑوں اور پٹھوں کی صحت کا عالمی دن	93
19	"آئینہ خیال و عکس زمانہ "کا ایک ورق	97
20	ڈویلپمنٹل لینگویج ڈس آرڈر (DLD) اگاہی دن-"بچہ دیر سے بولتا ہے" انتظار نہیں، توجہ دیجیے"! بچوں کا وہ پوشیدہ عارضہ جسے ہم اکثر شرارت یا نالائقی سمجھ بیٹھتے ہیں. والدین کے لئے ایک لمحہ فکریہ	98
21	17اکتوبر-غربت کے خاتمے کا عالمی دن۔ (سب کے لئے محفوظ چھت: غربت کے خاتمے کے لئے پاکستان اور حکومت پنجاب کا سفر)	106
22	16اکتوبر: ریڑھ کی ہڈی کا عالمی دن – (World Spine Day) اہمیت، طبی حقائق اور پنجاب میں حکومتی سہولیات	110
23	برادرانِ ملت..." اور پھر ہمیشہ کی خاموشی پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کا قتل — قاتل سید اکبر افغان فوج کا سابق بریگیڈیئر؟؟ پون صدی پرانا معمہ جس کی فائل کبھی پوری طرح نہ کھل سکی	113
24	بصارت سے محروم مگر بصیرت سے بھرپور 15اکتوبر: سفید چھڑی کے تحفظ کا عالمی دن اور حکومتِ پنجاب کے فلاحی اقدامات	119
25	آئینہ خیال و عکس زمانہ" سے منتخب ایک صفح-	126
26	آدھی آبادی، پورا حق (پائیدار ترقیاتی ہدف 5 (SDG 5) اور پاکستان میں صنفی مساوات کا سفر	127
27	12اکتوبر - جوڑوں کے درد کا عالمی دن (World Arthritis Day) اور پاکستان اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات کا جائزہ	132
28	این کارسن- تلخ و شیریں کی شاعرہ-نوبیل انعام برائے ادب 2026 کے تناظر میں ایک ادبی مطالعہ	137
29	11اکتوبر-بچیوں کا عالمی دن: پڑھی لکھی بیٹی -روشن پاکستان	142
30	10اکتوبر۔۔عالمی یوم ذہنی صحت-خاموش بحران سے قومی ترجیح تک: پاکستان میں ذہنی صحت کا مقدمہ	145

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
31	بھوک سے بڑی کوئی ذلت نہیں—پاکستان میں غربت، حکومتی اقدامات اور عوامی خوش حالی کا سوال؟؟	150
32	8اکتوبر" – (World Dyslexia Awareness Day) -پڑھنے لکھنے کی کمزوری "کی آگاہی کا عالمی دن)۔ حروف کی بھول بھلیاں-ڈسلیکسیا: کمزوری نہیں، سیکھنے کا ایک مختلف انداز	155
33	8 کتوبر (International Podiatry Day) ' پاؤں کی دیکھ بھال کا عالمی دن (پاؤں کی صحت: ایک نادیدہ نعمت اور ذیابیطس کے دور میں اس کی حفاظت	161
34	7اکتوبر کپاس کا عالمی دن -(World Cotton Day) سفید سونا: پاکستان کی معیشت کی شہ رگ حقائق و مسائل کے آئینے میں	165
35	6اکتوبر -سیریبرل پالسی (دماغی فالج،) کا عالمی دن اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات (ہمدردی نہیں، ہمقدمی چاہیے)۔	170
36	5اکتوبر—اساتذہ کا عالمی دن. تعظیم کے پھول۔ فاقے کی تنخواہ۔ پنجاب کے استاد کا المیہ	175
37	آئینہ خیال و عکس زمانہ-کانٹے ملیں تو ان پر بیٹھنا ضروری نہیں	180
38	دریا بٹ گئے، حوصلے نہیں! پاکستان کے پانی کی کہانی، جو ہر پاکستانی کو جاننی چاہیے	183
39	یکم اکتوبر—عالمی یوم عمر رسیدہ افراد اور پاکستان و حکومت پنجاب کے اقدامات کا جائزہ	186
40	دل کی حفاظت، زندگی کی حفاظت— 29 ستمبر عالمی یوم قلب اور پاکستان	189
41	28 ستمبر–ورلڈ ریبیز ڈے-سگ گزیدگی سے تحفظ : پاکستان میں کئے گئے اقدامات کا جائزہ	191
42	27 ستمبر-عالمی یوم سیاحت: تاریخ، اہمیت اور پاکستان میں سیاحتی امکانات	194
43	26 ستمبر-خرگوشوں کا عالمی دن۔ اور پاکستان میں اس کاروبار کا مستقبل	197
44	25 ستمبر۔ پھیپھڑوں کا عالمی دن اور پاکستان	201
45	24 ستمبر—عالمی یوم بحریہ-سمندر سے معیشت تک—بحری راستوں کی حفاظت، انسانیت کی خوش حالی-پاکستان کے تناظر میں	205
46	23 ستمبر—بین الاقوامی یوم اشارتی زبان: خاموشی نہیں، ایک مکمل زبان اور ایک مکمل شناخت	209
47	22 ستمبر—ورلڈ روز ڈے-گلاب جو امید، محبت اور انسانیت کا پیغام بن گیا	213
48	سعودی عرب اور یمن کا حوثی تنازع: تاریخی پس منظر،-پاکستان اور سعودی عرب کے دفاعی معاہدے کے پس منظر میں ایک تجزیہ	215
49	اوراق ماضی 'نصف صدی پر محیط فکر و قلم کا آئینہ	220

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
50	اخباری تراشوں نے کھولے ماضی کے بند دریچے	222
51	18 ستمبر-پانی کی نگرانی کا عالمی دن (World Water Monitoring Day)اور پاکستان میں بڑھتے ہوئے خدشات	224
52	17 ستمبر-عالمی یوم تحفظِ مریض پاکستان کے تناظر میں	228
53	16 ستمبر—عالمی یوم تحفظِ اوزون: انسان نے آسمان کا زخمی حصار کیسے بچایا؟ اوزون کی تہہ کیا ہے اور خطرہ کہاں سے آیا۔۔پاکستان کا ماحولیاتی الودگی ختم کرنے میں کردار؟	231
54	15 ستمبر—عالمی یوم جمہوریت: تصور سے عالمی دن تک--پاکستان میں جمہوریت؟؟(کہتی ہے خلق خدا غائبانہ کیا؟	237
55	14 ستمبر- نیشنل سوبر ڈے (NATIONAL SOBER DAY) اور پاکستان میں صورت حال	241
56	13 ستمبر۔۔سیلیک (گلوٹین الرجی) کی بیماری کا قومی بیداری کا دن (National Celiac Disease Awareness Day) .	244
57	12 ستمبر-(قومی یوم حوصلہ افزائی National Day of Encouragement اور اس کے معاشرے پر اثرات۔	247
58	11 ستمبر یوم وفات۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح: بیماری، آخری ایام اور وفات — محترمہ فاطمہ جناح کا موقف یا حکومت وقت کے خلاف چارج شیٹ۔۔۔ایک جامع جائزہ	251
59	10 ستمبر۔۔عالمی یوم انسدادِ خودکشی(World Suicide Prevention Day)۔عالمی اور پاکستان کے تناظر میں	256
60	9۔ ستمبر 1881ء: عرابی تحریک اور مصری قومی بیداری کا نقطہ آغاز	261
61	8 ستمبر-عالمی یوم خواندگی-پاکستان کے تناظر میں۔ حکومت شرح خواندگی میں اضافہ بھی چاہتی ہے۔۔۔مگر بغیر بجٹ کے۔ کیا یہ ممکن ہے؟؟؟؟	264
62	7 ستمبر: یوم فضائیہ پاکستان-جب عددی برتری ایمان کے جذبوں سے ہار گئی	269
63	6 ستمبر یوم دفاع۔جنگِ ستمبر 1965 —قومی بیانیے سے آگے تاریخی حقائق ۔۔۔کون جیتا۔ کون ہارا؟؟	271
64	5 ستمبر-خیرات کا عالمی دن (International Day of) Charity	275
65	جب روم جل رہا تھا تو کیا واقعی نیرو بانسری بجا رہا تھا۔؟؟؟	277

نمبر شمار	مضمون / عنوان	
66	4 ستمبر: سن 476 - جب دنیا کی سب سے بڑی سلطنت خاموشی سے دم توڑ گئی — سقوطِ روم کی کہانی اور اس کے دنیا پر اثرات	280
67	03 ستمبر۔1752۔ برطانوی عوام کا احتجاج (ہمارے گیارہ دن واپس کرو) 14 ستمبر کی تاریخیں غائب کر دی گئیں. کلنڈروں کی بدلتی ہوئی عالمی جب برطانیہ میں 3 ستمبر تا تاریخ پر ایک نظر	283
68	2 ستمبر 1666 جب لندن شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ وجوہات اور بعد از سانحہ کئے گئے اقدامات جنہوں نے دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی	287
69	یکم ستمبر) -1969 جب معمر قذافی نے بغاوت کے بعد لیبیا کا اقتدار سنبھالا 42 (سالہ امریت اور عروج وزوال کی داستان اور پاکستان کے ساتھ بدلتے تعلقات	290
70	31 اگست۔ دلوں کی شہزادی: لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت۔، فلاحی ورثہ اور برطانوی شاہی خاندان پر اثرات اور پاکستانی شخصیات سے تعلقات	294
71	جنرل راتکو ملاچچ" (Ratko Mladić) بوسنیا کے قصائی "کی جیل میں موت۔۔۔ تاریخ کے بدترین کردار کا ذلت آمیز انجام	298
72	30 اگست 'لاپتہ افراد (جبرًا لاپتہ کیے گئے متاثرین) کا عالمی دن۔ اقوام متحدہ کا لاپتہ افراد کے تحفظ کے معاہدے پر دستخط کے لئے پاکستان پر دباؤ اور صورت حال کا جائزہ	302
73	29 اگست: نیوکلیئر تجربات کے خلاف عالمی دن اور پاکستان و بھارت کی دفاعی صورتحال	305
74	29 اگست — نیشنل لیمن جوس ڈے: ایک قطرۂ لیموں سے صحت، ذائقے اور معیشت تک کا سفر	308
75	28 اگست 1955۔ گوری میم کو دیکھ کر سیٹی بجانے پر 14 سالہ سیاہ فام کا وحشیانہ قتل اور اس کے ما بعد اثرات	311
76	27 اگست - مدر ٹریسا کا یوم پیدائش، زندگی کے سفر، عالمی خدمات اور پاکستان پر ان کے اثرات	314
77	کامیابی کا اصل پیمانہ: اپنی ذات سے آگے سوچنا۔ (جسمانی موت سے پہلے نہ مریں)	317
78	محسنِ اعظم انسانیت حضرت محمد ﷺ: مائیکل ہارٹ کے اعترافِ عظمت کا ایک تحقیقی و ایمانی جائزہ	319
79	24 اگست سن 79ء (1947 سال قبل) — جب آسمان سے آگ برسی اور اٹلی کے دو شہر (پومپئی اور ہرکولینیم (وقت کی راکھ میں دفن ہو گئے	322
80	23 اگست۔۔ انسانیت کی عظیم فتح: غلامی کے خاتمے کا عالمی دن اور برصغیر پر اس کے گہرے اثرات	325

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
81	22اگست— "فرشتہ بننے" کا دن(BE AN ANGEL DAY)۔اسلام اور پاکستان کے تناظر میں	327
82	22 اگست-"مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر تشدد کا شکار ہونے والوں کی یاد کا عالمی دن	329
83	21 اگست: نیشنل سینئر سٹیزنز ڈے-بزرگ شہریوں کا احترام— تجربے، خدمت اور وقار کو سلام۔پاکستان اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات پر ایک نظر	332
84	20 اگست۔ مچھروں کا عالمی دن (World Mosquito Day)اور پاکستان اور صوبہ پنجاب میں کئے گئے اقدامات پر ایک نظر	335
85	19اگست عالمی یوم انسانیت: خدمت، قربانی اور یکجہتی کا دن	338
86	18اگست۔1920)جب امریکی خواتین کو۔ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا)اور اس کے عالمی اثرات	341
87	17اگست1988 :سانحہ بہاول پور۔۔۔ جنرل ضیاء الحق کے فضائی حادثے کا پس منظر اور مابعد اثرات	344
88	16اگست1858:پہلا بین البراعظمی ٹیلی گرافی پیغام— جب دو براعظم پہلی بار ایک تار سے جڑے اور موجودہ انٹرنیٹ انقلاب	346
89	15اگست 1945 ۔(وی جے ڈے(VICTORY OVER JAPAN DAY)	348
90	14اگست: آزادی کی قیمت-ہجرت، خون اور قربانی کی لازوال داستان	351
91	13اگست-لیفٹ ہینڈرز(خبچوں)کا عالمی دن (International Left Handers Day)	354
92	13اگست-عالمی یوم عطیہ اعضا(World Organ Donation Day) پاکستان کے پس منظر میں	356
93	انڈیا وِنز فریڈم: آزادی کی داستان یا متحدہ ہندوستان کے خواب کا ماتم ؟— قائداعظم اور قیام پاکستان کے تناظر میں ایک تنقیدی مطالعہ	360
94	12اگست-نوجوانوں کا عالمی دن(International Youth Day) اور پاکستان میں نوجوانوں کے لئے کئے گئے اقدامات	364
95	11اگست-پاکستان میں اقلیتوں کا قومی دن. تاریخ، آئینی تحفظات اور حالیہ پیش رفت	367
96	10اگست- سستی کا قومی دن (National Lazy Day) ۔ ۔ضرور منائیں مگر اپنے رسک پر	370
97	- 9اگست قدیم مقامی باشندگان کا عالمی دن پاکستان کے تناظر میں ۔عالمی سطح پر مڈوائف (دایوں) کی انسانیت کے لئے خدمات کا اعتراف	373

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
98	ایبولا کی نئی جنگ: کیا پرانی ویکسین Bundibugyo کے نئے خطرے کا مقابلہ کر سکے گی؟ (ڈاکٹر ثانیہ نشتر کی اہم عالمی صحت پیش رفت، پس منظر، سائنسی حقیقت اور پاکستان کے لیے سبق)	376
99	8 اگست — آسیان (ASEAN) کا یومِ تاسیس جنگ و تنازع سے علاقائی تعاون تک کا سفر اور پاکستان کے لیے نئے امکانات	381
100	میکبتھ کا المیہ — ہوسِ اقتدار اور جدید انسانی معاشرہ	385
101	6 اگست: ہیروشیما کا سانحہ — تاریخِ انسانیت کا سیاہ ترین دن اور امریکہ کا وحشیانہ قدم جس نے نسلوں کی تباہی کی بنیاد رکھی	388
102	یومِ استحصالِ کشمیر — 5 اگست 2019 سے سات برس بعد: آئینی حیثیت کی تبدیلی، قانونی جنگ، سفارتی ردِ عمل اور کشمیر کا آج	392
103	4 اگست: آسٹریلیا کا خاموش المیہ — "چوری شدہ نسلیں"، چھینی ہوئی شناخت اور تاریخی انصاف کی مسلسل جدوجہد	399
104	جنریشن زی، (GEN "Z") یا محسن نقوی کے " "کا کروچ "اسے سمجھنا ضروری ہے یا اس سے ٹکرائو۔؟ کیا بے بی بومرز (Baby Boomers) جین زی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ (فیصلہ اپ کے اپنے اختیار میں)	403
105	یکم اگست (1834ء — (برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے غلامی کے خاتمے کا تاریخی دن)۔ زنجیریں ختم ہوئیں، مگر کیا غلامی بھی ختم ہو گئی؟ پاکستان میں جدید غلامی کا ایک جائزہ	409
106	31 جولائی 1492ء — فرمانِ الحمراء: جب مذہبی تعصب (یہودیوں کی ملک بدری (نے اسپین کو اپنے ہی ذہین ترین لوگوں سے محروم کر دیا".	414
107	30 جولائی — انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی دن – انسان نہیں، انسانیت بچائیے — جدید غلامی سے آن لائن فراڈ تک پھیلتا ہوا ایک عالمی جرم	417
108	29 جولائی شیروں کا عالمی دن -(INTERNATIONAL TIGERS DAY)	423
109	29 جولائی: قومی یومِ لپ اسٹک — سرخ مٹی سے ماڈرن لپ اسٹک تک، لبوں کی رنگینی اور خود اعتمادی کا دلکش سفر	425
110	28 جولائی: عالمی یومِ ہیپاٹائٹس (کالا یرقان) ۔۔۔ ہیپاٹائٹس کے خاتمے کی عالمی جدوجہد — پاکستان اور پنجاب کے لیے ایک اہم چیلنج کے ساتھ۔۔ امید کی نئی کرن	429

نمبر شمار	مضمون / عنوان	صفحہ نمبر
111	27 جولائی۔عالمی یومِ سر و گردن کینسر: آگہی اور بروقت علاج ہی زندگی کی ضمانت ہے۔۔پاکستان خصوصا"پنجاب میں کئے گئے موثر اقدامات کا جائزہ (ایک ایسی بیماری جو اگر بروقت پہچان لی جائے تو مکمل شفایابی یقینی حد تک ممکن ہو جاتی ہے)	433
112	26جولائی معرکہ کارگل کے اختتام کا دن۔۔۔بھارت اور پاکستان کے متضاد دعوے۔۔ایک طرف فتح کا جشن تو دوسری طرف مکمل خاموشی	437
113	25جولائی۔عالمی یومِ انسدادِ ڈوبنے (World Drowning Prevention Day) اور پاکستان کے تناظر میں احتیاطی تدابیر	441
114	جولائی:"عالمی خود سنبھال دن اپنی صحت ،اپنی ذمہ داری " (International Self-Care Day)	445
115	23جولائی:عالمی شوگرن سنڈروم ڈے(World Sjögren's Day) خاموش بیماری،بڑا چیلنج۔۔بروقت تشخیص ہی بہتر زندگی کی ضمانت	448
116	22جولائی:عالمی یومِ دماغ-صحت مند دماغ،روشن مستقبل۔۔پاکستان میں دماغی صحت کو قومی ترجیح بنانے کا وقت۔WORLD BRAIN DAY)	450
117	(کبھی بہت دیر نہیں ہوتی)- T IS NEVER TOO LATE	453
118	20جولائی شطرنج کا عالمی دن۔ کھیل کی دلچسپ تاریخ،ترقی کے تدریجی مراحل اور اس سے جڑے حقائق پاکستان کے پس منظر میں	455
119	19جولائی 1848ء:سینیکا فالز کانفرنس۔۔۔ وہ پہلی صدا جس نے خواتین کے حقوق کی تاریخ کا رخ موڑ دیا	458
120	18-جولائی:یومِ نیلسن منڈیلا) (National Mandela Day)	461



خاتونِ اوّل- آئینی منصب نہیں، ایک باوقار سماجی و سفارتی روایت (ایک اعزازی خطاب کی تاریخ، ارتقا، قانونی حیثیت اور پاکستان میں اس کا سفر)

قارئین محترم۔ پاکستان میں صدر پاکستان جناب اصف علی زرداری کی چھوٹی صاحبزادی محترمہ اصفہ بھتو زرداری کو میڈیا میں خاتون اول کے نام سے متعارف کروایا جارہا ہے حالانکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں صدرِ مملکت یا سربراہِ حکومت کی اہلیہ کو "خاتونِ اوّل (First Lady)" کہا جاتا ہے۔ یہ لقب سنتے ہی ذہن میں سرکاری تقریبات، غیر ملکی مہمانوں کی میزبانی، فلاحی مہمات اور کیمروں کی چکاچوند کا منظر ابھرتا ہے۔ مگر کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ یہ خطاب کسی آئین یا باقاعدہ قانون کی پیداوار نہیں، بلکہ تاریخی روایات، سماجی آداب، سفارتی تقاضوں اور سرکاری پروٹوکول کے سہارے پروان چڑھا ہے۔ اس خطاب کی حامل خاتون کسی عوامی انتخاب، تقرری یا حلف کے بغیر قومی اور بین الاقوامی تقریبات میں نمایاں مقام حاصل کر لیتی ہیں، اور یہی پہلو اسے دلچسپ بھی بناتا ہے اور قابلِ بحث بھی۔ زیرِ نظر مضمون میں اس لقب کی تاریخ، اس کے ارتقا، اس کی آئینی و قانونی حیثیت اور پاکستان میں اس کے سفر کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اپ کی قیمتی آراء اور مزید معلومات شئر کرنے کے لئے یہ فورم حاضر ہے۔ شکریہ (امان اللہ خان)

خاتونِ اوّل کا تصور ہر ملک میں یکساں نہیں۔ امریکہ جیسے صدارتی نظام میں یہ خطاب صدر کی اہلیہ کے لیے مخصوص ہے، جبکہ بعض پارلیمانی ممالک میں وزیر اعظم کی اہلیہ کے لیے بھی غیر رسمی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ برطانیہ جیسے ممالک میں، جہاں سربراہِ مملکت بادشاہ ہوتا ہے، وزیر اعظم کے شریکِ حیات کے لیے کوئی سرکاری لقب رائج نہیں۔ جب سربراہِ مملکت خود خاتون ہوں تو بعض ممالک میں ان کے شوہر کے لیے "فرسٹ جینٹلمین" کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔

جہاں سربراہِ مملکت غیر شادی شدہ ہوں یا ان کی اہلیہ حیات نہ ہوں، وہاں والدہ، بیٹی، بہن، بھتیجی یا کسی دوسری قریبی خاتون رشتہ دار نے یہ سماجی فرائض انجام دیے ہیں۔ اس کی ایک مشہور مثال امریکی صدر جیمز بکنن ہیں، جو 1857ء سے 1861ء تک صدر رہے اور عمر بھر غیر شادی شدہ رہے؛ ان کے دور میں ان کی بھتیجی ہیریئٹ لین نے وائٹ ہاؤس کی میزبانی کے فرائض سنبھالے اور اپنی خوش سلیقگی کے باعث خاصی مقبول ہوئیں۔

اس خطاب کی جڑیں امریکہ میں پیوست ہیں، تاہم یہ کسی ایک شخصیت کی ایجاد یا کسی حکومتی فیصلے کا نتیجہ نہیں تھا۔ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی اہلیہ مارتھا واشنگٹن کو، جو 1789ء سے 1797ء تک اس حیثیت میں رہیں، تاریخی اعتبار سے پہلی امریکی خاتونِ اوّل تسلیم کیا جاتا ہے۔ مگر ان کے زمانے میں یہ لقب رائج نہیں تھا؛ انہیں عموماً "لیڈی واشنگٹن" یا محض "صدر کی اہلیہ" کہا جاتا تھا، اور ابتدائی دور میں "مسز پریزیڈنٹ" جیسے القابات بھی آزمائے گئے۔

یہاں ایک دلچسپ تاریخی تصحیح بھی ضروری ہے۔ عام تاثر کے برعکس مارتھا واشنگٹن کبھی وائٹ ہاؤس میں نہیں رہیں، کیونکہ اس وقت تک وائٹ ہاؤس تعمیر ہی نہیں ہوا تھا۔ جارج واشنگٹن کی صدارت کے دوران دارالحکومت پہلے نیویارک اور پھر فلاڈیلفیا میں رہا، جہاں مارتھا صدارتی رہائش گاہ پر ہر جمعے کی شام استقبالیوں کی میزبانی کرتی تھیں۔ انہی محفلوں نے بعد کی سرکاری سماجی روایات کی بنیاد رکھی۔ وائٹ ہاؤس میں قیام کرنے والی پہلی خاتونِ اوّل ابیگیل ایڈمز تھیں، جو نومبر 1800ء میں اپنے شوہر صدر جان ایڈمز کے ساتھ وہاں منتقل ہوئیں۔

تحریری شواہد کے مطابق اس اصطلاح کے ابتدائی استعمالات میں سے ایک 1838ء کا ہے، جب امریکی مصنفہ لیڈیا سگورنی نے ایک اخباری مضمون میں مارتھا واشنگٹن کو "قوم کی خاتونِ اوّل" کے الفاظ میں یاد کیا اور لکھا کہ اس مقام پر پہنچ کر بھی انہوں نے اپنی سادہ اور محنتی طرزِ زندگی ترک نہیں کی۔

اسی طرح ایک مشہور روایت یہ ہے کہ 1849ء میں صدر زیکری ٹیلر نے سابق صدر جیمز میڈیسن کی بیوہ ڈولی میڈیسن کی وفات پر تعزیتی کلمات میں انہیں "فرسٹ لیڈی آف دی لینڈ" کہا۔ یہ روایت اگرچہ بہت عام ہے، مگر اس تقریر کا کوئی تحریری ریکارڈ دستیاب نہیں، اس لیے مؤرخین اسے مصدقہ واقعہ قرار نہیں دیتے

۔چنانچہ یہ کہنا تاریخی طور پر درست نہیں کہ زیکری ٹیلر نے یہ خطاب ایجاد کیا تھا۔ البتہ ڈولی میڈیسن، جو 1809ء سے 1817ء تک خاتونِ اوّل رہیں، بلاشبہ امریکی دارالحکومت کی سماجی زندگی کی ایک افسانوی شخصیت تھیں۔ 1814ء کی جنگ میں جب برطانوی فوج نے وائٹ ہاؤس کو نذرِ آتش کیا تو انہی کی ہدایت پر جارج واشنگٹن کی مشہور قدِ آدم تصویر شعلوں کی نذر ہونے سے بچالی گئی، اور یہ واقعہ امریکی قومی یادداشت کا حصہ بن گیا۔

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں امریکی صحافت نے یہ اصطلاح باقاعدگی سے اپنانا شروع کی۔ بعض حوالوں کے مطابق 1870ء میں واشنگٹن کی صحافی ایملی ایڈسن بریگز کی تحریروں میں اس کا استعمال ملتا ہے، جبکہ 1877ء میں صحافی میری کلیمر ایمز نے صدر رتھر فورڈ ہیز کی تقریبِ حلف برداری کی رپورٹنگ کرتے ہوئے ان کی اہلیہ لوسی ہیز کو "فرسٹ لیڈی آف دی لینڈ" لکھا۔ اسی کے بعد یہ لقب ملک گیر سطح پر جانا پہچانا ہونے لگا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لوسی ہیز کالج کی ڈگری رکھنے والی پہلی خاتونِ اوّل بھی تھیں۔

پھر 1886ء میں جب صدر گروور کلیولینڈ نے وائٹ ہاؤس ہی میں اکیس سالہ فرانسس فولسم سے شادی کی تو وہ کم عمر ترین خاتونِ اوّل کے طور پر اخبارات کا مستقل موضوع بن گئیں، اور اس لقب کی مقبولیت میں نمایاں اضافہ ہوا۔ 1911ء میں ڈولی میڈیسن کی زندگی پر مبنی ایک مزاحیہ ڈرامہ "دی فرسٹ لیڈی اِن دی لینڈ" نیویارک کے اسٹیج پر پیش ہوا، جس نے اس اصطلاح کو عوامی زبان میں مزید راسخ کر دیا۔

بیسویں صدی کے آغاز ہی سے یہ کردار ادارہ جاتی شکل بھی اختیار کرنے لگا۔ 1901ء میں صدر تھیوڈور روزویلٹ کی اہلیہ ایڈتھ روزویلٹ نے پہلی بار ایک باقاعدہ سوشل سیکرٹری مقرر کیا، اور رفتہ رفتہ وہ انتظامی ڈھانچہ وجود میں آیا جسے آج "آفس آف دی فرسٹ لیڈی" کہا جاتا ہے۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک "فرسٹ لیڈی" امریکی صحافت کی ایک مانوس اور مستقل اصطلاح بن چکی تھی۔

اس خطاب کو غیر معمولی وقار اور عالمی شہرت دلانے میں صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کی اہلیہ ایلینور روزویلٹ کا کردار سب سے نمایاں ہے۔ وہ 1933ء سے 1945ء تک، یعنی امریکی تاریخ میں سب سے طویل عرصے تک، خاتونِ اوّل رہیں اور انہوں نے اس کردار کو محض سرکاری تقریبات کی میزبانی سے نکال کر عوامی خدمت اور فکری قیادت کا پلیٹ فارم بنا دیا۔

مارچ 1933ء میں انہوں نے خاتونِ اوّل کی حیثیت سے باقاعدہ پریس کانفرنسوں کا آغاز کیا اور ان میں صرف خواتین صحافیوں کو مدعو کیا، تاکہ اخبارات خواتین رپورٹرز کو ملازمت دینے پر آمادہ ہوں۔ 1935ء سے انہوں نے "مائی ڈے" کے عنوان سے اخباری کالم لکھنا شروع کیا جو 1962ء تک جاری رہا۔ خواتین کے حقوق، نسلی مساوات، تعلیم اور سماجی بہبود ان کی سرگرمیوں کے مرکزی موضوعات رہے۔

وائٹ ہاؤس سے رخصت کے بعد بھی ان کا سفر جاری رہا۔ صدر ہیری ٹرومین نے انہیں اقوامِ متحدہ میں امریکی وفد کا رکن نامزد کیا، جہاں انہوں نے انسانی حقوق کمیشن کی سربراہی کی اور 1948ء میں منظور ہونے والے انسانی حقوق کے عالمی منشور کی تیاری میں کلیدی کردار ادا کیا۔ انہی خدمات کی بنا پر ٹرومین نے انہیں "فرسٹ لیڈی آف دی ورلڈ" کہا۔ ان کے بعد یہ تصور پختہ ہو گیا کہ سربراہِ مملکت کی اہلیہ کسی آئینی عہدے کے بغیر بھی قومی و بین الاقوامی خدمت میں مؤثر کردار ادا کر سکتی ہیں۔

بعد کی امریکی خواتینِ اوّل نے بھی یہی روایت آگے بڑھائی۔ جیکولین کینیڈی نے وائٹ ہاؤس کی تاریخی بحالی کو ایک قومی منصوبہ بنا دیا، لیڈی برڈ جانسن نے ماحول اور شاہراہوں کی خوبصورتی کی مہم چلائی، جبکہ مشیل اوباما نے بچوں میں موٹاپے کے خلاف "لیٹس موو" تحریک شروع کی۔ یوں ہر خاتونِ اوّل نے اس غیر رسمی کردار کو اپنی ترجیحات کے مطابق نئی شکل دی۔

یہاں ایک بنیادی فرق سمجھنا ضروری ہے: کسی خطاب کا آئین میں موجود نہ ہونا ایک بات ہے، اور اس کے لیے انتظامی سہولتوں یا قانونی انتظامات کا موجود ہونا دوسری بات۔ امریکی آئین میں خاتونِ اوّل کا کوئی منصب موجود نہیں۔ انہیں صدر کی طرح کوئی انتظامی اختیار حاصل نہیں ہوتا، وہ اس حیثیت میں عوام کے سامنے جواب دہ منتخب نمائندہ نہیں ہوتیں، اور انہیں کوئی سرکاری تنخواہ بھی نہیں ملتی۔ اس کے باوجود 1978ء کے ایک وفاقی قانون میں صدر کی اہلیہ کو ان کے سرکاری و سماجی فرائض میں معاونت کے لیے وائٹ ہاؤس کا عملہ فراہم کرنے کی گنجائش رکھی گئی، جبکہ ان کی حفاظت امریکی سیکرٹ سروس کی ذمہ داری ہے۔

اس ابہام کی ایک دلچسپ مثال 1993ء میں سامنے آئی، جب ہیلری کلنٹن نے صحت کے نظام میں اصلاحات کے لیے قائم ایک سرکاری ٹاسک فورس کی سربراہی کی۔ اس معاملے پر دائر ایک مقدمے میں امریکی وفاقی اپیل کورٹ نے قرار دیا کہ ایک مخصوص وفاقی قانون کے مقاصد کے لیے خاتونِ اوّل کو عملاً سرکاری اہلکار تصور کیا جا سکتا ہے۔ گویا آئینی منصب نہ ہونے کے باوجود یہ کردار سرکاری دائرے سے مکمل طور پر باہر بھی نہیں۔

دیگر ممالک میں بھی تصویر مختلف ہے۔ فرانس میں 2017ء میں صدر ایمانویل میکرون کی اہلیہ بریجیت میکرون کو باقاعدہ سرکاری حیثیت دینے کی تجویز پر عوامی مخالفت سامنے آئی، جس کے بعد ایک "شفافیت کا منشور" جاری کیا گیا۔ اس میں ان کے کردار اور معاونتی عملے کی وضاحت تو کی گئی، مگر انہیں نہ تنخواہ دی گئی اور نہ علیحدہ بجٹ۔ دوسری جانب مصر میں صدر انور السادات کی اہلیہ جیہان سادات نے خواتین کے عائلی حقوق کے لیے ایسی بھرپور مہم چلائی کہ 1979ء کی متعلقہ قانونی ترامیم عوام میں "جیہان کے قوانین" کے نام سے مشہور ہوئیں۔ گویا بعض ملکوں میں یہ محض اعزازی خطاب ہے، اور بعض میں اس کے ساتھ باقاعدہ عملہ اور پروٹوکول بھی وابستہ ہے۔ سرکاری عملہ، پروٹوکول اور سکیورٹی کسی آئینی منصب کا ثبوت نہیں؛ لقب اور اختیار دو الگ چیزیں ہیں

۔

پاکستان میں خاتونِ اوّل کی اصطلاح قیامِ پاکستان کے بعد قومی اور سرکاری حلقوں میں رائج ہوئی۔ آزادی کے وقت سربراہِ مملکت گورنر جنرل قائدِ اعظم محمد علی جناح تھے، جن کی اہلیہ مریم جناح (رتن بائی) 1929ء میں وفات پا چکی تھیں۔ اس دور میں ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح سرکاری و قومی تقریبات میں ان کے ہمراہ نمایاں رہیں، جنہیں قوم نے بعد میں "مادرِ ملت" کا لقب دیا۔ تاہم روایتی طور پر بیگم رعنا لیاقت علی خان کو پاکستان کی پہلی خاتونِ اوّل قرار دیا جاتا ہے، کیونکہ وہ ملک کے پہلے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کی اہلیہ تھیں۔

بیگم رعنا لیاقت علی خان کی زندگی اس خطاب کی مثبت روح کی بہترین مثال ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد مہاجرین کی آبادکاری اور امداد کے لیے انہوں نے رضاکار خواتین کو منظم کیا، اور 1949ء میں آل پاکستان ویمنز ایسوسی ایشن (اپوا) کی بنیاد رکھی، جو آج بھی خواتین کی تعلیم، صحت اور معاشی خود مختاری کے لیے سرگرم ہے۔ انہوں نے خواتین کے لیے نیشنل گارڈ اور بحری ریزرو جیسے اداروں کے قیام میں بھی کردار ادا کیا۔

1951ء میں لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد بھی ان کا سفر رکا نہیں۔ وہ نیدرلینڈز، اٹلی اور تیونس میں پاکستان کی سفیر رہیں، اور 1973ء میں سندھ کی گورنر مقرر ہوئیں، یوں انہیں پاکستان کی پہلی خاتون گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ 1978ء میں اقوامِ متحدہ نے انہیں انسانی حقوق کے شعبے میں خدمات پر ایوارڈ سے نوازا۔ ان کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ خاتونِ اوّل کی حیثیت سے ملنے والی پہچان کو پائیدار قومی خدمت میں بدلا جا سکتا ہے۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس خطاب کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ یہاں کبھی صدارتی اور کبھی پارلیمانی نظام کو زیادہ عملی اہمیت حاصل رہی۔ اسی لیے مختلف ادوار میں صدر کی اہلیہ اور وزیر اعظم کی اہلیہ، دونوں کے لیے یہ لقب استعمال ہوتا رہا۔ بعض خواتینِ اوّل نے اس پہچان کو آگے چل کر عملی سیاست میں بدلا، جیسے بیگم نصرت بھٹو، جبکہ بعض نے اسے سماجی آگاہی کے لیے استعمال کیا، جیسے سابق صدر عارف علوی کی اہلیہ بیگم ثمینہ علوی، جنہوں نے چھاتی کے سرطان سے آگاہی اور خصوصی افراد کی سماجی شمولیت کی مہمات میں نمایاں حصہ لیا۔

پاکستان کے آئین میں صدر، وزیر اعظم، وفاقی وزرا اور دیگر آئینی عہدوں کے اختیارات اور ذمہ داریوں کی تفصیل موجود ہے، مگر خاتونِ اوّل کے نام سے کوئی منصب قائم نہیں کیا گیا، اور نہ ہی اس لقب کی کوئی ایسی مستقل آئینی تعریف ہے جو ہر دور میں یکساں طور پر نافذ رہی ہو۔ اس لیے یہ خطاب کسی خاتون کو از خود حکومتی فیصلے کرنے، سرکاری احکامات جاری کرنے یا ریاستی اداروں پر اختیار استعمال کرنے کا حق نہیں دیتا۔ اس حیثیت سے وابستہ پروٹوکول، سکیورٹی اور دیگر سہولتیں انتظامی فیصلوں اور روایت کی بنیاد پر طے پاتی ہیں، کسی آئینی شق کی بنیاد پر نہیں۔

پاکستان میں اس روایت کا تازہ اور منفرد باب مارچ 2024ء میں کھلا، جب آصف علی زرداری دوسری مرتبہ صدرِ مملکت منتخب ہوئے۔ ان کی اہلیہ، سابق وزیر اعظم محترمہ بینظیر بھٹو، دسمبر 2007ء میں شہید ہو چکی تھیں، چنانچہ ان کی صاحبزادی آصفہ بھٹو زرداری کو خاتونِ اوّل کا درجہ دیے جانے کی خبریں سامنے آئیں، اور تب سے ذرائع ابلاغ میں انہیں اسی حیثیت سے نمایاں کوریج مل رہی ہے۔ پاکستان کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ یہ کردار کسی صدر کی اہلیہ کے بجائے ان کی بیٹی کے حصے میں آیا، جو دنیا بھر کی اسی روایت سے مطابقت رکھتا ہے جس میں کسی قریبی خاتون رشتہ دار نے یہ فرائض انجام دیے۔

آصفہ بھٹو زرداری کی صورت میں ایک اور منفرد پہلو بھی سامنے آتا ہے۔ وہ 2024ء میں شہید بینظیر آباد کے حلقے سے ضمنی انتخاب میں قومی اسمبلی کی رکن بلامقابلہ منتخب ہوئیں۔ یوں وہ بیک وقت دو مختلف حیثیتیں رکھتی ہیں: ایک منتخب رکنِ قومی اسمبلی کی، جو آئین اور عوامی مینڈیٹ پر مبنی ہے، اور دوسری خاتونِ اوّل کی، جو اعزازی اور پروٹوکول سے متعلق ہے۔ صحافتی دیانت کا تقاضا یہی ہے کہ ان دونوں حیثیتوں کو الگ الگ سمجھا اور بیان کیا جائے۔
اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ سیاسی اور سماجی زندگی میں بعض روایات قانونی حیثیت کے بغیر بھی مستحکم ہو جاتی ہیں۔ میڈیا عوامی توجہ کا مرکز بننے والی شخصیات کے لیے مختصر اور فوراً پہچان میں آنے والے القابات اپناتا ہے، اور خاتونِ اوّل انہی اصطلاحات میں سے ایک ہے۔

اس خطاب کی مقبولیت میں سفارتی تقریبات، غیر ملکی دوروں، سربراہانِ مملکت کی ملاقاتوں، فلاحی سرگرمیوں اور قومی تقریبات کا نمایاں کردار ہے۔ جب صدر یا وزیر اعظم کی اہلیہ کسی غیر ملکی مہمان کی میزبانی کرتی ہیں یا کسی فلاحی مہم کی سرپرستی کرتی ہیں تو میڈیا انہیں خاتونِ اوّل کہہ کر متعارف کراتا ہے، اور وقت کے ساتھ یہی اصطلاح عوامی زبان اور سرکاری پروٹوکول کا حصہ بن جاتی ہے۔ سفارت کاری میں اس کردار کی عملی افادیت بھی ہے: سرکاری دوروں کے دوران میزبان اور مہمان خواتینِ اوّل کی ملاقاتیں اور ان کے الگ پروگرام دوطرفہ تعلقات میں ایک نرم اور انسانی رنگ بھر دیتے ہیں، جسے ”سافٹ ڈپلومیسی“ کا مؤثر ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

البتہ صحافتی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ اس اعزازی خطاب کو کسی آئینی منصب کے مترادف نہ سمجھا جائے۔ کسی شخصیت کی عزت و تکریم اپنی جگہ، لیکن اس کے اختیارات اور قانونی حیثیت کی درست وضاحت بھی اتنی ہی ضروری ہے، تاکہ قارئین لقب اور اختیار کے فرق کو واضح طور پر سمجھ سکیں۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ پاکستان سمیت دنیا کے متعدد ممالک میں یہ خطاب آج بھی رائج ہے۔ مارتھا واشنگٹن کی سادہ مگر باوقار محفلوں سے ایلینور روزویلٹ کی عالمی انسانی حقوق کی جدوجہد تک، اور بیگم رعنا لیاقت علی خان کی سماجی خدمات سے آج کے دور تک، اس خطاب کی حقیقی قدر اس بات میں نہیں کہ کوئی خاتون سربراہِ مملکت یا حکومت سے کیا رشتہ رکھتی ہیں، بلکہ اس میں ہے کہ وہ اس پہچان کو تعلیم، صحت، خواتین کی ترقی، انسانی ہمدردی اور قومی فلاح کے لیے کس طرح بروئے کار لاتی ہیں۔

یوں خاتونِ اوّل بنیادی طور پر ایک سماجی و سفارتی اعزاز ہے، آئینی اقتدار کا منصب نہیں۔ اس کی تاریخی اہمیت مسلّمہ ہے، مگر اس کی قانونی حیثیت کا تعین ہر ملک کے اپنے آئینی اور انتظامی نظام کی روشنی میں ہی کیا جانا چاہیے۔ یہ لقب آئین نے نہیں، تاریخ اور روایت نے جنم دیا؛ اور اسے حقیقی وقار تبھی ملتا ہے جب اس کے ساتھ خدمت جڑی ہو۔



31 اکتوبر-بچت کا عالمی دن-پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ: صورتِ حال، اسباب اور قابلِ عمل حل۔ قومی بچت سکیموں پر مختلف اراکا جائزہ-

) قارئین محترم؛ یہ مضمون عمومی آگاہی کے لیے ہے اور اسے سرمایہ کاری کا مشورہ یا شرعی فتویٰ نہ سمجھا جائے۔ سرمایہ کاری سے قبل مستند مالیاتی مشیر اور شرعی امور میں اپنے معتمد اہلِ علم سے رجوع کریں شکریہ۔ (امان اللہ خان)

ہر سال 31 اکتوبر کو دنیا بھر میں بچت کا عالمی دن (World Savings Day) منایا جاتا ہے، جسے بعض ممالک میں ورلڈ تھرفٹ ڈے (World Thrift Day) بھی کہا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد عوام میں بچت کی عادت کو فروغ دینا، مالیاتی خواندگی (Financial Literacy) کو عام کرنا اور یہ شعور اجاگر کرنا ہے کہ انفرادی بچت نہ صرف فرد اور خاندان کے مالی تحفظ کی ضامن ہے بلکہ قومی معیشت کی ترقی کی بنیاد بھی ہے۔

اس دن کی بنیاد 31 اکتوبر 1924 کو اٹلی کے شہر میلان میں منعقد ہونے والی پہلی بین الاقوامی بچت بینک کانگریس (First International Savings Bank Congress) کے اختتامی روز رکھی گئی۔ اس کانگریس میں 29 ممالک کے مندوبین شریک تھے۔ اطالوی پروفیسر فلیپو راویزا (Filippo Ravizza) نے اختتامی اجلاس میں اس دن کو "بچت کا عالمی دن" قرار دینے کا اعلان کیا جس کی تمام شرکا نے تائید کی۔ یہ دن پہلی بار باقاعدہ طور پر 1925 میں منایا گیا۔ اسی کانگریس میں بچت بینکوں کی بین الاقوامی تنظیم کی بنیاد بھی رکھی گئی، جو آج World Savings and Retail Banking Institute (WSBI) کہلاتی ہے اور عالمی سطح پر اس دن کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب پہلی جنگِ عظیم (1914 تا 1918) کے بعد یورپ شدید معاشی بحران، بے قابو مہنگائی اور عدم استحکام کی لپیٹ میں تھا۔ بینکاری نظام پر عوام کا اعتماد متزلزل ہو چکا تھا اور لوگ اپنی جمع پونجی بینکوں کے بجائے گھروں میں گدوں اور بستروں کے نیچے چھپا کر رکھنے لگے تھے، جسے انگریزی میں Mattress Hoarding کہا جاتا ہے۔

اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد یہ پیغام دینا تھا کہ رقم گھر میں بیکار رکھنے کے بجائے محفوظ مالیاتی اداروں میں رکھی جائے، تاکہ وہ محفوظ بھی رہے، اس پر منافع بھی ملے اور یہی سرمایہ ملکی معیشت کی بحالی میں بھی کام آئے۔ آج یہ دن دنیا کے بیشتر ممالک میں بینکوں، مالیاتی اداروں اور تعلیمی اداروں کے اشتراک سے منایا جاتا ہے۔ بھارت میں یہ دن 30 اکتوبر کو منایا جاتا ہے، کیونکہ 31 اکتوبر 1984 کو وہاں کی وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کا قتل ہوا تھا۔

ذاتی مالیات (Personal Finance) میں آمدنی کی تقسیم کا سب سے مقبول اور آسان فارمولا 50/30/20 کا اصول ہے، جسے امریکی ماہرین الزبتھ وارن اور امیلیا وارن تیاگی نے اپنی کتاب All Your Worth (2005) کے ذریعے مقبول بنایا۔ اس اصول کے تحت ٹیکس کٹوتی کے بعد کی ماہانہ آمدنی کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے:

پچاس فیصد — ضروریات: راشن، کرایہ، یوٹیلیٹی بل، بچوں کی تعلیم، علاج اور آمدورفت جیسے لازمی اخراجات۔

تیس فیصد — خواہشات: تفریح، باہر کا کھانا، غیر ضروری خریداری اور ایسے دیگر اخراجات جنہیں مؤخر یا کم کیا جا سکتا ہے۔

بیس فیصد — بچت: ہنگامی فنڈ، ریٹائرمنٹ، بچوں کی اعلیٰ تعلیم اور مستقبل کی سرمایہ کاری۔

یہ اصول ایک رہنما خاکہ ہے، کوئی حتمی قانون نہیں۔ پاکستان میں کم اور متوسط آمدنی والے گھرانوں کے لیے، جہاں آمدنی کا بڑا حصہ خوراک اور بلوں پر صرف ہو جاتا ہے، بیس فیصد بچت اکثر ممکن نہیں ہوتی۔ ایسی صورت میں اصل اہمیت شرح کی نہیں بلکہ تسلسل کی ہے۔ آمدنی کا پانچ یا دس فیصد بھی اگر تنخواہ ملتے ہی باقاعدگی سے الگ کر لیا جائے، یعنی "پہلے بچت، پھر خرچ"، تو وقت کے ساتھ ایک معقول سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ ماہرین عموماً یہ مشورہ دیتے ہیں کہ سب سے پہلے کم از کم تین سے چھ ماہ کے لازمی اخراجات کے برابر ہنگامی فنڈ (Emergency Fund) قائم کیا جائے اور اس کے بعد طویل مدتی سرمایہ کاری کی طرف توجہ دی جائے۔

عالمی اور علاقائی تناظر میں بچت کی شرح اور بچت کے اعداد و شمار کو درست طور پر سمجھنے کے لیے دو اصطلاحات کا فرق جاننا ضروری ہے۔ ملکی بچت (Domestic Savings) سے مراد ملک کے اندر پیدا ہونے والی آمدنی میں سے بچایا جانے والا حصہ ہے، جبکہ قومی بچت (Gross National Savings) میں بیرونِ ملک سے آنے والی ترسیلاتِ زر اور دیگر آمدنی بھی شامل ہوتی ہے۔ دونوں کو عموماً جی ڈی پی کے تناسب سے ظاہر کیا جاتا ہے، اور انہیں آپس میں گڈمڈ کرنے سے اکثر متضاد اعداد سامنے آتے ہیں۔ عالمی بینک کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں مجموعی قومی بچت کی اوسط شرح جی ڈی پی کا تقریباً 26 سے 27 فیصد ہے۔ ایشیا کی تیزی سے ترقی کرتی معیشتیں اس میں نمایاں ہیں: چین میں یہ شرح 40 فیصد سے زائد، جنوبی کوریا میں 30 سے 35 فیصد اور بھارت میں تقریباً 30 فیصد ہے۔ یورپی یونین میں مجموعی قومی بچت جی ڈی پی کے تقریباً 22 سے 25 فیصد کے درمیان رہتی ہے۔ یورپ کے حوالے سے اکثر بیان کیا جانے والا 13 سے 15 فیصد کا عدد دراصل گھریلو بچت کی شرح (Household Saving Rate) ہے، یعنی خاندانوں کی قابلِ تصرف آمدنی کا وہ حصہ جو بچایا جاتا ہے۔

پاکستان کی صورتِ حال اس کے برعکس تشویشناک ہے۔ اقتصادی جائزۂ پاکستان (Pakistan Economic Survey) کے مطابق حالیہ برسوں میں پاکستان کی ملکی بچت جی ڈی پی کے محض 7 سے 8 فیصد کے لگ بھگ رہی ہے، اور ترسیلاتِ زر کو شامل کرنے کے بعد بھی قومی بچت تقریباً 13 سے 14 فیصد تک ہی پہنچ پاتی ہے۔ سادہ الفاظ میں، قومی پیداوار کے ہر 100 روپے میں سے ملکی سطح پر بمشکل 7 سے 8 روپے بچائے جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ہمسایہ ممالک بھارت اور بنگلہ دیش میں قومی بچت کی شرح 25 سے 30 فیصد یا اس سے زائد ہے۔ کم بچت کا براہِ راست اثر سرمایہ کاری پر پڑتا ہے۔ پاکستان میں سرمایہ کاری کی شرح بھی جی ڈی پی کے تقریباً 13 سے 14 فیصد تک محدود ہے، جو پائیدار معاشی ترقی کے لیے درکار سطح سے بہت کم ہے۔ جب کوئی ملک اپنی ضرورت کا سرمایہ خود پیدا نہیں کر پاتا تو اسے بیرونی قرضوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے، اور یہی وہ چکر ہے جس میں پاکستان کئی دہائیوں سے گرفتار ہے۔

پاکستان میں بچت کی کم شرح کے اسباب میں سب سے بڑی وجہ مہنگائی اور افراطِ زر ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں اشیائے خورو نوش، بجلی، گیس اور ایندھن کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ مئی 2023 میں صارف قیمتوں کے اشاریے (CPI) کے مطابق مہنگائی تقریباً 38 فیصد کی تاریخی بلند سطح تک جا پہنچی تھی۔ اگرچہ بعد ازاں مہنگائی کی رفتار میں نمایاں کمی آئی، لیکن قیمتوں کی مجموعی سطح بلند ہی رہی اور عام آدمی کی آمدنی کا بڑا حصہ بنیادی ضروریات اور بلوں کی نذر ہو جاتا ہے۔ مزید یہ کہ جب مہنگائی کی شرح بچت پر ملنے والے منافع سے زیادہ ہو تو بچت کی حقیقی قدر (Real Return) منفی ہو جاتی ہے، جو بچت کی حوصلہ شکنی کا ایک بڑا سبب ہے

۔اس کے علاوہ پاکستان میں فی کس آمدنی خطے کے کئی ممالک کے مقابلے میں کم ہے اور آبادی کا ایک بڑا حصہ بمشکل گزارے لائق آمدنی رکھتا ہے۔ جب آمدنی محض ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی ہو تو بچت کی گنجائش نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہے۔ اس پر مستزاد پاکستان کے ٹیکس محصولات کا بڑا حصہ بالواسطہ ٹیکسوں (Indirect Taxes) پر مشتمل ہے، جیسے سیلز ٹیکس، پیٹرولیم لیوی اور موبائل فون سمیت مختلف خدمات پر ودہولڈنگ ٹیکس۔ یہ ٹیکس امیر اور غریب پر یکساں لاگو ہوتے ہیں، اس لیے کم آمدنی والے طبقے کی آمدنی کے تناسب سے ان کا بوجھ کہیں زیادہ پڑتا ہے۔

عالمی بینک کے Global Findex 2021 سروے کے مطابق پاکستان میں صرف تقریباً 21 فیصد بالغ افراد کے پاس کسی بینک یا موبائل والٹ میں اکاؤنٹ تھا، اور خواتین میں یہ شرح اس سے بھی کہیں کم تھی۔ بینکاری نظام سے دوری، دستاویزی کارروائی کی پیچیدگی اور اداروں پر اعتماد کی کمی کی وجہ سے لوگ کمیٹیاں ڈالنے، نقد رقم گھر میں رکھنے یا سونا خریدنے جیسے روایتی طریقوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ بچت اپنی جگہ موجود تو ہے، مگر رسمی معیشت اور سرکاری اعداد و شمار کا حصہ نہیں بن پاتی اور پیداواری سرمایہ کاری میں استعمال نہیں ہوتی۔ آبادی کا ایک قابلِ ذکر حصہ بینکوں اور بچت اسکیموں کے منافع کو سود (ربا) سمجھ کر ان سے گریز کرتا ہے۔ اس اہم پہلو کا تفصیلی جائزہ آگے پیش کیا گیا ہے۔ معاشرے میں نمود و نمائش اور صارفیت (Consumerism) کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات پر حیثیت سے بڑھ کر اخراجات کی روایت بہت سے خاندانوں کو بچت کے بجائے قرض کی طرف دھکیل دیتی ہے۔ حالانکہ بچت کی اہمیت فرد اور معیشت کے لیے اور مستقبل کے تحفظ کے بالکل واضح ہے۔ زندگی میں بیماری، روزگار کے خاتمے، قدرتی آفات یا معاشی بحران جیسے ناگہانی حالات کسی بھی وقت پیش آسکتے ہیں، جیسا کہ 2022 کے تباہ کن سیلاب میں لاکھوں خاندانوں نے دیکھا۔ ایسے وقت میں پہلے سے کی گئی بچت ہی سب سے بڑا سہارا بنتی ہے اور انسان کو مہنگے قرضوں یا اپنے اثاثے اونے پونے فروخت کرنے پر مجبور ہونے سے بچاتی ہے۔ اور بچت کی عادت انسان کو قرض کے بوجھ سے محفوظ رکھتی ہے، اسے اپنے فیصلے آزادانہ طور پر کرنے کے قابل بناتی ہے اور تعلیم، کاروبار یا اپنے گھر جیسے بڑے مقاصد کو ممکن بناتی ہے۔ جب شہری اپنی بچت رسمی مالیاتی نظام میں رکھتے ہیں تو یہی سرمایہ کاروباری اداروں، صنعت، زراعت اور ترقیاتی منصوبوں کی مالی ضروریات پوری کرنے میں استعمال ہوتا ہے، جس سے روزگار پیدا ہوتا ہے اور پیداوار بڑھتی ہے۔ ملکی بچت میں اضافے سے حکومت کا آئی ایم ایف (IMF) جیسے بیرونی اداروں اور مہنگے غیر ملکی قرضوں پر انحصار بھی کم ہوتا ہے، جو معاشی استحکام اور معاشی خود مختاری کے لیے ناگزیر ہے۔ بچت کی عادت بچپن میں سب سے آسانی سے پختہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اس دن دنیا بھر میں اسکولوں، کالجوں اور بینکوں میں خصوصی مہمات چلائی جاتی ہیں، تاکہ بچوں اور نوجوانوں کو مٹی کے گُلّک سے لے کر جدید ڈیجیٹل بینکاری تک بچت کے طریقوں اور ان کے فوائد سے روشناس کرایا جا سکے۔

پاکستان میں مذہبی تحفظات کی وجہ بھی بچت کی راہ میں ایک اہم رکاوٹ ہے کہ بہت سے لوگ روایتی بینکوں، بعض اسلامی بینکاری مصنوعات اور قومی بچت اسکیموں کے منافع کو سود کے زمرے میں سمجھتے ہیں اور دینی تحفظات کی بنا پر اپنا سرمایہ رسمی نظام سے باہر رکھتے ہیں۔ یہ تشویش محض انفرادی نہیں بلکہ ریاستی سطح پر بھی تسلیم کی گئی ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے اپریل 2022 کے اپنے تاریخی فیصلے میں سود پر مبنی نظام کو شریعت سے متصادم قرار دیتے ہوئے حکومت کو 31 دسمبر 2027 تک معیشت کو سود سے پاک کرنے کی ہدایت کی، اور بعد ازاں اسٹیٹ بینک سمیت بعض اداروں نے اس فیصلے کے خلاف اپنی اپیلیں واپس لے لیں۔ اکتوبر 2024 میں 26ویں آئینی ترمیم کے ذریعے بھی، جہاں تک ممکن ہو، یکم جنوری 2028 تک ربا کے خاتمے کا ہدف آئین میں شامل کر دیا گیا۔

اسی پس منظر میں اسلامی بینکاری کا شعبہ تیزی سے پھیلا ہے اور اب ملکی بینکاری نظام کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ اسلامی بینکاری پر مشتمل ہے، جبکہ حکومت بھی اپنی اندرونی قرض گیری کا بڑھتا ہوا حصہ اجارہ سکوک کے ذریعے حاصل کر رہی ہے۔ مسئلے کا عملی حل یہ ہے کہ دینی تحفظات رکھنے والے افراد کے سامنے ایسے شفاف اور معتبر متبادل رکھے جائیں جو حقیقی معیشت، کاروبار اور شرعی اصولوں سے ہم آہنگ ہوں، تاکہ ان کا سرمایہ بیکار پڑا رہنے کے بجائے پیداواری کاموں میں لگ سکے۔

قومی بچت کا مرکزی ادارہ (Central Directorate of National Savings) بہبود سیونگ سرٹیفکیٹس، پنشنرز بینیفٹ اکاؤنٹ اور دیگر اسکیموں کے ذریعے عوام کی بچت حاصل کرتا ہے۔ بہبود سرٹیفکیٹس بنیادی طور پر بیواؤں، بزرگ شہریوں اور خصوصی افراد کے لیے، جبکہ پنشنرز بینیفٹ اکاؤنٹ پنشن یافتہ افراد کے لیے بنائے گئے ہیں۔ ان اسکیموں کی شرعی حیثیت کے بارے میں اہلِ علم کی آرا مختلف ہیں۔

جاوید احمد غامدی اور بعض دیگر معاصر اہلِ علم کا موقف یہ ہے کہ ان اسکیموں کا منافع روایتی ربا کے زمرے میں نہیں آتا۔ ان کے استدلال کے بنیادی نکات یہ ہیں:

ادارے کی نوعیت: قومی بچت کا ادارہ روایتی بینکوں کی طرح کسی فرد یا تاجر کو سود پر قرض نہیں دیتا اور نہ وہ اس کا مجاز ہے۔ عوام کی رقوم براہِ راست حکومتِ پاکستان کے کھاتے میں جاتی ہیں، جنہیں حکومت اپنی مالی ضروریات اور بجٹ خسارہ پورا کرنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔

فلاحی پہلو: اس نقطۂ نظر کے حامل اہلِ علم بالخصوص بہبود سرٹیفکیٹس اور پنشنرز اکاؤنٹس کو ریاست کی جانب سے اپنے کمزور شہریوں کے لیے سماجی تحفظ (Social Security) یا وظیفے کی ایک صورت سمجھتے ہیں، نہ کہ تجارتی سود۔

استحصال کا عدم وجود: روایتی سود میں ضرورت مند مقروض پر بوجھ ڈال کر اس کا استحصال کیا جاتا ہے، جبکہ یہاں ریاست اپنے وسائل سے شہریوں کو منافع ادا کرتی ہے؛ اس لیے ان کے نزدیک یہاں استحصال کا وہ عنصر موجود نہیں جو سود کی بنیادی خرابی ہے۔

دوسری جانب روایتی علما کی ایک بڑی تعداد اور ملک کے متعدد معروف دارالافتاء کا موقف یہ ہے کہ قرض پر پہلے سے طے شدہ اضافہ، خواہ قرض لینے والا کوئی فرد ہو یا حکومت، ربا ہی ہے؛ اس لیے وہ ان اسکیموں کے مقررہ منافع کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ وفاقی شرعی عدالت کے 2022 کے فیصلے میں بھی حکومت کی اندرونی و بیرونی قرض گیری کو سود سے پاک بنانے کی ہدایت کی گئی تھی۔ یوں یہ ایک حقیقی علمی اختلاف ہے، اور ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنے معتمد اہلِ علم کی رہنمائی میں فیصلہ کرے

۔

عوامی رجحان کے پیشِ نظر قومی بچت کے ادارے نے خود بھی "سروا (Sarwa) " کے نام سے شریعہ کے مطابق اسلامی بچت اسکیمیں متعارف کرائی ہیں، جو ان افراد کے لیے ایک سرکاری متبادل ہیں جو روایتی اسکیموں کے بارے میں تذبذب کا شکار تھے۔ یہ پیش رفت اس امر کا اعتراف ہے کہ اگر شرعی تحفظات کا قابلِ اعتماد حل فراہم کیا جائے تو وہ سرمایہ بھی رسمی نظام میں آسکتا ہے جو اب تک گھروں میں نقد یا سونے کی صورت میں پڑا ہے۔ ریٹائرڈ افراد، بیواؤں اور بزرگ شہریوں کے لیے، جن کے لیے اپنی جمع پونجی کو محفوظ رکھنا اور اس پر معقول منافع حاصل کرنا بنیادی ضرورت ہے، ایسی علمی وضاحتیں اور متبادل اسکیمیں بچت کی شرح بڑھانے میں مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔

جو افراد مروجہ بینکاری کے منافع کے بارے میں شرعی تحفظات رکھتے ہیں، ان کے لیے متعدد متبادل موجود ہیں۔ تاہم ہر متبادل کے فوائد کے ساتھ اس کے خطرات کو سمجھنا بھی ضروری ہے، کیونکہ سود سے پاک سرمایہ کاری کا بنیادی اصول ہی نفع و نقصان میں حقیقی شراکت ہے، اور اس میں منافع کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔

1۔ کاروبار میں براہِ راست شراکت (مشارکہ و مضاربہ)

کسی قابلِ اعتماد تاجر، صنعت کار یا چھوٹے و درمیانے کاروبار (SME) کے ساتھ نفع و نقصان کی واضح شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری کی جا سکتی ہے۔ مشارکہ میں دونوں فریق سرمایہ لگاتے ہیں، جبکہ مضاربہ میں ایک فریق سرمایہ اور دوسرا محنت و مہارت فراہم کرتا ہے۔ ایسی شراکت میں منافع کی تقسیم کا تناسب، نقصان کی صورت میں ذمہ داری اور حساب کتاب کا طریقہ تحریری معاہدے میں پہلے سے طے کر لینا چاہیے، اور ممکن ہو تو شراکت کو قانونی طور پر رجسٹر کرایا جائے۔

2۔ زراعت اور لائیو اسٹاک

پاکستان کی معیشت میں زراعت کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی ہے اور دیہی آبادی کا بڑا حصہ اسی سے وابستہ ہے۔ فصلوں کی کاشت، باغبانی، ڈیری فارمنگ، مویشی پروری یا پولٹری میں سرمایہ کاری ایسا ذریعہ ہے جس میں منافع کا تعلق براہِ راست پیداوار سے ہوتا ہے۔ تاہم موسم، بیماریوں اور منڈی کی قیمتوں کے اتار چڑھاؤ کے خطرات کے پیشِ نظر تکافل (اسلامی بیمہ) اور تکنیکی رہنمائی سے فائدہ اٹھانا دانشمندی ہے۔

3۔ پاکستان اسٹاک ایکسچینج اور شریعہ کمپلائنٹ حصص

اسٹاک مارکیٹ میں کسی کمپنی کے حصص خریدنا دراصل اس کاروبار میں حصہ دار بننا ہے، جو بینک میں رقم رکھ کر مقررہ منافع لینے سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ پاکستان اسٹاک ایکسچینج میں KMI-30 (KSE-Meezan Index) اور KMI All Share Index جیسے شریعہ انڈیکس موجود ہیں، جن میں صرف وہ کمپنیاں شامل کی جاتی ہیں جو مقررہ شرعی معیارات پر پورا اترتی ہیں، یعنی جن کا بنیادی کاروبار جائز ہو اور جن کے سودی قرضوں، سودی سرمایہ کاری اور غیر شرعی آمدنی کا تناسب مقررہ حدود کے اندر رہو۔ غیر شرعی آمدنی کے معمولی حصے کو صدقہ کر کے منافع کو پاک (Purification) کرنے کی ہدایت بھی کی جاتی ہے۔

یہاں آمدنی کمپنیوں کے منافع (Dividends) اور حصص کی قیمت میں اضافے سے حاصل ہوتی ہے، اور نفع و نقصان مارکیٹ کی کارکردگی سے مشروط ہوتا ہے۔ اسٹاک مارکیٹ میں قلیل مدت کے دوران قیمتوں کا اتار چڑھاؤ عام ہے، اس لیے یہ صرف طویل مدتی سرمایہ کاری کے لیے موزوں ہے، اور سرمایہ کاری صرف سیکیورٹیز اینڈ ایکسچینج کمیشن آف پاکستان (SECP) سے رجسٹرڈ بروکر کے ذریعے کی جانی چاہیے۔

4۔ اسلامی میوچل فنڈز اور رضاکارانہ پنشن اسکیمیں

جن افراد کو اسٹاک مارکیٹ یا کاروبار کا براہِ راست تجربہ نہیں، ان کے لیے شریعہ کمپلائنٹ میوچل فنڈز ایک موزوں راستہ ہیں۔ یہ فنڈز سرمایہ کاروں کی رقوم کو شریعہ کمپلائنٹ حصص، اسلامی سکوک، اسلامی بینکوں کے ڈپازٹس اور بعض صورتوں میں سونے میں لگاتے ہیں۔ ہر فنڈ کا اپنا شریعہ ایڈوائزری یا شریعہ بورڈ ہوتا ہے جو لین دین کی نگرانی کرتا ہے، اور یہ فنڈز SECP کے ضابطے کے تحت کام کرتے ہیں۔ اسلامی انکم اور منی مارکیٹ فنڈز نسبتاً کم خطرے والے ہیں، جبکہ ایکویٹی فنڈز زیادہ خطرے کے ساتھ زیادہ منافع کا امکان رکھتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کی منصوبہ بندی کے لیے رضاکارانہ پنشن اسکیم (Voluntary Pension System) کے تحت اسلامی پنشن فنڈز بھی دستیاب ہیں، جن میں سرمایہ کاری پر انکم ٹیکس میں رعایت بھی حاصل کی جا سکتی ہے۔

5۔ اسلامی سکوک

سکوک ایسے اسلامی سرمایہ کاری سرٹیفکیٹس ہیں جو روایتی بانڈز کے برعکس کسی حقیقی اثاثے، جیسے موٹروے، ہوائی اڈے یا کسی پیداواری منصوبے، کی ملکیت یا اس کے کرائے (اجارہ) کی آمدنی سے منسلک ہوتے ہیں۔ حکومتِ پاکستان باقاعدگی سے اجارہ سکوک جاری کرتی ہے اور نجی کمپنیاں بھی سکوک کے ذریعے سرمایہ حاصل کرتی ہیں۔ عام سرمایہ کار ان میں عموماً اسلامی میوچل فنڈز کے ذریعے اور بعض صورتوں میں براہِ راست بھی سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔

6۔ اسلامی بینکاری اور قومی بچت کی اسلامی اسکیمیں

اسلامی بینکوں کے بچت اکاؤنٹس اور ٹرم ڈپازٹس عموماً مضاربہ یا مشارکہ کی بنیاد پر کام کرتے ہیں، جہاں منافع پہلے سے مقرر نہیں ہوتا بلکہ بینک کی حقیقی آمدنی کے مطابق طے شدہ تناسب سے تقسیم ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی بچت کی سروا اسلامی اسکیمیں بھی ایک سرکاری متبادل فراہم کرتی ہیں۔ جو افراد مروجہ اسلامی بینکاری پر بھی تحفظات رکھتے ہیں، وہ متعلقہ ادارے کی شریعہ آڈٹ رپورٹس اور شریعہ بورڈ کے فیصلوں کا خود مطالعہ کر سکتے ہیں، یا صرف ایسی مصنوعات کا انتخاب کر سکتے ہیں جنہیں ان کے معتمد علما نے جائز قرار دیا ہو۔

7۔ سونا اور جائیداد

روپے کی قدر میں کمی سے بچاؤ کے لیے سونا روایتی طور پر ایک محفوظ اثاثہ سمجھا جاتا ہے، اور اس میں کوئی سودی عنصر شامل نہیں ہوتا۔ البتہ سونا کوئی باقاعدہ آمدنی نہیں دیتا، اس کی قیمت میں بھی اتار چڑھاؤ آتا ہے، زیورات کی صورت میں بنوائی کی لاگت واپس نہیں ملتی اور گھر میں رکھنے پر چوری کا خطرہ رہتا ہے؛ اس لیے بچت کی غرض سے خالص سونے کے بسکٹ یا سکے زیادہ موزوں ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ نصاب پورا ہونے کی صورت میں سونے پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

جائیداد طویل مدت میں قدر بڑھنے اور کرائے کی صورت میں مستقل حلال آمدنی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ تاہم اس کے لیے بڑی رقم درکار ہوتی ہے، ضرورت پڑنے پر اسے فوری فروخت کرنا مشکل ہوتا ہے، اور خاص طور پر پلاٹ فائلوں اور غیر منظور شدہ ہاؤسنگ اسکیموں میں دھوکہ دہی کے واقعات عام ہیں۔ اس لیے سرمایہ کاری صرف متعلقہ ترقیاتی اتھارٹی سے منظور شدہ منصوبوں میں اور مکمل قانونی جانچ پڑتال کے بعد ہی کی جانی چاہیے۔

8۔ کمیٹی اور کمیونٹی کی سطح پر اجتماعی بچت

محلے، دفتر یا خاندان کی سطح پر کمیٹی (بی سی) کا نظام بغیر کسی سود یا بینک فیس کے یکمشت بڑی رقم جمع کرنے کا ایک آزمودہ سماجی و معاشی طریقہ ہے اور بچت کے نظم و ضبط میں مددگار ہوتا ہے۔ تاہم اسے کوئی قانونی تحفظ حاصل نہیں ہوتا، سارا انحصار باہمی اعتماد پر ہوتا ہے اور جمع شدہ رقم مہنگائی سے محفوظ نہیں رہتی؛ اس لیے کمیٹی صرف قابلِ اعتماد افراد کے ساتھ اور تحریری ریکارڈ کے ساتھ ڈالنی چاہیے۔

دیہی علاقوں میں کمیونٹی کی سطح پر اجتماعی بچت کا تجربہ بھی خاصا کامیاب رہا ہے۔ پاکستان کے دیہی سپورٹ پروگرامز نے دہائیوں سے یہ ماڈل اپنایا ہے کہ دیہی آبادی کو کمیونٹی تنظیموں میں منظم کیا جائے، ان میں باقاعدہ بچت کی عادت ڈالی جائے اور ان کی مہارتوں کو فروغ دیا جائے۔ اس ماڈل میں سماجی تنظیم، بچت اور ہنر کو ترقی کے تین بنیادی ستون سمجھا جاتا ہے۔ ایسی اجتماعی بچت نہ صرف ہنگامی ضروریات میں سہارا بنتی ہے بلکہ چھوٹے کاروبار، مویشی پروری اور دیگر پیداواری سرگرمیوں کے لیے سرمایہ بھی فراہم کرتی ہے، اور دیہی خواتین کی مالی خود مختاری میں نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ بچت کی شرح بڑھانے کے لیے محض نصیحت کافی نہیں؛ اس کے لیے ریاست، مالیاتی اداروں، علما اور سماجی تنظیموں کو مل کر ہمہ جہت اقدامات کرنے ہوں گے۔

عوام کو یہ سمجھانے کی ضرورت ہے کہ بچت کا مطلب صرف "بینک میں پیسہ رکھنا" نہیں، بلکہ سرمائے کو جمود سے نکال کر پیداواری کاموں اور ملکی ترقی میں لگانا ہے۔ مالیاتی تعلیم کو اسکولوں کے نصاب کا حصہ بنانا اور خواتین و دیہی آبادی کے لیے خصوصی آگاہی پروگرام چلانا اس سلسلے میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے فوری ادائیگی نظام "راست " (Raast)، آسان ڈیجیٹل اکاؤنٹس اور موبائل والٹس نے اکاؤنٹ کھولنے اور رقم منتقل کرنے کو پہلے سے کہیں آسان اور سستا بنا دیا ہے، جبکہ بیرونِ ملک مقیم پاکستانی روشن ڈیجیٹل اکاؤنٹ کے ذریعے ملک میں بچت اور سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔ ان سہولیات کی بدولت کم آمدنی والے افراد بھی چھوٹی رقوم باقاعدگی سے بچا سکتے ہیں۔ البتہ ڈیجیٹل فراڈ سے بچنے کے لیے اپنا پن کوڈ اور او ٹی پی کبھی کسی کو نہ بتائیں۔

مالیاتی اداروں کو اپنی مصنوعات، منافع کے طریقۂ کار اور شرعی بنیادوں کو سادہ اور قابلِ فہم زبان میں واضح کرنا چاہیے، جبکہ علما اور مالیاتی ماہرین کے درمیان سنجیدہ مکالمہ عوام کے ذہنی تذبذب کو دور کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

بچت کی سب سے بڑی ترغیب یہ ہے کہ بچائی گئی رقم کی حقیقی قدر برقرار رہے۔ اس کے لیے مہنگائی پر پائیدار قابو اور بچت پر حقیقی مثبت منافع کو یقینی بنانا حکومتی پالیسی کی اولین ترجیحات میں شامل ہونا چاہیے۔

بچت کا عالمی دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ بچت محض ایک انفرادی عادت نہیں بلکہ قومی خود انحصاری کی بنیاد ہے۔ پاکستان میں بچت کی کم شرح کے پیچھے مہنگائی، کم آمدنی، ٹیکس کا ڈھانچہ، اعتماد کی کمی، مذہبی تحفظات اور سماجی رویوں جیسے کئی عوامل کارفرما ہیں، اس لیے اس کا حل بھی ہمہ جہت ہونا چاہیے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ آج سود سے پاک بچت اور سرمایہ کاری کے متعدد قابلِ اعتماد متبادل موجود ہیں، جن کے ذریعے دینی تحفظات رکھنے والا شہری بھی اپنی بچت کو محفوظ رکھ سکتا ہے، اس پر جائز منافع کما سکتا ہے اور ملکی معیشت کی ترقی میں اپنا مثبت کردار ادا کر سکتا ہے۔ اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ آمدنی خواہ کتنی ہی کم کیوں نہ ہو، "پہلے بچت، پھر خرچ" کے اصول کو زندگی کا حصہ بنا لیا جائے۔

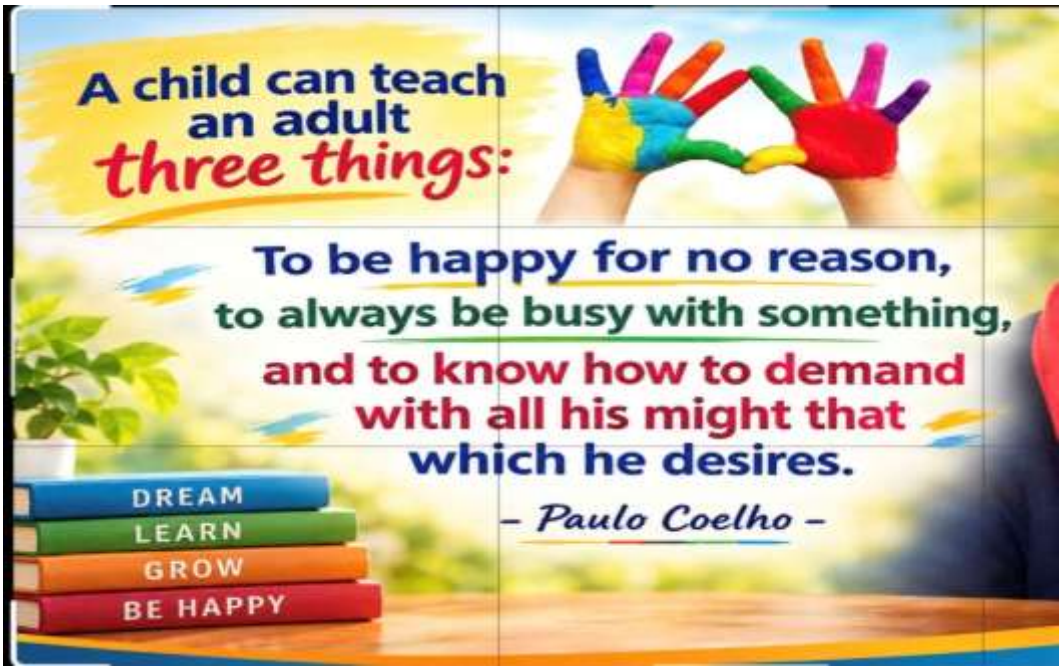

بچوں سے سیکھیں-زندگی کے تین اہم اصول (پائیلو کوہلو)

پائیلو کوہلو (Paulo Coelho) دنیا کے مشہور ترین برازیلی ناول نگار اور مصنف ہیں، جو خاص طور پر اپنے عالمی شہرت یافتہ ناول "دی الکیمسٹ (The Alchemist) " کی وجہ سے جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریریں اکثر فلسفیانہ، روحانی اور انسانی جذبات کی عکاس ہوتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایک بچہ کسی بالغ انسان کو تین اہم باتیں سکھا سکتا ہے۔

1۔ بغیر کسی خاص وجہ کے خوش رہنا،

2۔ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مگن رہنا

3۔ اور اپنی خواہشات کو پوری طاقت سے حاصل کرنے کا ہنر جاننا

بچے مادی غرض وغایت سے پاک بے ساختہ خوشی، زندگی کی دوڑ دھوپ میں مسلسل انہماک اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے بے پناہ لگن وعزم کی عملی تصویر ہوتے ہیں، جنہیں اکثر عمر کے بڑھنے کے ساتھ بڑے فراموش کر بیٹھتے ہیں۔

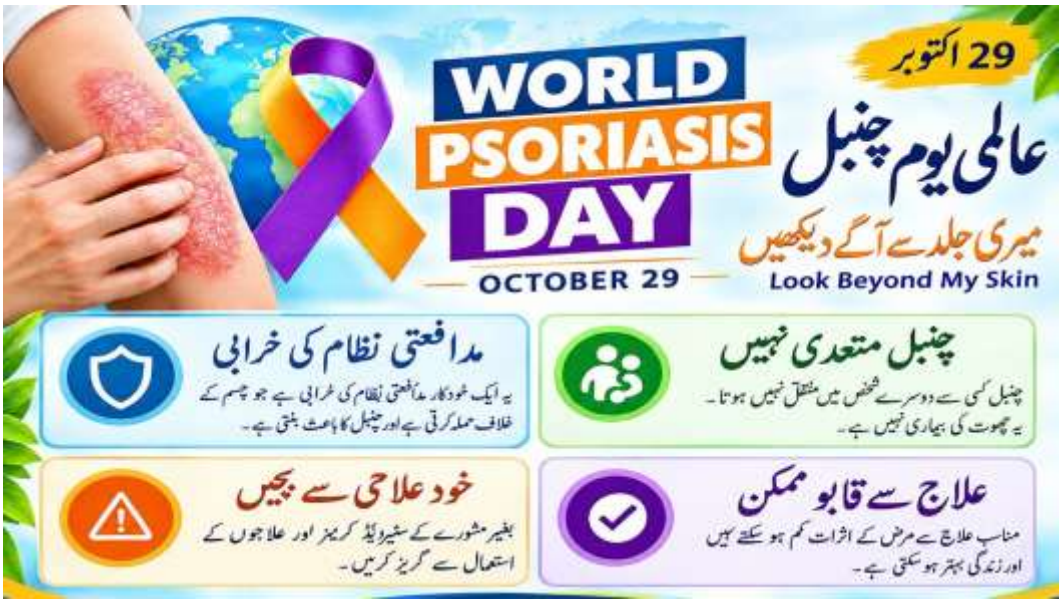

عالمی یومِ چنبل (سوریاسس) — 29 اکتوبر

آگاہی، حقائق اور پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ۔

ہر سال 29 اکتوبر کو دنیا بھر میں عالمی یومِ چنبل (World Psoriasis Day) منایا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد جلد اور جوڑوں کو متاثر کرنے والی اس دیرینہ بیماری کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنا، اس سے جڑی غلط فہمیوں کو دور کرنا اور مریضوں کے لیے بہتر اور قابلِ رسائی علاج کی ضرورت کو اجاگر کرنا ہے۔

اس دن کو منانے کا آغاز 2004ء میں چنبل کے مریضوں کی تنظیموں کے عالمی وفاق، انٹرنیشنل فیڈریشن آف سوریاسس ایسوسی ایشنز (IFPA)، نے کیا تھا۔ مئی 2014ء میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) کے فیصلہ ساز فورم، ورلڈ ہیلتھ اسمبلی، نے قرارداد WHA67.9 منظور کی جس میں چنبل کو ایک دائمی، غیر متعدی، تکلیف دہ اور معذوری کا باعث بن سکنے والی بیماری تسلیم کیا گیا۔ اسی قرارداد میں رکن ممالک کو ترغیب دی گئی کہ وہ ہر سال 29 اکتوبر کو آگاہی کی سرگرمیوں کے ذریعے اس بیماری کو اجاگر کریں۔ بعد ازاں 2016ء میں عالمی ادارۂ صحت نے چنبل پر اپنی پہلی عالمی رپورٹ (Global Report on Psoriasis) بھی جاری کی

چنبل محض جلد کا مسئلہ نہیں بلکہ مدافعتی نظام (Immune System) کی خرابی سے پیدا ہونے والی ایک دائمی بیماری ہے۔ صحت مند انسان میں جلد کے نئے خلیات بننے اور پرانے خلیات کے جھڑنے کا قدرتی عمل تقریباً ایک مہینے میں مکمل ہوتا ہے، لیکن چنبل میں مدافعتی نظام کی بے جا سرگرمی کی وجہ سے یہ عمل محض تین سے پانچ دن میں ہونے لگتا ہے۔ نتیجتاً نئے خلیات جلد کی سطح پر تیزی سے جمع ہوتے ہیں اور موٹے، کھردرے اور چھلکے دار دھبے بن جاتے ہیں۔ یہ بیماری کسی بھی عمر میں ہو سکتی ہے، تاہم زیادہ تر مریضوں میں اس کی پہلی علامات چالیس سال کی عمر سے پہلے، خصوصاً نوجوانی اور جوانی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ یہ بیماری عموماً لہروں کی صورت میں چلتی ہے، یعنی کبھی علامات شدت اختیار کر لیتی ہیں اور کبھی کافی حد تک کم ہو جاتی ہیں۔

چنبل کی سب سے نمایاں علامت جلد پر ابھرے ہوئے سرخ دھبے ہیں جن پر چاندی جیسے سفید چھلکوں (Scales) کی تہیں جمی ہوتی ہیں۔ گندمی یا سانولی رنگت والی جلد پر، جو پاکستان میں عام ہے، یہ دھبے سرخ کے بجائے بنفشی، گہرے بھورے یا سرمئی دکھائی دے سکتے ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات ان کی بروقت پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ یہ دھبے عموماً کہنیوں، گھٹنوں، سر کی جلد اور کمر کے نچلے حصے پر زیادہ نظر آتے ہیں۔ متاثرہ حصوں میں شدید خارش، جلن اور بعض اوقات درد ہوتا ہے، اور جلد اتنی خشک ہو سکتی ہے کہ اس میں دراڑیں پڑ جائیں اور خون رسنے لگے۔

سر کی جلد پر چنبل کو اکثر عام خشکی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ناخنوں میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جانا، ان کا رنگ پیلا یا بھورا ہو جانا، ناخن کا موٹا ہو جانا یا اپنی جگہ سے اکھڑ جانا بھی اس بیماری کی علامات ہیں۔ بعض مریضوں میں جوڑوں میں درد، اکڑاؤ اور سوجن بھی ہوتی ہے جسے سوریاٹک آرتھرائٹس (Psoriatic Arthritis) کہا جاتا ہے۔ اندازہ ہے کہ چنبل کے تیس فیصد تک مریضوں کو آگے چل کر جوڑوں کا یہ مسئلہ لاحق ہو سکتا ہے، اور بروقت علاج نہ ہونے کی صورت میں جوڑوں کو مستقل نقصان پہنچ سکتا ہے۔

چنبل کی کئی اقسام ہیں۔ سب سے عام قسم پلاک سوریاسس (Plaque Psoriasis) ہے جو تقریباً 80 سے 90 فیصد مریضوں میں پائی جاتی ہے اور اس میں اوپر بیان کردہ موٹے، چھلکے دار دھبے بنتے ہیں۔ گٹیٹ سوریاسس (Guttate Psoriasis) میں جسم پر بوندوں کی شکل کے چھوٹے چھوٹے دانے نکلتے ہیں؛ یہ قسم زیادہ تر بچوں اور نوجوانوں میں گلے کے بیکٹیریائی انفیکشن کے بعد ظاہر ہوتی ہے۔ انورس سوریاسس (Inverse Psoriasis) جلد کی تہوں، مثلاً بغلوں، رانوں کے درمیان اور چھاتی کے نیچے ہوتی ہے، جہاں چھلکوں کے بجائے چمکدار اور ہموار سرخ دھبے بنتے ہیں۔ پاکستان کے گرم اور مرطوب موسم میں پسینے کی وجہ سے یہ قسم زیادہ تکلیف دہ ہو جاتی ہے اور اسے اکثر فنگل انفیکشن سمجھ لیا جاتا ہے۔ پسچولر سوریاسس (Pustular Psoriasis) میں پیپ والے دانے نکلتے ہیں، جبکہ اریتھروڈرمک سوریاسس (Erythrodermic Psoriasis) ایک نایاب مگر خطرناک قسم ہے جس میں تقریباً پورا جسم سرخ ہو کر چھلکے اتارنے لگتا ہے۔ ان آخری دو اقسام میں فوری طبی امداد ضروری ہے۔

چنبل کی بنیادی وجہ مدافعتی نظام کی خرابی ہے اور اس میں موروثی (جینیاتی) عوامل کا بھی اہم کردار ہے؛ اگر والدین میں سے کسی کو یہ بیماری ہو تو بچوں میں اس کا امکان بڑھ جاتا ہے، تاہم جینیاتی رجحان رکھنے والے ہر فرد کو یہ بیماری لاحق نہیں ہوتی۔ کچھ بیرونی عوامل اس کے حملے کو متحرک کرتے یا اسے شدید بنا دیتے ہیں، جن میں ذہنی دباؤ اور پریشانی سرفہرست ہیں۔ جلد پر زخم، خراش، کیڑے کا کاٹنا یا دھوپ سے جل جانا بھی متاثرہ جگہ پر نئے دھبے پیدا کر سکتا ہے۔ گلے کا بیکٹیریائی انفیکشن (Strep Throat) اور دیگر انفیکشن، سگریٹ نوشی (بشمول حقہ اور شیشہ)، الکوحل کا استعمال، موٹاپا اور سردیوں کا خشک و ٹھنڈا موسم بھی اس کی شدت بڑھاتے ہیں۔ بعض ادویات، مثلاً بلڈ پریشر کی کچھ دوائیں (بیٹا بلاکرز)، لیتھیم اور ملیریا کی بعض ادویات، نیز سٹیرائیڈ گولیوں یا انجیکشنز کا اچانک بند کیا جانا بھی بیماری کو بھڑکا سکتا ہے۔

چنبل متعدی (Contagious) بیماری نہیں ہے۔ یہ ایک انسان سے دوسرے انسان کو چھونے، ہاتھ ملانے، ساتھ کھانا کھانے، اٹھنے بیٹھنے، ایک ہی تالاب میں نہانے یا کپڑے، تولیہ اور برتن مشترکہ استعمال کرنے سے بالکل نہیں پھیلتی۔ اس کا تعلق مریض کے اپنے مدافعتی نظام اور جینیاتی عوامل سے ہے۔ اسی طرح یہ صفائی کی کمی یا گندگی کا نتیجہ بھی نہیں ہے۔ یہ حقیقت عام کرنا اس لیے ضروری ہے کہ اسی غلط فہمی کی وجہ سے مریضوں کو سماجی تنہائی، امتیازی سلوک اور شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جدید تحقیق سے یہ واضح ہوا ہے کہ چنبل کا اثر صرف جلد تک محدود نہیں رہتا۔ خاص طور پر درمیانے اور شدید درجے کی چنبل میں مبتلا افراد میں دل کی بیماریوں، ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس (شوگر)، موٹاپے اور جگر پر چربی جمنے کا خطرہ عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ڈپریشن اور اضطراب (Anxiety) بھی ان مریضوں میں کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ چونکہ پاکستان میں ذیابیطس کی شرح دنیا کی بلند ترین شرحوں میں شمار ہوتی ہے اور دل کے امراض بھی عام ہیں، اس لیے یہاں چنبل کے مریضوں کے لیے باقاعدگی سے بلڈ پریشر، شوگر اور کولیسٹرول کا معائنہ کروانا خاص طور پر اہم ہے۔

طبی لحاظ سے فی الحال چنبل کا کوئی ایسا علاج موجود نہیں جو اسے جڑ سے ختم کر دے۔ تاہم مناسب اور باقاعدہ علاج سے اس پر مؤثر طریقے سے قابو پایا جا سکتا ہے اور بیشتر مریض معمول کی، فعال اور بھرپور زندگی گزار سکتے ہیں۔ ہلکی چنبل کا علاج عموماً جلد پر لگانے والی ادویات سے کیا جاتا ہے، جن میں سٹیرائیڈ کریمیں، وٹامن ڈی سے تیار کردہ کریمیں (مثلاً کیلسیپوٹرائیول) اور ٹاریا سیلی سیلک ایسڈ والی مصنوعات شامل ہیں۔ جلد کو نرم رکھنے کے لیے موئسچرائزر کا باقاعدہ استعمال علاج کا لازمی حصہ ہے۔

درمیانے اور شدید درجے کی بیماری میں فوٹو تھراپی (Phototherapy) یعنی ڈاکٹر کی نگرانی میں مخصوص الٹراوائلٹ شعاعوں سے علاج کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانے والی ادویات، مثلاً میتھوٹریکسیٹ، سائیکلوسپورین اور ایسٹریٹن، بھی استعمال ہوتی ہیں

۔ گزشتہ دو دہائیوں میں بائیولوجک ادویات (Biologics) نے چنبل کے علاج میں انقلاب برپا کیا ہے۔ یہ انجیکشن کی صورت میں دی جانے والی جدید ادویات ہیں جو مدافعتی نظام کے مخصوص اجزا کو نشانہ بناتی ہیں اور شدید مریضوں میں بھی جلد کو بڑی حد تک یا مکمل طور پر صاف کر سکتی ہیں۔ ان تمام ادویات کا استعمال صرف ماہر امراضِ جلد (Dermatologist) کے مشورے اور نگرانی میں ہونا چاہیے کیونکہ ان کے مضر اثرات کی باقاعدہ جانچ ضروری ہوتی ہے

۔

دنیا میں چنبل کے مریضوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازے موجود ہیں۔ مریضوں کی عالمی تنظیم IFPA کے مطابق دنیا کی تقریباً دو سے تین فیصد آبادی، یعنی کم و بیش ساڑھے بارہ کروڑ افراد، اس بیماری میں مبتلا ہیں۔ دوسری جانب گلوبل سوریاسس اٹلس (Global Psoriasis Atlas) کی تحقیق کے مطابق کم از کم تقریباً چھ کروڑ افراد اس کا شکار ہیں۔ اعداد و شمار میں یہ فرق مختلف ممالک میں تحقیق اور طبی ریکارڈ کے معیار میں فرق کی وجہ سے ہے۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شرح خطے کے لحاظ سے بدلتی ہے؛ یورپ، شمالی امریکا اور آسٹریلیا میں یہ نسبتاً زیادہ جبکہ مشرقی ایشیا میں کم ہے، اور بیشتر ترقی پذیر ممالک کے بارے میں قابلِ اعتماد اعداد و شمار بہت کم دستیاب ہیں۔

پاکستان میں چنبل کے مریضوں کی درست تعداد معلوم کرنے کے لیے اب تک کوئی جامع قومی سروے نہیں ہوا۔ دستیاب معلومات زیادہ تر بڑے ہسپتالوں کے شعبہ ہائے امراضِ جلد میں کی گئی تحقیقات پر مبنی ہیں۔ ایسی تحقیقات سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہسپتال آنے والے مریضوں میں یہ بیماری کتنی عام ہے، مگر پوری آبادی میں اس کی شرح کا درست تعین نہیں ہو پاتا۔ اگر محتاط اندازے کے مطابق آبادی کا صرف آدھا فیصد بھی اس سے متاثر سمجھا جائے تو 2023ء کی مردم شماری کے مطابق 24 کروڑ سے زائد آبادی والے ملک میں یہ تعداد تقریباً 12 لاکھ بنتی ہے۔ حقیقی تعداد اس سے زیادہ ہو سکتی ہے کیونکہ بہت سے مریض، خاص طور پر دیہی علاقوں میں، کبھی ماہرِ جلد تک پہنچ ہی نہیں پاتے اور ان کی بیماری کہیں ریکارڈ نہیں ہوتی۔
پاکستانی معاشرے میں چنبل سے جڑی غلط فہمیاں مریضوں کے لیے بعض اوقات بیماری سے بھی بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ بہت سے لوگ اسے چھوت کی بیماری یا گندگی کا نتیجہ سمجھتے ہیں، یا اسے دیگر سنگین جلدی امراض سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مریضوں کو تعلیمی اداروں، کام کی جگہوں اور خاندانی تقریبات میں امتیازی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ نوجوانوں، اور خاص طور پر لڑکیوں کے لیے، یہ بیماری رشتوں اور شادی کے معاملات میں بھی رکاوٹ سمجھی جاتی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے خاندان بیماری کو چھپاتے ہیں اور بروقت علاج نہیں کرواتے۔ یہی سماجی دباؤ مریضوں میں ڈپریشن اور احساسِ کمتری کو جنم دیتا ہے

۔

ایک اور بڑا مسئلہ خود علاجی اور غیر مستند معالجین سے رجوع کرنا ہے۔ سٹیرائیڈ والی کریمیں میڈیکل سٹوروں پر بغیر نسخے کے آسانی سے مل جاتی ہیں اور بہت سے لوگ انہیں ہر قسم کے جلدی مسئلے کے لیے مہینوں بلکہ برسوں استعمال کرتے رہتے ہیں۔ تیز اثر سٹیرائیڈ کریموں کا طویل اور بے احتیاط استعمال جلد کو پتلا کر دیتا ہے، اس پر نشانات چھوڑتا ہے اور دوا چھوڑنے پر بیماری پہلے سے زیادہ شدت سے لوٹ آتی ہے۔ اسی طرح عطائی معالجین کی جانب سے لگائے جانے والے سٹیرائیڈ انجیکشن وقتی طور پر تو آرام دے دیتے ہیں، مگر ان کا اثر ختم ہونے پر چنبل کی شدید اور خطرناک اقسام بھڑک سکتی ہیں۔ غیر مصدقہ نسخوں، تیلوں اور 'مکمل شفا' کے دعووں پر وقت اور پیسہ ضائع کرنے کے بجائے مستند ماہر جلد سے رجوع کرنا ضروری ہے۔

علاج تک رسائی بھی ایک بڑا چیلنج ہے۔ ماہرینِ امراضِ جلد کی بڑی تعداد بڑے شہروں میں مقیم ہے، جبکہ ملک کی آبادی کا بڑا حصہ دیہات میں رہتا ہے جہاں بنیادی مراکزِ صحت پر جلدی امراض کے ماہرین دستیاب نہیں ہوتے۔ فوٹو تھراپی کی سہولت چند بڑے سرکاری اور نجی ہسپتالوں تک محدود ہے، جبکہ اس علاج کے لیے مریض کو ہفتے میں کئی بار ہسپتال جانا پڑتا ہے۔ بائیولوجک ادویات کی قیمت عام آدمی کی پہنچ سے کہیں زیادہ ہے۔ چونکہ چنبل کا علاج زیادہ تر طویل مدتی ہوتا ہے اور ہسپتال میں داخلے کے بغیر، او پی ڈی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے، اس لیے صحت کارڈ جیسے پروگرام، جو بنیادی طور پر ہسپتال میں داخلے کے اخراجات کا احاطہ کرتے ہیں، ان مریضوں کو خاطر خواہ ریلیف نہیں دے پاتے اور علاج کا بوجھ زیادہ تر مریض کی اپنی جیب پر پڑتا ہے۔

پاکستان کا موسم بھی اس بیماری پر اثر انداز ہوتا ہے۔ سردیوں میں، خصوصاً پنجاب اور خیبر پختونخوا کے خشک اور ٹھنڈے مہینوں میں، جلد کی خشکی بڑھنے سے بہت سے مریضوں کی علامات شدید ہو جاتی ہیں، جبکہ گرمیوں میں پسینہ اور حبس جلد کی تہوں والی چنبل کو تکلیف دہ بنا دیتے ہیں۔ دوسری جانب ملک میں سورج کی وافر روشنی ایک قدرتی نعمت ہے؛ ڈاکٹر کے مشورے سے احتیاط کے ساتھ تھوڑی دیر دھوپ لینا کئی مریضوں کے لیے فائدہ مند ہو سکتا ہے، بشرطیکہ جلد دھوپ سے جلنے نہ پائے، کیونکہ دھوپ سے جلنا خود بیماری کو بھڑکا دیتا ہے۔

اس صورتحال میں بہتری کے لیے چند اقدامات ناگزیر ہیں۔ بنیادی مراکزِ صحت پر تعینات ڈاکٹروں اور عملے کو چنبل کی بروقت تشخیص اور ابتدائی علاج کی تربیت دی جائے تاکہ مریض کو شہر جانے کی ضرورت کم سے کم ہو۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز، دیہی سطح پر کام کرنے والی کمیونٹی تنظیمیں اور اسکول اساتذہ یہ پیغام گھر گھر پہنچانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں کہ چنبل چھوت کی بیماری نہیں اور اس کا مستند علاج ممکن ہے۔ میڈیکل سٹوروں پر سٹیرائیڈ ادویات کی بلا نسخہ فروخت کی مؤثر نگرانی، ٹیلی میڈیسن کے ذریعے دور دراز علاقوں کے مریضوں کو ماہرینِ جلد سے جوڑنا، طویل المدتی جلدی امراض کی ادویات کی سرکاری ہسپتالوں میں رعایتی یا مفت فراہمی، اور ملک گیر سطح پر اس بیماری کے مستند اعداد و شمار جمع کرنا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔

چنبل کے مریض روزمرہ زندگی میں چند سادہ احتیاطی تدابیر اپنا کر بیماری پر قابو پانے میں خاصی مدد حاصل کر سکتے ہیں۔ نہانے کے لیے بہت گرم پانی کے بجائے نیم گرم پانی استعمال کریں، تیز خوشبو والے صابن سے پرہیز کریں اور نہانے کے فوراً بعد، جب جلد ابھی ہلکی نم ہو، خوشبو سے پاک موئسچرائزر یا سادہ ویزلین لگائیں۔ دھبوں کو کھرچنے یا چھلکے زبردستی اتارنے سے گریز کریں کیونکہ جلد پر خراش نئے دھبوں کا سبب بن سکتی ہے۔ متوازن غذا، مناسب وزن، باقاعدہ ورزش، سگریٹ اور حقے سے مکمل پرہیز اور ذہنی دباؤ کم کرنے کی کوشش بیماری کے حملوں کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات اپنی مرضی سے شروع یا بند نہ کریں اور باقاعدگی سے معائنہ کرواتے رہیں۔

اہلِ خانہ اور دوستوں کا ہمدردانہ رویہ مریض کے لیے کسی دوا سے کم نہیں۔ انہیں چاہیے کہ مریض کو بیماری کی وجہ سے الگ تھلگ نہ کریں، اس کا حوصلہ بڑھائیں اور اگر وہ مسلسل اداسی یا مایوسی کا شکار ہو تو ماہر نفسیات سے مدد لینے میں اس کا ساتھ دیں۔

عالمی یومِ چنبل چار بنیادی مقاصد کے تحت منایا جاتا ہے۔ پہلا مقصد آگاہی بڑھانا ہے تاکہ عام لوگ اور صحت کے شعبے سے وابستہ افراد اس بیماری کی علامات، اس کی شدت اور اس سے جڑے صحت کے دیگر خطرات سے واقف ہوں۔ دوسرا مقصد غلط فہمیوں کا خاتمہ ہے، جن میں سب سے بڑی غلط فہمی اسے چھوت کی بیماری سمجھنا ہے؛ یہ پیغام عام کیا جاتا ہے کہ چنبل چھونے یا ساتھ بیٹھنے سے نہیں پھیلتی تاکہ مریضوں کو سماجی بائیکاٹ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ تیسرا مقصد علاج تک رسائی بہتر بنانا ہے، جس کے تحت حکومتوں اور صحت کے اداروں پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ مریضوں کے لیے سستا، جدید اور معیاری علاج یقینی بنائیں۔ چوتھا مقصد مریضوں کو بااختیار بنانا ہے، یعنی انہیں ایسا پلیٹ فارم فراہم کرنا جہاں وہ اپنے تجربات بیان کر سکیں، ایک دوسرے کا سہارا بن سکیں اور ان کی ذہنی صحت اور خود اعتمادی کو تقویت ملے۔

اس سال عالمی یومِ چنبل کا تھیم "Look Beyond My Skin" یعنی 'میری جلد سے آگے دیکھیں' ہے۔ اس مہم کا خصوصی مرکز وہ بچے اور نوجوان، بالخصوص 18 سے 35 برس کی عمر کے افراد، ہیں جو اس مرض کا شکار ہیں۔ چونکہ یہ بیماری نوجوانی میں انسان کے اعتماد، تعلیم، روزگار اور سماجی تعلقات کو شدید متاثر کرتی ہے، اس لیے یہ تھیم معاشرے کو دعوت دیتا ہے کہ وہ مریض کی جلد کے دھبوں کو نہیں بلکہ ان کے پیچھے موجود انسان، اس کی صلاحیتوں، احساسات اور ذہنی کرب کو دیکھے۔ پاکستان کے لیے، جس کی آبادی کا بہت بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے، یہ پیغام خاص اہمیت رکھتا ہے۔

چنبل ایک دائمی مگر قابلِ کنٹرول بیماری ہے۔ یہ نہ چھوت کی بیماری ہے اور نہ ہی گندگی کا نتیجہ۔ بروقت تشخیص، مستند علاج، صحت مند طرزِ زندگی اور معاشرے کا ہمدردانہ رویہ مل کر مریض کو ایک نارمل اور باوقار زندگی گزارنے کے قابل بنا سکتے ہیں۔ عالمی یومِ چنبل کے موقع پر ہمیں یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم غلط فہمیوں کا خاتمہ کریں گے، مریضوں کو تنہا نہیں چھوڑیں گے اور یہ پیغام عام کریں گے کہ انسان کی پہچان اس کی جلد سے نہیں بلکہ اس کے کردار اور صلاحیتوں سے ہوتی ہے۔



ہارمان لیناناکامی کی بڑی وجہ ہے

نپولین ہل(1883–1970)خود اعتمادی اور کامیابی کے موضوع (Self-Help) پر لکھنے والے ایک مشہور امریکی مصنف اور لیکچرر تھے، جنہیں جدید "فلسفۂ کامیابی" کا بانی مانا جاتا ہے۔ وہ اپنی 1937 میں شائع ہونے والی شہرہ آفاق کتاب "تھنک اینڈ گرو رچ (Think and Grow Rich) " کے لیے پوری دنیا میں جانے جاتے ہیں، جو تاریخ کی سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتابوں میں شمار ہوتی ہے ان کا کہنا ہے کہ

"ناکامی کا اصل سبب بڑی غلطیاں نہیں"

بلکہ عارضی اور وقتی مشکلات کے سامنے گھٹنے ٹیک دینا ہے۔ کیونکہ اصل ہار شکست کا سامنا کرنا نہیں بلکہ ہمت ہار کر میدان چھوڑ دینا ہے۔ کامیابی صرف ان ہی لوگوں کا مقدر بنتی ہے جو اندھیروں اور مشکلات کے طوفان میں بھی ثابت قدم رہتے ہیں، کیونکہ ہر عارضی شکست کے فوراً بعد کامیابی کا نیا سویرا انتظار کر رہا ہوتا ہے۔



27اکتوبر—یومِ سیاہ کشمیر-جبری قبضے کے 79برس-کشمیر،

اقوامِ متحدہ کا ادھوراوعدہ اور حقِ خودارادیت کی جدوجہد

27اکتوبر1947 کی صبح سری نگر کی فضاؤں میں ڈکوٹا طیاروں کی گھن گرج سنائی دی۔ ان طیاروں سے اترنے والے بھارتی فوجی دستوں نے ریاست جموں وکشمیر کی تاریخ کا رخ موڑ دیا۔ کشمیری عوام کے لیے یہ آزادی کی صبح نہیں بلکہ ایک ایسے قبضے کا آغاز تھا جو 79برس گزرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر سال یہ دن پاکستان، آزاد جموں وکشمیر، بھارت کے غیر قانونی زیرِ قبضہ جموں وکشمیر اور دنیا بھر میں بسنے والے کشمیری "یومِ سیاہ" کے طور پر مناتے ہیں۔

اس روز شہروں اور قصبوں میں احتجاجی ریلیاں نکلتی ہیں، سیاہ پرچم لہرائے جاتے ہیں، لوگ بازوؤں پر سیاہ پٹیاں باندھتے ہیں اور سیمیناروں میں اس تاریخ کو دہرایا جاتا ہے۔ مقبوضہ وادی میں حریت قیادت کی اپیل پر عموماً بازار بند اور گلیاں سنسان رہتی ہیں۔

یہ سب ایک ہی سوال کی صدائے بازگشت ہے: کشمیری عوام سے کیا گیا رائے شماری کا وعدہ آخر کب پورا ہو گا؟

اس کہانی کو سمجھنے کے لیے ہمیں 1947 کے موسمِ گرما میں جانا ہو گا، جب برصغیر میں برطانوی راج اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ 3 جون 1947 کے منصوبۂ تقسیم اور قانونِ آزادیٔ ہند کے تحت پانچ سو سے زائد نوابی ریاستوں سے کہا گیا کہ وہ جغرافیائی قربت اور اپنی آبادی کی خواہشات کو سامنے رکھ کر بھارت یا پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں۔

ریاست جموں وکشمیر رقبے کے لحاظ سے برصغیر کی سب سے بڑی نوابی ریاست تھی، اور 1941 کی مردم شماری کے مطابق اس کی تقریباً 77 فیصد آبادی مسلمان تھی۔ اس کے دریا—سندھ، جہلم اور چناب—پاکستان کی طرف بہتے تھے، اور بیرونی دنیا سے اس کا بنیادی رابطہ جہلم ویلی روڈ کے ذریعے راولپنڈی سے تھا۔ آبادی، جغرافیہ اور معیشت، ہر پیمانہ ایک ہی سمت اشارہ کر رہا تھا: تقسیم کے مسلمہ اصولوں کے مطابق ریاست کا فطری الحاق پاکستان کے ساتھ بنتا تھا۔

کشمیری مسلمان تو اس سے بہت پہلے، 13 جولائی 1931 کو، ڈوگرہ راج کے خلاف اپنی جدوجہد کا باقاعدہ آغاز کر چکے تھے، جب سری نگر سینٹرل جیل کے باہر ڈوگرہ فوج کی فائرنگ سے 22 کشمیری شہید ہوئے۔ 19 جولائی 1947 کو آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس نے سری نگر میں قراردادِ الحاقِ پاکستان منظور کر کے عوامی امنگوں کا واضح اعلان کر دیا۔ مگر ریاست کے ڈوگرہ حکمران مہاراجہ ہری سنگھ تذبذب کا شکار رہے۔ اگست 1947 میں انہوں نے پاکستان کے ساتھ معاہدۂ قائمہ (Standstill Agreement) کیا، جس کے تحت ڈاک، تار اور مواصلات کا نظام پاکستان کے پاس رہا، جبکہ بھارت کے ساتھ ایسا کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔

اسی دوران حالات تیزی سے بگڑنے لگے۔ اگست اور ستمبر میں پونچھ کے عوام مہاراجہ کی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور اس بغاوت کو سختی سے کچلنے کی کوشش کی گئی۔ پونچھ اور جموں کے مسلمانوں پر مظالم کی خبریں پھیلیں تو 22 اکتوبر 1947 کو قبائلی لشکر ریاست میں داخل ہو گیا، اور دو روز بعد، 24 اکتوبر کو، آزاد جموں وکشمیر کی حکومت قائم کر دی گئی۔ اکتوبر اور نومبر کے ان ہی تاریک دنوں میں جموں کے علاقے میں ڈوگرہ فوج اور انتہا پسند جتھوں نے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا۔ مختلف تخمینوں کے مطابق ہزاروں سے لے کر دو لاکھ سے زائد مسلمان شہید ہوئے اور لاکھوں گھر بار چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ اسی سانحے کی یاد میں آج بھی ہر سال 6 نومبر کو یومِ شہدائے جموں منایا جاتا ہے۔

بدلتے حالات میں مہاراجہ ہری سنگھ سری نگر چھوڑ کر جموں چلے گئے۔ بھارتی بیانیے کے مطابق 26 اکتوبر 1947 کو انہوں نے "انسٹرومنٹ آف ایکسیشن (Instrument of Accession) "یعنی الحاق نامے پر دستخط کیے، جسے اگلے روز بھارت کے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے قبول کر لیا۔ 27 اکتوبر کی صبح بھارتی فوج کے دستے ہوائی جہازوں کے ذریعے سری نگر اتار دیے گئے، اور یوں وہ فوجی قبضہ شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

پاکستان نے اس دستاویز کو کبھی تسلیم نہیں کیا، اور اس کی وجوہات محض سیاسی نہیں بلکہ اصولی ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ کہ ایک مسلم اکثریتی ریاست کے مستقبل کا فیصلہ ایک ایسے حکمران نے کیا جس کے خلاف اس کی اپنی رعایا کھلی بغاوت کر چکی تھی اور جو اپنے دارالحکومت پر عملی اختیار کھو چکا تھا۔ دوسری بات یہ کہ یہ دستاویز فوجی امداد کے بدلے، شدید دباؤ اور ہنگامی حالات میں حاصل کی گئی، اور یہ پاکستان کے ساتھ طے شدہ معاہدۂ قائمہ کی بھی خلاف ورزی تھی۔

پھر اس دستاویز کے وقت اور حالات پر بھی سنجیدہ سوالات اٹھے۔ برطانوی مؤرخ الیسٹر لیمب (Alastair Lamb) سمیت کئی محققین نے یہ رائے دی کہ دستخط غالباً بھارتی فوج کے سری نگر پہنچنے کے بعد ہوئے۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ خود لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے 27 اکتوبر 1947 کو مہاراجہ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ امن و امان بحال ہوتے ہی ریاست کے الحاق کا معاملہ عوام سے رجوع کر کے طے کیا جائے گا۔ گویا یہ الحاق اپنے پہلے ہی دن سے حتمی نہیں بلکہ عوامی رائے سے مشروط تھا۔

اس معاملے میں بھارت کا دوہرا معیار بھی کھل کر سامنے آیا۔ جونا گڑھ کے مسلمان نواب نے پاکستان سے الحاق کیا تو بھارت نے وہاں کی ہندو اکثریتی آبادی کی مرضی کو جواز بنا کر ریاست پر قبضہ کر لیا اور فروری 1948 میں وہاں رائے شماری کرائی۔ ستمبر 1948 میں حیدرآباد دکن پر فوج کشی کی گئی۔ مگر کشمیر پہنچ کر یہی اصول الٹ دیا گیا، اور عوام کے بجائے حکمران کا فیصلہ حرفِ آخر قرار پایا۔

بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو خود بھی اس حقیقت سے آگاہ تھے۔ 2 نومبر 1947 کو آل انڈیا ریڈیو سے اپنے خطاب میں انہوں نے اعلان کیا کہ کشمیر کی قسمت کا حتمی فیصلہ وہاں کے عوام کریں گے، اور یہ عہد صرف کشمیریوں سے نہیں بلکہ پوری دنیا سے کیا گیا ہے۔ یہ عہد آج تک وفا نہ ہو سکا۔

یکم جنوری 1948 کو بھارت خود یہ معاملہ اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل میں لے گیا۔ اس کے بعد عالمی ادارے نے جتنی قراردادیں منظور کیں، ان سب کا مرکزی نکتہ ایک ہی تھا: کشمیر کے مستقبل کا فیصلہ اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری (Plebiscite) کے ذریعے کشمیری عوام خود کریں گے۔

20 جنوری 1948 کو سلامتی کونسل نے قرارداد 39 کے ذریعے اقوامِ متحدہ کمیشن برائے بھارت و پاکستان (UNCIP) قائم کیا تاکہ تنازع کی تحقیق اور ثالثی کی جا سکے۔ 21 اپریل 1948 کو قرارداد 47 منظور ہوئی، جس نے جنگ بندی، افواج کے انخلا اور اقوامِ متحدہ کے نامزد ناظم کے تحت رائے شماری کا پورا طریقۂ کار طے کر دیا۔ اسی برس 13 اگست کو UNCIP نے جنگ بندی اور افواج کے انخلا کے معاہدے پر مبنی قرارداد منظور کی، اور پھر 5 جنوری 1949 کی قرارداد میں رائے شماری کے اصول اور ناظمِ رائے شماری (Plebiscite Administrator) کے تقرر کا طریقہ واضح کر دیا گیا۔ پاکستان اور بھارت، دونوں نے UNCIP کی ان قراردادوں کو باقاعدہ طور پر قبول کیا۔

بعد کے برسوں میں جب بھارت نے مقبوضہ کشمیر میں دستور ساز اسمبلی کے ذریعے الحاق کو پختہ کرنے کی کوشش کی تو سلامتی کونسل نے 30 مارچ 1951 کی قرارداد 91 اور 24 جنوری 1957 کی قرارداد 122 میں واضح کر دیا کہ ایسی کسی اسمبلی کا کوئی فیصلہ یا اقدام ریاست کے مستقبل کا حتمی تعین نہیں سمجھا جائے گا؛ یہ فیصلہ صرف عوام کی آزادانہ رائے سے ہو گا۔

یکم جنوری 1949 کو اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں جنگ بندی ہوئی، اور جولائی 1949 کے معاہدۂ کراچی کے تحت جنگ بندی لائن کھینچ دی گئی، جس کی نگرانی کے لیے اقوامِ متحدہ کا فوجی مبصر گروپ (UNMOGIP) آج بھی موجود ہے۔ لیکن رائے شماری سے پہلے افواج کے انخلا (Demilitarization) کے مرحلے پر معاملہ اٹک گیا۔ پاکستان کا موقف ہے کہ اقوامِ متحدہ کے نمائندوں سر اوون ڈکسن اور ڈاکٹر فرینک گراہم کی تجاویز بھارت کی عدم آمادگی کی نذر ہو گئیں۔ یوں سات دہائیاں گزر گئیں، وعدہ وعدہ ہی رہا، اور مسئلہ کشمیر آج بھی سلامتی کونسل کے ایجنڈے پر ایک حل طلب بین الاقوامی تنازع کے طور پر موجود ہے۔

1971 کی جنگ کے بعد 2 جولائی 1972 کو شملہ معاہدہ طے پایا۔ اس معاہدے نے جنگ بندی لائن کو "لائن آف کنٹرول" کا نام دیا، اور دونوں ممالک نے اختلافات کو پرامن اور دوطرفہ مذاکرات سے حل کرنے پر اتفاق کیا۔ بھارت نے بعد میں اسی معاہدے کو ڈھال بنا کر اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کسی تیسرے فریق کے کردار کو غیر متعلق قرار دینا شروع کر دیا۔
پاکستان اس تعبیر کو تسلیم نہیں کرتا۔ شملہ معاہدے میں خود یہ لکھا گیا کہ دونوں ممالک کے تعلقات اقوامِ متحدہ کے منشور کے اصولوں اور مقاصد کے تحت ہوں گے، اور یہ بھی مانا گیا کہ جموں و کشمیر کا "حتمی تصفیہ" ابھی باقی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر، دو ریاستوں کے درمیان کوئی معاہدہ اس تنازع کے اصل فریق، یعنی کشمیری عوام، کے حقِ خودارادیت کو ختم نہیں کر سکتا۔
پھر 5 اگست 2019 کا دن آیا۔ بھارت نے صدارتی حکم نامے اور پارلیمانی کارروائی کے ذریعے اپنے آئین کی دفعہ 370 کو غیر مؤثر کر دیا اور دفعہ 35 A- ختم کر دی، جو ریاست کو خصوصی آئینی حیثیت اور مقامی باشندوں کو جائیداد، سرکاری ملازمت اور مستقل سکونت کے خصوصی حقوق دیتی تھیں۔ "جموں و کشمیر تنظیمِ نو ایکٹ 2019" کے تحت ریاست کو دو وفاقی علاقوں — (Union Territories) جموں و کشمیر اور لداخ — میں بانٹ دیا گیا، اور 31 اکتوبر 2019 سے اس پر عمل درآمد شروع ہو گیا۔
ان اقدامات کے ساتھ ہی وادی کو غیر معمولی فوجی محاصرے، کرفیو اور مکمل مواصلاتی بندش میں جکڑ دیا گیا۔ سابق وزرائے اعلیٰ سمیت ہزاروں سیاسی رہنما اور کارکن گرفتار ہوئے، اور تیز رفتار (4 (G موبائل انٹرنیٹ تقریباً ڈیڑھ سال بعد، فروری 2021 میں جا کر بحال ہوا۔

اگلے مرحلے میں 2020 کے نئے ڈومیسائل قواعد نے غیر کشمیریوں کے لیے سکونتی سرٹیفکیٹ، سرکاری ملازمتوں اور زمین کی خریداری کے دروازے کھول دیے، اور 2022 میں حلقہ بندی کمیشن نے اسمبلی نشستوں کی ایسی از سرِ نو تقسیم کی جس میں جموں ڈویژن کو نسبتاً زیادہ نشستیں ملیں۔ پاکستان کی نظر میں یہ سب علاقے کا آبادیاتی تناسب بدلنے اور مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کی ایک منظم کوشش ہے، جو سلامتی کونسل کی قراردادوں اور چوتھے جنیوا کنونشن کی صریح خلاف ورزی ہے۔

11 دسمبر 2023 کو بھارتی سپریم کورٹ نے دفعہ 370 کے خاتمے کو برقرار رکھا۔ پاکستان نے اس فیصلے کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ بین الاقوامی قانون 5 اگست 2019 کے یکطرفہ اقدامات کو تسلیم نہیں کرتا، اور کسی ملک کی داخلی عدالت ایک بین الاقوامی تنازع کی قانونی حیثیت نہیں بدل سکتی۔ ستمبر اور اکتوبر 2024 میں مقبوضہ علاقے میں اسمبلی انتخابات ہوئے، مگر پاکستان کا موقف ہے کہ قرارداد 122 کی روشنی میں قابض انتظامیہ کے تحت ہونے والے انتخابات اقوامِ متحدہ کی زیرِ نگرانی رائے شماری کا متبادل نہیں ہو سکتے۔

5 اگست 2019 کے فوراً بعد پاکستان نے بھارت کے ساتھ سفارتی تعلقات کا درجہ کم کیا اور دوطرفہ تجارت معطل کر دی۔ معاملہ سلامتی کونسل میں پہنچا، جہاں 16 اگست 2019 کو کئی دہائیوں بعد مسئلہ کشمیر پر خصوصی مشاورتی اجلاس ہوا۔ 2020 سے پاکستان ہر سال 5 اگست کو "یومِ استحصالِ کشمیر" کے طور پر مناتا ہے۔

پاکستانی اور کشمیری ذرائع کے مطابق مقبوضہ جموں و کشمیر دنیا کے سب سے زیادہ فوجی نفری والے علاقوں میں شمار ہوتا ہے، جہاں تقریباً نو لاکھ بھارتی فوجی اور نیم فوجی اہلکار تعینات ہیں۔ آرمڈ فورسز اسپیشل پاورز ایکٹ (AFSPA)، پبلک سیفٹی ایکٹ (PSA) اور غیر قانونی سرگرمیوں کی روک تھام کے قانون (UAPA) جیسے قوانین نے سیکیورٹی فورسز کو وسیع اختیارات اور عملاً قانونی تحفظ فراہم کر رکھا ہے، اور بغیر مقدمہ طویل نظر بندیاں معمول بن چکی ہیں۔

یہ صرف پاکستان کا دعویٰ نہیں۔ اقوامِ متحدہ کے دفتر ہائی کمشنر برائے انسانی حقوق (OHCHR) نے جون 2018 اور جولائی 2019 کی اپنی رپورٹوں میں ماورائے عدالت ہلاکتوں، پیلٹ گنوں سے شہریوں کے زخمی اور بینائی سے محروم ہونے، جبری گمشدگیوں، من مانی گرفتاریوں اور احتساب کے فقدان کی نشاندہی کی، اور ان خلاف ورزیوں کی جامع بین الاقوامی تحقیقات کے لیے کمیشن آف انکوائری کے قیام پر غور کی سفارش کی۔

کشمیری انسانی حقوق تنظیموں کے مطابق 1989 سے اب تک ہزاروں افراد جبری طور پر لاپتہ کیے جا چکے ہیں۔ 2011 میں ریاست کے اپنے انسانی حقوق کمیشن نے شمالی کشمیر کے 38 مقامات پر دو ہزار سے زائد نامعلوم قبروں کی موجودگی کی تصدیق کی۔ صحافیوں، انسانی حقوق کے کارکنوں اور سیاسی رہنماؤں کی گرفتاریاں، جائیدادوں کی ضبطی اور اظہارِ رائے پر پابندیاں آج بھی جاری ہیں۔ حریت قیادت کی بڑی تعداد برسوں سے قید ہے، اور جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے سربراہ محمد یاسین ملک کو مئی 2022 میں عمر قید کی سزا سنائی گئی۔

اپریل 2025 میں پہلگام میں سیاحوں پر حملہ ہوا۔ بھارت نے، پاکستان کے مطابق کوئی ثبوت پیش کیے بغیر، اس کا الزام پاکستان پر لگا دیا اور سندھ طاس معاہدے کو یکطرفہ طور پر "معطل (in abeyance) "رکھنے کا اعلان کر دیا۔ پاکستان نے واقعے کی غیر جانبدارانہ اور شفاف تحقیقات میں شریک ہونے کی پیشکش کی، اور قومی سلامتی کمیٹی نے دوٹوک الفاظ میں واضح کیا کہ یہ معاہدہ یکطرفہ طور پر معطل نہیں کیا جا سکتا اور پاکستان کے حصے کا پانی روکنے یا اس کا رخ موڑنے کی کوئی بھی کوشش جنگی اقدام تصور ہو گی۔

مئی 2025 میں بھارتی حملوں کے بعد دو جوہری طاقتیں براہِ راست آمنے سامنے آ گئیں۔ پاکستان نے 10 مئی کو "آپریشن بنیان مرصوص" کے تحت جوابی کارروائی کی، اور اسی روز جنگ بندی عمل میں آئی۔ پاکستان کے نزدیک اس بحران نے دنیا کو ایک بار پھر یاد دلایا کہ حل طلب مسئلہ کشمیر جنوبی ایشیا میں عدمِ استحکام کی جڑ اور ایک ممکنہ جوہری فلیش پوائنٹ ہے، اور خطے کا دیرپا امن اس کے منصفانہ حل سے وابستہ ہے۔

ان تمام برسوں میں پاکستان کا موقف ایک لمحے کے لیے بھی نہیں بدلا۔ پاکستان کے نزدیک جموں و کشمیر ایک بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ متنازع علاقہ ہے جس کے مستقبل کا فیصلہ ابھی ہونا باقی ہے، اور یہ فیصلہ کرنے کا حق صرف کشمیری عوام کو حاصل ہے۔ آئینِ پاکستان کی دفعہ 257 بھی اسی اصول کی گواہی دیتی ہے، جس کے مطابق جب ریاست جموں و کشمیر کے عوام پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کریں گے تو دونوں کے تعلقات کا تعین بھی وہاں کے عوام کی خواہشات کے مطابق ہو گا۔

اسی اصول کی بنیاد پر پاکستان عالمی برادری کے سامنے اپنا مقدمہ رکھتا ہے۔ پاکستان کا مطالبہ ہے کہ سلامتی کونسل کی قراردادوں کے مطابق اقوامِ متحدہ کی نگرانی میں آزادانہ اور غیر جانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے کشمیری عوام کو ان کا حقِ خودارادیت دیا جائے، اور 5 اگست 2019 اور اس کے بعد کیے گئے تمام یکطرفہ اور غیر قانونی اقدامات واپس لیے جائیں۔ پاکستان یہ بھی چاہتا ہے کہ ڈومیسائل قوانین، زمینوں کی منتقلی اور حلقہ بندیوں سمیت آبادیاتی تبدیلی کے تمام اقدامات فوراً روکے جائیں، فوجی محاصرہ ختم ہو، کالے قوانین منسوخ ہوں اور حریت قیادت سمیت تمام سیاسی قیدی رہا کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اقوامِ متحدہ، انسانی حقوق کے آزاد اداروں اور بین الاقوامی میڈیا کو مقبوضہ علاقے تک بلا روک ٹوک رسائی دی جائے، اور مسئلے کا پرامن حل ایسے بامعنی مذاکرات سے نکالا جائے جن میں کشمیری عوام کی حقیقی قیادت شریک ہو۔

پاکستان کشمیری عوام کی جائز جدوجہدِ آزادی کی سیاسی، سفارتی اور اخلاقی حمایت جاری رکھنے کے عزم پر قائم ہے، اور یہ آواز اقوامِ متحدہ، اسلامی تعاون تنظیم (OIC) کے کشمیر رابطہ گروپ اور دیگر عالمی فورمز پر مسلسل بلند کرتا رہا ہے۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح سے منسوب الفاظ میں کشمیر پاکستان کی "شہ رگ" ہے، اور یہ رشتہ محض جغرافیے کا نہیں بلکہ تاریخ، تہذیب، دین اور معیشت کا رشتہ ہے۔

اگر اس طویل سفر پر ایک نظر ڈالی جائے تو یہ داستان 13 جولائی 1931 کے شہداء سے شروع ہو کر 19 جولائی 1947 کی قراردادِ الحاقِ پاکستان اور اگست 1947 کے معاہدۂ قائمہ تک پہنچتی ہے۔ پھر 22 اکتوبر کو قبائلی لشکر کی آمد، 24 اکتوبر کو آزاد حکومت کا قیام اور 27 اکتوبر 1947 کو سری نگر میں بھارتی فوج کا اترنا، اور اس کے بعد 2 نومبر کو نہرو کا وعدۂ رائے شماری اور نومبر ہی میں جموں کا قتلِ عام۔ یکم جنوری 1948 کو معاملہ سلامتی کونسل پہنچا، 21 اپریل 1948 کو قرارداد 47 آئی اور یکم جنوری 1949 کو جنگ بندی ہوئی۔ 2 جولائی 1972 کو شملہ معاہدے نے جنگ بندی لائن کو لائن آف کنٹرول بنا دیا۔ 5 اگست 2019 کو خصوصی حیثیت چھینی گئی، 31 اکتوبر 2019 کو ریاست کے حصے بخرے کیے گئے، 11 دسمبر 2023 کو بھارتی سپریم کورٹ نے اس اقدام پر مہرِ تصدیق ثبت کی، اور اپریل و مئی 2025 میں پہلگام واقعے، سندھ طاس معاہدے کی یکطرفہ معطلی اور فوجی تصادم نے خطے کو ایک بار پھر جنگ کے دہانے پر لا کھڑا کیا۔ اس پورے سفر میں اگر کوئی چیز نہیں بدلی تو وہ کشمیری عوام کا اپنے حقِ خودارادیت پر اصرار ہے۔

یوں 27 اکتوبر محض ایک تاریخی دن کی یاد نہیں بلکہ عالمی ضمیر کے سامنے ایک سوال ہے: اقوامِ متحدہ کی قراردادوں، عالمی برادری کی یقین دہانیوں اور خود بھارتی قیادت کے وعدوں کے باوجود ایک قوم 79 برس سے اپنے بنیادی حقِ خودارادیت سے کیوں محروم ہے؟

یومِ سیاہ کا پیغام واضح ہے: کشمیری عوام کی قربانیاں رائیگاں نہیں جائیں گی، پاکستانی قوم ان کے شانہ بشانہ کھڑی ہے، اور جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کا راستہ اقوامِ متحدہ کی قراردادوں اور کشمیری عوام کی امنگوں کے مطابق مسئلہ کشمیر کے منصفانہ اور پرامن حل سے ہو کر گزرتا ہے۔

تقابلی مطالعے اور مکمل تصویر کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ بھارت اس معاملے کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ بھارت کا موقف ہے کہ مہاراجہ ہری سنگھ کے دستخط شدہ الحاق نامے کے تحت جموں و کشمیر کا بھارت سے الحاق آئینی، قانونی اور حتمی ہے، اور یہ وہی طریقۂ کار تھا جس کے ذریعے دیگر نوابی ریاستوں نے الحاق کیا۔ بھارت کے مطابق اکتوبر 1947 میں اس کی فوج قبائلی حملہ آوروں سے ریاست کے دفاع کے لیے مہاراجہ کی درخواست پر بھیجی گئی، اور وہ جموں و کشمیر کو اپنا "اٹوٹ انگ (Integral part)" قرار دیتا ہے۔

اقوامِ متحدہ کی قراردادوں کے بارے میں بھارت کا کہنا ہے کہ رائے شماری کی پیشگی شرط—پاکستانی افواج کا انخلا— کبھی پوری نہیں ہوئی، بدلے ہوئے حالات میں یہ قراردادیں قابلِ عمل نہیں رہیں، اور شملہ معاہدے کے بعد یہ مسئلہ صرف دوطرفہ طور پر طے ہو سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر وہ کسی تیسرے فریق کی ثالثی کو مسترد کرتا ہے اور پاکستان کی جانب سے بین الاقوامی فورمز پر یہ معاملہ اٹھانے کی مخالفت کرتا ہے۔

بھارت 5 اگست 2019 کے اقدامات کو اپنا اندرونی معاملہ قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ دفعہ 370 کا خاتمہ ترقی، قانون کی حکمرانی، مرکزی قوانین کے نفاذ اور علاقے کے عوام کو قومی دھارے میں لانے کے لیے کیا گیا، جس کی توثیق دسمبر 2023 میں اس کی سپریم کورٹ نے کی۔ بھارت 2024 کے انتخابات میں عوامی شرکت کو اپنے موقف کے حق میں پیش کرتا ہے اور پاکستان پر سرحد پار دہشت گردی کی پشت پناہی کا الزام عائد کرتا ہے، جس کی پاکستان سختی سے تردید کرتا ہے اور کشمیریوں کی جدوجہد کو ایک مقامی اور جائز عوامی تحریک قرار دیتا ہے۔

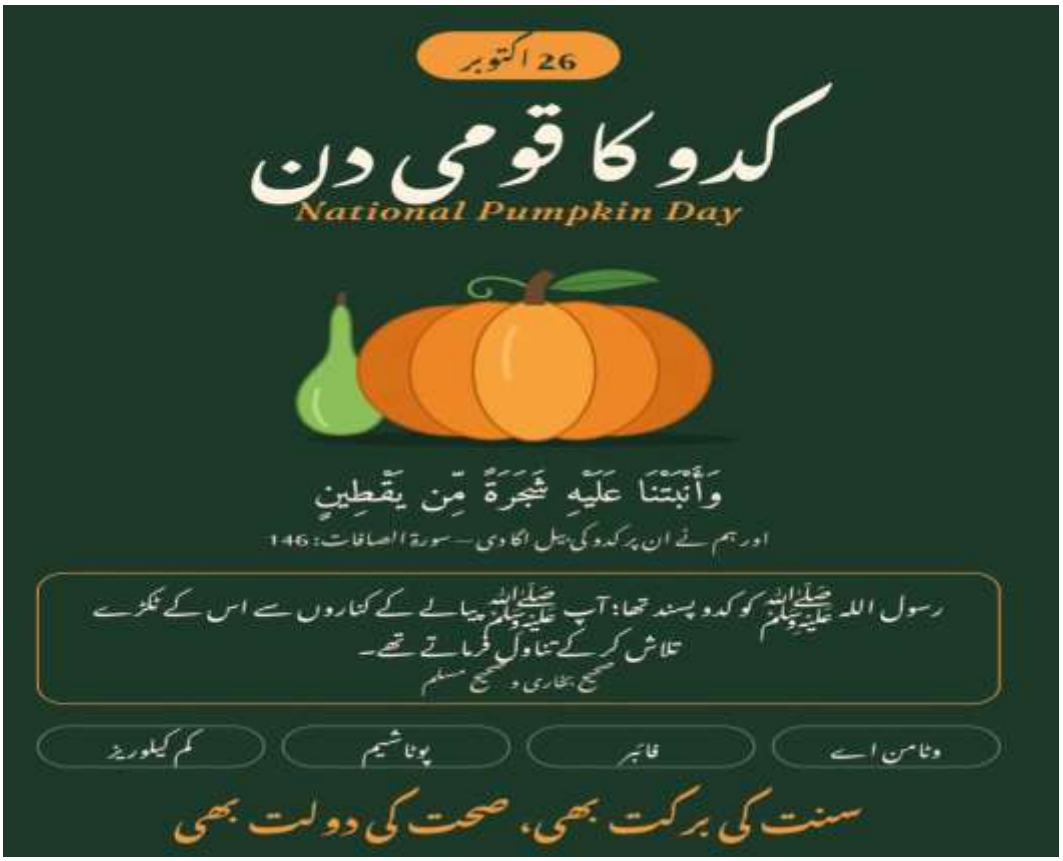

26 اکتوبر: کدو کا قومی دن۔ (نیشنل پمپکن ڈے)

-غذائیت اور اسلام کے تناظر میں

بچپن کی یادوں میں ایک دلچسپ واقعہ آج تک حافظے میں محفوظ ہے۔ ہمارے قصبے نارنگ میں جید اکھو کھر نام کا ایک سبزی فروش ہوا کرتا تھا۔ ایک دن سبزی منڈی میں کدو کی بولی شروع ہوئی تو اس نے کسی بات پر غصے میں آکر بولی کا مقابلہ جیت لیا اور منڈی میں آئے ہوئے تمام کدو خرید لیے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس روز اس کی دکان پر کدو کے سوا کوئی سبزی نہ تھی اور شہر کی کسی دوسری دکان پر کدو نام کو بھی نہ تھا۔ جید اسخت پریشان تھا کہ اتنے سارے کدو کون خریدے گا، اور اسے یوں لگ رہا تھا کہ گھاٹا اس کا مقدر بن چکا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ وہ جمعے کا دن تھا۔ علاقے کی نامور مذہبی شخصیت اور جامعہ مسجد کے خطیب مولانا عبدالرشید صاحب سبزی خریدنے اس کی دکان پر آئے تو انہیں سارا قصہ معلوم ہوا۔ انہوں نے جیدے کھوکھر کو تسلی دی کہ اللہ بہتر کرے گا۔ جمعے کے خطبے میں مولانا نے اس بات پر زور دیا کہ نبی کریم ﷺ کی سنت کو زندہ رکھنے کا بڑا اجر ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ ہر شخص کبھی نہ کبھی کدو کھاتا ہی ہے، لیکن اگر وہ اسے رسول اللہ ﷺ کی پسندیدہ غذا سمجھ کر، محبت اور اتباع کی نیت سے کھائے تو اسے ثواب بھی ملے گا، کیونکہ اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے (اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ — صحیح بخاری)۔ پھر انہوں نے نمازیوں سے ایک عہد لیا اور کہا کہ دیکھتے ہیں آج کون مسلمان اس نیت سے کدو لے کر گھر جاتا ہے کہ اسے سنت کو زندہ کرنا ہے۔ تو قارئینِ محترم! شام تک شہر میں کدو نایاب ہو چکا تھا اور جیدا کھوکھر خوش و خرم تھا۔

یہ چھوٹا سا واقعہ اس حقیقت کی خوب صورت مثال ہے کہ ہمارے معاشرے میں کدو محض ایک سبزی نہیں بلکہ ایسی غذا ہے جس کے ساتھ دینی عقیدت اور محبتِ رسول ﷺ کا رشتہ جڑا ہوا ہے۔ دلچسپ اتفاق یہ ہے کہ دنیا کے ایک بڑے خطے میں ہر سال 26 اکتوبر کو کدو کا قومی دن بھی منایا جاتا ہے۔ آیئے اس موقع پر کدو کو دینی، تاریخی، ثقافتی اور غذائی، ہر پہلو سے دیکھتے ہیں۔

عربی زبان میں کدو کو «دُبّاء» اور «قَرْع» کہا جاتا ہے، جبکہ قرآنِ کریم میں اس کے لیے «یَقْطِین» کا لفظ آیا ہے۔ اہلِ لغت کے مطابق یقطین ہر اس پودے کو کہتے ہیں جو تنے کے بغیر زمین پر بیل کی صورت میں پھیلتا ہے، جیسے کدو، ککڑی اور خربوزہ؛ تاہم حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سمیت اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں اس سے مراد کدو ہی ہے۔

یہاں ایک وضاحت ضروری ہے۔ احادیث میں جس «دُبّاء» کا ذکر ہے وہ وہی لمبا یا گول سبز کدو ہے جسے ہم لوکی یا گھیا کدو کہتے ہیں (نباتاتی نام Lagenaria siceraria :۔ یہ افریقہ اور ایشیا میں ہزاروں سال سے کاشت ہوتا آ رہا ہے۔ اس کے برعکس نارنجی رنگ کا بڑا کدو، جسے ہمارے ہاں حلوہ کدو یا میٹھا کدو کہا جاتا ہے اور انگریزی میں پمپکن (Pumpkin) کہلاتا ہے، براعظم امریکہ کی پیداوار ہے اور پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں کولمبس کے سفروں کے بعد یورپ، ایشیا اور افریقہ تک پہنچا۔ گویا نبی کریم ﷺ کا پسندیدہ کدو لوکی تھا، جبکہ نیشنل پمپکن ڈے نارنجی کدو سے منسوب ہے۔ البتہ دونوں ایک ہی نباتاتی خاندان (کدو خاندان یعنی (Cucurbitaceae سے تعلق رکھتے ہیں، جس میں ٹینڈا، توری، کریلا، کھیرا، خربوزہ، تربوز اور پیٹھا بھی شامل ہیں۔ پیٹھا (Ash gourd) وہی سبزی ہے جس سے مشہور مٹھائی «پیٹھا» تیار کی جاتی ہے۔

قرآنِ کریم میں کدو کا ذکر حضرت یونس علیہ السلام کے واقعے کے ضمن میں آیا ہے۔ سورۃ الصافات (آیات 139 تا 148) میں بیان ہوا ہے کہ جب حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ اللہ کی تسبیح کرنے والوں میں سے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں نجات دی اور مچھلی نے انہیں ایک چٹیل، بے آب و گیاہ ساحل پر ڈال دیا، اس حال میں کہ وہ بیمار اور نڈھال تھے (آیت 145)۔ پھر ارشاد ہوا: «وَأَنۢبَتْنَا عَلَيْهِ شَجَرَةً مِّن يَقْطِينٍ» یعنی «اور ہم نے ان پر کدو کی ایک بیل اگا دی» (آیت 146)۔

مفسرین لکھتے ہیں کہ کدو کے بڑے اور چوڑے پتوں نے انہیں دھوپ سے سایہ فراہم کیا، اس کا پھل ان کی غذا بنا، اور بعض مفسرین کے بقول مکھیاں اس پودے کے قریب نہیں آتیں، اس لیے یہ ان کے کمزور جسم کے لیے ہر طرح سے راحت کا ذریعہ بنا۔ صحت یاب ہونے کے بعد انہیں ایک لاکھ یا اس سے زیادہ لوگوں کی طرف بھیجا گیا جو ایمان لے آئے (آیات 147 تا 148)۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ ایک درزی نے رسول اللہ ﷺ کو کھانے پر مدعو کیا اور حضرت انس بھی آپ ﷺ کے ساتھ گئے۔ درزی نے جو کی روٹی اور ایسا شوربہ پیش کیا جس میں کدو اور خشک کیا ہوا گوشت (قدید) تھا۔ حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ نبی کریم ﷺ پیالے کے کناروں سے کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے تناول فرما رہے تھے، اور اسی دن سے مجھے بھی کدو سے محبت ہو گئی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ یہ دیکھ کر حضرت انس کدو کے ٹکڑے جمع کر کے آپ ﷺ کے قریب کرنے لگے۔ دیگر روایات میں بھی آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو کدو پسند تھا۔ صحابہ کرام کے اس طرزِ عمل سے یہ سبق ملتا ہے کہ محبوب کی پسند سے محبت بھی محبت ہی کا حصہ ہے۔

اس کے علاوہ عوام میں چند اور روایات بھی بہت مشہور ہیں، مثلاً حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے منسوب یہ قول کہ «کدو کثرت سے کھایا کرو کیونکہ یہ دماغ کو قوت دیتا اور عقل کو بڑھاتا ہے»؛ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے متعلق یہ روایت کہ «جب ہانڈی پکاؤ تو اس میں کدو زیادہ ڈال لیا کرو کیونکہ یہ غمگین دل کو مضبوط کرتا ہے»؛ اور یہ کہ آپ ﷺ کدو کو «میرے بھائی یونس کا درخت» فرماتے تھے۔ تحقیق اور دیانت کا تقاضا ہے کہ یہ بات واضح کر دی جائے کہ محدثین کے نزدیک ان روایات کی اسناد ضعیف (کمزور) ہیں، اس لیے انہیں صحیح احادیث کی طرح قطعی انداز میں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرنے میں احتیاط برتنی چاہیے۔ البتہ آپ ﷺ کا کدو کو پسند فرمانا صحیح ترین احادیث سے ثابت ہے، اور ایک مومن کے لیے اس سبزی کی قدر و منزلت سمجھنے کو یہی کافی ہے۔

علما فرماتے ہیں کہ کھانے پینے کے معاملے میں نبی کریم ﷺ کی پسند و ناپسند کا تعلق عام طور پر «سنتِ عادیہ» سے ہے، یعنی اس پر عمل واجب یا لازم نہیں، لیکن جو شخص آپ ﷺ سے محبت اور اتباع کی نیت سے کدو کھائے تو امید ہے کہ وہ اپنی اس نیت پر اجر پائے گا۔ مولانا عبدالرشید صاحب کے خطبے کی روح بھی یہی تھی۔

ہر سال 26 اکتوبر کو امریکہ میں، اور اس کی دیکھا دیکھی بعض دوسرے ممالک میں بھی، نیشنل پمپکن ڈے (کدو کا قومی دن) منایا جاتا ہے۔ یہ کوئی سرکاری تعطیل نہیں بلکہ ایک غیر رسمی عوامی دن ہے، جس کا مقصد خزاں (Autumn) کے موسم کی اس مقبول ترین سوغات کی زرعی، ثقافتی اور غذائی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے

۔یہ دن ایسے وقت آتا ہے جب شمالی امریکہ میں کدو کی فصل اتر چکی ہوتی ہے اور 31 اکتوبر کے ہالووین (Halloween) اور نومبر کے تھینکس گیونگ (Thanksgiving) کی تیاریاں عروج پر ہوتی ہیں۔اس موسم میں کھیتوں میں «پمپکن پیچ» سجتے ہیں جہاں خاندان خود کدو چن کر خریدتے ہیں، اور دیو ہیکل کدو اگانے کے مقابلے بھی ہوتے ہیں؛ ان مقابلوں میں ایک ہزار کلو گرام سے بھی زیادہ وزنی کدو پیش کیے جا چکے ہیں۔

یہ دن کدو سے بننے والے روایتی پکوانوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا دن بھی ہے، جیسے پمپکن پائی (Pumpkin Pie) جو تھینکس گیونگ کے دستر خوان کا لازمی حصہ سمجھی جاتی ہے، پمپکن سوپ، پمپکن بریڈ، اور مشہورِ زمانہ «پمپکن اسپائس لاٹے» (کافی)، جسے امریکی کافی کمپنی سٹار بکس نے 2003ء میں متعارف کرایا اور جو آج خزاں کے موسم کی پہچان بن چکی ہے۔ہالووین پر کدو کو کھوکھلا کر کے اس پر چہرہ تراشنے اور اندر چراغ جلانے کی رسم، جسے «جیک او لینٹرن (Jack-o'-lantern)» کہا جاتا ہے، دراصل آئرلینڈ کی ایک لوک روایت سے آئی ہے جہاں یہ کام شلجم پر کیا جاتا تھا؛ آئرش تارکینِ وطن امریکہ پہنچے تو انہوں نے شلجم کی جگہ کدو کو اپنا لیا جو تراشنے میں کہیں آسان تھا۔

نارنجی کدو بنیادی طور پر براعظم امریکہ کی پیداوار ہے۔ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو میکسیکو کے علاقے اوآخاکا (Oaxaca) کے ایک غار سے کدو کے ایسے بیج ملے ہیں جو تقریباً آٹھ سے دس ہزار سال پرانے ہیں، اور کدو کو انسان کی اولین کاشت کردہ فصلوں میں شمار کیا جاتا ہے۔امریکہ کے مقامی باشندے صدیوں سے اسے اپنی خوراک کا لازمی حصہ بنائے ہوئے تھے۔وہ مکئی، پھلی (بینز) اور کدو کو ایک ساتھ کاشت کرتے تھے جنہیں «تین بہنیں (Three Sisters)» کہا جاتا تھا: مکئی کا ڈنٹھل پھلی کی بیل کو سہارا دیتا، پھلی زمین کی زرخیزی (نائٹروجن) بڑھاتی، اور کدو کے چوڑے پتے زمین کو ڈھانپ کر نمی محفوظ رکھتے اور جڑی بوٹیوں کو اگنے نہ دیتے۔

مقامی لوگ کدو کو سخت سردیوں میں بقا کے لیے ذخیرہ کرتے، اس کی پٹیاں کاٹ کر سکھا لیتے اور خشک پٹیوں سے چٹائیاں بھی بنتے تھے، جبکہ سخت چھلکے والے کدوؤں (تونبوں) کے خشک خول برتنوں کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔یورپ سے آنے والے آبادکاروں نے کدو کا استعمال انہی سے سیکھا اور اسے کھوکھلا کر کے اس میں دودھ، شہد اور مصالحے بھر کر راکھ میں پکانے لگے، جسے آج کی پمپکن پائی کی ابتدائی شکل کہا جاتا ہے۔

کدو کو انگریزی میں «Pumpkin» کہا جاتا ہے۔اس لفظ کی بنیاد یونانی لفظ «Pepon» پر ہے جس کے معنی «بڑا خربوزہ» ہیں۔فرانسیسیوں نے اسے «Pompon» کہا، انگریزی میں یہ «Pumpion» بنا اور پھر امریکہ کے ابتدائی آبادکاروں کی زبان پر بدل کر «Pumpkin» ہو گیا۔اردو میں رائج لفظ «کدو» فارسی سے آیا ہے، جبکہ «لوکی» اور «گھیا» مقامی نام ہیں۔

کدو ایک انتہائی غذائیت بخش اور کم کیلوری والی سبزی ہے۔ نارنجی کدو کے سو گرام میں صرف 26 کے لگ بھگ کیلوریز ہوتی ہیں اور اس کا 90 فیصد سے زیادہ حصہ پانی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں وٹامن اے (بیٹا کیروٹین کی شکل میں) وافر مقدار میں پایا جاتا ہے؛ اس کا شوخ نارنجی رنگ دراصل بیٹا کیروٹین ہی کی علامت ہے، اور ایک پیالی پکا ہوا کدو روزانہ درکار وٹامن اے کا بڑا حصہ فراہم کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں وٹامن سی، وٹامن ای، پوٹاشیم، فائبر اور آنکھوں کے لیے مفید اجزا لیوٹین اور زیاز ینتھین بھی موجود ہوتے ہیں۔ لوکی (سبز کدو) میں بیٹا کیروٹین تو کم ہوتا ہے، مگر یہ پانی سے بھرپور، نہایت ہلکی اور زود ہضم سبزی ہے جس میں کیلوریز نارنجی کدو سے بھی کم ہوتی ہیں۔ کدو میں موجود اینٹی آکسیڈنٹس جسم کو نقصان دہ فری ریڈیکلز سے بچاتے اور قوتِ مدافعت کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں، جس سے انسان موسمی بیماریوں اور انفیکشنز کا بہتر مقابلہ کر پاتا ہے۔

طبی لحاظ سے کدو دل، آنکھوں اور نظامِ ہضم کے لیے بے حد مفید ہے۔ اس میں موجود بیٹا کیروٹین جسم میں جا کر وٹامن اے میں تبدیل ہوتا ہے جو بینائی، خصوصاً کم روشنی میں دیکھنے کی صلاحیت، کے لیے ضروری ہے، جبکہ لیوٹین اور زیاز ینتھین بڑھتی عمر کے ساتھ ہونے والے نظر کے مسائل کے خطرے کو کم کرنے میں مددگار سمجھے جاتے ہیں۔ پوٹاشیم بلڈ پریشر کو اعتدال میں رکھنے اور دل کی صحت میں معاون ہے۔ فائبر اور پانی کی وافر مقدار کی وجہ سے کدو وزن کم کرنے، کولیسٹرول کو قابو میں رکھنے اور قبض جیسے مسائل دور کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ طبِ یونانی اور ہمارے روایتی طبی تصورات میں کدو، خصوصاً لوکی، کی تاثیر ٹھنڈی مانی جاتی ہے جو معدے کی گرمی اور تیزابیت کو کم کر کے جسم کو تراوٹ اور سکون بخشتی ہے، اسی لیے گرمیوں میں اور بیماری سے صحت یابی کے دوران اسے ہلکی اور پرہیزی غذا کے طور پر دیا جاتا ہے۔

البتہ ایک احتیاط بہت ضروری ہے: اگر لوکی یا کدو کا ذائقہ کڑوا ہو تو اسے ہرگز استعمال نہ کریں، خصوصاً اس کا کچا جوس نہ پئیں۔ کڑواہٹ اس میں قدرتی زہریلے مادے (کیوکربیٹاسن) کی موجودگی کی علامت ہوتی ہے، جو شدید فوڈ پوائزننگ کا باعث بن سکتا ہے اور اس کے سنگین واقعات رپورٹ ہو چکے ہیں۔ اس لیے جوس بنانے سے پہلے لوکی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا چکھ لینا دانش مندی ہے۔

کدو کے بیج بھی غذائیت کا خزانہ ہیں۔ ان میں پروٹین، زنک، میگنیشیم، آئرن، اینٹی آکسیڈنٹس اور صحت بخش غیر سیر شدہ چکنائیاں (جن میں کچھ مقدار اومیگا-3 کی بھی ہوتی ہے) پائی جاتی ہیں، اور یہ دل و دماغ کی صحت کے لیے بہترین مانے جاتے ہیں۔ زنک قوتِ مدافعت کے لیے اور میگنیشیم پٹھوں، اعصاب اور اچھی نیند کے لیے مفید ہے۔ بھنے ہوئے بیج ایک صحت بخش سنیک ہیں، تاہم نمک لگے بیج اعتدال سے کھانے چاہییں۔

ماہرین چند بخش ترکیبیں بھی بتاتے ہیں کہ

وزن کم کرنے کے لیے کدو کو ابال کر، اس کا سوپ بنا کر یا سلاد کے طور پر استعمال کرنا بے حد مفید ہے، کیونکہ یہ کم کیلوریز کے ساتھ دیر تک پیٹ بھرے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ کدو سے بننے والی صحت بخش ترکیبوں میں «کدو کا رائتہ» (دہی کے ساتھ)، «کدو اور چنے کی دال کا سالن» (کم تیل میں)، «کدو کا سوپ» اور «کدو گوشت» سب سے زیادہ مقبول اور زود ہضم ہیں، جو نہ صرف ذائقہ دار ہوتی ہیں بلکہ جسم کو توانائی بھی فراہم کرتی ہیں۔ میٹھے کے شوقین افراد کے لیے «کدو کا حلوہ» اور «لوکی کی کھیر» ہمارے دستر خوان کی روایتی سوغاتیں ہیں، اگرچہ چینی اور گھی کی زیادتی کے باعث انہیں اعتدال سے کھانا ہی بہتر ہے۔

اقوام متحدہ کے ادارۂ خوراک وزراعت (FAO) کے اعداد و شمار میں کدو، اس کی مختلف اقسام اور پیٹھے (Pumpkins, squash and gourds) کو ایک ساتھ شمار کیا جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی عالمی سالانہ پیداوار تقریباً 34.6 ملین ٹن (3 کروڑ 46 لاکھ ٹن) ہے، اگرچہ مختلف برسوں اور ذرائع کے اعداد و شمار میں فرق پایا جاتا ہے۔ ان اعداد و شمار کے مطابق پہلے نمبر پر بھارت ہے جس کی پیداوار تقریباً 9.3 ملین ٹن یعنی عالمی پیداوار کا تقریباً 27 فیصد ہے، جبکہ دوسرے نمبر پر چین تقریباً 7.7 ملین ٹن (تقریباً 22 فیصد) پیدا کرتا ہے۔ یوں صرف یہ دو ممالک دنیا کا تقریباً نصف کدو اگاتے ہیں۔ دیگر بڑے پیداواری ممالک میں یوکرین، روس، امریکہ، مصر، اسپین اور میکسیکو شامل ہیں۔

پاکستان میں کدو اور اس سے ملتی جلتی سبزیوں (لوکی، حلوہ کدو اور پیٹھا وغیرہ) کی سالانہ پیداوار تقریباً 3 لاکھ 78 ہزار میٹرک ٹن (378,125 ٹن) ہے، اور عالمی درجہ بندی میں پاکستان تقریباً اٹھارہویں یا انیسویں نمبر پر آتا ہے۔ پاکستان میں کدو کی زیادہ تر پیداوار مقامی ضروریات اور کھپت پوری کرنے میں استعمال ہوتی ہے۔ یہ فصل نسبتاً کم وقت میں تیار ہو جاتی ہے، چھوٹے رقبے پر بھی اچھی پیداوار دیتی ہے اور گھریلو کچن گارڈن کے لیے بھی نہایت موزوں ہے۔ اگر کسانوں کو بہتر بیج، جدید طریقۂ کاشت اور ذخیرہ و پروسیسنگ کی سہولیات میسر آئیں تو کدو کے بیجوں، پاؤڈر اور دیگر مصنوعات کی صورت میں برآمدات اور دیہی آمدن میں اضافے کے نئے امکانات پیدا ہو سکتے ہیں۔

المختصر کدو بظاہر ایک سادہ اور عام سی سبزی ہے، مگر اس کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ قرآنِ کریم میں ایک جلیل القدر پیغمبر کی شفا اور راحت کے ذکر سے لے کر رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ کھانے تک، امریکہ کے قدیم باشندوں کی بقا سے لے کر آج کی جدید غذائی تحقیق تک، کدو ہر دور میں انسان کا ساتھی رہا ہے۔ کدو کے قومی دن کے موقع پر ہم بھی جیدے کھوکھر کے قصبے والوں کی طرح محبتِ رسول ﷺ کی نیت سے اسے اپنے دستر خوان کا حصہ بنائیں، اپنے گھروں کے صحن اور کیاریوں میں اس کی بیل لگائیں، اور اس سستی مگر غذائیت سے بھرپور نعمت کی قدر کریں۔ یوں ہم سنت کی برکت بھی پائیں گے اور صحت کی دولت بھی۔



25 اکتوبر — انٹرنیشنل آرٹسٹ ڈے

فن، فنکار اور انسانی تہذیب کے تخلیقی سفر کا دن۔

ہر سال 25 اکتوبر کو دنیا کے مختلف ممالک میں فنکار، آرٹ گیلریاں اور فن سے محبت رکھنے والے ادارے انٹرنیشنل آرٹسٹ ڈے مناتے ہیں۔ یہ دن اُن تخلیق کاروں کے نام ہے جو رنگ، لکیر، لفظ، آواز اور حرکت کے ذریعے انسانی احساسات کو زبان دیتے ہیں اور اپنے عہد کی تاریخ، دکھ، خواب اور امیدیں آنے والی نسلوں کے لیے محفوظ کر جاتے ہیں

۔عام طور پر فنکار کا تصور مصور یا مجسمہ ساز تک محدود سمجھا جاتا ہے، مگر اس دن کا دائرہ کہیں وسیع ہے؛ اس میں شاعری، ادب، خطاطی، موسیقی، ڈراما، رقص، فوٹو گرافی، دست کاری اور جدید ڈیجیٹل آرٹ سمیت تخلیق کی ہر صورت شامل ہے۔ اس دن کا بنیادی پیغام سادہ مگر گہرا ہے کہ فنکار کو صرف اس کی وفات کے بعد یاد کرنے کے بجائے اس کی زندگی ہی میں اس کی محنت، ہنر اور معاشرتی خدمت کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے۔

اس دن کا آغاز 2004ء میں کینیڈا سے تعلق رکھنے والے مصور کرس میک کلور (Chris MacClure) نے کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ سال میں ایک دن ایسا ہو جب معاشرہ فنکاروں کی خدمات کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرے اور انہیں وہ پذیرائی دے جس کے وہ حق دار ہیں۔ تاریخ کے انتخاب میں انہوں نے بیسویں صدی کے عظیم ہسپانوی مصور پابلو پکاسو (Pablo Picasso) کو پیشِ نظر رکھا، جو 25 اکتوبر 1881ء کو اسپین کے ساحلی شہر ملاگا میں پیدا ہوئے اور 8 اپریل 1973ء کو فرانس میں انتقال کر گئے۔ پکاسو نے فرانسیسی مصور ژورژ براک (Georges Braque) کے ساتھ مل کر کیوبزم (Cubism) کی بنیاد رکھی، جس میں کسی شے کو ایک زاویے کے بجائے بیک وقت کئی زاویوں سے دکھایا جاتا ہے، اور اس اسلوب نے صدیوں پرانی مصوری کی روایت کا رخ بدل دیا۔ ان کی 1907ء کی تصویر لے دموازیل داوینیوں کو جدید آرٹ کا سنگِ میل مانا جاتا ہے، جبکہ گوئرنیکا (Guernica)، جو 1937ء میں ہسپانوی خانہ جنگی کے دوران ایک قصبے پر ہونے والی بمباری کے ردِ عمل میں بنائی گئی، آج بھی جنگ کے خلاف فن کی سب سے طاقتور آوازوں میں شمار ہوتی ہے۔ یوں پکاسو کے یومِ پیدائش کو اس دن سے جوڑ کر فن کی تاریخ اور عصرِ حاضر کے فنکاروں کو ایک ہی لڑی میں پرو دیا گیا۔

اس دن کی حیثیت بیان کرتے ہوئے یہ فرق ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ کسی دن کا مختلف ممالک میں منایا جانا اور اقوامِ متحدہ کی جانب سے باضابطہ عالمی دن قرار پانا دو الگ باتیں ہیں۔ انٹرنیشنل آرٹسٹ ڈے ایک فرد کی فنکارانہ تحریک سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ فنکاروں، گیلریوں، تعلیمی اداروں اور سوشل میڈیا کے ذریعے دنیا بھر میں مقبول ہوا، لیکن یہ اقوامِ متحدہ یا یونیسکو کے باضابطہ عالمی دنوں میں شامل نہیں، اس لیے اسے بین الاقوامی سطح پر منایا جانے والا غیر سرکاری دن کہنا زیادہ درست ہے۔ اسے عالمی یومِ فن (World Art Day) سے بھی الگ سمجھنا چاہیے، جو ہر سال 15 اپریل کو اطالوی مصور اور مفکر لیونارڈو ڈاونچی کے یومِ پیدائش پر منایا جاتا ہے۔ اس دن کی تجویز یونیسکو کی شراکت دار تنظیم انٹرنیشنل ایسوسی ایشن آف آرٹ (IAA) نے 2011ء میں منظور کی، یہ پہلی بار 2012ء میں منایا گیا اور 2019ء میں یونیسکو کی جنرل کانفرنس نے اسے باضابطہ طور پر اپنے عالمی دنوں میں شامل کر لیا۔

دنیا بھر میں یہ دن مختلف انداز سے منایا جاتا ہے۔ کہیں آرٹ گیلریاں مصوری، مجسمہ سازی، خطاطی اور فوٹو گرافی کی نمائشیں سجاتی ہیں تو کہیں معروف اور ابھرتے ہوئے فنکاروں کو اعزازات اور تعریفی اسناد سے نوازا جاتا ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں مصوری کے مقابلے، تخلیقی ورکشاپس اور طلبہ کے فن پاروں کی نمائشیں ہوتی ہیں، جبکہ شاعری، موسیقی اور تھیٹر کی محفلیں اس دن کی رونق بڑھاتی ہیں۔ ڈیجیٹل دور نے اس دن کو نئی وسعت دی ہے اور لوگ سوشل میڈیا پر اپنے پسندیدہ فنکاروں کا تعارف اور ان کے فن پارے شیئر کرتے ہیں۔ تاہم کسی فنکار کی سب سے مؤثر حوصلہ افزائی یہ ہے کہ اس کا فن پارہ خریدا جائے، اس کا کام شیئر کرتے ہوئے اس کا نام دیا جائے اور اس کی تخلیق کو اجازت کے بغیر تجارتی مقاصد کے لیے استعمال نہ کیا جائے، کیونکہ فنکار کی پہچان اور روزی دونوں اسی سے وابستہ ہیں۔

پاکستان فن و ثقافت کے اعتبار سے ایک زرخیز سرزمین ہے جس کی جڑیں ہزاروں برس پرانی ہیں۔ وادیٔ سندھ کی تہذیب کے مرکز موہنجو داڑو سے ملنے والی نقش دار مہریں اور مجسمے بتاتے ہیں کہ اس خطے میں فن قدیم زمانے سے زندگی کا حصہ رہا ہے، جبکہ ٹیکسلا اور سوات کے گندھارا آرٹ نے یونانی اسلوب اور بدھ روایت کو ملا کر سنگ تراشی کا ایک منفرد مکتب پیدا کیا۔ بعد کے ادوار میں اسلامی خطاطی، لاہور کی بادشاہی مسجد کی شان دار تعمیر اور مسجد وزیر خان کی کاشی کاری، ملتان کے نیلے ظروف، سندھ کی اجرک، بلوچستان کی کشیدہ کاری اور ٹرک آرٹ ہماری ثقافتی شناخت بنے۔ جدید دور میں عبدالرحمٰن چغتائی نے مشرقی اسلوب کی مصوری کو نئی زندگی دی، صادقین نے خطاطی اور دیواری تصاویر کے ذریعے بین الاقوامی شہرت پائی، اور گل جی، بشیر مرزا، ظہور الاخلاق اور شہزیہ سکندر جیسے فنکاروں نے پاکستانی فن کو دنیا بھر میں متعارف کرایا۔ اس سفر میں 1875ء میں میو اسکول آف آرٹس کے نام سے قائم ہونے والے لاہور کے نیشنل کالج آف آرٹس، پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس اور حالیہ برسوں میں کراچی اور لاہور بینالے جیسے بین الاقوامی نمائشی میلوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

پاکستان کے تناظر میں اس دن کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ فنکاروں کی پذیرائی ایک روزہ تقریب تک محدود نہ رہے۔ ہمارے بہت سے باصلاحیت مصور، خطاط، موسیقار اور دست کار آج بھی مالی مشکلات کا شکار ہیں، اس لیے حکومتی اداروں، نجی شعبے اور عوام کو ان کے فن پاروں کی خریداری، نمائشوں، وظائف اور باعزت روزگار کے ذریعے ان کا ساتھ دینا ہوگا۔ اسکولوں، کالجوں اور جامعات میں فنونِ لطیفہ کو غیر ضروری مشغلہ سمجھنے کے بجائے تخلیقی صلاحیت، ذہنی نشوونما اور پیشہ ورانہ ترقی کا ذریعہ تسلیم کرنا ضروری ہے، تاکہ بچوں کو مصوری، خطاطی اور موسیقی جیسی سرگرمیوں کے مواقع مل سکیں۔ ڈیجیٹل پلیٹ فارمز پاکستانی فنکاروں کے لیے عالمی منڈی تک پہنچنے کا دروازہ کھول چکے ہیں، مگر اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے مناسب تربیت، آن لائن فروخت کی سہولت اور کاپی رائٹ کے مؤثر تحفظ کی ضرورت ہے۔ فنکار معاشرے کو کبھی آئینہ دکھاتا ہے، کبھی ماضی سے جوڑتا ہے اور کبھی مستقبل کے لیے نئے راستے کھولتا ہے؛ اور جس معاشرے میں فن کی قدر کی جاتی ہے، وہاں تخیل پروان چڑھتا ہے، ثقافت زندہ رہتی ہے اور انسانیت کے اظہار کو نئی جہتیں ملتی ہیں۔



خوف کو تقدیر کا فیصلہ نہ کرنے دیں

: اپنے خوف کو کبھی اپنی قسمت کا فیصلہ نہ کرنے دیں؛ سرنگ کے اُس پار روشنی ہے

زندگی میں کامیابی اور ترقی کا سفر اکثر غیر یقینی صورتحال اور چیلنجز سے گھرا ہوتا ہے، جہاں ناکامی کا خوف انسان کے قدم روکنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاہم، ایک حقیقی قائد اور باہمت فرد وہی ہے جو خوف کو اپنے فیصلوں اور مستقبل کی سمت متعین کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ تاریک راہوں اور سرنگ کے اختتام پر ہمیشہ روشنی منتظر ہوتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ ہم اپنے عزم، خود اعتمادی اور ہمت کے ساتھ آگے بڑھتے رہیں۔ جب ہم ڈر کو پیچھے چھوڑ کر فیصلے کرتے ہیں، تو ہم نہ صرف اپنے اہداف حاصل کرتے ہیں بلکہ اپنی تقدیر خود لکھنے کی صلاحیت بھی پیدا کر لیتے ہیں۔ خوف کو خود پر حاوی کرنے کے بجائے اسے اپنی جدوجہد اور پیشرفت کا ذریعہ بنائیں اور کامیابی کی روشنی کی طرف گامزن رہیں



24 اکتوبر - یومِ اقوامِ متحدہ - کامیابیوں اور ناکامیوں کا اکیاسی سالہ سفر: پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ

ہر سال 24 اکتوبر کو دنیا بھر میں یومِ اقوامِ متحدہ منایا جاتا ہے، جو 1945ء میں اسی تاریخ کو اقوامِ متحدہ کے منشور کے باضابطہ نفاذ کی یاد دلاتا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم (1939ء تا 1945ء) کی ہولناک تباہ کاریوں اور مجلسِ اقوام (League of Nations) کی ناکامی نے عالمی برادری پر واضح کر دیا تھا کہ پائیدار امن، اجتماعی سلامتی اور بین الاقوامی تعاون کے لیے ایک مؤثر اور ہمہ گیر عالمی ادارہ ناگزیر ہے۔ چنانچہ 26 جون 1945ء کو سان فرانسسکو کانفرنس میں 50 ممالک کے نمائندوں نے اقوامِ متحدہ کے منشور پر دستخط کیے، جبکہ پولینڈ نے بعد میں دستخط کر کے بانی ارکان کی تعداد 51 تک پہنچا دی

۔24 اکتوبر 1945ء کو سلامتی کونسل کے پانچوں مستقل ارکان، یعنی امریکہ، برطانیہ، فرانس، سوویت یونین اور چین (اُس وقت جمہوریہ چین)، سمیت دستخط کنندگان کی اکثریت نے منشور کی توثیق کر دی اور یوں اقوامِ متحدہ نے باقاعدہ طور پر کام کا آغاز کیا۔ جنرل اسمبلی نے 1947ء میں اپنی قرارداد نمبر 168 کے ذریعے اس دن کو "یومِ اقوامِ متحدہ" کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ اسی برس 30 ستمبر 1947ء کو نوزائیدہ مملکتِ پاکستان آزادی کے محض ڈیڑھ ماہ بعد اس عالمی ادارے کی رکن بنی، اور آج اقوامِ متحدہ کے رکن ممالک کی تعداد 193 ہو چکی ہے۔

اقوامِ متحدہ کے منشور میں اس کے بنیادی مقاصد بین الاقوامی امن و سلامتی کا قیام، اقوام کے درمیان دوستانہ تعلقات کا فروغ، انسانی حقوق کا تحفظ، اور معاشی، سماجی و ثقافتی مسائل کے حل کے لیے بین الاقوامی تعاون قرار دیے گئے ہیں۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ادارے کے چھ بنیادی اعضا قائم کیے گئے، جن میں جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل، اقتصادی و سماجی کونسل، بین الاقوامی عدالتِ انصاف، سیکرٹریٹ اور ٹرسٹی شپ کونسل شامل ہیں؛ آخر الذکر اپنا کام مکمل ہونے پر 1994ء سے غیر فعال ہے۔ سلامتی کونسل کو عالمی امن کے قیام اور تنازعات کے حل کی بنیادی ذمہ داری سونپی گئی ہے اور اس کے فیصلے رکن ممالک پر لازم ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ متعدد خصوصی ادارے اور پروگرام عملی میدان میں سرگرم ہیں، جن میں یونیسف (UNICEF) بچوں کی صحت، غذائیت اور تعلیم کے لیے، عالمی ادارۂ صحت (WHO) بیماریوں کی روک تھام اور صحتِ عامہ کی بہتری کے لیے، یونیسکو (UNESCO) تعلیم، سائنس اور ثقافت کے فروغ کے لیے، اقوامِ متحدہ کا ادارہ برائے پناہ گزین (UNHCR) بے گھر افراد کے تحفظ کے لیے، عالمی خوراک پروگرام (WFP) بھوک کے خاتمے کے لیے اور اقوامِ متحدہ کا ترقیاتی پروگرام (UNDP) پائیدار ترقی کے لیے کوشاں ہیں۔ یہ تمام ادارے کئی دہائیوں سے پاکستان میں بھی حکومت اور سماجی شعبے کے ساتھ مل کر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اپنے اکیاسی سالہ سفر میں اقوامِ متحدہ نے کئی نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ سرد جنگ کے کشیدہ دور میں اس نے بڑی طاقتوں کو مذاکرات کا مستقل فورم فراہم کر کے ایک اور عالمی جنگ کے خطرے کو کم رکھنے میں اہم سفارتی کردار ادا کیا۔ اس کی سرپرستی میں نوآبادیاتی نظام کے خاتمے کا عمل تیز ہوا اور ایشیا و افریقہ کی درجنوں اقوام نے آزادی حاصل کی۔ نامیبیا، کمبوڈیا اور موزمبیق جیسے ممالک میں اس کے امن مشنز نے خانہ جنگی کے بعد انتخابات اور سیاسی استحکام کی راہ ہموار کی، اور انہی خدمات کے اعتراف میں 1988ء میں اقوامِ متحدہ کی امن افواج کو نوبل امن انعام سے نوازا گیا

۔10 دسمبر 1948ء کو منظور ہونے والا انسانی حقوق کا عالمی منشور (Universal Declaration of Human Rights) آج بھی بین الاقوامی انسانی حقوق کے قوانین کی بنیاد ہے۔ عالمی ادارۂ صحت کی قیادت میں چلنے والی مہم کے نتیجے میں 1980ء میں چیچک (Smallpox) کے مکمل خاتمے کا اعلان کیا گیا، جو انسانی تاریخ میں کسی متعدی بیماری کے خاتمے کی پہلی مثال ہے، جبکہ 1988ء سے اب تک عالمی سطح پر پولیو کے کیسز میں 99 فیصد سے زائد کمی آچکی ہے۔ اس کے علاوہ کروڑوں پناہ گزینوں اور جنگ و آفات سے متاثرہ افراد کو خوراک، رہائش اور تحفظ کی فراہمی، اور 2015ء میں پائیدار ترقی کے اہداف (SDGs) اور ماحولیاتی تبدیلی سے متعلق پیرس معاہدے پر عالمی اتفاقِ رائے پیدا کرنا بھی اس کی اہم کامیابیوں میں شمار ہوتا ہے۔

دوسری جانب اقوامِ متحدہ کی کارکردگی پر کئی سنجیدہ سوالات بھی موجود ہیں۔ مسئلۂ کشمیر اور مسئلۂ فلسطین جیسے دیرینہ تنازعات سات دہائیوں سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود حل طلب ہیں، اور ان خطوں میں انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کی اطلاعات مسلسل سامنے آتی رہی ہیں۔ 1994ء میں روانڈا میں تقریباً سو دنوں کے اندر آٹھ لاکھ کے قریب افراد کی نسل کشی، اور 1995ء میں بوسنیا کے شہر سربرینتسا میں، جسے اقوامِ متحدہ نے "محفوظ علاقہ" قرار دے رکھا تھا، آٹھ ہزار سے زائد مسلمان مردوں اور لڑکوں کا قتلِ عام اس ادارے کی تاریخ کے تاریک ترین ابواب ہیں۔ 2003ء میں سلامتی کونسل کی واضح منظوری کے بغیر عراق پر حملہ، شام اور یمن کی طویل خانہ جنگیاں، اور حالیہ برسوں میں یوکرین اور غزہ کے بحران بھی اس کی محدود اثر پذیری کو نمایاں کرتے ہیں۔ ان ناکامیوں کی ایک بڑی وجہ سلامتی کونسل کے پانچ مستقل ارکان کو حاصل ویٹو کا اختیار (Veto Power) ہے، جو اکثر عالمی امن کے بجائے بڑی طاقتوں اور ان کے اتحادیوں کے مفادات کے تحفظ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ اسی لیے سلامتی کونسل میں اصلاحات کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے، اور پاکستان "اتحاد برائے اتفاقِ رائے (Uniting for Consensus) گروپ کے فعال رکن کی حیثیت سے نئے مستقل ارکان کے اضافے کے بجائے غیر مستقل نشستوں میں اضافے اور ایک زیادہ جمہوری، نمائندہ اور جوابدہ کونسل کی حمایت کرتا ہے۔

پاکستان اور اقوامِ متحدہ کا تعلق باہمی تعاون اور اعتماد کی ایک طویل داستان ہے۔ پاکستان 1960ء میں کانگو مشن سے لے کر آج تک اقوامِ متحدہ کے امن مشنز میں دستے فراہم کرنے والے نمایاں ترین ممالک میں شامل رہا ہے؛ دو لاکھ سے زائد پاکستانی امن اہلکار مختلف براعظموں کے شورش زدہ علاقوں میں خدمات انجام دے چکے ہیں اور ڈیڑھ سو سے زائد نے امن کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کیا ہے، جن کی پیشہ ورانہ کارکردگی کو عالمی سطح پر سراہا گیا ہے

۔پاکستان آٹھ مرتبہ سلامتی کونسل کا غیر مستقل رکن منتخب ہو چکا ہے اور اس وقت 2025ء تا 2026ء کی مدت کے لیے کونسل میں نمائندگی کر رہا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے اداروں نے 2005ء کے تباہ کن زلزلے اور 2010ء و 2022ء کے تاریخی سیلابوں کے دوران امدادی و بحالی سرگرمیوں میں پاکستان کی بھرپور مالی اور تکنیکی معاونت کی، جبکہ جنوری 2023ء میں جنیوا میں اقوامِ متحدہ اور پاکستان کی مشترکہ میزبانی میں منعقدہ "لچکدار پاکستان (Resilient Pakistan)" کانفرنس میں نو ارب ڈالر سے زائد کے وعدے کیے گئے۔ یونیسف اور عالمی ادارۂ صحت انسدادِ پولیو مہم میں پاکستان کے اہم شراکت دار ہیں، کیونکہ پاکستان اور افغانستان دنیا کے وہ آخری دو ممالک ہیں جہاں جنگلی پولیو وائرس اب بھی موجود ہے۔ اسی طرح یو این ایچ سی آر کے تعاون سے پاکستان نے چار دہائیوں سے زائد عرصے تک لاکھوں افغان پناہ گزینوں کی میزبانی کی، اور 2022ء میں جی-77 کی صدارت کرتے ہوئے موسمیاتی "نقصان و تلافی فنڈ (Loss and Damage Fund)" کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔

تاہم پاکستان کے نقطۂ نظر سے اقوامِ متحدہ کی سب سے بڑی ناکامی مسئلۂ کشمیر کا حل نہ ہونا ہے۔ یہ مسئلہ یکم جنوری 1948ء کو خود بھارت سلامتی کونسل میں لے کر گیا تھا، جس کے بعد کونسل کی قرارداد نمبر 47 (اپریل 1948ء) اور اقوامِ متحدہ کمیشن برائے ہند و پاکستان (UNCIP) کی 13 اگست 1948ء اور 5 جنوری 1949ء کی قراردادوں میں کشمیری عوام کے لیے آزادانہ اور غیر جانبدارانہ استصوابِ رائے کا وعدہ کیا گیا۔ 1949ء سے اقوامِ متحدہ کا فوجی مبصر گروپ (UNMOGIP) جنگ بندی لائن، جو اب لائن آف کنٹرول کہلاتی ہے، کی نگرانی کر رہا ہے، مگر سات دہائیاں گزرنے کے باوجود یہ قراردادیں عملدرآمد کی منتظر ہیں، اور 5 اگست 2019ء کو بھارت کی جانب سے مقبوضہ جموں و کشمیر کی خصوصی آئینی حیثیت کے یکطرفہ خاتمے کے بعد بھی عالمی ادارہ کوئی مؤثر عملی قدم نہ اٹھا سکا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی عوام میں اس ادارے کی سیاسی افادیت اور غیر جانبداری کے بارے میں سوالات اٹھتے رہتے ہیں۔ مجموعی طور پر اقوامِ متحدہ نہ تو مکمل طور پر ناکام ادارہ ہے اور نہ ہی سو فیصد کامیاب؛ یہ عالمی برادری کا وہ واحد ہمہ گیر فورم ہے جہاں چھوٹے بڑے تمام ممالک کو آواز ملتی ہے، اور جس نے بین الاقوامی قانون، سفارت کاری اور سماجی بہبود کے شعبوں میں ناقابلِ فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ پاکستان کے لیے دانشمندانہ راستہ یہی ہے کہ وہ اس فورم پر اپنی فعال سفارت کاری جاری رکھے، سلامتی کونسل میں منصفانہ اصلاحات کی حمایت کرے اور کشمیر سمیت تمام دیرینہ تنازعات کے منصفانہ حل کے لیے عالمی ضمیر کو مسلسل جھنجھوڑتا رہے، تاکہ یہ ادارہ صحیح معنوں میں اپنے منشور کی روح کے مطابق تمام اقوام کا نمائندہ بن سکے



23 اکتوبر — عالمی یومِ برفانی چیتا- برف پوش پہاڑوں کے خاموش محافظ کی بقا، ہماری مشترکہ ذمہ داری

قراقرم اور ہمالیہ کی بلند و بالا چٹانوں میں پایا جانے والا برفانی چیتا(Panthera uncia) ، جسے دنیا "پہاڑوں کا بھوت " (Ghost of the Mountains) کہتی ہے، ایک ایسا نایاب اور پراسرار جانور ہے جسے شاذ و نادر ہی دیکھا جا سکتا ہے۔

ہر سال 23 اکتوبر کو منایا جانے والا عالمی یومِ برفانی چیتا محض ایک جنگلی جانور کی یاد کا دن نہیں، بلکہ یہ اُن پہاڑوں، گلیشیئرز اور دریاؤں کے تحفظ کی یاددہانی ہے جن پر کروڑوں انسانوں کی زندگی کا دارومدار ہے

قدرت نے اس تنہائی پسند درندے کو سخت ترین ماحول میں جینے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا ہے، جن میں موٹی کھال، چوڑے پنجے اور طویل توازن بخشنے والی دُم شامل ہیں۔ یہ دنیا کے 12 بلند پہاڑی ممالک کے سرد خطوں میں پایا جاتا ہے، جبکہ عالمی ادارہ برائے تحفظِ فطرت (IUCN) کے مطابق اس کی عالمی آبادی 4,000 سے 6,500 کے درمیان ہے اور یہ تاحال "خطرے کی زد میں (Vulnerable) " انواع میں شامل ہے۔

اس دن کی بنیاد اکتوبر 2013ء میں کرغزستان کے دارالحکومت بشکیک میں ہونے والے پہلے عالمی فورم پر رکھی گئی، جہاں "اعلانِ بشکیک" کے ذریعے مشترکہ تحفظ کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد 12 دسمبر 2024ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد A/RES/79/143 منظور کرتے ہوئے 23 اکتوبر کو باضابطہ طور پر عالمی یومِ برفانی چیتا قرار دیا، جس سے اس کی بقا کی مہم کو عالمی سطح پر مزید وسعت ملی۔

برفانی چیتا محض ایک شکاری نہیں بلکہ اپنے ماحولیاتی نظام کا "چھتری نما محافظ" ہے۔ اس کا صحت مند مسکن اس بات کی علامت ہے کہ "ایشیا کے آبی مینار" یعنی بڑے دریاؤں کے منبع اور گلیشیئرز محفوظ ہیں۔ اس کے علاوہ، یہ ماحول دوست سیاحت، فوٹو گرافی اور ٹرافی ہنٹنگ کے ذریعے مقامی معیشت کو فروغ دینے اور پائیدار ترقی میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔

پاکستان ان 12 خوش نصیب ممالک میں شامل ہے جہاں قراقرم، ہندوکش اور ہمالیہ کے سنگم پر برفانی چیتے کا قدرتی مسکن موجود ہے۔ گلگت بلتستان، خیبر پختونخوا اور آزاد جموں و کشمیر کے بلند علاقوں میں تقریباً 200 سے 420 برفانی چیتے پائے جاتے ہیں۔ خنجراب اور سنٹرل قراقرم جیسے قومی پارکوں میں اس کی موجودگی ہمارے ملک کے مالامال حیاتیاتی تنوع کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مستحکم کوششوں کے باوجود اس کی بقا کو اب بھی سنگین خطرات لاحق ہیں۔ غیر قانونی شکار، جنگلی حیات کی تجارت، مسکن کی تباہی، موسمیاتی تبدیلیوں کے باعث گلیشیئرز کا سکڑنا، اور مویشیوں پر حملوں کے ردِ عمل میں انسانوں کے ساتھ پیدا ہونے والے تنازعات اس نایاب نسل کے لیے روز بروز بڑے چیلنج بن رہے ہیں۔

برفانی چیتے کا تحفظ دراصل انسان کے اپنے مستقبل کا تحفظ ہے۔ حکومتوں، بین الاقوامی تنظیموں، اور بالخصوص مقامی آبادیوں کی عملی شمولیت — جیسے مویشیوں کی بیمہ اسکیمیں اور باڑوں کی مضبوطی — سے ہی بقائے باہمی کی راہ ہموار ہو سکتی ہے

۔ آیئے اس 23 اکتوبر کو عہد کریں کہ ہم اس سرمئی محافظ اور اپنے قدرتی ورثے کو بچانے میں اپنا بھرپور کردار ادا کریں گے۔

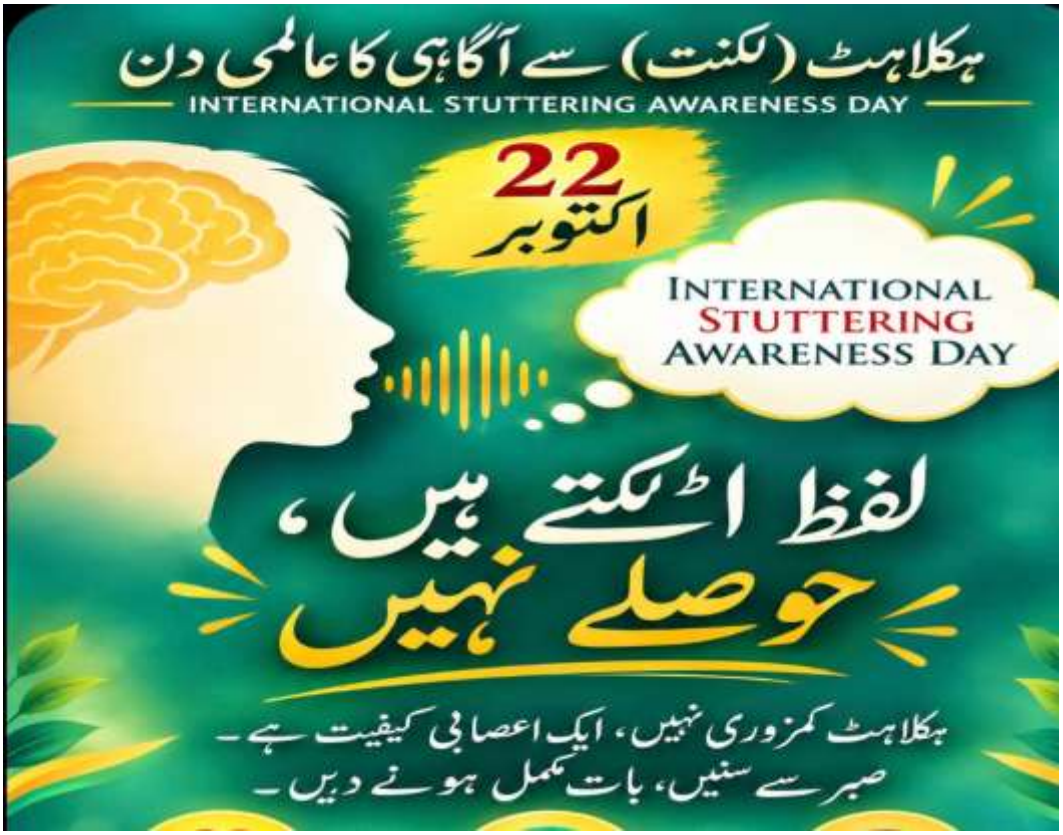

لفظ اٹکتے ہیں، حوصلے نہیں 22-اکتوبر — ہکلاہٹ (لکنت) سے آگاہی کا عالمی دن-پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ

صبح کے نو بجے ہیں۔ جنوبی پنجاب کے ایک سرکاری اسکول کی پانچویں جماعت میں استاد نے سوال پوچھا تو دس سالہ علی نے سب سے پہلے ہاتھ کھڑا کیا۔ جواب اسے معلوم تھا، مگر جیسے ہی وہ بولنے کے لیے اٹھا، پہلا لفظ ہونٹوں تک آ کر جیسے کسی ان دیکھی دیوار سے ٹکرا گیا: "پ...پ...پاکستان"۔ پچھلی قطار سے دبی دبی ہنسی ابھری، کسی نے نقل اتاری، اور علی خاموشی سے بیٹھ گیا۔ اس دن کے بعد اس نے کبھی ہاتھ نہیں اٹھایا۔

علی کوئی اکیلا بچہ نہیں۔ پاکستان کے شہروں، قصبوں اور دیہات میں ایسے لاکھوں بچے اور بڑے موجود ہیں جن کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے، مگر لفظ ساتھ دیتے دیتے اٹک جاتے ہیں۔ ان کا مسئلہ ذہانت کی کمی، کمزور اعصاب یا بزدلی نہیں، بلکہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے طب کی زبان میں ہکلاہٹ یا لکنت (Stuttering / Stammering) کہا جاتا ہے۔ ہر سال 22 اکتوبر کو دنیا بھر میں منایا جانے والا "ہکلاہٹ سے آگاہی کا عالمی دن (International Stuttering Awareness Day) " ہمیں یاد دلاتا ہے کہ اصل رکاوٹ اکثر بولنے والے کی زبان میں نہیں، سننے والوں کے رویّے میں ہوتی ہے۔

ہکلاہٹ دراصل ہے کیا؟

ہکلاہٹ بول چال کی روانی (Fluency) کا ایک عارضہ ہے۔ اس میں بولنے والا اچھی طرح جانتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے، مگر ادائیگی کے دوران گفتگو کا تسلسل بار بار ٹوٹ جاتا ہے۔ ماہرین اس کی تین بنیادی صورتیں بیان کرتے ہیں: کسی آواز، حرف یا لفظ کو بار بار دہرانا (جیسے "م-م-میں")، کسی آواز کو غیر معمولی طور پر لمبا کھینچ دینا (جیسے "سسسکول")، اور بولتے بولتے اچانک رک جانا، جسے "بلاک (Block) " کہا جاتا ہے—یعنی منہ کھلا ہوتا ہے مگر آواز نکلتی ہی نہیں۔

بہت سے افراد ان رکاوٹوں سے بچنے کے لیے کچھ ثانوی عادات بھی اپنا لیتے ہیں، جیسے آنکھیں جھپکنا، سر یا جبڑے کو جھٹکا دینا، مشکل لفظ کی جگہ کوئی آسان لفظ استعمال کرنا، یا سرے سے بات ہی نہ کرنا۔ وقت کے ساتھ یہی گریز (Avoidance) اکثر خود ہکلاہٹ سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے، کیونکہ انسان کلاس میں سوال پوچھنے، فون سننے یا نوکری کے انٹرویو جیسے مواقع سے کترانے لگتا ہے۔

جدید سائنسی تحقیق اس بات پر متفق ہے کہ ہکلاہٹ کوئی نفسیاتی بیماری، گھبراہٹ یا کم ذہانت کی علامت نہیں۔ یہ ایک نیورو ڈیولپمنٹل، یعنی اعصابی نشوونما سے متعلق، کیفیت ہے جس میں دماغ کے وہ نظام متاثر ہوتے ہیں جو بولنے کے عمل کی منصوبہ بندی اور اس کی بروقت ترتیب کو کنٹرول کرتے ہیں۔ دماغی اسکین پر مبنی تحقیق میں ہکلانے والے افراد کے دماغ میں گویائی سے متعلق اعصابی راستوں اور بیسل گینگلیا (Basal Ganglia) کی کارکردگی میں فرق دیکھا گیا ہے۔ البتہ ذہنی دباؤ، تھکن یا گھبراہٹ ہکلاہٹ کو وقتی طور پر بڑھا ضرور سکتے ہیں—یعنی گھبراہٹ اسے نمایاں تو کر سکتی ہے، مگر اس کی بنیادی وجہ نہیں ہوتی۔

ماہرین ہکلاہٹ کی عموماً تین اقسام بیان کرتے ہیں۔ سب سے عام "نشوونمائی ہکلاہٹ (Developmental Stuttering) " ہے جو بچپن میں، عموماً دو سے پانچ برس کی عمر میں، اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب بچہ تیزی سے زبان سیکھ رہا ہوتا ہے۔ دوسری قسم "اعصابی ہکلاہٹ (Neurogenic Stuttering) " کہلاتی ہے جو فالج، سر کی چوٹ یا کسی دماغی بیماری کے بعد پیدا ہو سکتی ہے، جبکہ تیسری اور نسبتاً نایاب قسم شدید نفسیاتی صدمے سے جڑی ہوتی ہے۔

ہکلاہٹ کا خاندانوں میں چلنا ایک پرانا مشاہدہ ہے۔ ماہرین کے مطابق ہکلانے والے تقریباً 60 فیصد افراد کے خاندان میں کوئی نہ کوئی دوسرا فرد بھی اس کیفیت کا شکار رہا ہوتا ہے، اور جڑواں بچوں پر کی گئی تحقیق بھی اس میں موروثی عوامل کے نمایاں کردار کی تصدیق کرتی ہے۔

پاکستان کے لیے یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس شعبے کی ایک اہم عالمی تحقیق میں پاکستانی خاندانوں اور سائنس دانوں کا نمایاں حصہ رہا۔ 2010 میں طب کے معروف جریدے "نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن" میں شائع ہونے والی ایک تحقیق، جو امریکی ادارے نیشنل انسٹیٹیوٹس آف ہیلتھ (NIH) کے محقق ڈاکٹر ڈینس ڈرینا اور لاہور کے سینٹر آف ایکسیلنس اِن مالیکیولر بیالوجی (CEMB) سے وابستہ پروفیسر شیخ ریاض الدین سمیت دیگر ماہرین نے مل کر کی، میں ایک بڑے پاکستانی خاندان کے مطالعے سے ان جینز کی نشاندہی کی گئی جن میں تبدیلیاں ہکلاہٹ سے منسلک پائی گئیں۔ اس تحقیق نے دنیا بھر میں اس تصور کو مضبوط کیا کہ ہکلاہٹ کی جڑیں حیاتیاتی ہیں، نفسیاتی کمزوری میں نہیں۔

دنیا کی بالغ آبادی کا تقریباً ایک فیصد، یعنی سات سے آٹھ کروڑ افراد، ہکلاہٹ کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ بچوں میں یہ شرح کہیں زیادہ ہے: اندازاً ہر بیس میں سے ایک بچہ کبھی نہ کبھی کچھ عرصے کے لیے ہکلاہٹ کے مرحلے سے گزرتا ہے۔

حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ ان میں سے تقریباً 75 سے 80 فیصد بچے بڑھتی عمر کے ساتھ یا بروقت رہنمائی سے روانی سے بولنے لگتے ہیں۔ لڑکوں میں یہ کیفیت لڑکیوں کے مقابلے میں زیادہ دیر تک برقرار رہتی ہے، اسی لیے بالغ افراد میں مردوں کی تعداد خواتین سے تقریباً چار گنا ہے۔

اگر یہی عالمی شرح پاکستان کی 24 کروڑ سے زائد آبادی (مردم شماری 2023) پر لاگو کی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ ملک میں کم از کم 24 لاکھ افراد ہکلاہٹ کا شکار ہیں — یعنی کسی بڑے شہر کی پوری آبادی کے برابر۔ پاکستان میں اس حوالے سے کوئی جامع قومی سروے دستیاب نہیں، اس لیے یہ عدد ایک تخمینہ ہے، مگر مسئلے کی وسعت سمجھنے کے لیے کافی ہے۔

ہکلاہٹ کا عالمی دن ہر سال 22 اکتوبر کو منایا جاتا ہے اور پہلی بار 1998 میں منایا گیا؛ اس کی علامت سی گرین ربن ہے۔ دنیا بھر میں بالغ آبادی کا تقریباً ایک فیصد، یعنی سات سے آٹھ کروڑ افراد، اس کیفیت کا شکار ہیں، جبکہ پاکستان میں یہ تعداد اندازاً 24 لاکھ سے زائد ہے۔ ہکلاہٹ عموماً دو سے پانچ برس کی عمر میں شروع ہوتی ہے، تقریباً 75 سے 80 فیصد بچے وقت کے ساتھ روانی حاصل کر لیتے ہیں، بالغوں میں مرد خواتین کے مقابلے میں تقریباً چار گنا زیادہ متاثر ہوتے ہیں، اور تقریباً 60 فیصد ہکلانے والے افراد کے خاندان میں کوئی اور فرد بھی متاثر ہوتا ہے۔

اس عالمی دن کی کہانی ایک فرد کی سوچ سے شروع ہوئی۔ امریکا کے مائیکل شوگرمین (Michael Sugarman)، جو 1977 میں قائم ہونے والی امریکی تنظیم "نیشنل اسٹٹرنگ پروجیکٹ" (موجودہ نیشنل اسٹٹرنگ ایسوسی ایشن) کے شریک بانی تھے، نے 1997 میں یہ تجویز پیش کی کہ دنیا بھر کے ہکلانے والے افراد کے لیے ایک مخصوص بین الاقوامی دن مقرر کیا جائے۔

اس تجویز کو تین بڑی عالمی تنظیموں — انٹرنیشنل اسٹٹرنگ ایسوسی ایشن (ISA)، انٹرنیشنل فلوئنسی ایسوسی ایشن (IFA) اور یورپین لیگ آف اسٹٹرنگ ایسوسی ایشنز — (ELSA) نے پذیرائی بخشی، اور یوں 22 اکتوبر 1998 کو پہلی بار یہ دن باقاعدہ طور پر منایا گیا۔ اس دن کی علامت کے طور پر "سی گرین" رنگ کا ربن اپنایا گیا، جس میں نیلا رنگ سکون اور سبز رنگ آزادی کی نمائندگی کرتا ہے۔

اس دن کو محض علامتی مہم کے بجائے ایک علمی اور تحقیقی روایت بنانے میں ماہرینِ لسانیات، اسپیچ لینگویج پیتھالوجسٹس (SLPs) اور محققین کی مشترکہ کوششیں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں امریکا کی منیسوٹا اسٹیٹ یونیورسٹی، مینکاٹو کی پروفیسر جوڈتھ (جوڈی) کسٹر کا نام نمایاں ہے، جنہوں نے 1998 ہی سے ISAD آن لائن کانفرنس کا آغاز کیا۔ یہ کانفرنس روایتی طور پر یکم سے 22 اکتوبر تک جاری رہتی ہے، جس میں دنیا بھر کے محققین، معالجین اور خود ہکلاہٹ کا شکار افراد اپنے تحقیقی مقالے، کیس اسٹڈیز اور ذاتی تجربات پیش کرتے ہیں۔ یوں پورا اکتوبر ہکلاہٹ پر علمی مکالمے کا مہینہ بن جاتا ہے۔

اس دن کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہکلاہٹ کو ایک اعصابی اور جینیاتی کیفیت کے طور پر تسلیم کیا جائے، اس سے جڑے توہمات اور معاشرتی بدسلوکی کا خاتمہ ہو، اسپیچ تھراپی کو سائنسی بنیادوں پر فروغ ملے، اور ہکلانے والے افراد کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کی آواز بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کسی اور کی۔

پاکستان میں ہکلاہٹ کے حوالے سے سب سے بڑی رکاوٹ معلومات کی کمی اور نسل در نسل چلے آنے والے توہمات ہیں، جو اکثر بچے کو بروقت اور درست مدد سے محروم کر دیتے ہیں۔ چند عام غلط فہمیاں اور ان کی حقیقت درج ذیل ہے:

"بچہ کسی چیز سے ڈر گیا تھا، اسی لیے ہکلانے لگا": یہ سب سے عام خیال ہے، مگر ہکلاہٹ کی بنیادی وجہ اعصابی اور جینیاتی ہے۔ کوئی صدمہ اسے وقتی طور پر نمایاں کر سکتا ہے، لیکن عام طور پر یہ اس کی جڑ نہیں ہوتا۔

"یہ نظر بد یا کسی روحانی اثر کا نتیجہ ہے": ہکلاہٹ ایک طبی کیفیت ہے جسے سائنس اچھی طرح سمجھتی ہے۔ دعا اپنی جگہ، مگر عملی حل مستند اسپیچ تھراپی ہی ہے۔

"زبان کے نیچے کی جھلی (ٹنگ ٹائی) کٹوانے سے ہکلاہٹ ختم ہو جاتی ہے": ٹنگ ٹائی کا ہکلاہٹ سے کوئی ثابت شدہ تعلق نہیں، اس لیے اس غرض سے کیا گیا آپریشن غیر ضروری ہے۔

"ہکلانے والے کم ذہین یا ڈرپوک ہوتے ہیں": ہکلاہٹ کا ذہانت یا ہمت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہکلانے والے افراد ہر شعبے میں نمایاں کامیابیاں حاصل کرتے رہے ہیں۔

"کسی ہکلانے والے کی نقل اتارنے سے بچہ بھی ہکلانے لگتا ہے": ہکلاہٹ نقل یا صحبت سے منتقل نہیں ہوتی، البتہ کسی کی نقل اتارنا اس کی دل آزاری ضرور ہے۔

"بچے کو 'آرام سے بولو' یا 'سانس لے کر بولو' کہنا مفید ہے": ایسی ہدایات بچے پر دباؤ بڑھاتی ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ خود دھیمے انداز میں بات کی جائے اور بچے کو پورا وقت دیا جائے۔

"بچہ بڑا ہو کر خود ٹھیک ہو جائے گا، علاج کی ضرورت نہیں": اکثر بچے بہتر ہو جاتے ہیں، مگر کون سا بچہ ٹھیک ہو گا، یہ پہلے سے طے نہیں کیا جا سکتا؛ اس لیے بروقت معائنہ ضروری ہے۔

"کسی ٹوٹکے، جڑی بوٹی یا خاص نسخے سے فوری علاج ممکن ہے": اب تک ہکلاہٹ کے لیے کوئی دوا باقاعدہ منظور شدہ نہیں، لہٰذا فوری علاج کا دعویٰ کرنے والے عطائیوں سے ہوشیار رہیں۔

پاکستانی معاشرے میں ہکلانے والے بچے کا سامنا اکثر سب سے پہلے مذاق سے ہوتا ہے—گھر میں بہن بھائیوں کی چھیڑ چھاڑ، کلاس میں ہم جماعتوں کی ہنسی، اور بعض اوقات اساتذہ کی بے صبری۔ ٹی وی ڈراموں، فلموں اور اسٹیج شوز میں ہکلانے والے کرداروں کو مدتوں مزاح کا ذریعہ بنایا جاتا رہا ہے، جس نے اس رویّے کو معاشرتی طور پر "قابلِ قبول" بنا دیا۔ سوشل میڈیا کے دور میں یہی مذاق میمز اور ویڈیوز کی صورت میں اور بھی تیزی سے پھیلتا ہے۔

اس رویّے کی قیمت ہکلانے والا فرد عمر بھر ادا کرتا ہے۔ بچے زبانی امتحان، تقریری مقابلوں اور کلاس کی سرگرمیوں سے کترانے لگتے ہیں؛ نوجوان نوکری کے انٹرویو میں اپنی صلاحیت کے مطابق کارکردگی نہیں دکھا پاتے؛ اور کئی خاندانوں میں رشتے طے کرتے وقت بھی اسے ایک "عیب" سمجھا جاتا ہے۔ نتیجتاً بہت سے باصلاحیت لوگ خاموشی اختیار کر لیتے ہیں، اور معاشرہ ان کی صلاحیتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔

دوسرا بڑا چیلنج سہولیات تک رسائی ہے۔ پاکستان میں تربیت یافتہ اسپیچ لینگویج پیتھالوجسٹس کی تعداد آبادی کے تناسب سے بہت کم ہے، اور جو ماہرین موجود ہیں وہ زیادہ تر بڑے شہروں کے نجی کلینکس اور چند بڑے ہسپتالوں تک محدود ہیں۔ دیہی علاقوں کے والدین کے لیے نہ صرف ماہر تک پہنچنا مشکل ہے بلکہ کئی ماہ تک جاری رہنے والے سیشنز کا خرچ اٹھانا بھی آسان نہیں۔ اسی خلا میں عطائی اور فوری علاج کے دعوے دار پنپتے ہیں۔

تاہم تصویر کا روشن رخ بھی ہے۔ گزشتہ برسوں میں ملک کی متعدد جامعات نے اسپیچ اینڈ لینگویج پیتھالوجی میں باقاعدہ ڈگری پروگرام شروع کیے ہیں، اور بڑے سرکاری و نجی ہسپتالوں میں اسپیچ تھراپی کے شعبے قائم ہو رہے ہیں۔ آن لائن تھراپی (Teletherapy) نے بھی دور دراز علاقوں کے خاندانوں کے لیے ماہرین تک رسائی کو قدرے آسان بنا دیا ہے۔

ہکلاہٹ کے بارے میں سب سے اہم پیغام یہ ہے کہ اس کا مؤثر انتظام ممکن ہے، اور جتنی جلد مدد لی جائے نتائج اتنے ہی بہتر ہوتے ہیں۔ چھوٹے بچوں کے لیے اسپیچ تھراپی خاص طور پر مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا میں تیار کیا گیا "لِڈکم پروگرام (Lidcombe Program) "ایک ایسا طریقہ ہے جس میں تھراپسٹ کی نگرانی میں والدین گھر پر روزمرہ گفتگو کے دوران بچے کی رہنمائی کرتے ہیں؛ اسکول جانے کی عمر سے پہلے کے بچوں کے لیے اسے دنیا بھر میں ایک آزمودہ طریقہ مانا جاتا ہے۔

بڑے بچوں اور بالغ افراد کے لیے تھراپی کا مقصد عموماً "مکمل خاتمے" کے بجائے روانی میں بہتری اور پر اعتماد گفتگو ہوتا ہے۔ اس کے لیے دو بڑے طریقے استعمال ہوتے ہیں: "فلوئنسی شیپنگ (Fluency Shaping) "، جس میں سانس، آواز کے نرم آغاز اور بولنے کی رفتار پر کام کر کے روانی بڑھائی جاتی ہے؛ اور "اسٹٹرنگ موڈیفیکیشن (Stuttering Modification)"، جس میں فرد کو سکھایا جاتا ہے کہ وہ اٹکنے کے لمحے کو کم تناؤ کے ساتھ کیسے سنبھالے اور اس کے خوف سے کیسے آزاد ہو۔ گفتگو سے جڑی جھجک اور خوف پر قابو پانے کے لیے کاگنیٹو بیہیویرَل تھراپی (CBT) اور سیلف ہیلپ و سپورٹ گروپس بھی بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں، جہاں ہکلانے والے افراد ایک دوسرے کے تجربات سے حوصلہ پاتے ہیں۔

یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اب تک ہکلاہٹ کے علاج کے لیے کوئی دوا عالمی سطح پر باقاعدہ منظور شدہ نہیں، اگرچہ اس پر تحقیق جاری ہے۔ اس لیے کسی بھی "یقینی اور فوری علاج" کے دعوے پر بھروسا کرنے کے بجائے کسی مستند اسپیچ لینگویج پیتھالوجسٹ سے رجوع کرنا ہی دانش مندی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ والدین کب ماہر سے رجوع کریں؟

بولنا سیکھنے کے دوران چھوٹے بچوں کا کبھی کبھار الفاظ دہرانا فطری بات ہے۔ تاہم ماہرین کے مطابق درج ذیل صورتوں میں کسی مستند اسپیچ تھراپسٹ سے معائنہ کروالینا چاہیے:

اگر ہکلاہٹ چھ ماہ سے زیادہ عرصے سے جاری ہو۔

:اگر ہکلاہٹ ساڑھے تین برس کی عمر کے بعد شروع ہوئی ہو۔

اگر خاندان میں کوئی اور فرد بھی ہکلاتا رہا ہو یا اب بھی ہکلاتا ہو۔

اگر بولتے وقت چہرے یا گردن میں کھنچاؤ، آنکھیں جھپکنا یا جسم کو جھٹکا دینا نظر آئے۔

اگر بچہ بولنے سے کترانے لگے، مخصوص الفاظ سے بچے یا اپنی ہکلاہٹ پر پریشانی ظاہر کرے۔

اگر آپ خود فکرمند ہیں تو یہی معائنے کی ایک معقول وجہ ہے؛ بروقت مشورہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوتا۔

ہکلانے والے فرد کی سب سے بڑی مدد ایک اچھا سامع کر سکتا ہے۔ چند سادہ رویّے کسی کی پوری زندگی کا اعتماد بدل سکتے ہیں:

گھر میں: والدین بچے کو ٹوکنے، ڈانٹنے یا بار بار درست کروانے کے بجائے اس کی بات کے مفہوم پر توجہ دیں۔ خود دھیمے اور پر سکون انداز میں بات کریں، روزانہ چند منٹ بچے کے ساتھ بغیر جلدی کے گفتگو کے لیے مخصوص کریں، اور گھر میں ایسا ماحول بنائیں جہاں ہر فرد کو اپنی بات مکمل کرنے کی باری ملے۔

گفتگو کے دوران: بولنے والے کے جملے خود مکمل نہ کریں، بیچ میں نہ ٹوکیں، آنکھوں کا قدرتی رابطہ برقرار رکھیں اور اسے بات مکمل کرنے کا پورا وقت دیں۔ "جلدی بولو" یا "سانس لے کر بولو" جیسے مشورے مدد کے بجائے دباؤ بڑھاتے ہیں۔

اسکول میں: اساتذہ ہکلانے والے طالب علم سے الگ سے بات کر کے پوچھیں کہ اسے کلاس میں کس طرح کی سہولت درکار ہے، اور کلاس میں مذاق اڑانے یا بُلیئنگ (Bullying) کے خلاف واضح اور سخت مؤقف اپنائیں۔

دفتر میں: آجر اور انٹرویو لینے والے صلاحیت کو روانی سے الگ کر کے دیکھیں؛ ہکلاہٹ کسی کی قابلیت، دیانت یا قیادت کی اہلیت کا پیمانہ نہیں۔

میڈیا اور سوشل میڈیا پر: ہکلاہٹ کو مزاح کا موضوع بنانے سے گریز کیا جائے، اور ایسا مواد آگے بڑھانے سے پہلے سوچا جائے جو کسی کی مشکل کو تماشا بنائے۔

ہکلاہٹ کبھی بڑی کامیابی کی راہ میں حتمی رکاوٹ ثابت نہیں ہوئی۔ ہماری دینی روایت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وہ دعا خاص طور پر یاد کی جاتی ہے جو قرآن مجید کی سورۃ طٰہٰ میں مذکور ہے، اور جس میں آپؑ نے اپنی زبان کی گرہ کھلنے کی التجا کی:

رَبِّ اشْرَحْ لِي صَدْرِي، وَيَسِّرْ لِي أَمْرِي، وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّن لِّسَانِي، يَفْقَهُوا قَوْلِي

"اے میرے رب! میرا سینہ کھول دے، میرا کام میرے لیے آسان کر دے، اور میری زبان کی گرہ کھول دے تاکہ لوگ میری بات سمجھ سکیں۔" (سورۃ طٰہٰ، آیات 25 تا 28)

یہ دعا آج بھی ہکلانے والے بہت سے افراد کے لیے حوصلے کا سرچشمہ ہے، اور یہ پیغام دیتی ہے کہ زبان کی رکاوٹ پیغام کی عظمت کو کم نہیں کرتی۔

جدید تاریخ میں بھی ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ برطانیہ کے بادشاہ جارج ششم شدید ہکلاہٹ کا شکار تھے، اور آسٹریلوی اسپیچ تھراپسٹ لائنل لوگ کی مدد سے انہوں نے دوسری جنگِ عظیم کے دوران قوم سے تاریخی خطابات کیے؛ ان کی کہانی پر بننے والی فلم "دی کنگز اسپیچ" (2010) نے آسکر ایوارڈ جیتا۔ برطانوی وزیرِ اعظم سر ونسٹن چرچل کے بارے میں بھی روایت ہے کہ وہ نوجوانی میں بولنے کی دشواری سے نبرد آزما رہے، مگر دنیا کے عظیم خطیبوں میں شمار ہوئے۔

اپنی گونج دار آواز کے لیے مشہور امریکی اداکار آنجہانی جیمز ارل جونز بچپن میں ہکلاہٹ کے باعث کئی برس تک تقریباً خاموش رہے، اور امریکا کے سابق صدر جو بائیڈن نے بچپن میں ہکلاہٹ کی وجہ سے مذاق کا سامنا کرنے کے باوجود ملک کا سب سے بڑا عہدہ حاصل کیا۔ گلوکار ایڈ شیر ان، اداکارہ ایملی بلنٹ اور بھارتی اداکار ہریتک روشن بھی بچپن میں ہکلاہٹ کا شکار رہے اور آج اپنے اپنے شعبوں کے نمایاں نام ہیں۔ ایسی کہانیاں ہمارے بچوں کو یہ پیغام دیتی ہیں کہ ہکلاہٹ ان کی پہچان نہیں، ان کی کہانی کا محض ایک پہلو ہے۔

پاکستان میں ہر سال اکتوبر میں بڑے ہسپتالوں، میڈیکل کالجز اور جامعات کے اسپیچ تھراپی کے شعبوں میں خصوصی سیمینارز، آگاہی واکس اور ورکشاپس کا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ ہکلاہٹ سے جڑے توہمات کا ازالہ ہو سکے۔ مختلف فلاحی ادارے اور اسپیچ تھراپسٹس اس موقع پر بچوں اور بڑوں کے لیے مفت مشاورت اور تھراپی کیمپ لگاتے ہیں، جبکہ ٹی وی، اخبارات اور سوشل میڈیا پر ماہرین کے انٹرویوز اور آگاہی پیغامات نشر کیے جاتے ہیں۔ کئی غیر سرکاری تنظیمیں اور سائنس سینٹرز بھی والدین کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ بچوں کو ڈانٹنے یا ان کا مذاق اڑانے کے بجائے ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔

تاہم ایک دن کی سرگرمیاں کافی نہیں۔ پائیدار تبدیلی کے لیے چند اقدامات ناگزیر ہیں:

تعلیم: اساتذہ کی تربیت کے نصاب میں ہکلاہٹ اور بولنے کی دیگر دشواریوں کی بنیادی پہچان شامل کی جائے، تاکہ ہکلانے والا بچہ کلاس روم میں تنہا نہ رہ جائے۔

صحت: ضلعی اور تحصیل ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں تک اسپیچ تھراپی کی سہولت پہنچائی جائے، اور لیڈی ہیلتھ ورکرز و کمیونٹی ہیلتھ ورکرز کو بچوں میں بولنے کی دشواریوں کی ابتدائی نشاندہی کی تربیت دی جائے۔

ماہرین کی تیاری: اسپیچ لینگویج پیتھالوجی کے تعلیمی پروگراموں اور تربیت یافتہ ماہرین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، خصوصاً چھوٹے شہروں کے لیے۔

معاشرہ: میڈیا، منبر و محراب، کمیونٹی تنظیمیں اور سول سوسائٹی ہکلاہٹ کو مذاق کے بجائے ہمدردی اور سائنسی سمجھ کے ساتھ پیش کریں۔

کہانی کے آغاز میں ذکر کیے گئے علی جیسے بچوں کو ترس کی نہیں، بس تھوڑے سے صبر، سمجھ اور موقع کی ضرورت ہے۔ اگر اس دن استاد ہنسنے والے بچوں کو روک دیتا، علی کو مسکرا کر بات مکمل کرنے کا وقت دیتا، اور اس کے والدین کو کسی ماہر سے رجوع کا مشورہ دیتا، تو شاید وہ ہاتھ پھر کبھی نیچے نہ جاتا۔

22 اکتوبر ہمیں یہی سبق دیتا ہے کہ روانی سے بولنا ذہانت یا قابلیت کا واحد معیار نہیں۔ لفظ اٹک سکتے ہیں، مگر خیالات، خواب اور حوصلے نہیں۔ اصل سوال یہ نہیں کہ کوئی کتنی روانی سے بولتا ہے، بلکہ یہ ہے کہ ہم کتنے صبر سے سنتے ہیں۔ اور کسی کی بات بیچ میں نہں کاٹتے—اسے مکمل ہونے دیتے ہیں



خود کو سب سے بڑا تحفہ: خوش رہنے کی اجازت

ہم اکثر خوشی کو کسی شرط، کسی کامیابی یا کسی دوسرے سے مشروط کر دیتے ہیں۔
حالانکہ سب سے قیمتی تحفہ یہ ہے کہ ہم خود کو خوش رہنے کی اجازت دے دیں۔
خوشی کے لیے کسی کی منظوری ضروری نہیں۔

". آئینہ خیال وعکس زمانہ "سے ایک صفحہ

ڈوزانتاماٹا (Doe Zantamata) ایک امریکی مصنفہ، بلاگر، گرافک ڈیزائنر اور فوٹو گرافر ہیں، جو اپنی ترغیبی (motivational) تحریروں، مثبت اقتباسات (quotes) اور خود شناسی سے متعلق کتابوں کے لیے دنیا بھر میں جانی جاتی ہیں۔

ان کا یہ خوب صورت قول زندگی کی ایک ایسی حقیقت کو اجاگر کرتا ہے جسے ہم اکثر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ

"خود کو خوش رہنے کی اجازت دینا اپنے آپ کو دیا جانے والا سب سے قیمتی تحفہ ہے۔"

ہم اکثر اپنی خوشی کو کسی کامیابی، خواہش کی تکمیل، حالات کی بہتری یا دوسروں کی منظوری سے مشروط کر لیتے ہیں اور یوں حال کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے محروم رہتے ہیں۔ اپنی خوشی کو دوسروں کی رضامندی کا محتاج بنانا درست نہیں، کیونکہ دوسروں کی خوشی میں شریک ہونا یقیناً خوبی ہے، لیکن اپنی خوشی کو مسلسل قربان کرتے رہنا کوئی لازمی نیکی نہیں۔ اس کا مطلب ذمہ داریوں سے فرار یا مشکلات سے آنکھیں بند کرنا بھی نہیں، بلکہ آزمائشوں کے باوجود امید کا دامن تھامے رکھنا اور زندگی کی خوب صورتی کو محسوس کرنا ہے

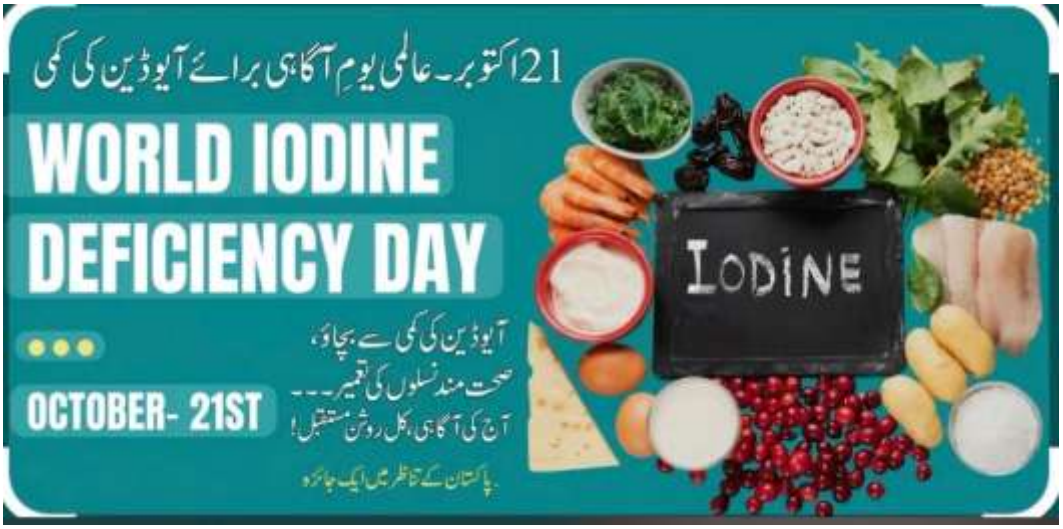

21 اکتوبر-عالمی یومِ آگاہی برائے آیوڈین کی کمی- آیوڈین کی کمی سے بچاؤ، صحت مند نسلوں کی تعمیر—آج کی آگاہی، کل کا روشن مستقبل!. پاکستان کے تناظر میں ایک جائزہ.

ہمارے دسترخوان پر رکھا نمک بظاہر ایک معمولی سی چیز ہے، مگر اس میں شامل آیوڈین کی چند مائیکرو گرام مقدار انسانی دماغ، جسمانی نشوونما اور آنے والی نسلوں کی ذہنی صلاحیت کا تعین کرتی ہے۔ آیوڈین (Iodine) ایک ایسا ضروری معدنی عنصر ہے جسے انسانی جسم نہ خود تیار کر سکتا ہے اور نہ ہی بڑی مقدار میں ذخیرہ کرتا ہے، اس لیے اس کی باقاعدہ فراہمی صرف خوراک ہی کے ذریعے ممکن ہے۔ ایک انسان کو پوری زندگی میں مجموعی طور پر ایک چائے کے چمچ سے بھی کم آیوڈین درکار ہوتی ہے، لیکن یہی معمولی مقدار بروقت نہ ملے تو اس کے اثرات عمر بھر ساتھ رہتے ہیں۔

ہر سال 21 اکتوبر کو دنیا کے مختلف حصوں، بالخصوص جنوبی ایشیا میں، آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والے عوارض کی روک تھام کے حوالے سے آگاہی کا دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد یہ پیغام عام کرنا ہے کہ ایک معمولی غذائی عنصر کی کمی بھی فرد کی صحت، بچوں کی ذہنی نشوونما اور پوری قوم کی پیداواری صلاحیت کو متاثر کر سکتی ہے، اور یہ کہ اس نقصان سے بچاؤ نہایت آسان اور کم خرچ ہے۔

چند بنیادی حقائق اس مسئلے کی اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ایک بالغ فرد کو روزانہ 150 مائیکرو گرام آیوڈین درکار ہوتی ہے، جبکہ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے یہ ضرورت 250 مائیکرو گرام تک پہنچ جاتی ہے۔ یونیسیف کے مطابق دنیا کے تقریباً 88 فیصد گھرانے آیوڈین ملا نمک استعمال کرتے ہیں۔

پاکستان میں قومی غذائی سروے کے مطابق آیوڈین ملے نمک کا گھریلو استعمال 2001ء میں تقریباً 17 فیصد تھا، جو 2018ء تک بڑھ کر تقریباً 80 فیصد ہو گیا۔ عالمی ادارۂ صحت بالغ افراد کو روزانہ 5 گرام سے کم نمک کھانے کی سفارش کرتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ لاہوری یا پنک (چٹانی) نمک میں قدرتی آیوڈین نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے، جب تک اس میں الگ سے آیوڈین شامل نہ کی جائے۔

آیوڈین اور گلہڑ کے باہمی تعلق کو انیسویں صدی ہی میں سمجھ لیا گیا تھا، تاہم اس مسئلے کے خلاف منظم اجتماعی کوشش بیسویں صدی میں سامنے آئی۔ سوئٹزرلینڈ نے 1922ء میں خوردنی نمک میں آیوڈین شامل کرنے کا آغاز کیا اور یوں وہ اس طریقے کو اپنانے والے اولین ممالک میں شامل ہوا۔ اس کے بعد امریکہ سمیت کئی ممالک نے یہی راستہ اختیار کیا اور گلہڑ کی شرح میں نمایاں کمی دیکھنے میں آئی۔

1980ء کی دہائی کے وسط میں آسٹریلوی ماہرِ طب ڈاکٹر باسل ہیٹزل (Basil Hetzel) کی قیادت میں International Council for Control of Iodine Deficiency Disorders (ICCIDD) قائم ہوئی، جس کا ایک اہم تاسیسی اجلاس نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں منعقد ہوا۔ یہی ادارہ آج آیوڈین گلوبل نیٹ ورک (Iodine Global Network – IGN) کے نام سے کام کر رہا ہے۔ 1990ء میں عالمی ادارۂ صحت کی اسمبلی اور اسی برس منعقد ہونے والی عالمی سربراہی کانفرنس برائے اطفال (World Summit for Children) نے آیوڈین کی کمی کے عوارض کے عملی خاتمے کو ایک بین الاقوامی ہدف قرار دیا۔ بعد ازاں 1993ء–94ء میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) اور یونیسیف نے یونیورسل سالٹ آیوڈائزیشن (Universal Salt Iodization – USI)، یعنی انسانوں اور مویشیوں کے استعمال میں آنے والے تمام نمک میں آیوڈین شامل کرنے کو، اس مسئلے کا بنیادی اور سب سے مؤثر حل تسلیم کیا۔

جہاں تک 21 اکتوبر کا تعلق ہے، یہ دن Global Iodine Deficiency Disorders Prevention Day کے نام سے بھارت سمیت جنوبی ایشیا کے کئی ممالک میں منایا جاتا ہے۔ تاہم یہ واضح رہے کہ یہ اقوامِ متحدہ کے باضابطہ عالمی ایام کی فہرست میں شامل نہیں، اور اس دن کے اولین آغاز کو کسی ایک ادارے یا شخصیت سے منسوب کرنے کی مستند تاریخی تصدیق دستیاب نہیں۔ اس کے باوجود صحتِ عامہ کے حلقوں میں یہ دن آگاہی مہمات کے ایک مؤثر موقع کے طور پر اپنی جگہ بنا چکا ہے۔

آیوڈین کا بنیادی کام گردن کے اگلے حصے میں واقع تتلی نما تھائیرائڈ غدود (Thyroid Gland) کو ہارمون بنانے کے قابل بنانا ہے۔ یہ غدود آیوڈین کی مدد سے دو اہم ہارمون تیار کرتا ہے: تھائرو کسین (T4) اور ٹرائی آیوڈو تھائرونین (T3)۔ یہ ہارمون جسم میں توانائی کے استعمال (میٹابولزم)، درجۂ حرارت کے توازن، دل کی دھڑکن، جسمانی بڑھوتری اور سب سے بڑھ کر دماغ اور اعصابی نظام کی نشوونما کو منظم کرتے ہیں۔ حمل کے دوران اور زندگی کے ابتدائی دو برسوں میں ان ہارمونز کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے، کیونکہ یہی وہ مرحلہ ہے جب بچے کے دماغ کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔

عالمی ادارۂ صحت، یونیسیف اور آیوڈین گلوبل نیٹ ورک کی مشترکہ سفارشات کے مطابق پیدائش سے 5 سال تک کے بچوں کو روزانہ 90 مائیکروگرام، 6 سے 12 سال کے بچوں کو 120 مائیکروگرام، اور 12 سال سے زائد عمر کے نوجوانوں اور بالغ افراد کو 150 مائیکروگرام آیوڈین درکار ہوتی ہے۔ حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کے لیے یہ مقدار بڑھ کر 250 مائیکروگرام ہو جاتی ہے۔ یوں ماؤں کی ضرورت ایک عام بالغ فرد کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ ماں کے ذریعے ہی بچے کی آیوڈین کی ضرورت پوری ہوتی ہے۔

آیوڈین کی کمی سے پیدا ہونے والے تمام مسائل کو مجموعی طور پر آیوڈین کی کمی کے عوارض (Iodine Deficiency Disorders – IDD) کہا جاتا ہے۔ ان کی شدت کا انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ کمی کس درجے کی ہے اور زندگی کے کس مرحلے پر واقع ہوئی ہے۔

گلہڑ :(Goitre) یہ آیوڈین کی کمی کی سب سے نمایاں اور جانی پہچانی علامت ہے۔ جب جسم کو مطلوبہ آیوڈین نہیں ملتی تو تھائیرائڈ غدود زیادہ ہارمون بنانے کی کوشش میں اپنا حجم بڑھا لیتا ہے، جس سے گردن کے اگلے حصے میں سوجن نمودار ہو جاتی ہے۔ بڑا گلہڑ سانس لینے اور نگلنے میں دشواری کا باعث بھی بن سکتا ہے۔

ہائپو تھائیرائڈزم :(Hypothyroidism) تھائیرائڈ ہارمون کی کمی کی صورت میں شدید تھکاوٹ، سستی، سردی زیادہ محسوس ہونا، جلد کی خشکی، قبض، وزن میں بلاوجہ اضافہ اور توجہ مرکوز کرنے میں دشواری جیسی علامات سامنے آتی ہیں۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ ہائپو تھائیرائڈزم کی دیگر وجوہات بھی ہو سکتی ہیں، اس لیے تشخیص ہمیشہ مستند معالج اور مناسب ٹیسٹ کے ذریعے ہی ہونی چاہیے۔

حمل پر اثرات: دورانِ حمل آیوڈین کی شدید کمی اسقاطِ حمل (Miscarriage)، مردہ بچے کی پیدائش (Stillbirth)، پیدائشی نقائص اور نوزائیدہ بچوں کی اموات کے خطرات بڑھا دیتی ہے۔ ماں کے جسم میں آیوڈین کی کمی براہِ راست جنین کے دماغ اور اعصابی نظام کی نشوونما کو متاثر کرتی ہے، اور یہ نقصان اکثر ناقابلِ تلافی ہوتا ہے۔

کریٹن ازم :(Cretinism) شدید کمی کی انتہائی صورت میں بچہ شدید ذہنی معذوری، قد کی کمی، بہرے پن اور بولنے کی صلاحیت سے متعلق مسائل کے ساتھ پیدا ہو سکتا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت آیوڈین کی کمی کو دنیا بھر میں دماغی نقصان اور ذہنی معذوری کی سب سے بڑی ایسی وجہ قرار دیتا ہے جس کی روک تھام ممکن ہے۔

سیکھنے کی صلاحیت میں کمی: کمی کی ہلکی یا درمیانی سطح بھی خاموشی سے اپنا اثر دکھاتی ہے۔ تحقیقی جائزوں کے مطابق آیوڈین کی کمی والے علاقوں میں پلنے بڑھنے والے بچوں کا اوسط آئی کیو (IQ) آیوڈین کی مناسب فراہمی والے علاقوں کے بچوں کے مقابلے میں کئی پوائنٹ، بعض جائزوں کے مطابق 12 سے 13 پوائنٹ تک، کم پایا گیا ہے۔ ایسے بچے تعلیمی میدان میں پیچھے رہ جاتے ہیں، اور جب یہ کیفیت پوری آبادی میں پھیلی ہو تو اس کا اثر قومی سطح پر تعلیمی معیار، افرادی قوت کی استعداد اور معاشی ترقی پر پڑتا ہے۔ اسی لیے آیوڈین کی مناسب فراہمی محض انفرادی صحت کا معاملہ نہیں بلکہ انسانی ترقی کا سوال ہے۔

گزشتہ تین دہائیوں میں آیوڈین کی کمی کے خلاف جدوجہد صحتِ عامہ کی کامیاب ترین عالمی مہمات میں شمار ہوتی ہے۔ 1990ء کی دہائی کے آغاز میں سو سے زائد ممالک میں آیوڈین کی کمی صحتِ عامہ کا ایک سنگین مسئلہ تھی، جبکہ آیوڈین گلوبل نیٹ ورک کے حالیہ جائزوں کے مطابق ایسے ممالک کی تعداد گھٹ کر بیس کے لگ بھگ رہ گئی ہے۔ یونیسیف کے مطابق دنیا کے تقریباً 88 فیصد گھرانے اب آیوڈین ملا نمک استعمال کر رہے ہیں۔

اس کے باوجود مسئلہ مکمل طور پر ختم نہیں ہوا۔ عالمی ادارۂ صحت کے 2000ء کی دہائی کے اوائل کے تخمینوں کے مطابق دنیا کے تقریباً دو ارب افراد، جن میں لگ بھگ 28 کروڑ 50 لاکھ اسکول جانے والے بچے شامل تھے، آیوڈین کی ناکافی مقدار حاصل کر رہے تھے۔ 2011ء کے ایک بعد کے عالمی تخمینے میں یہ تعداد قدرے کم ہو کر تقریباً ایک ارب 88 کروڑ رہ گئی، جن میں قریباً 24 کروڑ اسکول جانے والے بچے شامل تھے۔ یہ اعداد بتاتے ہیں کہ نمایاں پیش رفت کے باوجود دنیا کی ایک بڑی آبادی اب بھی خطرے کی زد میں ہے۔

عالمی بیماریوں کے بوجھ سے متعلق تحقیق (Global Burden of Disease Study) کے مطابق آیوڈین کی کمی کا سب سے زیادہ بوجھ سب صحارا افریقہ اور جنوبی ایشیا کے خطوں پر ہے، جہاں سیاسی عدم استحکام، کمزور غذائی نظام اور نمک کی صنعت کی ناکافی نگرانی جیسے عوامل اس کمی کو برقرار رکھتے ہیں۔ جغرافیائی اعتبار سے ہمالیہ، الپس اور اینڈیز جیسے پہاڑی سلسلے اور بار بار سیلاب کی زد میں آنے والے میدانی علاقے خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں، کیونکہ برفانی ادوار، گلیشیئرز کے پگھلاؤ، شدید بارشوں اور سیلابوں کے باعث یہاں کی مٹی سے آیوڈین بہہ چکی ہے۔ نتیجتاً اس مٹی میں اگنے والی فصلوں اور اس پر پلنے والے مویشیوں سے حاصل ہونے والی خوراک میں بھی آیوڈین کم ہوتی ہے۔ قابلِ ذکر امر یہ ہے کہ یورپ کے بعض ترقی یافتہ ممالک میں بھی ہلکی نوعیت کی آیوڈین کی کمی دیکھی گئی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ مسئلہ صرف غربت سے نہیں بلکہ مٹی کی ساخت اور غذائی عادات سے بھی جڑا ہوا ہے۔

پاکستان کا شمار تاریخی طور پر ان ممالک میں ہوتا رہا ہے جہاں آیوڈین کی کمی صحتِ عامہ کا ایک بڑا مسئلہ رہی ہے۔ گلگت بلتستان، چترال، خیبر پختونخوا کے پہاڑی اضلاع اور آزاد جموں و کشمیر کے بالائی علاقے اس کمی سے سب سے زیادہ متاثر رہے، جہاں ماضی کے بعض مطالعات میں گلہڑ کی شرح 30 فیصد سے 70 فیصد تک ریکارڈ کی گئی۔ صرف پہاڑی علاقے ہی نہیں بلکہ دریاؤں کے کنارے آباد اور سیلاب سے بار بار متاثر ہونے والے میدانی علاقے بھی اس خطرے کی زد میں رہے، کیونکہ سیلابی پانی زمین سے آیوڈین بہالے جاتا ہے۔

اس صورتحال کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان نے 1990ء کی دہائی میں یونیسیف کے تعاون سے آیوڈین کی کمی کے خلاف قومی سطح پر اقدامات کا آغاز کیا، جنہیں بعد ازاں مائیکرونیوٹرینٹ انیشی ایٹو (موجودہ نام: نیوٹریشن انٹرنیشنل) سمیت دیگر شراکت دار اداروں کی معاونت سے وسعت دی گئی۔ اس پروگرام کا محور نمک تیار کرنے والے یونٹس کو پوٹاشیم آیوڈیٹ (Potassium Iodate) کی فراہمی، تکنیکی تربیت، معیار کی نگرانی اور عوامی آگاہی تھا۔ یونیورسل سالٹ آیوڈائزیشن کی اس حکمتِ عملی کے نتائج قومی غذائی سروے (National Nutrition Survey) کے اعداد و شمار میں واضح طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ 2001ء–02ء کے سروے میں ملک کے صرف تقریباً 17 فیصد گھرانے آیوڈین ملا نمک استعمال کر رہے تھے۔ 2011ء میں یہ شرح بڑھ کر تقریباً 69 فیصد اور 2018ء میں تقریباً 80 فیصد تک پہنچ گئی۔ یعنی دو دہائیوں سے بھی کم عرصے میں آیوڈین ملے نمک کا استعمال چار گنا سے زیادہ بڑھ گیا، جو کسی بھی ترقی پذیر ملک کے لیے ایک قابلِ ذکر کامیابی ہے۔

تاہم ان اعداد کا ایک دوسرا رخ بھی ہے۔ 2018ء کے سروے کے مطابق بھی تقریباً ہر پانچ میں سے ایک گھرانہ آیوڈین ملا نمک استعمال نہیں کر رہا تھا، جبکہ صوبوں، اضلاع اور شہری و دیہی آبادی کے درمیان نمایاں فرق موجود رہا۔ مزید یہ کہ نمک میں آیوڈین کا محض موجود ہونا کافی نہیں؛ اس کی مقدار کا معیاری حد کے مطابق ہونا بھی ضروری ہے، اور مختلف جائزوں کے مطابق بہت سے گھرانوں میں استعمال ہونے والا نمک اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔

اٹھارہویں آئینی ترمیم (2010ء) کے بعد صحت اور خوراک کے شعبے صوبوں کو منتقل ہو گئے، چنانچہ اب نمک میں آیوڈین کی شمولیت سے متعلق قانون سازی اور اس پر عملدرآمد بنیادی طور پر صوبائی حکومتوں کی ذمہ داری ہے۔ مختلف صوبوں نے آیوڈین ملے نمک سے متعلق قوانین اور ضوابط متعارف کرائے ہیں، جبکہ پنجاب فوڈ اتھارٹی سمیت صوبائی فوڈ اتھارٹیز خوراک کے معیار کی نگرانی کرتی ہیں۔ وفاقی سطح پر وزارتِ قومی صحت، ضوابط و رابطہ کاری پالیسی سازی، صوبوں کے درمیان رابطے اور قومی سرویز کی ذمہ دار ہے۔ تاہم بڑی تعداد میں چھوٹے اور غیر رجسٹرڈ نمک یونٹس کی موجودگی کے باعث قوانین پر یکساں عملدرآمد اب بھی ایک چیلنج ہے۔

پاکستان قدرتی نمک کے دنیا کے بڑے ذخائر رکھتا ہے، اور کھیوڑہ کی کان کا شمار دنیا کی بڑی اور قدیم ترین نمک کی کانوں میں ہوتا ہے۔ مگر یہ ایک اہم حقیقت ہے کہ چٹانی نمک، جسے عام طور پر لاہوری نمک یا ہمالین پنک سالٹ کہا جاتا ہے، میں قدرتی طور پر آیوڈین نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے۔ حالیہ برسوں میں قدرتی اور صحت بخش ہونے کے تاثر کے ساتھ اس نمک کے بڑھتے ہوئے رجحان نے بہت سے گھرانوں کو آیوڈین ملے نمک سے دور کر دیا ہے۔ جب تک اس نمک میں الگ سے آیوڈین شامل نہ کی جائے، یہ جسم کی آیوڈین کی ضرورت پوری نہیں کرتا۔

ماضی میں بعض علاقوں میں یہ بے بنیاد افواہ پھیلائی گئی کہ آیوڈین ملا نمک بانجھ پن کا باعث بنتا ہے یا یہ آبادی کم کرنے کی کوئی سازش ہے۔ ان افواہوں نے کئی دیہی اور دور دراز علاقوں میں آیوڈین ملے نمک کی قبولیت کو نقصان پہنچایا۔ سائنسی حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے: آیوڈین کی کمی خود بانجھ پن، اسقاطِ حمل اور حمل کی پیچیدگیوں کا خطرہ بڑھاتی ہے، جبکہ آیوڈین کی مناسب مقدار صحت مند حمل کے لیے ضروری ہے۔

ملک میں نمک کی پراسیسنگ کا ایک بڑا حصہ چھوٹے اور روایتی یونٹس پر مشتمل ہے، جن کے پاس آیوڈین کی یکساں اور معیاری شمولیت کے لیے مناسب مشینری، تربیت اور معیار جانچنے کی سہولیات اکثر دستیاب نہیں ہوتیں۔

آیوڈین گرمی، نمی اور دھوپ کے اثر سے ضائع ہو سکتی ہے۔ نمک کو کھلے برتنوں میں یا چولہے کے قریب رکھنا، اور بازار میں کھلی بوریوں میں فروخت ہونے والا نمک خریدنا اس کی افادیت کو کم کر دیتا ہے۔ نیز پہاڑی، صحرائی اور دور افتادہ علاقوں میں معیاری آیوڈین ملے نمک کی دستیابی، قیمت اور آگاہی، تینوں ہی چیلنج ہیں، حالانکہ یہی علاقے قدرتی طور پر سب سے زیادہ خطرے میں ہیں۔

عوامی سطح پر دستیاب آخری جامع قومی غذائی سروے 2018ء کا ہے۔ موجودہ صورتحال کے درست اندازے کے لیے، خاص طور پر حاملہ خواتین اور بچوں میں پیشاب کے ذریعے آیوڈین کی سطح (Urinary Iodine) کی جانچ کے لیے، باقاعدہ اور تازہ قومی و صوبائی سرویز ناگزیر ہیں۔

آیوڈین کی کمی سے بچاؤ کا سب سے مؤثر، سستا اور آزمودہ طریقہ معیاری آیوڈین ملا خوردنی نمک ہے۔ اس سلسلے میں چند بنیادی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

صرف آیوڈین ملا نمک خریدیں: پیکٹ پر آیوڈین ملا نمک (Iodized Salt) کی واضح تحریر، برانڈ اور تیاری و میعاد کی تاریخ دیکھ کر خریداری کریں۔ اگر لاہوری یا پنک نمک استعمال کرنا ہو تو یہ یقینی بنائیں کہ اس میں آیوڈین شامل کی گئی ہو۔

درست ذخیرہ: نمک کو ہوا بند ڈبے میں رکھیں اور اسے چولہے، دھوپ اور نمی سے دور رکھیں۔

پکاتے وقت احتیاط: بہتر ہے کہ نمک کھانا پکنے کے آخری مرحلے میں یا پکنے کے بعد شامل کیا جائے، تاکہ دیر تک حرارت کی وجہ سے آیوڈین ضائع نہ ہو۔

نمک بڑھانا حل نہیں: آیوڈین کی خاطر نمک کی مقدار بڑھانا درست نہیں۔ عالمی ادارۂ صحت بالغ افراد کو روزانہ پانچ گرام، یعنی تقریباً ایک چائے کے چمچ، سے کم نمک کھانے کا مشورہ دیتا ہے، کیونکہ زیادہ نمک بلڈ پریشر، دل کے امراض اور فالج کا خطرہ بڑھاتا ہے۔ درست اصول یہی ہے کہ نمک کم ہو، مگر آیوڈین ملا ہو۔

متوازن غذا: دودھ اور دودھ سے بنی اشیا، انڈے، مچھلی اور سمندری غذا آیوڈین کے اچھے قدرتی ذرائع ہیں اور متوازن خوراک کا حصہ ہونے چاہئیں۔

حاملہ خواتین پر خصوصی توجہ: حاملہ اور دودھ پلانے والی خواتین کو آیوڈین کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے، اس لیے دورانِ حمل باقاعدہ طبی معائنہ کرائیں اور سپلیمنٹ کے بارے میں معالج کے مشورے پر عمل کریں۔

خود علاجی سے گریز: آیوڈین کی زیادتی بھی تھائیرائڈ کے مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ آیوڈین کی گولیاں یا سپلیمنٹ ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر استعمال نہ کریں، اور گردن میں سوجن یا تھائیرائڈ سے متعلق علامات کی صورت میں مستند معالج سے رجوع کریں۔

آیوڈین کی کمی کا مکمل خاتمہ کسی ایک ادارے کے بس کی بات نہیں؛ اس کے لیے حکومت، طبی ماہرین، تعلیمی اداروں، صنعت اور معاشرے کو مل کر کام کرنا ہو گا۔

حکومت اور ریگولیٹری ادارے: قوانین پر مؤثر عملدرآمد، نمک کی صنعت کی رجسٹریشن اور باقاعدہ معائنہ، پوٹاشیم آیوڈیٹ کی مسلسل دستیابی، اور وقفے وقفے سے قومی و صوبائی سرویز کے ذریعے صورتحال کی نگرانی۔

محکمۂ صحت اور لیڈی ہیلتھ ورکرز: پاکستان کا لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام گھر گھر رسائی کا ایک منفرد نیٹ ورک ہے۔ ہزاروں لیڈی ہیلتھ ورکرز حاملہ خواتین اور ماؤں تک آیوڈین کے بارے میں درست معلومات پہنچانے اور سادہ ٹیسٹ کٹس کے ذریعے گھریلو نمک میں آیوڈین کی جانچ میں کلیدی کردار ادا کر سکتی ہیں

۔بنیادی مراکزِ صحت (BHUs) اور دیہی مراکزِ صحت (RHCs) میں دورانِ حمل معائنے کے موقع پر آیوڈین سے متعلق مشاورت کو معمول کا حصہ بنایا جانا چاہیے۔

تعلیمی ادارے: اسکولوں میں صحت و غذائیت کی تعلیم، 21 اکتوبر کے موقع پر آگاہی سرگرمیاں اور طلبہ کے ذریعے گھروں تک پیغام رسانی نہایت مؤثر ثابت ہو سکتی ہے، کیونکہ بچے اپنے گھروں میں تبدیلی کے بہترین سفیر ہوتے ہیں۔

نمک کی صنعت: معیاری آیوڈائزیشن، درست پیکنگ اور واضح لیبلنگ کو محض قانونی تقاضا نہیں بلکہ کاروباری اور اخلاقی ذمہ داری کے طور پر اپنانا۔

علمائے کرام، میڈیا اور سماجی تنظیمیں: افواہوں اور غلط فہمیوں کے ازالے میں علمائے کرام اور مقامی معتبر شخصیات کا کردار نہایت اہم ہے۔

ذرائع ابلاغ، سوشل میڈیا، اور کمیونٹی کی سطح پر کام کرنے والی تنظیمیں، خصوصاً دیہی ترقی کے ادارے اور کمیونٹی آرگنائزیشنز، دیہی گھرانوں تک آسان زبان میں پیغام پہنچا کر رویوں میں پائیدار تبدیلی لا سکتی ہیں۔

21 اکتوبر کا پیغام سادہ مگر گہرا ہے: صحت مند معاشرے کی تعمیر صرف علاج سے نہیں بلکہ بروقت آگاہی اور روک تھام سے ممکن ہوتی ہے۔ آیوڈین کی کمی ان چند مسائل میں سے ہے جن کا حل سستا، آسان اور ثابت شدہ ہے، اور وہ حل ہر گھر کے باورچی خانے میں موجود معیاری آیوڈین ملا نمک ہے۔ پاکستان نے گزشتہ دو دہائیوں میں اس میدان میں قابلِ قدر پیش رفت کی ہے، مگر آخری گھرانے تک رسائی، معیار کی یقینی فراہمی اور غلط فہمیوں کا خاتمہ ابھی باقی ہے۔

اگر ہم آج ماؤں کی صحت، بچوں کی ذہنی نشوونما اور غذائی تحفظ کو ترجیح دیں تو آنے والی نسلوں کے لیے ایک زیادہ صحت مند، باصلاحیت اور خوش حال پاکستان کی بنیاد رکھ سکتے ہیں۔



20اکتوبر " -ہڈیوں کے بھربھرے ہن اور کمزوری "کا عالمی دن-(ہڈیاں مضبوط-زندگی توانا-خاموش بیماری کے خلاف جاگنے کا دن)

ہر سال20اکتوبر کو دنیا بھر میں عالمی یومِ آسٹیوپوروسس منایا جاتا ہے تاکہ ہڈیوں کے بھربھرے پن اور کمزوری کی اُس خاموش بیماری کے بارے میں آگاہی پیدا کی جاسکے جو برسوں تک کوئی علامت ظاہر کیے بغیر انسانی ڈھانچے کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی رہتی ہے۔

اس دن کی بنیاد 20 اکتوبر 1996 کو برطانیہ کی نیشنل آسٹیوپوروسس سوسائٹی (National Osteoporosis Society) نے یورپی کمیشن کے تعاون سے رکھی۔ 1997 سے انٹرنیشنل آسٹیوپوروسس فاؤنڈیشن (IOF) نے اس مہم کی باگ ڈور سنبھالی اور اسے ایک ملکی مہم سے بڑھا کر عالمی تحریک بنا دیا، جبکہ 1998 اور 1999 میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) نے بھی اس کی مشترکہ سرپرستی کی، جس سے اسے مزید بین الاقوامی اہمیت ملی

۔1999 میں پہلی بار یہ دن ایک باقاعدہ موضوع "Early Detection" یعنی مرض کی جلد تشخیص کے تحت منایا گیا، اور تب سے ہر سال ہڈیوں کی صحت، خوراک، ورزش اور علاج سے متعلق کسی نئے موضوع کے ساتھ سال بھر آگاہی مہم چلائی جاتی ہے۔

آسٹیوپوروسس کو بجا طور پر "خاموش بیماری" کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں ہڈیوں کی کثافت (Density) اور اندرونی بناوٹ رفتہ رفتہ کمزور ہوتی چلی جاتی ہے مگر نہ درد ہوتا ہے نہ کوئی واضح علامت، یہاں تک کہ ایک معمولی ٹھوکر، گرنے یا جھکنے سے ہڈی ٹوٹ جاتی ہے۔ ایسے فریکچر زیادہ تر کولہے، ریڑھ کی ہڈی اور کلائی میں ہوتے ہیں، جبکہ ریڑھ کے مہروں کے دب جانے سے قد کا گھٹ جانا، کمر کا جھک جانا اور مستقل کمر درد بھی اسی مرض کی عام نشانیاں ہیں۔ کولہے کا فریکچر خاص طور پر خطرناک سمجھا جاتا ہے، کیونکہ عالمی اعداد و شمار کے مطابق ایسے تقریباً ہر پانچ میں سے ایک مریض ایک سال کے اندر زندگی کی بازی ہار جاتا ہے اور بہت سے مریض دوبارہ پہلے کی طرح خود مختار زندگی گزارنے کے قابل نہیں رہتے۔

اس مرض کی تشخیص کا بنیادی اور معتبر ذریعہ ڈیکسا اسکین (DEXA Scan) ہے، جو چند منٹوں میں ہڈیوں کی کثافت ناپ کر بتا دیتا ہے کہ ہڈیاں نارمل ہیں، ابتدائی کمزوری (آسٹیوپینیا) کا شکار ہیں یا آسٹیوپوروسس کی حد کو چھو چکی ہیں۔

اس سال انٹرنیشنل آسٹیوپوروسس فاؤنڈیشن نے عالمی مہم کے لیے "Build, Protect, Strengthen Your Bones for Life" یعنی "اپنی ہڈیوں کو زندگی بھر کے لیے بنائیں، ان کی حفاظت کریں اور انہیں مضبوط کریں" کا موضوع اپنایا ہے، جس کا پیغام یہ ہے کہ ہڈیوں کی فکر صرف بڑھاپے کا نہیں بلکہ زندگی کے ہر مرحلے کا تقاضا ہے۔ "بنائیں" کا مطلب یہ ہے کہ بچپن اور نوجوانی ہی وہ سنہری دور ہے جب ہڈیوں کا ذخیرہ جمع ہوتا ہے؛ ماہرین کے مطابق لڑکیاں 18 اور لڑکے 20 برس کی عمر تک اپنے زیادہ سے زیادہ بون ماس کا 90 فیصد تک حاصل کر لیتے ہیں، اس لیے اس عمر میں دودھ، دہی، لسی، پنیر، ہرے پتوں والی سبزیاں، چنے، تل اور کانٹوں سمیت کھائی جانے والی چھوٹی مچھلی جیسی کیلشیم سے بھرپور غذائیں، روزانہ کچھ وقت دھوپ اور کھیل کود بے حد ضروری ہیں۔ "حفاظت کریں" سے مراد اپنے خطرات کو پہچان کر ہڈیوں کے نقصان کو روکنا اور گرنے سے بچنا ہے، خصوصاً بزرگوں کے لیے گھروں میں مناسب روشنی، پھسلن سے پاک فرش اور غسل خانوں میں سہارے کا بندوبست۔ اور "مضبوط کریں" کا پیغام یہ ہے کہ بڑھتی عمر کے ساتھ بروقت طبی معائنے، ضرورت پڑنے پر ڈیکسا اسکین اور معالج کے مشورے سے باقاعدہ علاج کے ذریعے ہڈیوں کی کثافت کو برقرار رکھا جائے۔

آسٹیوپوروسس کے خطرات کو دو بڑے حصوں میں سمجھا جاسکتا ہے۔ پہلے وہ عوامل ہیں جنہیں بدلا نہیں جاسکتا: عمر پچاس برس سے تجاوز کرتے ہی ہڈیاں قدرتی طور پر کمزور ہونے لگتی ہیں
؛یہ مرض مردوں کی نسبت خواتین میں کہیں زیادہ پایا جاتا ہے، کیونکہ مینوپاز (ایامِ ماہواری کے خاتمے) کے بعد ایسٹروجن ہارمون کی کمی کے باعث پہلے پانچ سے سات برسوں میں خواتین اپنی ہڈیوں کی کثافت کا 20 فیصد تک کھو سکتی ہیں؛ والدین یا بہن بھائیوں میں آسٹیوپوروسس یا ہڈی ٹوٹنے کی تاریخ خطرہ بڑھا دیتی ہے؛ اور دبلے پتلے، چھوٹے جسمانی ڈھانچے والے افراد بھی زیادہ زد میں ہوتے ہیں کیونکہ ان کا بون ماس پہلے ہی کم ہوتا ہے۔ دوسری طرف وہ عوامل ہیں جو ہمارے طرزِ زندگی سے جڑے ہیں اور جنہیں قابو میں لایا جاسکتا ہے: خوراک میں کیلشیم اور وٹامن ڈی کی مسلسل کمی، ورزش سے دوری اور دن کا بیشتر حصہ بیٹھ کر گزارنا، سگریٹ نوشی اور شراب نوشی جو ہڈیوں کے خلیات کو نقصان پہنچاتی اور کیلشیم کے جذب کو روکتی ہیں، اور سٹیرائڈز سمیت بعض ادویات کا طویل استعمال۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ تیز قدموں سے چلنا، سیڑھیاں چڑھنا اور ہلکی وزن اٹھانے والی ورزشیں (Weight-bearing exercises) ہڈیوں کو مضبوط رکھنے کا سستا اور مؤثر ذریعہ ہیں۔

عالمی سطح پر یہ مرض صحتِ عامہ کے بڑے چیلنجوں میں شمار ہوتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 50 کروڑ افراد آسٹیوپوروسس کا شکار ہیں۔ متعدد تحقیقات کے ایک جامع عالمی جائزے کے مطابق اس کی مجموعی شرح تقریباً 18.3 فیصد ہے، جو خواتین میں 23.1 فیصد اور مردوں میں 11.7 فیصد یعنی تقریباً دگنی ہے۔ پچاس برس سے زائد عمر کی ہر تین میں سے ایک خاتون اور ہر پانچ میں سے ایک مرد زندگی میں کبھی نہ کبھی اس مرض کے باعث فریکچر کا سامنا کرتا ہے، جبکہ معمر آبادی میں یہ شرح مزید بڑھ جاتی ہے اور بزرگ خواتین میں 35 فیصد کے قریب جا پہنچتی ہے۔ ماہرین خبردار کرتے ہیں کہ ایشیا میں بزرگ آبادی کے تیزی سے بڑھنے کے باعث 2050 تک دنیا بھر میں ہونے والے کولہے کے آدھے سے زیادہ فریکچر اسی براعظم میں ہوں گے، اور پاکستان بھی اسی خطے کا حصہ ہے۔

پاکستان میں صورتحال اور بھی تشویشناک ہے۔ انٹرنیشنل آسٹیوپوروسس فاؤنڈیشن کے ایشیائی جائزے کے تخمینوں کے مطابق ملک میں تقریباً 99 لاکھ افراد اس مرض میں مبتلا تھے، جن میں لگ بھگ 72 لاکھ خواتین تھیں، اور 2050 تک یہ تعداد بڑھ کر تقریباً ایک کروڑ 29 لاکھ تک پہنچنے کا اندیشہ ظاہر کیا گیا۔ چونکہ یہ تخمینے کئی برس پرانے ہیں، اس لیے آبادی میں اضافے اور بڑھتی ہوئی اوسط عمر کے پیشِ نظر آج حقیقی تعداد اس سے زیادہ ہونے کا امکان ہے۔

مختلف مقامی تحقیقات میں پچاس برس سے زائد عمر کی خواتین میں اس کی شرح 20 سے 49.3 فیصد تک، جبکہ ہڈیوں کی ابتدائی کمزوری یعنی آسٹیوپینیا کی شرح خواتین اور نوجوانوں میں 34 سے 72 فیصد تک ریکارڈ کی گئی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ دھوپ سے مالامال ملک ہونے کے باوجود یہاں کی آبادی کی بڑی تعداد وٹامن ڈی کی کمی کا شکار ہے، جس کی وجوہات میں گھروں اور دفاتر تک محدود زندگی، دھوپ میں کم نکلنا، غذا میں دودھ اور کیلشیم والی اشیاء کی کمی، خواتین میں کم وقفے سے حمل اور ناکافی غذائیت کے ساتھ بچوں کو دودھ پلانا، اور اتائیوں کے ہاتھوں سٹیرائڈ ادویات کا بلاضرورت استعمال شامل ہیں

۔پنجاب میں سردیوں کے موسم میں اسموگ اور دھند کئی ہفتوں تک سورج کی روشنی کو محدود کر دیتی ہیں، جس سے وٹامن ڈی کی کمی کا مسئلہ مزید سنگین ہو جاتا ہے۔

پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں آسٹیوپوروسس کے لیے حکومتی سطح پر کوئی الگ اور مخصوص پروگرام تو موجود نہیں، تاہم صحت کے عمومی نظام اور فلاحی اسکیموں کے ذریعے مریضوں کو کئی سہولیات میسر ہیں۔ میو ہسپتال اور جناح ہسپتال لاہور، نشتر ہسپتال ملتان اور الائیڈ ہسپتال فیصل آباد جیسے بڑے تدریسی ہسپتالوں کے ساتھ ساتھ ضلعی (DHQ) اور تحصیل (THQ) ہیڈ کوارٹر ہسپتالوں میں آرتھوپیڈک کے شعبے کام کر رہے ہیں، جہاں او پی ڈی میں معمولی پرچی فیس پر معائنہ ہوتا ہے اور فریکچر کی صورت میں مفت یا رعایتی نرخوں پر آپریشن کیا جاتا ہے۔ ڈیکسا اسکین کی سہولت زیادہ تر بڑے شہروں کے سرکاری تدریسی ہسپتالوں اور تشخیصی مراکز میں نجی لیبارٹریوں کے مقابلے میں کہیں کم قیمت پر دستیاب ہے، جبکہ کیلشیم اور وٹامن ڈی کے ٹیسٹ بھی سرکاری لیبارٹریوں میں رعایتی نرخوں پر ہوتے ہیں۔ اسٹاک کی دستیابی کی صورت میں کیلشیم، وٹامن ڈی اور بنیادی ادویات (جیسے Bisphosphonates) مفت فراہم کی جاتی ہیں؛ صحت کارڈ پروگرام کی موجودہ شرائط کے تحت رجسٹرڈ خاندانوں کو پینل پر موجود سرکاری اور منتخب نجی ہسپتالوں میں داخلے اور سرجری کی سہولت ملتی ہے؛ اور مہنگے انجیکشن (جیسے Teriparatide یا Denosumab) خریدنے سے قاصر مستحق مریض ہسپتال ویلفیئر سوسائٹی، ضلعی بیت المال کمیٹی یا زکوٰۃ فنڈ سے مالی امداد کے لیے درخواست دے سکتے ہیں۔ وقت کا تقاضا ہے کہ ہڈیوں کی صحت کو بنیادی مراکزِ صحت اور لیڈی ہیلتھ ورکرز کی آگاہی مہمات کا باقاعدہ حصہ بنایا جائے، کیونکہ آسٹیوپوروسس سے بچاؤ اس کے علاج سے کہیں آسان اور سستا ہے

آیئے اس عالمی دن پر عہد کریں کہ اپنی اور اپنے پیاروں کی ہڈیوں کو آج ہی سے بنانا، بچانا اور مضبوط کرنا شروع کریں گے، تاکہ عمر کا ہر حصہ وقار، خودمختاری اور توانائی کے ساتھ گزرے۔

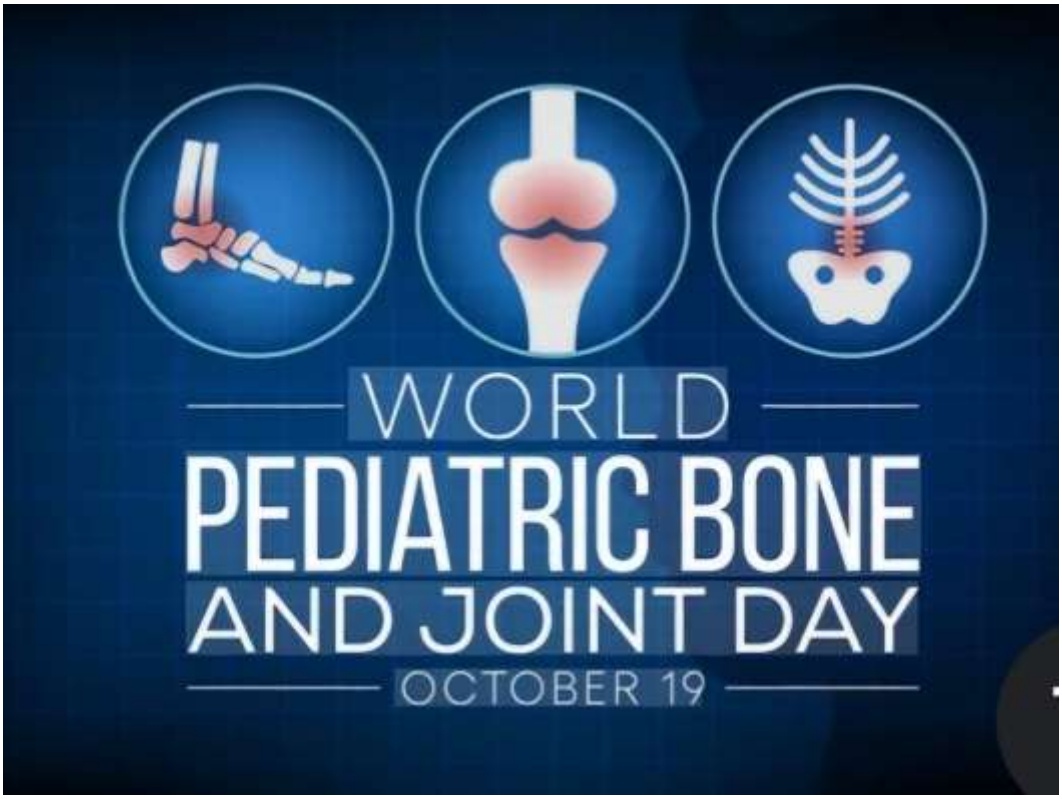

19 اکتوبر—بچوں کی ہڈیوں، جوڑوں اور پٹھوں کی صحت کا عالمی دن۔

قارئین محترم؛ یہ دن 12 سے 20 اکتوبر تک منائے جانے والے ہڈی و جوڑ آگاہی ہفتے کی ایک اہم کڑی ہے، جس میں جوڑوں کے گٹھیا کا عالمی دن (12 اکتوبر)، ریڑھ کی ہڈی کا عالمی دن (16 اکتوبر)، اور ہڈیوں کے بھربھرے پن کا عالمی دن (20 اکتوبر) بھی شامل ہیں۔ (جس کا زکر میں اپنی کل کی پوسٹ میں مفصل طور پر کروں گا شکریہ (امان اللہ خان)

صبح سویرے کندھوں پر بھاری بستہ لادے، کمر جھکائے سکول کی طرف بڑھتا ہوا ننھا بچہ ہمارے گلی محلوں کا ایک عام منظر ہے، مگر کم ہی لوگ سوچتے ہیں کہ یہ بوجھ اس کی نازک ہڈیوں پر کیا اثر ڈال رہا ہے۔ ایسی ہی بے شمار اَن دیکھی تکالیف کی طرف توجہ دلانے کے لیے دنیا بھر میں ہر سال 19 اکتوبر کو بچوں کی ہڈیوں، جوڑوں اور پٹھوں کی صحت کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

ماہرینِ صحت بتاتے ہیں کہ بچپن ہڈیوں کی تعمیر کا سنہری دور ہے، کیونکہ انسان اپنی زندگی کی زیادہ سے زیادہ ہڈیوں کی مضبوطی کا تقریباً نوے فیصد حصہ لڑکیوں میں اٹھارہ اور لڑکوں میں بیس برس کی عمر تک حاصل کر لیتا ہے۔ گویا بچپن میں ہڈیوں کے کھاتے میں جو کچھ جمع ہو جائے، وہی عمر بھر کام آتا ہے، اور یہی وجہ ہے کہ ہڈیوں اور جوڑوں کے بہت سے امراض کی بنیاد اکثر بچپن ہی میں پڑ جاتی ہے۔

اس دن کا باقاعدہ آغاز 19 اکتوبر 2012ء کو امریکا سے ہوا، جب ہڈیوں اور جوڑوں کی صحت کے لیے سرگرم ایک امریکی قومی تنظیم کے شعبۂ اطفال نے شمالی امریکا میں بچوں کی ہڈیوں کے ماہرین کی انجمنوں کے اشتراک سے اس مہم کی بنیاد رکھی۔ چونکہ مقصد صرف امریکی بچوں تک محدود نہ تھا، اس لیے ہڈیوں اور پٹھوں کی صحت کے عالمی اتحاد اور دنیا بھر کی طبی انجمنوں نے جلد ہی اسے عالمی دن کی حیثیت دے دی۔

اس موقع پر ہسپتالوں، طبی جامعات اور فلاحی اداروں میں مذاکرے، تربیتی نشستیں اور آگاہی مہمات منعقد کی جاتی ہیں تاکہ والدین اور اساتذہ بچوں کی جسمانی نشوونما، متوازن غذا اور ورزش کی اہمیت سے آگاہ ہو سکیں۔

بچوں میں ہڈیوں کا سب سے عام مسئلہ ان کا ٹوٹنا ہے۔ تحقیق کے مطابق سولہ برس کی عمر تک تقریباً چالیس فیصد لڑکے اور ستائیس فیصد لڑکیاں کم از کم ایک بار کسی نہ کسی ہڈی کے ٹوٹنے کا سامنا کرتے ہیں۔ بچوں کی ہڈیاں لچک دار ہوتی ہیں اور جلد جڑ جاتی ہیں، مگر ہڈیوں کے سروں پر موجود نشوونما کے نرم مراکز کو لگنے والی چوٹ کا درست علاج نہ ہو تو عضو کی لمبائی اور ساخت متاثر ہو سکتی ہے۔ پیدائشی نقائص میں پاؤں کا اندر کی طرف مڑا ہونا، یعنی ٹیڑھا پاؤں، تقریباً ہر ایک ہزار میں سے ایک بچے میں پایا جاتا ہے، جبکہ کولہے کے جوڑ کی پیدائشی خرابی بروقت پکڑی نہ جائے تو عمر بھر کی لنگڑاہٹ چھوڑ جاتی ہے۔

والدین کے لیے یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ دو برس تک کی عمر میں ٹانگوں کا کمان کی طرح ہلکا سا باہر کو مڑنا اور تین چار برس کی عمر میں گھٹنوں کا آپس میں ٹکرانا اکثر قدرتی نشوونما کا حصہ ہوتا ہے، البتہ اگر یہ خم بڑھتا جائے یا ایک ٹانگ میں زیادہ ہو تو معائنہ لازم ہے۔ اس کے علاوہ بچوں کا گٹھیا، جس میں جوڑ چھ ہفتوں سے زیادہ سوجے اور دکھتے رہتے ہیں

؛پٹھوں کے بتدریج کمزور ہونے کی موروثی بیماری، جو زیادہ تر لڑکوں کو متاثر کرتی ہے؛ اور وٹامن ڈی و کیلشیم کی کمی سے ہونے والی سوکھے کی بیماری، جس میں ہڈیاں نرم ہو کر ٹیڑھی ہونے لگتی ہیں، بھی عام عوارض ہیں۔ بھاری بستے اور گھنٹوں برقی آلات کے سامنے جھک کر بیٹھنا کمر اور کندھوں کے درد اور بگڑی ہوئی جسمانی وضع کا باعث بنتے ہیں، تاہم ماہرین واضح کرتے ہیں کہ ریڑھ کی ہڈی کا پہلو کی جانب مستقل ٹیڑھا پن عموماً ان وجوہات سے پیدا نہیں ہوتا، اس لیے اس کی تشخیص کے لیے الگ سے طبی معائنہ ضروری ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق دنیا بھر میں ایک ارب ستر کروڑ سے زائد افراد ہڈیوں، جوڑوں اور پٹھوں کے کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا ہیں، اور ان میں سے بہت سے مسائل کی جڑیں بچپن تک جاتی ہیں۔ اسی ادارے کے مطابق دنیا کے تقریباً اسّی فیصد نوعمر روزانہ کی مطلوبہ جسمانی سرگرمی پوری نہیں کرتے، جو مستقبل کی کمزور ہڈیوں کی واضح علامت ہے۔ ان عوارض کی نوعیت امیر اور غریب ملکوں میں مختلف ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں کھیل کی چوٹیں، حادثات اور جسمانی سستی سے جنم لینے والا موٹاپا بڑے مسائل ہیں، جبکہ ترقی پذیر ملکوں، بالخصوص جنوبی ایشیا اور افریقہ کے پسماندہ خطوں میں غربت، ناقص غذا، دورانِ حمل ماں کی صحت سے غفلت اور علاج تک محدود رسائی کے باعث سوکھے کی بیماری اور پیدائشی نقائص کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ٹیڑھے پاؤں کے ساتھ پیدا ہونے والے تقریباً اسّی فیصد بچے کم اور متوسط آمدنی والے ملکوں میں جنم لیتے ہیں، جہاں علاج نہ ملنے کی صورت میں یہ مکمل طور پر قابلِ علاج نقص عمر بھر کی معذوری میں بدل جاتا ہے۔

پاکستان میں یہ صورتحال اور بھی تشویش ناک ہے۔ قومی غذائی جائزہ 2018ء کے مطابق پانچ برس سے کم عمر کے تقریباً تریسٹھ فیصد بچوں میں وٹامن ڈی کی کمی پائی گئی، جبکہ تقریباً چالیس فیصد بچے غذائی قلت کے باعث اپنی عمر کے لحاظ سے پست قد ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ سال بھر دھوپ سے بھرپور اس ملک میں بھی گھروں کے اندر محدود زندگی، جسم کو پوری طرح ڈھانپنے والے لباس اور خصوصاً پنجاب کے میدانی شہروں میں سردیوں کی زہریلی دھند کی وجہ سے بچے سورج کی شعاعوں سے پورا فائدہ نہیں اٹھا پاتے۔ مقامی تحقیقات میں سکول جانے والے بچوں کی بڑی تعداد میں کمر اور کندھوں کے درد کی نشاندہی ہوئی ہے، کیونکہ اکثر بستوں کا وزن بچے کے اپنے وزن کے دس فیصد کی محفوظ حد سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔

ملک میں ہر سال ساٹھ لاکھ سے زائد بچوں کی پیدائش کے پیشِ نظر ہزاروں بچے ٹیڑھے پاؤں کے ساتھ جنم لیتے ہیں؛ اس کا بغیر آپریشن، پلستر اور مخصوص جوتوں کے ذریعے مؤثر علاج متعدد سرکاری اور فلاحی مراکز میں دستیاب ہے، مگر دیہات میں آگاہی کی کمی کے باعث بہت سے بچے بروقت وہاں نہیں پہنچ پاتے۔ ایک اور سنگین مسئلہ ٹوٹی ہڈیوں کے لیے غیر تربیت یافتہ دیسی ہڈی جوڑوں سے رجوع کرنا ہے، جن کی حد سے زیادہ کسی ہوئی پٹیاں اکثر ہڈی کے ٹیڑھا جڑنے، پٹھوں کے سکڑنے اور بعض اوقات عضو کاٹنے تک کی نوبت لے آتی ہیں۔

اسی طرح پاکستان دنیا کے ان دو ملکوں میں شامل ہے جہاں پولیو کا جرثومہ اب بھی گردش میں ہے، اور یہ مرض بچوں کے اعضا کو عمر بھر کے لیے مفلوج اور کمزور کر سکتا ہے۔ اگرچہ لاہور، کراچی اور اسلام آباد کے بڑے سرکاری ہسپتالوں میں بچوں کی ہڈیوں کے علاج کے خصوصی شعبے کام کر رہے ہیں، لیکن دیہی علاقوں میں ایسی سہولیات اب بھی بہت محدود ہیں۔

اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے حکومت، معاشرے اور خاندان سب کو اپنا کردار ادا کرنا ہو گا۔ مضبوط ہڈیوں کا سفر بچے کی پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے، اس لیے حاملہ ماؤں کی خوراک میں کیلشیم اور وٹامن ڈی کو یقینی بنایا جائے اور نوزائیدہ بچوں کو معالج کے مشورے سے وٹامن ڈی کے قطرے دیے جائیں۔ بچوں کو روزانہ دودھ، دہی، انڈے، دالیں اور سبز پتوں والی سبزیاں کھلائی جائیں اور انہیں روزانہ کچھ دیر دھوپ میں کھیلنے کا موقع دیا جائے، البتہ شدید گرمی میں احتیاط برتی جائے

۔

عالمی ادارۂ صحت کی سفارش ہے کہ پانچ سے سترہ برس کے بچے روزانہ کم از کم ساٹھ منٹ بھاگ دوڑ اور کھیل کود کریں، اس لیے انہیں برقی آلات سے ہٹا کر کھلے میدانوں کی طرف لانا ہو گا۔ سکولوں میں بستے کا وزن بچے کے اپنے وزن کے دس فیصد تک محدود رکھنے کے واضح ضابطے بنائے جائیں، دونوں کندھوں پر اٹھائے جانے والے بستوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ہر سال بچوں کا باقاعدہ طبی معائنہ ہو تاکہ ریڑھ کی ہڈی کے خم یا پاؤں کے نقائص ابتدا ہی میں پکڑے جا سکیں۔ نوزائیدہ بچوں میں کولہے اور پاؤں کی جانچ کو معمول بنایا جائے، دیہات میں کام کرنے والی خواتین صحت کارکنان کو ان نقائص کی پہچان کی تربیت دی جائے، ٹوٹی ہڈی کے لیے اتائیوں کے بجائے مستند معالج سے رجوع کیا جائے اور پولیو کے قطرے ہر مہم میں لازماً پلائے جائیں۔

یاد رکھیے، آج کے بچوں کی مضبوط ہڈیاں ہی کل کی صحت مند اور توانا قوم کی ضمانت ہیں



ناپسند کرنے والوں کے سامنے خوش رہیں

جو آپ کو پسند نہیں کرتے، ان کے سامنے خوش رہیں — یہی ان کے لیے

سب سے بڑا جواب ہے۔

"آئینہ خیال و عکس زمانہ "کا ایک ورق

زندگی کے سفر میں اپ کا اکثر ایسے لوگوں سے واسطہ بھی پڑتا ہے جن کی نگاہوں میں اپ کی کامیابی کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے اور جن کے لبوں پر اپ کی خوشی کا ذکر آتے ہی تلخی اتر آتی ہے۔ایسے لحات میں انسان کے سامنے دو راستے ہوتے ہیں: یا تو وہ ان کی ناپسندیدگی کو اپنے دل کا بوجھ بنالے اور تلخی کا جواب تلخی سے دے، یا پھر وقار اور تحمل کا دامن تھام کر مسکراہٹ کو اپنا شعار بنا لے۔ دانش مند وہی ہے جو یہ راز جان لے کہ حسد اور بغض کی آگ کو ایندھن اپ کی بے چینی سے ملتا ہے۔جب اپ پُر سکون اور شاد رہتے ہیں تو یہ آگ اپنے ہی شعلوں میں جل کر راکھ ہو جاتی ہے۔ایک خاموش اور باوقار مسکراہٹ دراصل وہ مدلل جواب ہے جس کی کوئی تردید ممکن نہیں۔



۔ڈویلپمنٹل لینگویج ڈس آرڈر (DLD) اگاہی دن-"بچہ دیر سے بولتا ہے" انتظار نہیں، توجہ دیجیے"! بچوں کا وہ پوشیدہ عارضہ جسے ہم اکثر شرارت یا نالائقی سمجھ بیٹھتے ہیں. والدین کے لئے ایک لمحہ فکریہ

یہ تحریر عمومی آگاہی کے لیے ہے۔ کسی بچے کی تشخیص اور علاج کے لیے مستند ماہر سے رجوع کریں۔ شکریہ -امان اللہ خان

ہمارے اسکولوں کی تقریباً ہر جماعت میں ایک دو ایسے بچے ضرور ہوتے ہیں جو استاد کی بات پوری طرح سمجھ نہیں پاتے، سوال کا جواب دیتے ہوئے الفاظ ڈھونڈتے رہ جاتے ہیں، یا کوئی واقعہ سناتے ہوئے بات کا سرا کھو بیٹھتے ہیں۔ دیکھنے میں وہ بالکل عام بچوں جیسے ہوتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں، دوست بناتے ہیں، اس لیے گھر والے اور اساتذہ اکثر یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بچہ سست ہے، توجہ نہیں دیتا یا جان بوجھ کر شرارت کرتا ہے۔ کبھی ڈانٹ پڑتی ہے، کبھی دوسرے بچوں سے موازنہ ہوتا ہے، اور رفتہ رفتہ بچہ خود بھی یہ ماننے لگتا ہے کہ وہ "کمزور" ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسے بہت سے بچے ایک ایسے عارضے کا سامنا کر رہے ہوتے ہیں جس کا نام بھی ہمارے ہاں کم ہی لوگوں نے سنا ہے: ڈویلپمنٹل لینگویج ڈس آرڈر، یعنی زبان کی نشوونما کا عارضہ، جسے مختصراً ڈی ایل ڈی (DLD) کہا جاتا ہے۔

ڈی ایل ڈی ایک دیرپا اعصابی نشوونما کی کیفیت (Neurodevelopmental Condition) ہے جس میں بچے کو زبان سیکھنے، سمجھنے اور استعمال کرنے میں مستقل اور نمایاں دشواری رہتی ہے۔ ایسے بچوں کو الفاظ ڈھونڈنے، جملے بنانے، گرامر درست رکھنے، کہانی یا واقعہ ترتیب سے بیان کرنے اور دوسروں کی ہدایات سمجھ کر ان پر عمل کرنے میں مشکل پیش آتی ہے۔ یہ مسئلہ صرف بول چال تک محدود نہیں رہتا بلکہ آگے چل کر پڑھنے لکھنے، امتحانات، دوستیوں اور خود اعتمادی تک کو متاثر کرتا ہے۔ ڈی ایل ڈی کوئی ایسی بیماری نہیں جو دوا سے ختم ہو جائے؛ یہ عموماً عمر بھر ساتھ رہنے والی کیفیت ہے، لیکن اچھی خبر یہ ہے کہ بروقت پہچان اور مناسب مدد سے اس کے اثرات بہت حد تک کم کیے جا سکتے ہیں۔

اسی پوشیدہ عارضے کی طرف توجہ دلانے کے لیے ہر سال اکتوبر کے وسط میں دنیا بھر میں "ڈی ایل ڈی آگاہی دن (DLD Awareness Day)" منایا جاتا ہے۔ اس دن کی کوئی ایک مستقل تاریخ مقرر نہیں بلکہ ہر سال اکتوبر میں اس کی تاریخ کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اس مہم کا آغاز RADLD (Raising Awareness of Developmental Language Disorder) نامی بین الاقوامی رضاکار گروپ نے کیا، جس میں محققین، اسپیچ تھراپسٹ، اساتذہ اور متاثرہ خاندان شامل ہیں۔ پہلا ڈی ایل ڈی آگاہی دن 22 ستمبر 2017 کو منایا گیا، بعد میں اسے اکتوبر میں منتقل کر دیا گیا، اور چند ہی برسوں میں یہ ایک چھوٹی مہم سے بڑھ کر دنیا کے بہت سے ممالک میں منایا جانے والا دن بن گیا، جس پر اسکولوں، اسپتالوں، جامعات اور سوشل میڈیا پر آگاہی پروگرام منعقد کیے جاتے ہیں۔

"ڈی ایل ڈی" کا نام بھی نسبتاً نیا ہے۔ اس سے پہلے اس کیفیت کو (Specific Language Impairment (SLI ، لینگویج ڈیلے اور کئی دوسرے ناموں سے پکارا جاتا تھا، جس کی وجہ سے والدین، اساتذہ اور حتیٰ کہ ماہرین میں بھی الجھن پائی جاتی تھی۔ 2016 اور 2017 میں برطانوی ماہرین کی قیادت میں ہونے والی ایک بین الاقوامی مشاورت (CATALISE) کے بعد "ڈویلپمنٹل لینگویج ڈس آرڈر" کی اصطلاح پر اتفاق ہوا۔ آگاہی دن کا ایک بڑا مقصد اسی واضح اور یکساں نام کو عام کرنا بھی ہے، کیونکہ جس مسئلے کا نام ہی معلوم نہ ہو، اس کی پہچان اور علاج بھی مشکل ہو جاتا ہے

عالمی تحقیق کے مطابق ڈی ایل ڈی بچوں میں پائے جانے والے عام ترین نشو و نما کے مسائل میں سے ایک ہے۔ برطانیہ میں اسکول جانے والے بچوں پر ہونے والی ایک بڑی تحقیق کے مطابق تقریباً ساڑھے سات فیصد بچے اس سے متاثر ہوتے ہیں، یعنی ہر 14 میں سے لگ بھگ ایک بچہ۔ آسان الفاظ میں، 30 بچوں کی ہر جماعت میں اوسطاً دو بچے ایسے ہو سکتے ہیں جنہیں زبان سمجھنے اور استعمال کرنے میں فطری طور پر دشواری ہے۔ یہ شرح آٹزم سے کئی گنا زیادہ ہے، مگر آٹزم کے برعکس ڈی ایل ڈی کا نام بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ چونکہ یہ عارضہ بچپن کے ساتھ ختم نہیں ہوتا، اس لیے بالغ افراد کی بھی ایک بڑی تعداد اس کے اثرات کے ساتھ زندگی گزار رہی ہوتی ہے، اگرچہ ان میں سے اکثر کی کبھی تشخیص ہی نہیں ہوئی ہوتی۔

پاکستان میں ڈی ایل ڈی کے بارے میں قومی سطح کا کوئی جامع سروے یا مستند اعداد و شمار موجود نہیں۔ تاہم اگر عالمی شرح ہی کو بنیاد بنایا جائے تو 2023 کی مردم شماری کے مطابق تقریباً 24 کروڑ آبادی والے ملک میں، جہاں ایک تہائی سے زیادہ آبادی 15 سال سے کم عمر ہے، صرف اس عمر کے 60 لاکھ سے زائد بچے اس عارضے سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ پنجاب، جس کی آبادی 12 کروڑ 77 لاکھ کے قریب ہے، میں یہ تعداد 30 لاکھ سے اوپر بنتی ہے۔ یہ محض اندازے ہیں، مگر یہ سمجھانے کے لیے کافی ہیں کہ مسئلہ کتنا وسیع ہے۔ بڑے شہروں میں بچوں کی نشو و نما کے مراکز اور اسپیچ تھراپی کلینکس سے وابستہ ماہرین بھی بتاتے ہیں کہ بولنے میں تاخیر اور زبان کے مسائل وہاں لائے جانے والے بچوں کی ایک نمایاں وجہ ہیں۔

ہمارے معاشرے میں دیر سے بولنے والے بچے کے بارے میں سب سے عام جملہ یہی سننے کو ملتا ہے کہ

"فکر نہ کرو، خود ہی بولنے لگے گا"،

یا

"اس کے ابا بھی تو دیر سے بولے تھے"۔

یہی سوچ قیمتی وقت ضائع کر دیتی ہے۔ پنجاب کے تناظر میں ایک اور پہلو بھی اہم ہے: یہاں بیشتر بچے گھر میں پنجابی، سرائیکی یا کوئی اور مادری زبان سنتے ہیں، اسکول میں اردو اور کتابوں میں انگریزی سے ان کا واسطہ پڑتا ہے۔ تحقیق واضح طور پر بتاتی ہے کہ ایک سے زیادہ زبانیں سیکھنا ڈی ایل ڈی کا سبب نہیں بنتا۔ جو بچہ صرف انگریزی یا کسی نئی زبان میں کمزور ہو مگر اپنی مادری زبان میں روانی سے بات کرتا ہو، اسے عموماً ڈی ایل ڈی نہیں ہوتا؛ اس کے برعکس ڈی ایل ڈی والا بچہ اپنی گھر کی زبان سمیت ہر زبان میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے تشخیص کے وقت بچے کی مادری زبان میں اس کی صلاحیت کو دیکھنا بہت ضروری ہے۔

ڈی ایل ڈی کی کوئی ایک واضح وجہ ابھی تک معلوم نہیں، لیکن تحقیق سے یہ ثابت ہے کہ اس میں موروثی (جینیاتی) عوامل کا بڑا کردار ہے اور یہ اکثر ایک ہی خاندان کے کئی افراد میں دیکھا جاتا ہے

۔ماہرین کے مطابق ایسے بچوں کے دماغ میں زبان سیکھنے والے نظام کی نشوونما میں معمولی فرق ہوتا ہے جو باہر سے نظر نہیں آتا۔ اتنا ہی اہم یہ جاننا ہے کہ یہ عارضہ کن وجوہات سے نہیں ہوتا: یہ والدین کی پرورش میں کمی، بچے کی سستی، کم عقلی، یا ایک سے زیادہ زبانیں بولنے کا نتیجہ نہیں۔ اسی طرح اگر زبان کی دشواری کسی واضح طبی وجہ، مثلاً سماعت کی کمی، دماغی چوٹ، ڈاؤن سنڈروم یا آٹزم سے جڑی ہو تو ماہرین اسے ڈی ایل ڈی کے بجائے اسی کیفیت سے منسلک لینگویج ڈس آرڈر قرار دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی بچے کی زبان کی جانچ سے پہلے اس کی سماعت کا ٹیسٹ ضرور کروایا جاتا ہے۔

ڈی ایل ڈی کی علامات ہر بچے میں مختلف ہوتی ہیں اور عمر کے ساتھ ان کی شکل بھی بدلتی رہتی ہے۔ اسکول جانے سے پہلے کی عمر میں ایسا بچہ عموماً دیر سے بولنا شروع کرتا ہے، اس کے الفاظ کا ذخیرہ ہم عمر بچوں سے کم ہوتا ہے، وہ سادہ ہدایات یا سوالات سمجھنے میں الجھتا ہے، جملے جوڑ نہیں پاتا، اور جب اپنی بات نہیں سمجھا پاتا تو شدید چڑچڑا پن یا غصہ دکھاتا ہے۔ پرائمری اسکول تک پہنچ کر یہی بچہ لمبی یا کئی مراحل پر مشتمل ہدایات یاد نہیں رکھ پاتا، کہانی یا دن بھر کی باتیں ترتیب سے نہیں سنا پاتا، نئے الفاظ دیر سے سیکھتا ہے اور اکثر پڑھنے لکھنے میں بھی پیچھے رہنے لگتا ہے۔

سیکنڈری اسکول کی عمر میں یہ مشکل پیچیدہ جملوں، محاوروں، تجریدی (Abstract) تصورات اور مضمون نویسی کی صورت اختیار کر لیتی ہے، اور بار بار کی ناکامی خود اعتمادی کی کمی، جماعت میں خاموشی یا بعض اوقات رویے کے مسائل کی شکل میں سامنے آتی ہے۔ بالغ عمر میں یہی دشواری ملازمت کے انٹرویو، دفتری خط و کتابت یا لمبی گفتگو میں محسوس ہو سکتی ہے۔۔

ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ بچے کے پانچ سال کا ہونے تک انتظار کرنا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ کچھ بچے محض "دیر سے بولنے والے (Late Talkers) "ہوتے ہیں جو وقت کے ساتھ ہم عمروں کے برابر آ جاتے ہیں، اور ڈی ایل ڈی کی باقاعدہ تشخیص عموماً چار پانچ سال کی عمر کے آس پاس اسی وقت کی جاتی ہے جب یہ واضح ہو جائے کہ مسئلہ برقرار ہے۔ لیکن جانچ اور مدد شروع کرنے کے لیے پانچ سال تک انتظار ضروری نہیں، بلکہ نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ اگر بچہ ڈیڑھ سال کی عمر تک کوئی بامعنی لفظ نہ بولے، دو سال کی عمر تک دو الفاظ ملا کر نہ بولے، تین سال کی عمر تک سادہ جملے نہ بنا سکے یا گھر والوں کے علاوہ دوسروں کی سمجھ میں نہ آئے، یا کسی بھی عمر میں سیکھے ہوئے الفاظ بولنا چھوڑ دے، تو بلا تاخیر سماعت کا ٹیسٹ کروانا اور کسی اسپیچ اینڈ لینگویج تھراپسٹ (SLT) یا بچوں کے ماہر نشوونما سے رجوع کرنا چاہیے۔ ابتدائی مدد (Early Intervention) جتنی جلد شروع ہو، نتائج اتنے ہی بہتر ہوتے ہیں۔

ڈی ایل ڈی کو اکثر آٹزم یا لکنت کے ساتھ ملا دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ الگ الگ کیفیات ہیں۔ ڈی ایل ڈی کا تعلق بنیادی طور پر زبان سیکھنے، سمجھنے اور استعمال کرنے سے ہے، جبکہ آٹزم ایک وسیع تر کیفیت ہے جو بچے کے سماجی رابطے، رویوں اور دنیا کو محسوس کرنے کے انداز کو متاثر کرتی ہے

۔ڈی ایل ڈی کا شکار بچہ دوسروں سے جڑنا چاہتا ہے؛ الفاظ ساتھ نہ دیں تو وہ اشاروں، چہرے کے تاثرات اور آنکھوں کے رابطے (Eye Contact) سے اپنی بات سمجھانے کی کوشش کرتا ہے، اور اس کی دلچسپیاں عام بچوں جیسی ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس آٹزم میں آنکھیں ملانا، دوسروں کے جذبات سمجھنا اور سماجی طور پر گھلنا ملنا مشکل ہوتا ہے، اور اکثر دہرائے جانے والے مخصوص رویے (جیسے ہاتھ ہلانا یا کھلونوں کو قطار میں لگانا)، کسی ایک موضوع یا چیز سے غیر معمولی لگاؤ، اور تیز آواز، روشنی یا لمس جیسی حسیاتی چیزوں پر شدید ردعمل دیکھنے میں آتا ہے۔ ڈی ایل ڈی میں یہ رویے عام طور پر نہیں پائے جاتے۔

لکنت یا ہکلاہٹ (Stammering / Stuttering) کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کا تعلق زبان سے نہیں بلکہ بولنے کی روانی (Fluency) سے ہے۔ لکنت والا شخص بات پوری طرح سمجھتا ہے اور جانتا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے، لیکن بولتے وقت کوئی آواز یا لفظ بار بار دہرایا جاتا ہے، کھنچ جاتا ہے یا اٹک جاتا ہے۔ اسی طرح توتلا پن، یعنی کچھ آوازوں کا درست تلفظ نہ کر پانا (مثلاً "روٹی" کو "لوٹی" کہنا)، آوازوں کی ادائیگی (Speech Sound) کا مسئلہ ہے، زبان کا نہیں۔ مختصراً، ڈی ایل ڈی "کیا کہنا ہے اور بات کو کیسے سمجھنا ہے" کی دشواری ہے، جبکہ لکنت اور توتلا پن "بات کو کیسے ادا کرنا ہے" کی۔ بعض بچوں میں یہ مسائل ایک ساتھ بھی موجود ہو سکتے ہیں، کیونکہ سب کا تعلق دماغ کے بول چال سے متعلق نظام سے ہے، اسی لیے درست تشخیص صرف تربیت یافتہ ماہر ہی کر سکتا ہے۔

بچے کی زبان کی نشوونما میں سب سے بڑا کردار گھر کا ہے، اور اس کے لیے کسی مہنگے سامان کی ضرورت نہیں۔ بچے سے بات کرتے وقت چھوٹے اور سادہ جملے بولیں، اور سوال پوچھنے کے بعد اسے جواب سوچنے کے لیے اضافی وقت دیں؛ جلد بازی کرنا یا اس کی جگہ خود جواب دے دینا اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔ اگر بچہ غلط جملہ بولے، مثلاً "میں نے اسکول گیا"، تو اسے ٹوکنے یا ڈانٹنے کے بجائے پیار سے درست جملہ دہرا دیں: "اچھا، آپ اسکول گئے تھے؟" اس طرح بچہ درست زبان سنتا ہے مگر شرمندہ نہیں ہوتا۔ بات چیت میں ہاتھ کے اشاروں، تصویروں اور اصل چیزوں کا سہارا لیں، روزمرہ کاموں جیسے کھانا پکانے، بازار جانے یا کھیلنے کے دوران چیزوں اور کاموں کے نام لیں، اور روزانہ کچھ وقت بچے کے ساتھ تصویری کتاب دیکھنے یا کہانی سنانے میں گزاریں۔

والدین کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ موبائل فون اور ٹی وی، چاہے ان پر تعلیمی مواد ہی کیوں نہ ہو، آمنے سامنے کی بات چیت کا متبادل نہیں ہو سکتے۔ گھر میں اپنی مادری زبان بولنا ترک نہ کریں؛ بچے کے لیے وہی زبان سب سے بہتر ہے جس میں والدین خود روانی اور اپنائیت سے بات کر سکیں۔ بچے کا موازنہ بہن بھائیوں یا دوسرے بچوں سے نہ کریں اور اس کی چھوٹی چھوٹی کامیابیوں کو سراہیں۔ تھراپی شروع ہو جائے تو اس میں خود بھی شریک ہوں، کیونکہ تھراپسٹ سے سیکھے ہوئے طریقے جب گھر میں روزانہ دہرائے جاتے ہیں تو بچے کی ترقی کہیں تیز ہو جاتی ہے۔

ڈی ایل ڈی والا بچہ دن کا بڑا حصہ اسکول میں گزارتا ہے، اس لیے استاد کا رویہ صرف اس کی تعلیم ہی نہیں بلکہ اس کی خود اعتمادی کا بھی فیصلہ کرتا ہے۔ ہمارے سرکاری اسکولوں میں، جہاں جماعتیں بڑی ہوتی ہیں اور اساتذہ کو زبان اور سیکھنے کی مشکلات کی پہچان کی کوئی خاص تربیت نہیں دی جاتی، ایسے بچوں کو انفرادی توجہ دینا واقعی ایک بڑا چیلنج ہے، اور اس کے لیے اس شعبے میں تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت ہے۔

اس کے باوجود چند سادہ طریقے ایسے ہیں جو کوئی بھی استاد بغیر اضافی خرچ کے اپنا سکتا ہے۔ لمبی ہدایات ایک ساتھ دینے کے بجائے کام کو چھوٹے چھوٹے مراحل میں تقسیم کر کے بتائیں اور ہر مرحلے کے بعد تسلی کر لیں کہ بچہ بات سمجھ گیا ہے۔ ٹائم ٹیبل، تصاویر اور چارٹس کا استعمال کریں تاکہ بچے کو روزمرہ کے معمولات اور اسباق سمجھنے کے لیے صرف زبانی بات پر انحصار نہ کرنا پڑے۔ سبق کے نئے اور اہم الفاظ بار بار دہرائیں اور مثالوں سے ان کا مطلب واضح کریں۔ ایسے بچے کو اپنے قریب بٹھائیں، اسے پوری جماعت کے سامنے بولنے پر مجبور نہ کریں جس سے اس کا اعتماد مجروح ہو، بلکہ اس کی چھوٹی چھوٹی کوششوں پر بھی حوصلہ افزائی کریں۔ والدین اور استاد کا باہمی رابطہ اس سارے عمل کو کئی گنا مؤثر بنا دیتا ہے۔

ڈی ایل ڈی کا کوئی دوائی علاج موجود نہیں۔ اس کا بنیادی علاج اسپیچ اینڈ لینگویج تھراپی ہے، جس میں ماہر تھراپی بچے کے الفاظ کے ذخیرے، جملوں کی بناوٹ، سمجھنے کی صلاحیت اور بات چیت کی مہارتوں پر کام کرتا ہے، اور ساتھ ہی والدین کی رہنمائی اور اسکول کے تعاون سے بچے کے لیے موزوں ماحول بنایا جاتا ہے۔ بعض اداروں میں ہر بچے کی صلاحیت کے مطابق انفرادی تعلیمی منصوبہ (Individualized Education Plan – IEP) بنایا جاتا ہے، جس میں اس کے لیے الگ اہداف اور سیکھنے کی رفتار طے کی جاتی ہے۔

پاکستان میں حالیہ برسوں میں اس شعبے میں مثبت پیش رفت ہوئی ہے۔ کراچی، لاہور، اسلام آباد، راولپنڈی، فیصل آباد اور ملتان جیسے بڑے شہروں کے سرکاری و نجی اسپتالوں میں اسپیچ اینڈ لینگویج پیتھالوجسٹس (SLPs) کی خدمات دستیاب ہیں۔ لاہور میں چلڈرن ہسپتال اور یونیورسٹی آف چائلڈ ہیلتھ سائنسز جیسے سرکاری ادارے بچوں کی نشوونما سے متعلق مسائل کی تشخیص کا اہم مرکز ہیں۔ ماہرین کی کمی پوری کرنے کے لیے رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، یونیورسٹی آف لاہور اور کراچی کی ضیاء الدین یونیورسٹی سمیت متعدد جامعات اب اسپیچ اینڈ لینگویج پیتھالوجی میں باقاعدہ ڈگریاں کروا رہی ہیں۔

سرکاری سطح پر حکومتِ پنجاب کا محکمہ خصوصی تعلیم (Special Education Department) صوبے کے تمام اضلاع میں خصوصی تعلیم کے اسکول اور مراکز چلاتا ہے، جہاں مفت تعلیم، کتابیں اور ٹرانسپورٹ جیسی سہولیات فراہم کی جاتی ہیں۔ تاہم یہ ادارے زیادہ تر بصارت، سماعت، جسمانی اور ذہنی معذوری کے شکار بچوں کے لیے ہیں، اور ڈی ایل ڈی جیسے زبان کے عوارض کو عموماً الگ زمرے کے طور پر نہیں دیکھا جاتا، اس لیے اس عارضے کے شکار بیشتر بچے عام اسکولوں میں کسی خصوصی مدد کے بغیر پڑھ رہے ہوتے ہیں

۔پالیسی کی سطح پر آئین کا آرٹیکل 25 A-پانچ سے سولہ سال تک کے ہر بچے کو مفت اور لازمی تعلیم کا حق دیتا ہے، پاکستان 2011 میں معذور افراد کے حقوق سے متعلق اقوامِ متحدہ کے کنونشن (UNCRPD) کی توثیق کر چکا ہے، اور پنجاب کی خصوصی تعلیم پالیسی 2020 اور معذور افراد کے حقوق سے متعلق ایکٹ 2022 شمولیتی تعلیم (Inclusive Education) پر زور دیتے ہیں۔ اگر ڈی ایل ڈی کو ان پالیسیوں کے دائرے میں واضح طور پر شامل کر لیا جائے تو لاکھوں بچوں کو اسکول کی سطح پر مدد مل سکتی ہے۔

نجی شعبے میں لاہور میں کئی ادارے ایسے ہیں جو ڈی ایل ڈی، ڈسلیکسیا (Dyslexia)، یعنی پڑھنے لکھنے کی دشواری) اور سیکھنے کی دیگر مشکلات کے شکار بچوں کے لیے اسپیچ تھراپی، انفرادی تعلیمی منصوبے اور شمولیتی تعلیم کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ ان میں جوہر ٹاؤن کا OTM Inclusive Setup اولیوٹری مونٹیسوری) شامل ہے، جو بولنے، سیکھنے اور پڑھنے میں دشواری والے بچوں کو انفرادی تعلیمی منصوبے اور اسپیچ تھراپی کی خدمات دیتا ہے؛ فیصل ٹاؤن کا SLI (Sen Learning Institute)، جو بچوں کو عمر کے مطابق جماعتوں میں بول چال اور دیگر مہارتوں پر کام کروا کر عام اسکولوں کے لیے تیار کرتا ہے؛ کیولری گراؤنڈ کا Impact For Kids، جو زبان اور الفاظ کی پہچان بہتر بنانے کے لیے ملٹی سینسری (Multisensory) طریقے استعمال کرتا ہے؛ اور Rising Sun Institute for Special Children، جو ڈی ایچ اے سمیت کئی کیمپسز کے ساتھ لاہور کے بڑے نیٹ ورکس میں شمار ہوتا ہے اور اسپیچ تھراپی، بحالی اور خصوصی تعلیم کی سہولیات رکھتا ہے۔ یہ فہرست صرف رہنمائی کے لیے ہے؛ والدین کسی بھی ادارے سے رجوع کرنے سے پہلے اس کی خدمات، ماہرین کی اہلیت اور فیس کے بارے میں خود تصدیق کر لیں۔

جو والدین اور اساتذہ مزید پڑھنا چاہیں، ان کے لیے انٹرنیٹ پر انگریزی زبان میں (radld.org) RADLD اور DLD and Me (dldandme.org) جیسی ویب سائٹس مفید معلومات، مختصر ویڈیوز اور تدریسی رہنمائی فراہم کرتی ہیں، جبکہ Moor House Research Institute کی ویب سائٹ پر تدریسی حکمتِ عملیوں سے متعلق تفصیلی مواد موجود ہے۔

ان مثبت کوششوں کے باوجود پاکستان میں ڈی ایل ڈی کے حوالے سے سب سے بڑا چیلنج عوامی شعور کی کمی ہے۔ اسپیچ تھراپی کی سہولیات زیادہ تر بڑے شہروں اور نجی شعبے تک محدود ہیں، جہاں فیس عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہوتی ہے، جبکہ دیہی اور دور دراز علاقوں میں یہ سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ آبادی کے لحاظ سے تربیت یافتہ ماہرین کی تعداد بہت کم ہے، سرکاری اسکولوں میں بچوں کی زبان کی جانچ کا کوئی نظام نہیں، اور اردو، پنجابی یا سرائیکی جیسی مقامی زبانوں میں معیاری تشخیصی ٹیسٹ بھی بہت محدود ہیں۔ قومی سطح پر اعداد و شمار نہ ہونے کی وجہ سے یہ مسئلہ پالیسی سازوں کی ترجیحات میں بھی جگہ نہیں بنا پاتا۔

اس صورتحال میں چند عملی اقدامات بڑا فرق ڈال سکتے ہیں۔ لیڈی ہیلتھ ورکرز کے گھریلو دوروں اور بنیادی مراکزِ صحت میں بچوں کی زبان کی نشوونما کے سنگِ میل (Milestones) کی سادہ جانچ شامل کی جا سکتی ہے، اور اسکول میں داخلے کے وقت بچوں کی زبان اور سماعت کی ابتدائی اسکریننگ کی جا سکتی ہے۔ قائداعظم اکیڈمی برائے تعلیمی ترقی (QAED) کے اساتذہ کے تربیتی پروگراموں میں زبان اور سیکھنے کی مشکلات کی پہچان کا باب شامل کیا جا سکتا ہے۔ ضلعی اور تحصیل ہیڈ کوارٹر اسپتالوں میں اسپیچ تھراپسٹ کی آسامیاں، آن لائن تھراپی (Tele-therapy) کی سہولت، مقامی زبانوں میں تشخیصی ٹولز کی تیاری اور قومی سطح پر تحقیق، یہ سب وہ اقدامات ہیں جن سے دیہی پنجاب کے بچے بھی اس دھارے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ میڈیا، سول سوسائٹی اور کمیونٹی تنظیمیں والدین تک یہ پیغام پہنچانے میں اہم کردار ادا کر سکتی ہیں کہ دیر سے بولنے والے بچے کو نظر انداز کرنا دراصل اس کے مستقبل کو داؤ پر لگانا ہے۔

ڈی ایل ڈی کو جڑ سے ختم تو نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ یہ عموماً عمر بھر کا ساتھ ہے، لیکن اسے بچے کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کی اجازت بھی نہیں دی جانی چاہیے۔ اگر ابتدائی عمر ہی میں بچے کی پہچان ہو جائے، اسے مناسب تھراپی ملے، اور گھر اور اسکول دونوں جگہ اسے سمجھنے والے لوگ موجود ہوں، تو یہی بچے تعلیم مکمل کرتے ہیں، روزگار حاصل کرتے ہیں اور ایک کامیاب اور بھرپور زندگی گزارتے ہیں۔ ڈی ایل ڈی آگاہی دن ہمیں یہی یاد دلاتا ہے کہ جماعت کا وہ خاموش بچہ نالائق نہیں، اسے بس سمجھے جانے کی ضرورت ہے۔



17 اکتوبر-غربت کے خاتمے کا عالمی دن۔

(سب کے لئے محفوظ چھت: غربت کے خاتمے کے لئے

پاکستان اور حکومت پنجاب کا سفر)

ہر سال 17 اکتوبر کو دنیا بھر میں غربت کے خاتمے کا عالمی دن (International Day for the Eradication of Poverty) منایا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد غربت کے بارے میں عالمی سطح پر شعور اجاگر کرنا، غربت میں زندگی گزارنے والے کروڑوں انسانوں کی ہمت اور جدوجہد کو خراجِ تحسین پیش کرنا، اور حکومتوں، اداروں اور معاشرے کو اس کے خاتمے کے لیے عملی اقدامات پر آمادہ کرنا ہے۔

یہ دن اقوامِ متحدہ کے پائیدار ترقیاتی اہداف میں سے پہلے ہدف (SDG 1: غربت کا خاتمہ) سے براہِ راست جڑا ہوا ہے، جس کا عزم 2030 تک ہر جگہ اور ہر صورت میں غربت کا خاتمہ ہے۔ اقوامِ متحدہ اس وقت غربت کے خاتمے کی تیسری دہائی (2018–2027) بھی منا رہا ہے، جو اس حقیقت کی یاد دہانی ہے کہ یہ ہدف ابھی پوری طرح حاصل نہیں ہو سکا

اس دن کی تاریخ 17 اکتوبر 1987 سے شروع ہوتی ہے، جب ATD فورتھ ورلڈ (ATD Fourth World) کے بانی فادر جوزف ریسنسکی (Joseph Wresinski) کی پکار پر ایک لاکھ سے زائد افراد پیرس کے ٹروکاڈیرو (Trocadéro) میں جمع ہوئے—وہی مقام جہاں 1948 میں انسانی حقوق کا عالمی منشور منظور کیا گیا تھا۔ اس اجتماع نے انتہائی غربت کو انسانی حقوق کی خلاف ورزی قرار دیا، اور وہاں نصب کیے گئے یادگاری پتھر پر یہ پیغام کندہ کیا گیا کہ جہاں بھی انسان انتہائی غربت میں زندگی گزارنے پر مجبور ہوں، وہاں انسانی حقوق پامال ہوتے ہیں، اور ان حقوق کے احترام کے لیے متحد ہونا ہمارا مقدس فریضہ ہے۔ بعد ازاں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 22 دسمبر 1992 کو قرارداد 47/196 کے ذریعے اس دن کو باضابطہ طور پر عالمی دن قرار دیا۔

سال 2026 کے لیے اس دن کا موضوع "سب کے لیے محفوظ گھر (Safe Homes for All)" ہے، جو 2026 سے 2028 تک کے مجموعی موضوع "امن اور انسانی حقوق کے لیے متحد (United for Peace and Human Rights)" کا حصہ ہے، اور اس سال اقوامِ متحدہ کی مرکزی تقریب 16 اکتوبر کو نیویارک میں اقوامِ متحدہ کے ہیڈ کوارٹر میں منعقد ہو رہی ہے۔ اس موضوع کی بنیاد یہ تصور ہے کہ مناسب اور محفوظ گھر محض ایک آسائش نہیں بلکہ انسانی وقار، تحفظ اور سماجی شمولیت کی بنیاد ہے۔ اس وقت دنیا میں 2.8 ارب سے زائد افراد کسی نہ کسی صورت میں ناکافی یا ناموزوں رہائش کا سامنا کر رہے ہیں، اور اس کا سب سے بھاری بوجھ غربت اور سماجی محرومی کے شکار طبقات اٹھاتے ہیں۔ محفوظ اور مستقل گھر کے بغیر صحت، تعلیم، روزگار اور سماجی زندگی تک رسائی انتہائی مشکل ہو جاتی ہے، جبکہ غیر محفوظ، مہنگی اور گنجان رہائش غربت اور محرومی کو مزید گہرا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محفوظ رہائش کی فراہمی SDG 1 کے ساتھ ساتھ) SDG 10 عدم مساوات میں کمی(، SDG 11 پائیدار شہر اور بستیاں)اور) SDG 16 امن، انصاف اور مضبوط ادارے) کے حصول میں بھی کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔ اسی ماہ کے آغاز میں منائے گئے عالمی یومِ سکونت (World Habitat Day) کا موضوع "سب کے لیے مناسب رہائش (Adequate Housing for All)" بھی اسی پیغام کی تائید کرتا ہے۔

اس موضوع (THEME) کے تحت اقوامِ متحدہ نے 2026 کے لیے تین بنیادی ترجیحات مقرر کی ہیں۔

پہلی ترجیح محفوظ رہائش کو انسانی حقوق کی ترجیح بنانا ہے، یعنی مناسب رہائش کے حق کا احترام اور تحفظ کیا جائے اور عوامی پالیسیوں اور بجٹ میں باوقار معیارِ زندگی کو مناسب مقام دیا جائے

۔ دوسری ترجیح متاثرہ افراد کی شمولیت ہے، جس کے مطابق غربت اور رہائشی محرومی کے شکار لوگوں کو محض رسمی مشاورت تک محدود رکھنے کے بجائے ہاؤسنگ پالیسیوں کی تیاری، نفاذ اور جائزے میں براہِ راست شریک کیا جائے۔

تیسری ترجیح وسائل کو متحرک کرنا ہے، تاکہ عوامی فنڈنگ اور دیگر ذرائع کو مضبوط بنا کر محفوظ اور سستی رہائش تک رسائی بڑھائی جاسکے اور کوئی بھی پیچھے نہ رہ جائے

۔یہ ترجیحات دوحہ سیاسی اعلامیے (A/RES/80/5) پر استوار ہیں، جو نومبر 2025 میں دوحہ (قطر) میں منعقدہ سماجی ترقی کے دوسرے عالمی سربراہی اجلاس کے نتیجے میں اپنایا گیا۔ یہ اعلامیہ مناسب معیارِ زندگی کے حق کی توثیق کرتا ہے، جس میں محفوظ، قابلِ رسائی اور سستی رہائش کے ساتھ ساتھ پینے کا صاف پانی اور صفائی ستھرائی کی سہولیات بھی شامل ہیں۔

پاکستان کے تناظر میں یہ موضوع غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ آئینِ پاکستان کا آرٹیکل 38 ریاست کو پابند کرتا ہے کہ وہ روزی کمانے سے مستقل یا عارضی طور پر قاصر شہریوں کے لیے خوراک، لباس، رہائش، تعلیم اور طبی امداد جیسی بنیادی ضروریات کا اہتمام کرے۔ اس کے باوجود اقوامِ متحدہ کے ترقیاتی پروگرام (UNDP) اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے اشتراک سے جاری ہونے والے عالمی کثیر الجہتی غربت انڈیکس (Global MPI) کے مطابق، دستیاب سروے (2017-18) کی بنیاد پر پاکستان کی تقریباً 38.3 فیصد آبادی کثیر الجہتی غربت کا شکار ہے، یعنی صحت، تعلیم اور مناسب رہائش سمیت معیارِ زندگی کی بنیادی سہولیات سے محروم ہے۔ اس صورتحال سے نمٹنے کے لیے وفاقی سطح پر بینظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) ملک کا سب سے بڑا سماجی تحفظ کا نیٹ ورک ہے، جو قومی سماجی و معاشی رجسٹری (NSER) کے ذریعے مستحق خاندانوں کی نشاندہی کرتا ہے اور "بینظیر کفالت" کے تحت تقریباً ایک کروڑ خاندانوں کو غیر مشروط نقد امداد فراہم کر رہا ہے، جبکہ "تعلیمی وظائف" اور "نشوونما" جیسے مشروط پروگرام بچوں کی تعلیم اور ماں و بچے کی غذائیت میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ پاکستان پاورٹی ایلیویشن فنڈ (PPAF) بلاسود قرضوں اور کمیونٹی کی سطح کے منصوبوں کے ذریعے، اور پاکستان بیت المال وظائف اور مالی معاونت کے ذریعے پسماندہ طبقات کو سہارا دے رہے ہیں۔

اب حکمتِ عملی کا رخ محض نقد امداد سے آگے بڑھ کر "پاورٹی گریجویشن" ماڈل کی جانب ہے، جس کی نمایاں مثال IFAD کے تعاون سے PPAF کا نیشنل پاورٹی گریجویشن پروگرام (NPGP) ہے، جس کے تحت غریب ترین خاندانوں کو اثاثے، ہنر اور بلاسود قرضے دے کر مستقل خود کفالت کی راہ پر گامزن کیا جاتا ہے۔

"سب کے لیے محفوظ گھر" کے عالمی موضوع کی مناسبت سے پاکستان میں سب سے اہم پیشرفت نئی قومی ہاؤسنگ پالیسی کا اجرا ہے۔ عالمی یومِ سکونت کے موقع پر وفاقی وزارتِ ہاؤسنگ اینڈ ورکس نے UN-Habitat پاکستان کے تعاون سے یہ پالیسی باضابطہ طور پر متعارف کرائی، جو 2001 کی قومی ہاؤسنگ پالیسی کے تقریباً 25 سال بعد اس شعبے میں سب سے بڑی اسٹریٹجک پیشرفت ہے۔ اندازوں کے مطابق ملک کو ایک کروڑ کے لگ بھگ رہائشی یونٹس کی کمی کا سامنا ہے، جبکہ شہری آبادی کا ایک بڑا حصہ کچی آبادیوں اور غیر رسمی بستیوں میں مقیم ہے۔

نئی پالیسی کم آمدنی والے طبقے کے لیے سستے مکانات (Affordable Housing) کی فراہمی، کچی آبادیوں کی اپ گریڈیشن، ہاؤسنگ فنانس تک آسان رسائی اور زمین کی ملکیت کے تحفظ (Land Tenure Security) کو اپنی بنیاد بناتی ہے۔ موسمیاتی تبدیلی کے پس منظر میں اس کا ایک اہم پہلو ایسے مکانات کی تعمیر کو ترجیح دینا ہے جو موسمی شدت اور قدرتی آفات کو برداشت کر سکیں (Climate Resilient Housing)۔

2022 کے تباہ کن سیلاب میں 20 لاکھ سے زائد مکانات تباہ یا متاثر ہوئے، جبکہ 2025 کے مون سون سیلاب نے پنجاب میں دریائے راوی، ستلج اور چناب کے کنارے ہزاروں دیہات کو متاثر کیا؛ یہ واقعات واضح کرتے ہیں کہ غریب خاندان کے لیے محفوظ گھر کا مطلب ایسا گھر بھی ہے جو آفات کے سامنے ڈٹ سکے۔

صوبائی سطح پر حکومتِ پنجاب نے SDG 1 کو اپنی ترقیاتی منصوبہ بندی کا لازمی حصہ بنایا ہے اور رہائش، سماجی تحفظ اور روزگار کے شعبوں میں متعدد اقدامات کیے ہیں۔ رہائش کے شعبے میں "اپنی چھت اپنا گھر" پروگرام کے تحت ایسے کم آمدنی والے خاندانوں کو، جن کے پاس اپنا پلاٹ موجود ہے، گھر کی تعمیر کے لیے 15 لاکھ روپے تک کے بلاسود قرضے آسان اقساط پر فراہم کیے جا رہے ہیں، جبکہ "اپنی زمین اپنا گھر" کے تحت بے زمین اور بے گھر خاندانوں کو رہائشی پلاٹ دینے کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے۔ اس سے قبل IFAD کے تعاون سے نافذ کیے گئے سدرن پنجاب پاورٹی ایلیویشن پروجیکٹ (SPPAP) نے، جنوبی پنجاب کے ان پسماندہ اضلاع میں جہاں غربت کی شرح صوبائی اوسط سے کہیں زیادہ ہے، غریب ترین خاندانوں کو مویشی، بے زمین خاندانوں کو رہائشی پلاٹ اور مکانات، اور فنی و کاروباری تربیت فراہم کر کے پائیدار غربت میں کمی کا ایک کامیاب ماڈل پیش کیا۔ سماجی تحفظ کے میدان میں پنجاب سوشل پروٹیکشن اتھارٹی اور پنجاب سوشیو اکنامک رجسٹری (PSER) مستحق خاندانوں کی درست نشاندہی اور شفاف امداد کو ممکن بنا رہی ہیں، جبکہ "آسان کاروبار" جیسے پروگرام چھوٹے کاروباروں کو بلاسود قرضے دے کر روزگار کے نئے مواقع پیدا کر رہے ہیں۔

اسی طرح پنجاب چیریٹیز ایکٹ 2018 کے تحت قائم پنجاب چیریٹی کمیشن فلاحی اداروں اور ان کے فنڈز میں شفافیت کو یقینی بناتا ہے، اور منصوبہ بندی و ترقیات بورڈ کا SDGs یونٹ اور ڈیٹا ڈیش بورڈ غربت کے خاتمے سے متعلق اقدامات کی ڈیجیٹل نگرانی میں معاونت فراہم کر رہے ہیں۔

ان تمام کوششوں کے باوجود چیلنجز بدستور موجود ہیں، اور اقوامِ متحدہ کی 2026 کی ترجیحات پاکستان اور پنجاب کے لیے ایک واضح لائحۂ عمل فراہم کرتی ہیں: رہائش کو بنیادی حق تسلیم کرتے ہوئے اسے پالیسی اور بجٹ میں ترجیح دینا، غریب طبقات کو منصوبہ بندی، عملدرآمد اور نگرانی میں براہِ راست شریک کرنا—جس کا عملی نمونہ دیہی سپورٹ پروگراموں کا کمیونٹی کی شمولیت پر مبنی ماڈل ہے—اور سرکاری، نجی اور ترقیاتی شراکت داروں کے وسائل کو یکجا کرنا۔ نقد امداد فوری ریلیف ضرور دیتی ہے، مگر غربت سے مستقل نجات اثاثوں، ہنر، باوقار روزگار اور محفوظ چھت کے امتزاج سے ہی ممکن ہے

۔17 اکتوبر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ غربت کا خاتمہ خیرات نہیں بلکہ انصاف اور انسانی وقار کا تقاضا ہے، اور ایک محفوظ گھر وہ پہلی اینٹ ہے جس پر ایک خوشحال، منصفانہ اور پرامن معاشرے کی عمارت کھڑی ہوتی ہے

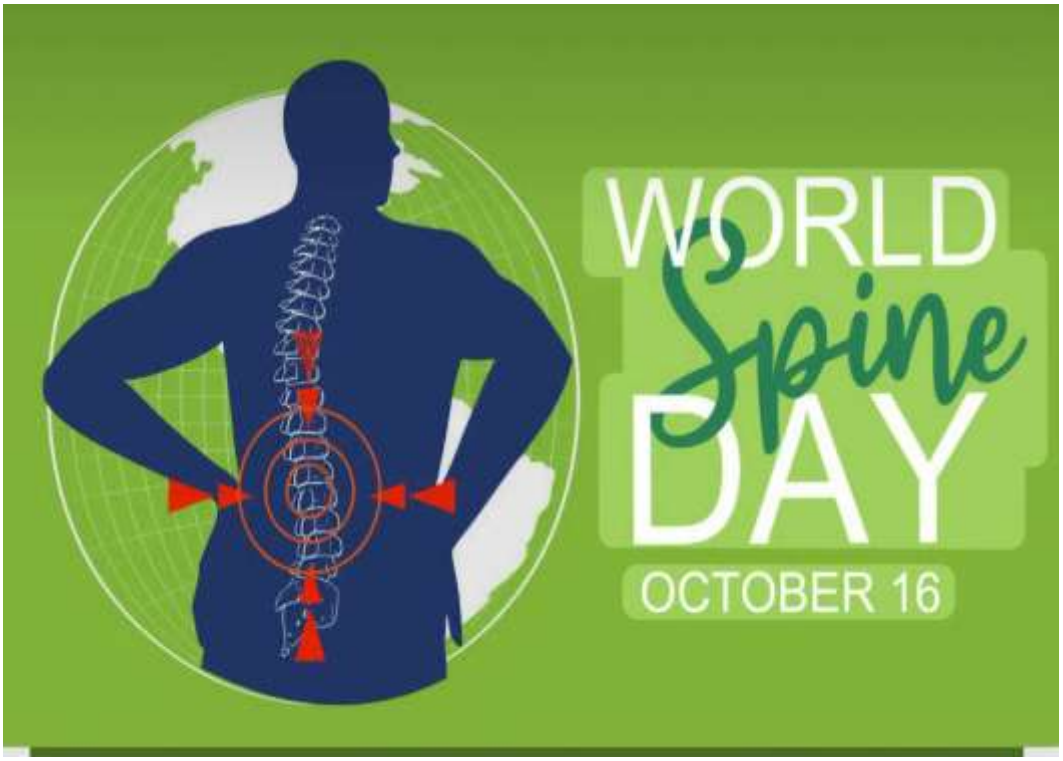

16 اکتوبر: ریڑھ کی ہڈی کا عالمی دن – (World Spine Day)

اہمیت، طبی حقائق اور پنجاب میں حکومتی سہولیات

دنیا بھر میں ہر سال 16 اکتوبر کو "ریڑھ کی ہڈی کا عالمی دن (World Spine Day) "منایا جاتا ہے۔ طبی تحقیقات کے مطابق کمر درد اور ریڑھ کی ہڈی کی تکالیف دنیا بھر میں معذوری (Disability) اور کام کی صلاحیت متاثر ہونے کی سب سے بڑی واحد وجہ ہیں۔ اس سنگین صورتحال کے پیش نظر عوام الناس میں ریڑھ کی ہڈی کی صحت، درست طرزِ زندگی، محفوظ نشست و برخواست اور امراض سے بچاؤ کے حوالے سے بین الاقوامی سطح پر بیداری پیدا کرنے کے لیے یہ دن مختص کیا گیا۔

اس دن کا باقاعدہ آغاز سال 2008 میں ورلڈ فیڈریشن آف کائروپریکٹک (World Federation of Chiropractic – WFC) کی قیادت میں ہوا۔ ڈبلیو ایف سی نے عالمی سطح پر طبی تنظیموں کو یکجا کر کے ریڑھ کی ہڈی کے امراض کی روک تھام کا عزم کیا۔ بعد ازاں اس مہم کو دی گلوبل الائنس فار مسکولو سکیلیٹل ہیلتھ (The Global Alliance for Musculoskeletal Health) کے تحت "بون اینڈ جوائنٹ ڈیکیڈ" کے ایک کلیدی منصوبے کا حصہ بنا دیا گیا۔ فزیوتھراپسٹس، نیوروسرجنز، اور پبلک ہیلتھ ماہرین کی انتھک کاوشوں کے باعث آج یہ دن تمام براعظموں میں ایک اثر انگیز عالمی صحت کا اقدام بن چکا ہے۔

ہر سال اس دن کی مناسبت سے ایک مخصوص اور جامع عنوان مقرر کیا جاتا ہے۔ سال 2026 کے لیے اس دن کا عالمی تھیم) "Spine Health for Life" زندگی بھر کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی صحت) مقرر کیا گیا ہے۔ اس تھیم کا بنیادی مقصد بچپن، جوانی سے لے کر بڑھاپے تک عمری کے تمام مراحل میں ریڑھ کی ہڈی کے تحفظ، متحرک طرزِ زندگی اور ورزش کی اہمیت پر زور دینا ہے تاکہ مستقبل میں معذوری سے بچا جا سکے۔

طبی لحاظ سے ریڑھ کی ہڈی کے امراض کو چند بنیادی اقسام میں تقسیم کیا جاتا ہے:

انحطاطی امراض :(Degenerative Diseases) بڑھتی عمر اور نامناسب نشست کی وجہ سے مہروں کا گھس جانا (Spondylosis) یا ڈسک کا خشک ہونا۔

سلپ ڈسک / ہرنیٹڈ ڈسک :(Herniated Disc) مہروں کے درمیان موجود ڈسک کا ہٹ کر اعصاب (Nerves) پر دباؤ ڈالنا۔

اسپائنل اسٹینوسس :(Spinal Stenosis) اسپائنل کینال کا تنگ ہونا جس سے حرام مغز اور اعصاب متاثر ہوتے ہیں۔

سائٹیکا :(Sciatica) کمر کے نچلے حصے سے شروع ہو کر کولہے اور ٹانگ کے نچلے حصے تک شدید درد کی لہر جانا۔

ٹیڑھا پن :(Scoliosis / Kyphosis) ریڑھ کی ہڈی کا پیدائشی یا نامناسب طرز سے ایک طرف مڑ جانا یا کبڑا پن۔

چوٹیں و فریکچر :(Spinal Cord Injury) حادثات، بلندی سے گرنے یا صدمے کے باعث حرام مغز کا متاثر ہونا، جس سے جسم کا نچلا حصہ یا تمام اعضاء مفلوج ہو سکتے ہیں۔

دنیا بھر میں تقریباً 1 ارب افراد ریڑھ کی ہڈی کے درد میں مبتلا ہیں، جبکہ پاکستان میں بھی یہ امراض تشویشناک حد تک بڑھ رہے ہیں۔ اگرچہ ملک میں ریڑھ کی ہڈی کی باقاعدہ نیشنل رجسٹری تو موجود نہیں، تاہم آرتھوپیڈک اور نیورو سرجیکل ایسوسی ایشنز کے محتاط اندازوں کے مطابق پاکستان کی 10٪ سے 15٪ آبادی کسی نہ کسی حد تک مہروں یا کمر کے دائمی درد کا شکار ہے۔ وزنی اشیاء اٹھانے، موٹاپے، اور متحرک زندگی کے فقدان کے ساتھ ساتھ ٹریفک حادثات کے باعث حرام مغز (Spinal Cord Injuries) کی شدید چوٹوں کے ہزاروں کیسز سالانہ رپورٹ ہوتے ہیں۔

حکومتِ پنجاب نے ریڑھ کی ہڈی کے علاج اور آپریشنز کے لیے صوبے کے تمام بڑے اور تدریسی ہسپتالوں میں نیورو سرجری اور آرتھوپیڈک ڈیپارٹمنٹس قائم کر رکھے ہیں:

لاہور جنرل ہسپتال (LGH) پنجاب میں نیورو سرجری اور ریڑھ کی ہڈی کے پیچیدہ آپریشنز کا ملک گیر بڑا مرکز ہے جہاں جدید اسپائن سرجری تھیٹرز دستیاب ہیں۔ اسی طرح میو ہسپتال، جناح ہسپتال اور سروسز ہسپتال (لاہور) میں تخصصی اسپائن سرجری یونٹس مفت ورعایتی علاج فراہم کر رہے ہیں۔

دیگر اضلاع میں فیصل آباد کا الائیڈ ہسپتال، ملتان کا نشتر ہسپتال، راولپنڈی کے تدریسی ہسپتال اور بہاولپور کا وکٹوریہ ہسپتال مقامی سطح پر مہروں کے علاج، جراحت اور تشخیص (MRI, CT Scan) کی مکمل سہولیات سے آراستہ ہیں۔

ریڑھ کی ہڈی کی جراحت کے بعد یا حادثات سے مفلوج ہونے والے مریضوں کے لیے صرف آپریشن ہی کافی نہیں ہوتا، بلکہ طویل مدتی بحالی (Rehabilitation) کلیدی حیثیت رکھتی ہے:

سرکاری ریہیب اور فزیو تھراپی سینٹرز: پنجاب کے تمام ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر (DHQ) اور تدریسی ہسپتالوں میں فزیوتھراپی کے شعبے فعال ہیں جہاں پیشہ ورانہ معالج مریضوں کی بحالی کے لیے کام کرتے ہیں۔

محکمہ سماجی بہبود پنجاب اور محکمہ صحت کے مشترکہ تعاون سے معذور افراد کو وہیل چیئرز، معاون آلات اور فنی روزگار کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں۔

پیراپلیجک سینٹر پشاور کی طرز پر صوبائی اقدامات: خیبر پختونخوا میں پیراپلیجک سینٹر پشاور مفت اور خود مختار سروسز دے رہا ہے، جس کی طرز پر پنجاب میں بھی اسپائنل کارڈ انجری کے مریضوں کی مربوط بحالی کے لیے پالیسیاں مرتب کی جا رہی ہیں۔

ریڑھ کی ہڈی کی سرجری اور ایم آر آئی جیسے معائنے عام آدمی کے لیے خاصے مہنگے ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں قومی صحت کارڈ (پنجاب صحت سہولت پروگرام) ایک انتہائی اہم اور انقلابی قدم ہے۔ اس کارڈ کے پینل پر موجود سرکاری و نجی (پرائیویٹ) ہسپتالوں میں ریڑھ کی ہڈی کی پیچیدہ سرجریز Spine) (Surgery, Fusion, Disc Replacement لاکھوں روپے کی حد تک بالکل مفت فراہم کی جا رہی ہیں، جس سے صوبہ پنجاب کے ہزاروں غریب اور متوسط خاندانوں کو معذوری سے بچانے اور ایک صحت مند زندگی کی طرف لانے میں نمایاں مدد ملی ہے۔



"برادرانِ ملت..." اور پھر ہمیشہ کی خاموشی

پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کا قتل — قاتل سید اکبر افغان فوج کا سابق بریگیڈیئر؟؟ پون صدی پرانا معمہ جس کی فائل کبھی پوری طرح نہ کھل سکی۔

منگل، 16 اکتوبر 1951ء کی سہ پہر راولپنڈی کا کمپنی باغ انسانوں کے سمندر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ہزاروں لوگ دور دراز سے اپنے وزیرِ اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان کو سننے کے لیے جمع تھے۔ قیامِ پاکستان کو ابھی صرف چار برس گزرے تھے؛ ملک ہجرت کے گہرے زخموں، کشمیر کے تنازعے اور اندرونی سیاسی کشمکش سے گزر رہا تھا، اور لوگوں کو توقع تھی کہ آج ان کا قائد کوئی اہم بات کہہ کر قوم کا حوصلہ بڑھائے گا۔ لیاقت علی خان اسٹیج پر آئے، مائیک کے سامنے کھڑے ہوئے اور ابھی انہوں نے "برادرانِ ملت" کے الفاظ ہی ادا کیے تھے کہ اگلی صفوں سے پستول کی گولیاں چلیں اور پاکستان کا پہلا وزیرِ اعظم اسٹیج پر گر پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد قوم اپنے "قائدِ ملت" سے محروم ہو چکی تھی، اور اسی لمحے ایک ایسے معمے نے جنم لیا جو پون صدی گزرنے کے باوجود آج تک پوری طرح حل نہیں ہو سکا۔

اس سانحے کی گہرائی کو سمجھنے کے لیے اس شخصیت کو جاننا ضروری ہے جسے اس روز نشانہ بنایا گیا۔ نوابزادہ لیاقت علی خان یکم اکتوبر 1895ء کو کرنال کے ایک ممتاز نواب خاندان میں پیدا ہوئے، جو اس وقت برطانوی پنجاب کا حصہ تھا اور آج بھارتی ریاست ہریانہ میں واقع ہے۔ انہوں نے ایم اے او کالج علی گڑھ سے 1918ء میں گریجویشن کی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے، جہاں آکسفورڈ یونیورسٹی کے ایگزیٹر کالج سے قانون کی تعلیم حاصل کی اور 1922ء میں اِنر ٹیمپل لندن سے بیرسٹری کی سند لی۔

وطن واپسی کے بعد 1923ء میں وہ آل انڈیا مسلم لیگ سے وابستہ ہوئے اور 1926ء میں متحدہ صوبہ جات (یوپی) کی قانون ساز کونسل کے رکن منتخب ہو کر برسوں تک وہاں مسلمانوں کی مؤثر آواز بنے رہے۔ 1930ء کی دہائی کے اوائل میں جب قائداعظم محمد علی جناح ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن میں مقیم تھے، تو لیاقت علی خان اور ان کی اہلیہ بیگم رعنا لیاقت علی خان نے انہیں وطن واپس آ کر مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے پر آمادہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1936ء میں وہ مسلم لیگ کے اعزازی جنرل سیکریٹری منتخب ہوئے اور قیامِ پاکستان تک اس منصب پر فائز رہے، یہاں تک کہ انہیں قائداعظم کا دستِ راست کہا جانے لگا۔ 1946ء میں قائم ہونے والی عبوری حکومت میں وزیرِ خزانہ کی حیثیت سے انہوں نے جو بجٹ پیش کیا، وہ تاریخ میں "غریب آدمی کا بجٹ" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

14 اگست 1947ء کو پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو لیاقت علی خان ملک کے پہلے وزیرِ اعظم بنے۔ نئی ریاست کو ابتدا ہی سے بے شمار بحرانوں کا سامنا تھا: لاکھوں مہاجرین کی آبادکاری، تقریباً خالی خزانہ، ناکافی انتظامی ڈھانچہ، اثاثوں کی تقسیم کا تنازع اور کشمیر پر بھارت سے جنگ۔ ستمبر 1948ء میں قائداعظم کی وفات کے بعد ریاست کا سارا بوجھ عملاً انہی کے کندھوں پر آ گیا۔ انہوں نے سول سروس کی بنیاد رکھنے، معیشت کو سہارا دینے اور ابتدائی دفاعی ڈھانچے کو مضبوط بنانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

ان کا سب سے بڑا آئینی کارنامہ 12 مارچ 1949ء کو دستور ساز اسمبلی سے قراردادِ مقاصد کی منظوری ہے، جو بعد میں پاکستان کے تمام دساتیر کا دیباچہ بنی۔ اپریل 1950ء میں انہوں نے بھارتی وزیرِ اعظم جواہر لعل نہرو کے ساتھ اقلیتوں کے تحفظ کا معاہدہ کیا جو "لیاقت–نہرو معاہدہ" کہلاتا ہے۔ مئی 1950ء میں امریکی صدر ہیری ٹرومین کی دعوت پر امریکہ کا دورہ کیا، جبکہ ان ہی کے دور میں مئی 1951ء میں عوامی جمہوریہ چین کے ساتھ باقاعدہ سفارتی تعلقات قائم ہوئے۔

1951ء کے موسمِ گرما میں جب بھارت نے سرحد پر فوجیں جمع کیں تو کراچی کے ایک جلسے میں ان کا فضا میں لہرایا ہوا مُکّا قومی عزم کی علامت بن گیا۔

ناقدین کی رائے میں سوویت یونین کی دعوت کے باوجود ماسکو کے بجائے واشنگٹن کا رخ کرنا پاکستان کی خارجہ پالیسی کے مغربی جھکاؤ کا نقطۂ آغاز تھا، جس کے اثرات آنے والی دہائیوں تک محسوس کیے گئے۔ تاہم ذاتی کردار کے حوالے سے انہیں ایک دیانت دار، سادہ اور محبِ وطن رہنما کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ نواب خاندان سے تعلق رکھنے کے باوجود انہوں نے ہندوستان میں چھوڑی ہوئی وسیع جائیداد کے عوض پاکستان میں کوئی کلیم داخل نہیں کیا، اور شہادت کے وقت ان کے ذاتی اثاثے نہایت معمولی تھے۔

1951ء کا سال سیاسی اعتبار سے نہایت کشیدہ تھا۔ مارچ 1951ء میں حکومت نے "راولپنڈی سازش کیس" بے نقاب کیا، جس میں چیف آف جنرل اسٹاف میجر جنرل اکبر خان سمیت بعض فوجی افسران اور فیض احمد فیض اور سید سجاد ظہیر جیسے بائیں بازو کے دانشوروں پر حکومت کا تختہ الٹنے کی منصوبہ بندی کا الزام تھا۔ کشمیر کے مسئلے پر حکومتی پالیسی سے کئی حلقے ناخوش تھے، "پشتونستان" کے مسئلے پر افغانستان کے ساتھ تعلقات تناؤ کا شکار تھے، اور حکمران جماعت اور بیوروکریسی کے اندر بھی اقتدار کی خاموش رسہ کشی جاری تھی۔ یہی وہ پس منظر تھا جس میں 16 اکتوبر کا جلسہ منعقد ہوا۔

جلسہ مسلم لیگ کے زیرِ اہتمام تھا اور وزیر اعظم کو سننے کے لیے مجمع اسٹیج کے بالکل قریب تک پھیلا ہوا تھا۔ جیسے ہی انہوں نے "برادرانِ ملت" کہہ کر خطاب کا آغاز کیا، اگلی صفوں میں بیٹھے ایک شخص نے اٹھ کر قریب سے پستول کی دو گولیاں چلائیں جو ان کے سینے میں پیوست ہو گئیں۔ یہ حملہ آور سید اکبر تھا۔ گولیاں چلتے ہی جلسہ گاہ میں افراتفری مچ گئی۔ موقع پر موجود ایس پی نجف خان نے پشتو میں چلا کر حملہ آور کو گولی مارنے کا حکم دیا، جس پر انسپکٹر محمد شاہ نے فائر کر کے اسے وہیں ڈھیر کر دیا، جبکہ مشتعل ہجوم بھی اس پر ٹوٹ پڑا۔ یوں وہ واحد شخص، جو یہ بتا سکتا تھا کہ اس نے یہ قدم کیوں اٹھایا اور اس کے پیچھے کون تھا، چند ہی لمحوں میں ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا گیا۔

وکیپیڈیا کے مطابق قتل کے بعد آنے والے دنوں میں سید اکبر خان کے بارے میں تفصیلات سامنے آنے لگیں۔ وہ افغانستان کے بادشاہ امان اللہ خان کی فوج میں بریگیڈیئر تھا، لیکن جب افغانستان میں خانہ جنگی کے نتیجے میں امان اللہ کو ملک سے فرار ہونا پڑا اور اقتدار ظاہر شاہ کے پاس آ گیا تو 1947ء میں آزادیِ ہند سے سات ماہ قبل سید اکبر خان بھی ملک چھوڑ کر ہندوستان آ گیا جہاں انگریزوں نے اسے سیاسی پناہ دے دی اور وہ اپنے خاندان کے ہمراہ ایبٹ آباد میں مقیم ہو گیا۔ اکبر خان کو انگریز حکومت کی طرف سے گذر بسر کے لیے وظیفہ ملتا تھا، جب پاکستان بنا تب بھی وظیفہ جاری رکھا۔ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ اقبال اور مولانا رومی کا بڑا مداح تھا اور اس کا نشانہ بے خطا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی چلائی ہوئی پہلی گولی لیاقت علی خان کے دل کے پار ہو گئی

۔جوں جوں تحقیقات آگے بڑھتی گئیں تو بہت سی اور باتیں بھی سامنے آئیں۔وہ ہر وقت کشمیر میں جہاد اور بھارت پر حملے کے خواب دیکھتا رہتا تھا۔اس نے اپنے گھر میں الٹے سیدھے جنگی نقشے لٹکا رکھے تھے۔وہ ایبٹ آباد کے مولویوں سے تقاضا کیا کرتا تھا کہ وہ عوام پر جہاد کی اہمیت واضح کریں۔14 اکتوبر کو ایبٹ آباد سے راولپنڈی جاتے ہوئے سید اکبر نے وہی لباس پہن رکھا تھا جو اس نے جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار کرایا تھا۔اس کے مکان کی تلاشی میں روزنامہ تعمیر اور نوائے وقت کے متعدد تراشے ملے جن میں بیگم لیاقت علی خان کے خلاف رسوا کن اداریے تحریر تھے۔ان دونوں اخبارات میں وزیر اعظم اور ان کی بیوی کے خلاف گھٹیا مہم چلائی جارہی تھی جس میں سید اکبر کو گہری دلچسپی تھی۔دوسری طرف سید اکبر کے بھائی مرزک کے مطابق سید اکبر خود پردہ ترک کر چکا تھا۔وہ کبھی کبھی اپنی بیوی اور بیٹے کو سینما دکھانے لے جایا کرتا تھا۔اس نے 16 اپریل 49 کو لاہور سے دو گھڑیاں خریدیں، جن میں سے ایک اس کی داشتہ رخ عافیہ کے لیے تھی۔اس نے اپنے لڑکے دلاور خاں کو ایبٹ آباد میں ماڈرن یورپین اسکول میں تعلیم کے لیے داخل کرایا تھا۔مرنے کے بعد سید اکبر کی جیب سے 2041 روپے برامد ہوئے(اس وقت سونے کا ریٹ 60 تا 80 روپے تولہ تھا (۔450 روپیہ ماہانہ سرکاری وظیفہ پانے والے قاتل کے گھر سے 7650 روپے کے نوٹ اور منی لال چمن لال اینڈ کمپنی بمبئی کی تیار کردہ نقلی سونے کی 38 اینٹیں ملیں۔سید اکبر پراسرار طور پر کچھ آدمیوں سے ملتا جلتا تھا۔14 اکتوبر کو پنڈی پہنچ کر سید اکبر نے چند سوالات لکھ کر کسی سے استخارے کی درخواست کی تھی۔ قتل سے ایک روز قبل اسے تحریری جواب ملا جس میں اور باتوں کے علاوہ یہ بھی لکھا تھا کہ بہشت میں حوریں تمھاری منتظر ہیں۔تم ہماری خوشنودی پاؤ گے۔

شدید زخمی وزیر اعظم کو فوری طور پر کمبائنڈ ملٹری ہسپتال (سی ایم ایچ) راولپنڈی پہنچایا گیا، جہاں ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود وہ جانبر نہ ہو سکے۔روایات کے مطابق ان کے آخری الفاظ تھے:

"خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔ "

ان کا جسدِ خاکی کراچی لایا گیا اور انہیں قائد اعظم کے مزار کے احاطے میں سپردِ خاک کیا گیا۔قوم نے انہیں "شہیدِ ملت" کا خطاب دیا اور کمپنی باغ کا نام بدل کر "لیاقت باغ" رکھ دیا گیا۔

قتل کے فوراً بعد پولیس اور سی آئی ڈی نے تفتیش کا آغاز کیا، اور کچھ ہی عرصے بعد حکومت نے جسٹس محمد منیر اور سینئر سول افسر اختر حسین پر مشتمل ایک تحقیقاتی کمیشن قائم کیا، جسے قتل کے حالات اور حفاظتی انتظامات کا جائزہ لینے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ کمیشن نے جلسے کے حفاظتی انتظامات کو ناقص قرار دیا اور پولیس افسران کی کارکردگی پر سخت سوالات اٹھائے، خصوصاً اس بات پر کہ حملہ آور کو زندہ گرفتار کرنے کے بجائے موقع پر ہی کیوں ہلاک کر دیا گیا، جس سے تفتیش کا سب سے اہم سرا ہاتھ سے نکل گیا۔

سازش کے بنیادی سوال پر کمیشن کوئی حتمی اور واضح جواب نہ دے سکا۔ قاتل کی موت، گواہوں کے متضاد بیانات اور شواہد کی کمی کے باعث یہ طے نہ ہو سکا کہ سید اکبر تنہا تھا یا کسی منظم منصوبے کا آلۂ کار۔ بعد کی سرکاری تحقیقات کا مجموعی مؤقف یہی رہا کہ کسی بڑی ملکی یا بین الاقوامی سازش کے ٹھوس شواہد نہیں ملے، تاہم یہ مؤقف عوام اور محققین کی بڑی تعداد کو کبھی مطمئن نہ کر سکا۔

تفتیش کا سب سے پراسرار موڑ اس وقت آیا جب انسپکٹر جنرل اسپیشل پولیس نوابزادہ اعتزاز الدین، جو اس مقدمے کی تحقیقات کی نگرانی کر رہے تھے، 1952ء میں کیس کی اہم دستاویزات لے کر بذریعہ طیارہ سفر کر رہے تھے۔ ان کا جہاز جہلم کے قریب کھیوڑہ کے علاقے میں گر کر تباہ ہو گیا؛ وہ خود جاں بحق ہو گئے اور ساتھ موجود اہم کاغذات بھی جل کر خاک ہو گئے۔ تفتیش کے نگران افسر کی موت اور ریکارڈ کی تباہی نے پہلے سے موجود شکوک و شبہات کو اور گہرا کر دیا۔

بڑھتے ہوئے عوامی دباؤ کے پیشِ نظر حکومت نے برطانیہ کے سکاٹ لینڈ یارڈ سے مدد طلب کی، جس کے تجربہ کار تفتیش کار سی ڈبلیو اروِن (C. W. Urwin) نے 1954ء اور 1955ء کے دوران کیس کا از سرِ نو جائزہ لیا۔ عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ان کی رپورٹ میں بھی کسی منظم سازش کے ٹھوس ثبوت سامنے نہیں آئے اور قتل کو بنیادی طور پر قاتل کا انفرادی فعل قرار دیا گیا۔ مگر چونکہ قاتل اور اہم دستاویزات دونوں پہلے ہی ختم ہو چکے تھے، اس لیے بہت سے حلقوں نے اس نتیجے کو بھی ادھورا قرار دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اس قتل کے گرد سوالات کا ایک ایسا جال بُن گیا جو آج تک نہیں سلجھ سکا۔ قاتل کو زندہ گرفتار کرنے کے بجائے فوراً ہلاک کیوں کیا گیا؟ ایک معلوم شخص اسلحے سمیت اگلی صفوں تک کیسے پہنچا؟ جلسے میں بعض اہم سرکاری و سیاسی شخصیات کی غیر موجودگی محض اتفاق تھی یا کچھ اور؟ اور تفتیش کا ریکارڈ ایک فضائی حادثے میں کیسے ضائع ہو گیا؟ انہی سوالات کی بنیاد پر مختلف نظریات سامنے آئے: بعض نے اسے حکمران حلقوں کی اندرونی کشمکش کا نتیجہ قرار دیا، بعض نے افغانستان کے ساتھ کشیدہ تعلقات کی طرف اشارہ کیا، اور بعض نے عالمی طاقتوں کے مفادات کو اس کے پیچھے دیکھا۔ تاہم کسی بھی مصدقہ عدالتی یا تاریخی دستاویز سے کسی مخصوص فرد، ادارے یا فوجی قیادت کے براہِ راست ملوث ہونے کا حتمی ثبوت سامنے نہیں آ سکا۔

قتل کے بعد اقتدار کی منتقلی نے بھی ان شکوک کو تقویت دی۔ گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین وزیرِ اعظم بن گئے اور وزیرِ خزانہ ملک غلام محمد گورنر جنرل کے منصب پر فائز ہوئے۔ اپریل 1953ء میں غلام محمد نے ناظم الدین کی حکومت برطرف کر دی اور اکتوبر 1954ء میں دستور ساز اسمبلی ہی توڑ دی۔ یوں لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد ملک میں سیاسی عدم استحکام کا ایک طویل دور شروع ہوا، جس کی وجہ سے بہت سے مؤرخین اس قتل کو پاکستان کی سیاسی تاریخ کا فیصلہ کن موڑ قرار دیتے ہیں۔

لیاقت باغ آج بھی راولپنڈی کے قلب میں موجود ہے۔ تاریخ کا ایک تلخ اتفاق یہ بھی ہے کہ 27 دسمبر 2007ء کو اسی لیاقت باغ میں جلسے سے خطاب کے بعد واپسی پر سابق وزیر اعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کو بھی باغ کے دروازے کے قریب قتل کر دیا گیا۔ لیاقت علی خان کی شہادت کو پون صدی گزر چکی ہے، مگر "برادرانِ ملت" کے بعد کہے جانے والے وہ الفاظ، جو کبھی ادا نہ ہو سکے،

آج بھی تاریخ کے دامن میں ایک ادھورے جملے کی طرح لٹکے ہوئے ہیں۔ قاتل موقع پر مارا گیا، تفتیشی کاغذات جل گئے، کمیشن کسی حتمی نتیجے تک نہ پہنچ سکے اور فائل بند ہو گئی؛ لیکن قوم کے ذہن میں یہ سوال آج بھی زندہ ہے کہ 16 اکتوبر 1951ء کی اس سہ پہر کے پیچھے اصل کہانی کیا تھی۔



بصارت سے محروم مگر بصیرت سے بھرپور

15 اکتوبر: سفید چھڑی کے تحفظ کا عالمی دن اور حکومتِ پنجاب کے فلاحی اقدامات

ہر سال 15 اکتوبر کو دنیا بھر میں سفید چھڑی کے تحفظ کا عالمی دن (International White Cane Safety Day) منایا جاتا ہے۔

سفید چھڑی محض راستہ ٹٹولنے کا ایک آلہ نہیں بلکہ بصارت سے محروم افراد کی آزادی، خود مختاری اور باوقار زندگی کی علامت ہے۔ یہ دن معاشرے کو یاد دلاتا ہے کہ نابینا افراد بھی تعلیم، روزگار اور آزادانہ نقل و حرکت کا اتنا ہی حق رکھتے ہیں جتنا کوئی دوسرا شہری، اور ان کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور کرنا پوری قوم کی اجتماعی ذمہ داری ہے۔

طبی اور عالمی معیار کے مطابق نابینا پن کی تعریف مختلف پیمانوں سے کی جاتی ہے:

- مکمل نابینا پن :(Total Blindness) جب آنکھیں روشنی کا احساس مکمل طور پر کھو دیں اور فرد روشنی اور اندھیرے میں بھی فرق نہ کر سکے۔ طبی اصطلاح میں اسے No Light Perception کہا جاتا ہے۔

● قانونی نابینا پن :(Legal Blindness) جب عینک یا علاج کے باوجود بہتر آنکھ کی بینائی 20/200 یا اس سے کم رہ جائے، یعنی جو چیز عام آدمی 200 فٹ کے فاصلے سے دیکھ لیتا ہے، متاثرہ فرد اسے صرف 20 فٹ یا اس سے کم فاصلے سے دیکھ پائے۔ اسی طرح اگر نظر کا دائرہ (Visual Field) سکڑ کر 20 درجے یا اس سے کم رہ جائے تو بھی فرد قانونی طور پر نابینا شمار ہوتا ہے جبکہ WHO کے مطابق اگر بہتر آنکھ کی بینائی 3/60 سے کم ہو، یعنی فرد 3 میٹر کے فاصلے سے وہ چیز بھی نہ دیکھ سکے جو عام آدمی 60 میٹر سے دیکھ لیتا ہے، یا نظر کا دائرہ 10 درجے سے کم ہو، تو اسے نابینا پن قرار دیا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ قانونی طور پر نابینا قرار دیے گئے افراد کی اکثریت میں کچھ نہ کچھ بینائی باقی ہوتی ہے، اسی لیے بروقت علاج اور بحالی کی خدمات ان کی زندگی میں بڑا فرق ڈال سکتی ہیں۔

نابینا پن کی مختلف اقسام میں سر فہرست پیدائشی نابینا پن (Congenital Blindness) ہے۔ جس میں وہ بچے شامل ہیں جو پیدائشی طور پر بینائی سے محروم ہوتے ہیں۔ اس کی وجوہات میں جینیاتی نقائص (Genetic Disorders)، دورانِ حمل ماں کو لاحق ہونے والے انفیکشنز مثلاً روبیلا (جرمن خسرہ)، پیدائشی سفید موتیا اور کالا موتیا، اور قبل از وقت پیدائش کے باعث پردۂ بصارت کی بیماری (Retinopathy of Prematurity) شامل ہیں۔ قریبی رشتہ داروں میں شادیوں سے بعض موروثی امراضِ چشم کا خطرہ بڑھ جاتا ہے، جبکہ روبیلا سے بچاؤ کی ویکسین اس کے خطرے کو بڑی حد تک کم کر دیتی ہے۔

بعد میں لاحق ہونے والا نابینا پن (Acquired Blindness) پیدائش کے بعد کسی بیماری یا حادثے کے نتیجے میں ہوتا ہے اس میں سفید موتیا (Cataract) دنیا بھر میں اندھے پن کی سب سے بڑی وجہ ہے۔ اس کے علاوہ کالا موتیا (Glaucoma)، ذیابیطس کے باعث پردۂ بصارت کا متاثر ہونا (Diabetic Retinopathy)، عمر کے ساتھ پردۂ بصارت کے مرکزی حصے کی کمزوری (Age-related Macular Degeneration)، آنکھ کی شفاف جھلی یعنی قرنیہ (Cornea) کی بیماریاں اور ٹریکوما جیسی متعدی بیماریاں بھی نمایاں وجوہات ہیں۔ بروقت عینک نہ ملنا (Uncorrected Refractive Error) درمیانے اور شدید درجے کی بینائی کی کمزوری کا سب سے بڑا سبب ہے۔ اور ایک بڑی وجہ حادثات جیسے آنکھ پر لگنے والی شدید چوٹ، تیزاب یا کیمیکل کا گرنا، آتش بازی، اور کارخانوں یا کھیتوں میں کام کے دوران حفاظتی چشمہ استعمال نہ کرنے سے پیش آنے والے حادثات ہیں

عالمی ادارۂ صحت (WHO) اور انٹرنیشنل ایجنسی فار دی پریوینشن آف بلائنڈنس (IAPB) کے پیش کردہ عالمی تخمینوں (2020) کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 4 کروڑ 30 لاکھ افراد مکمل طور پر بینائی سے محروم ہیں

۔اگر ہر درجے کی نظر کی کمزوری کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ تعداد 1 ارب 10 کروڑ سے تجاوز کر جاتی ہے، جن میں سے تقریباً 29 کروڑ 50 لاکھ افراد درمیانے اور شدید درجے کی کمزوری کا شکار ہیں۔ ان متاثرہ افراد میں سے تقریباً 90 فیصد کم اور متوسط آمدنی والے ممالک میں رہتے ہیں، اور آبادی کے تناسب سے نابینا پن کی سب سے زیادہ شرح جنوبی ایشیا، جس کا پاکستان بھی حصہ ہے، اور ذیلی صحارا افریقہ کے خطوں میں پائی جاتی ہے۔ دنیا بھر میں اندھے پن کی سب سے بڑی وجہ سفید موتیا ہے، اور آبادی میں اضافے اور اوسط عمر بڑھنے کے باعث خدشہ ہے کہ 2050 تک نابینا افراد کی تعداد 6 کروڑ 10 لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

اس عالمی منظر نامے میں پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں یہ مسئلہ خاصی سنگین صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ اندازوں کے مطابق ملک میں تقریباً 18 لاکھ افراد مکمل طور پر بینائی سے محروم ہیں، جبکہ 2 کروڑ 10 لاکھ سے زائد افراد کسی نہ کسی درجے کی نظر کی کمزوری کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ دنیا کی طرح پاکستان میں بھی نابینا پن کی سب سے بڑی وجہ سفید موتیا ہی ہے، جو یہاں نصف سے زائد کیسز کا سبب بنتا ہے، حالانکہ اس کا علاج ایک سادہ اور نسبتاً کم خرچ آپریشن سے ممکن ہے۔

ملک گیر قومی سروے برائے نابینا پن و بصری معذوری (2001 تا 2004) کے مطابق 30 سال سے زائد عمر کے افراد میں نابینا پن کی شرح تقریباً 2.7 فیصد تھی۔ دیہی علاقوں میں یہ شرح شہری علاقوں کے مقابلے میں نمایاں طور پر زیادہ پائی گئی، جس کی بڑی وجوہات ماہرینِ امراضِ چشم تک محدود رسائی، علاج کے اخراجات اور آگاہی کی کمی ہیں۔ یوں یہ اعداد و شمار واضح کرتے ہیں کہ پاکستان میں نابینا پن کا ایک بڑا حصہ قابلِ علاج ہے، بشرطیکہ بروقت تشخیص اور علاج کی سہولت ہر شہری کی دسترس میں ہو۔

سفید چھڑی کو نابینا افراد کی عالمی پہچان بننے میں کئی دہائیاں لگیں۔ اس سفر کا آغاز 1921 میں برطانیہ کے شہر برسٹل سے ہوا، جہاں فوٹو گرافر جیمز بگز (James Biggs) ایک حادثے میں اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ گھر کے آس پاس بڑھتی ہوئی ٹریفک سے بچنے اور گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے انہوں نے اپنی عام چھڑی کو سفید رنگ دے دیا۔ چند برس بعد 1930 میں امریکی شہر پیوریا (ریاست الینوائے) میں لائنز کلب کے رکن جارج بونہم (George Bonham) نے سرخ پٹی والی سفید چھڑی متعارف کروائی، اور شہر نے سفید چھڑی بردار افراد کو ٹریفک میں ترجیح دینے کا قانون منظور کیا۔

اگلے ہی برس، 1931 میں، اس خیال نے ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کر لی جب فرانس کے دارالحکومت پیرس میں سماجی کارکن خاتون گیلی ڈی ہربیمونٹ (Guilly d'Herbemont) نے "سفید چھڑی کی تحریک (White Stick Movement)" شروع کی اور نابینا افراد میں ہزاروں سفید چھڑیاں تقسیم کیں۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران 1944 میں امریکی ماہر رچرڈ ہوور (Richard Hoover) نے لمبی چھڑی (Long Cane) کے استعمال کا جدید طریقہ وضع کیا، جو آج بھی دنیا بھر میں نابینا افراد کو سکھایا جاتا ہے۔

امریکہ میں نابینا افراد کی تنظیم نیشنل فیڈریشن آف دی بلائنڈ (NFB) کی طویل کوششوں کے بعد 6 اکتوبر 1964 کو امریکی کانگریس نے ایک مشترکہ قرارداد منظور کی، جس کے بعد صدر لنڈن بی جانسن (Lyndon B. Johnson) نے 15 اکتوبر کو باقاعدہ طور پر "وائٹ کین سیفٹی ڈے" قرار دیا۔ بعد کے برسوں میں نابینا افراد کی بین الاقوامی تنظیموں، جن میں انٹرنیشنل فیڈریشن آف دی بلائنڈ اور بعد ازاں ورلڈ بلائنڈ یونین (World Blind Union) شامل ہیں، کی کوششوں سے یہ دن عالمی سطح پر منایا جانے لگا۔ پھر 2006 میں اقوامِ متحدہ کے کنونشن برائے حقوقِ افرادِ باہم معذوری (CRPD) نے رسائی اور آزادانہ نقل و حرکت کو بنیادی انسانی حق کے طور پر تسلیم کر کے اس جدوجہد کو عالمی قانونی بنیاد فراہم کی۔

آج یہ دن پاکستان، بھارت، امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور یورپی ممالک سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں باقاعدگی سے منایا جاتا ہے، اور پاکستان میں بھی کئی دہائیوں سے سرکاری و غیر سرکاری سطح پر اس دن کی تقریبات منعقد کی جاتی ہیں۔

سفید چھڑی کی کئی اقسام ہیں اور ہر ایک کا مقصد مختلف ہے:

- لمبی چھڑی :(Long Cane) سب سے عام چھڑی، جو راستے کی رکاوٹیں، سیڑھیاں اور فٹ پاتھ کے کنارے محسوس کرنے میں مدد دیتی ہے۔
- شناختی چھڑی :(Symbol Cane) ہلکی اور تہہ ہونے والی چھوٹی چھڑی، جس کا بنیادی مقصد دوسروں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ اس فرد کی بینائی کمزور ہے۔
- سہارے والی چھڑی :(Support Cane) سفید رنگ کی وہ چھڑی جو شناخت کے ساتھ ساتھ جسمانی سہارا اور توازن بھی فراہم کرتی ہے۔
- سرخ و سفید دھاری دار چھڑی: کئی ممالک میں یہ اس بات کی علامت ہے کہ فرد بیک وقت بینائی اور سماعت دونوں سے محروم (Deafblind) ہے۔

اس دن کے موقع پر بصارت سے محروم افراد اور سماجی تنظیموں کے ارکان ہاتھوں میں سفید چھڑیاں لے کر علامتی واک کرتے ہیں تاکہ عوام کو یہ پیغام دیا جا سکے کہ سفید چھڑی بردار کو راستہ دینا ان کا اخلاقی فریضہ اور شہری ذمہ داری ہے۔ اور سرکاری و غیر سرکاری سطح پر سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں جن میں نابینا افراد کی تعلیم، روزگار اور قابلِ رسائی انفراسٹرکچر، مثلاً فٹ پاتھوں پر ابھری ہوئی رہنما ٹائلز (Tactile Paving)، آواز والے ٹریفک سگنلز اور قابلِ رسائی عمارتوں پر بات کی جاتی ہے۔

نیز فلاحی ادارے اور لائنز کلب (Lions Clubs) جیسے عالمی نیٹ ورک مستحق نابینا افراد میں مفت سفید چھڑیاں اور دیگر معاون آلات تقسیم کرتے ہیں۔ ڈرائیوروں اور شہریوں کو بتایا جاتا ہے کہ سفید چھڑی تھامے فرد کو سڑک عبور کرنے کا پہلا حق (Right of Way) حاصل ہے؛ دنیا کے کئی ممالک میں یہ باقاعدہ قانونی تقاضا بھی ہے۔

سفید چھڑی دیکھیں تو رک جائیں، ہارن نہ بجائیں اور راستہ دیں—یہی اس دن کا بنیادی پیغام ہے۔

ہم سب نابینا افراد کی مدد اس طریقے سے کرتے سکتے ہیں کہ

- مدد کرنے سے پہلے اپنا تعارف کروائیں اور پوچھیں کہ کیا انہیں مدد درکار ہے؛ اجازت کے بغیر ان کا ہاتھ یا چھڑی نہ پکڑیں۔
- رہنمائی کرتے وقت اپنی کہنی پیش کریں تا کہ وہ اسے تھام کر آپ کے ساتھ آدھا قدم پیچھے چل سکیں۔
- راستے کی رکاوٹوں، سیڑھیوں اور موڑ کی واضح نشاندہی کریں، مثلاً: "دو قدم آگے دائیں جانب سیڑھیاں ہیں"۔
- نابینا فرد سے براہِ راست بات کریں، اس کے ساتھی کے ذریعے نہیں، اور رخصت ہوتے وقت انہیں بتا دیں۔
- فٹ پاتھوں اور رہنما ٹائلز پر موٹر سائیکل، گاڑی یا سامان کھڑا کر کے ان کا راستہ نہ روکیں۔

پاکستان بالخصوص پنجاب میں نابینا افراد کو معاشرے کا خود مختار اور مفید شہری بنانے، اور اندھے پن کا باعث بننے والی بیماریوں کی روک تھام و علاج کے لیے حکومتی اور غیر سرکاری (NGOs) سطح پر متعدد اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

پاکستان نے 2011 میں اقوامِ متحدہ کے کنونشن برائے حقوقِ افرادِ باہم معذوری (CRPD) کی توثیق کی، جبکہ پنجاب امپاورمنٹ آف پرسنز وِد ڈس ایبلٹیز ایکٹ 2022 صوبے میں ان حقوق کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔ نیز حکومت پنجاب کے درج ذیل اقدامات بھی قابل تحسین ہیں

- مالی معاونت (ہمت کارڈ اور وظائف): وزیرِ اعلیٰ پنجاب مریم نواز کی قیادت میں حکومتِ پنجاب نے ہمت کارڈ (Himmat Card) پروگرام متعارف کروایا ہے، جس کے تحت افرادِ باہم معذوری کو باوقار انداز میں مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ رجسٹرڈ نابینا افراد کے لیے 12,000 روپے ماہانہ وظیفہ بھی منظور کیا گیا ہے تا کہ ان کی مالی خود مختاری یقینی بنائی جا سکے۔
- تعلیم اور مفت بریل کتب: پنجاب کے سرکاری اور نجی تعلیمی اداروں میں زیرِ تعلیم نابینا طلبہ کو قرآنِ پاک سمیت مفت بریل (Braille) کتب فراہم کی جا رہی ہیں۔ لاہور اور بہاولپور میں جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ بریل پرنٹنگ پریس یہ خدمت انجام دے رہے ہیں، جبکہ خصوصی تعلیم کے اداروں کو 'سینٹرز آف ایکسیلینس (Centres of Excellence)' میں تبدیل کیا جا رہا ہے۔ یاد رہے کہ بریل رسم الخط فرانس کے لوئی بریل (Louis Braille) نے ایجاد کیا تھا، جو خود بچپن میں ایک حادثے کے باعث بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔
- معاون آلات کی فراہمی: نابینا افراد کی نقل و حرکت آسان بنانے کے لیے سفید چھڑیاں (White Canes) اور دیگر معاون آلات (Assistive Devices) مفت تقسیم کیے جا رہے ہیں۔ آج اسکرین ریڈر سافٹ ویئر، بولنے والے موبائل فون، بریل ڈسپلے اور سینسر والی اسمارٹ چھڑیاں نابینا افراد کے لیے تعلیم اور روزگار کے نئے دروازے کھول رہی ہیں۔
- روزگار میں 3 فیصد کوٹہ: پنجاب امپاورمنٹ آف پرسنز وِد ڈس ایبلٹیز ایکٹ کے تحت ملازمتوں میں افرادِ باہم معذوری کے 3 فیصد کوٹے پر سختی سے عمل درآمد کروایا جا رہا ہے تا کہ نابینا افراد باعزت روزگار حاصل کر سکیں۔

● نادرا کی خصوصی سہولیات: نادرا (NADRA) مراکز پر نابینا اور دیگر افرادِ باہم معذوری کو قطار کے بغیر ترجیحی بنیادوں پر ایگزیکٹو کیٹیگری میں تاحیات میعاد کے شناختی کارڈ (CNIC) جاری کیے جاتے ہیں۔

بیماریوں سے بچاؤ اور علاج کے لئے حکومت اور دیگر ادارے اہم کردار ادا کر رہے ہیں

پاکستان میں اندھے پن کی بڑی وجوہات میں سفید موتیا، کالا موتیا، قرنیہ کی بیماریاں اور ذیابیطس کے باعث پردۂ بصارت کا متاثر ہونا شامل ہیں۔ ان کی روک تھام اور علاج کے لیے درج ذیل اقدامات جاری ہیں:

● ٹریکوما کا خاتمہ: پاکستان نے ایک تاریخی کامیابی حاصل کرتے ہوئے اندھے پن کا باعث بننے والی متعدی بیماری ٹریکوما (روہے) کو صحتِ عامہ کے مسئلے کے طور پر ختم کر دیا ہے، جس کی تصدیق عالمی ادارۂ صحت نے کی ہے۔

● مفت آپریشن اور علاج: ملک کے سب سے بڑے مفت آئی کیئر نیٹ ورک ایل آر بی ٹی (LRBT) اور الشفاء ٹرسٹ آئی ہسپتال (Al-Shifa Trust) کروڑوں مریضوں کا مفت معائنہ و علاج اور لاکھوں کامیاب آپریشن، جیسے سفید موتیا، ریٹینا اور قرنیہ کی پیوند کاری، کر چکے ہیں۔

● سرکاری ہسپتالوں میں جدید علاج: حکومتِ پنجاب کے تحت میو ہسپتال لاہور جیسے بڑے سرکاری ہسپتالوں میں جدید ٹیکنالوجی کی مدد سے ریٹینا کیئر، بچوں کی آنکھوں کے علاج (Pediatric Ophthalmology) اور لیزر سرجری کی سہولیات فراہم کی جا رہی ہیں۔

● آئی کیمپس اور اسکول اسکریننگ: پنجاب ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ فلاحی اداروں (جیسے CBM اور HHRD) کے اشتراک سے دیہی اور پسماندہ علاقوں میں مفت آئی کیمپس لگاتا ہے، جہاں مفت مصنوعی عدسے (IOL) اور چشمے فراہم کیے جاتے ہیں۔ اسکولوں میں بچوں کی بینائی کی جانچ کی جاتی ہے تاکہ ابتدائی مرحلے پر ہی مسائل کی نشاندہی ہو سکے۔

● بنیادی سطح پر تشخیص: نیشنل پروگرام فار پریوینشن اینڈ کنٹرول آف بلائنڈنس کے تحت لیڈی ہیلتھ ورکرز (LHWs) کو آنکھوں کی عام بیماریوں کی ابتدائی تشخیص کی تربیت دی جا رہی ہے تاکہ گاؤں کی سطح پر ہی مریضوں کی نشاندہی کر کے انہیں بروقت علاج کے لیے بھیجا جا سکے۔

ہر شخص کو اپنی بینائی کی حفاظت کرنا لازمی ہے اور 40 سال کی عمر کے بعد ہر ایک سے دو سال میں آنکھوں کا مکمل معائنہ کروائیں، کیونکہ کالا موتیا ابتدا میں عموماً کوئی علامت ظاہر نہیں کرتا

۔ ذیابیطس کے مریض شوگر اور بلڈ پریشر کنٹرول میں رکھیں اور سال میں کم از کم ایک بار پردۂ بصارت کا معائنہ لازماً کروائیں۔

● بچوں کی بینائی کی جانچ اسکول جانے کی عمر سے پہلے کروائیں؛ بھینگا پن یا آنکھ کی پتلی میں سفیدی نظر آئے تو فوراً ماہر امراضِ چشم سے رجوع کریں۔

● ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر آنکھوں میں اسٹیرائیڈ والے قطرے استعمال نہ کریں؛ ان کا بے جا استعمال کالا موتیا اور سفید موتیا کا سبب بن سکتا ہے۔

● ویلڈنگ، کھیتی باڑی، کارخانوں کے کام اور آتش بازی کے دوران حفاظتی چشمہ استعمال کریں۔

● آنکھ میں کیمیکل یا تیزاب گرنے کی صورت میں فوراً کم از کم 15 منٹ تک صاف پانی سے آنکھ دھوئیں اور بلا تاخیر ہسپتال پہنچیں۔

15 اکتوبر کا یہ دن بینائی اور معذوری سے متعلق ان عالمی دنوں کی ایک کڑی ہے جو سال بھر اس موضوع کی جانب توجہ مبذول کرواتے ہیں۔ سال کا آغاز 4 جنوری کو عالمی یومِ بریل (World Braille Day) سے ہوتا ہے، جو بریل رسم الخط کے موجد لوئی بریل کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے منایا جاتا ہے۔ اکتوبر کی دوسری جمعرات کو عالمی یومِ بصارت (World Sight Day) آنکھوں کی صحت اور قابلِ علاج اندھے پن کی روک تھام کا پیغام دیتا ہے، اور اس کے چند ہی روز بعد 15 اکتوبر کو سفید چھڑی کے تحفظ کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ 3 دسمبر کو افرادِ باہم معذوری کے عالمی دن پر اختتام پذیر ہوتا ہے، جو معذوری کے ساتھ زندگی گزارنے والے تمام افراد کے حقوق اور معاشرے میں ان کی بھرپور شمولیت کی یاد دہانی ہے۔

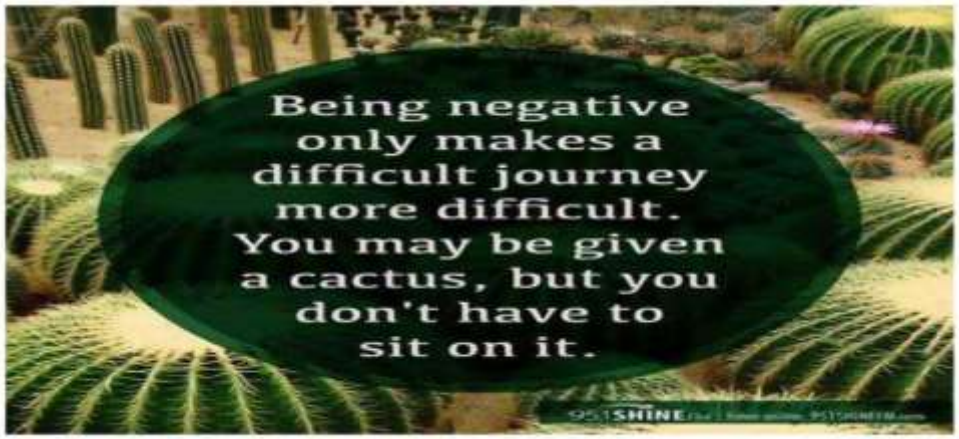

کانٹے ملیں تو ان پر بیٹھنا ضروری نہیں

زندگی کے سفر میں مشکلات آتی ہیں، مگر منفی سوچ ان مشکلات کو دوگنا کر دیتی ہے۔ اگر قسمت نے کیکٹس تھما دیا ہے تو اس پر بیٹھ کر خود کو زخمی کرنا ضروری نہیں۔ مثبت رویہ کٹھن راہ کو بھی آسان کر دیتا ہے۔

"آئینہ خیال و عکس زمانہ" سے منتخب ایک صفحہ

کانٹے ملیں تو ان پر بیٹھنا ضروری نہیں

زندگی کا سفر کبھی ہموار نہیں ہوتا۔ ہر انسان کو کسی نہ کسی موڑ پر ایسی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اس کے اختیار سے باہر ہوتی ہیں۔ حالات ہمیں کیکٹس تھما سکتے ہیں، مگر اس پر بیٹھ کر خود کو زخمی کرنا یا اسے ایک طرف رکھ کر آگے بڑھنا ہمارا اپنا فیصلہ ہے۔ منفی سوچ مسئلے کو حل نہیں کرتی بلکہ اس کا بوجھ دگنا کر دیتی ہے۔ شکوہ، مایوسی اور ایک ہی تکلیف کو بار بار دہرانا ہماری ساری توانائی اسی کانٹے پر صرف کروا دیتا ہے جس سے ہمیں بچنا تھا

۔اس کے برعکس مثبت رویہ مشکل سے انکار نہیں کرتا۔ وہ اسے حقیقت مان کر یہ سوچتا ہے کہ اب آگے کیا کیا جا سکتا ہے، اور یہی سوچ انسان کو حوصلہ، صبر اور راستہ نکالنے کی صلاحیت دیتی ہے۔ دانشمندی یہی ہے کہ جہاں ممکن ہو حالات بدلنے کی کوشش کریں، اور جہاں ممکن نہ ہو وہاں کم از کم اپنا ردِ عمل ایسا رکھیں کہ کٹھن راہ مزید کٹھن نہ بن جائے۔

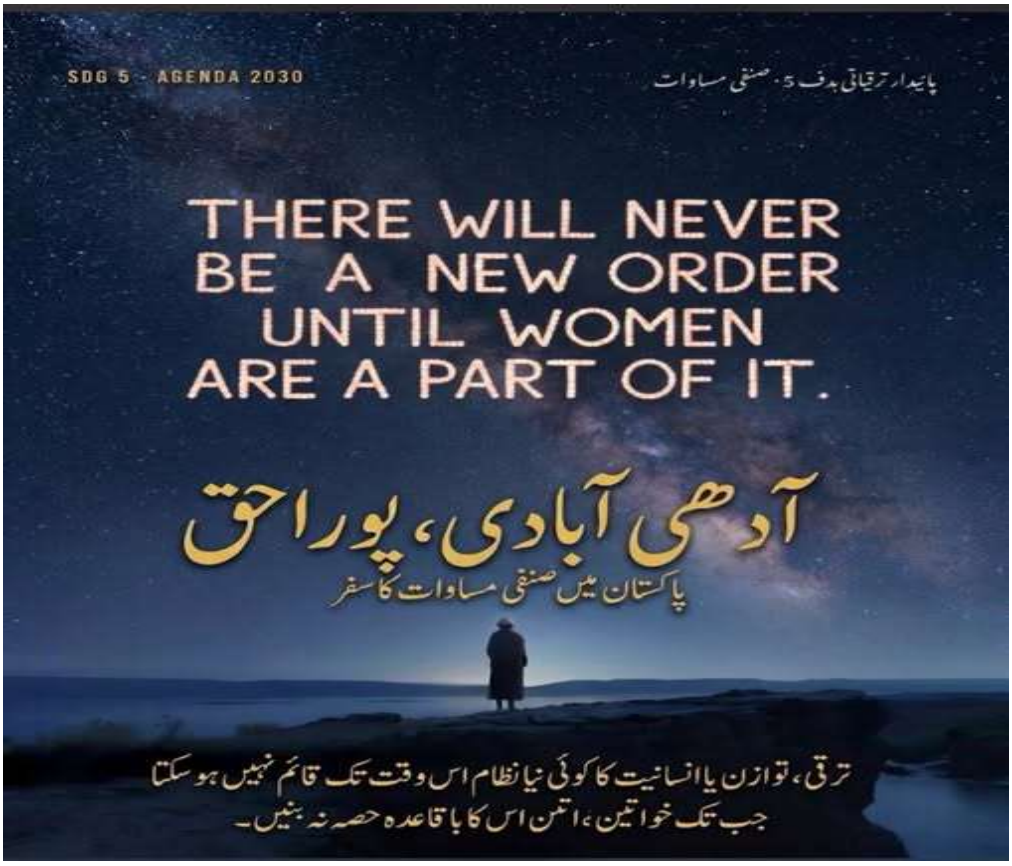

آدھی آبادی، پورا حق (پائیدار ترقیاتی ہدف 5 (SDG 5)

اور پاکستان میں صنفی مساوات کا سفر

اقوامِ متحدہ نے ستمبر 2015 میں "ایجنڈا 2030" کے تحت 17 پائیدار ترقیاتی اہداف (SDGs) منظور کیے، جن پر تمام 193 رکن ممالک نے اتفاق کیا۔ ان اہداف کے ساتھ 169 ذیلی اہداف بھی طے کیے گئے، جن کا مقصد 2030 تک غربت کا خاتمہ، زمین کا تحفظ اور سب کے لیے امن و خوشحالی ہے۔ اس پورے منصوبے کی روح یہ وعدہ ہے کہ ترقی کے سفر میں "کوئی پیچھے نہ رہ جائے"

۔انہی اہداف میں ہدف نمبر 5، یعنی صنفی مساوات، خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ دنیا کی تقریباً آدھی آبادی خواتین پر مشتمل ہے اور تعلیم، صحت، معیشت یا ماحول، کسی بھی شعبے میں دیرپا ترقی ان کی برابر شرکت کے بغیر ممکن نہیں۔ بجا طور پر کہا جاتا ہے کہ

"ترقی، توازن یا انسانیت کا کوئی نیا نظام اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک خواتین اس کا باقاعدہ حصہ نہ بنیں۔"

ہدف 5 کے تحت نو ذیلی اہداف رکھے گئے ہیں۔ ان کا خلاصہ یہ ہے کہ خواتین اور لڑکیوں کے خلاف ہر طرح کا امتیاز ختم ہو، گھر کے اندر اور باہر انہیں تشدد، اسمگلنگ اور استحصال سے تحفظ ملے، اور کم عمری و جبری شادی جیسی نقصان دہ رسموں کا خاتمہ ہو۔ گھریلو اور دیکھ بھال کے بلا معاوضہ کام کو تسلیم کرنا، سیاست، معیشت اور عوامی زندگی میں فیصلہ سازی کی ہر سطح پر خواتین کو برابر مواقع دینا، تولیدی صحت تک رسائی، زمین، جائیداد، وراثت اور مالی خدمات پر برابر حق، جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے خواتین کو بااختیار بنانا اور ان مقاصد کے لیے مضبوط پالیسیاں اور قوانین بنانا بھی اسی ہدف کا حصہ ہیں۔ عالمی مالیاتی اداروں کی تحقیق بتاتی ہے کہ جب خواتین معیشت میں آگے بڑھتی ہیں تو ملک کی مجموعی پیداوار بھی بڑھتی ہے، اس لیے صنفی مساوات صرف ایک اخلاقی تقاضا نہیں بلکہ معاشی ضرورت بھی ہے۔

دنیا بھر میں اس سمت میں پیش رفت تو ہوئی ہے، مگر اس کی رفتار بہت سست ہے۔ عالمی بینک کی رپورٹ Women, Business and the Law 2024 کے مطابق کوئی بھی ملک خواتین کو مردوں کے برابر مکمل قانونی حقوق نہیں دیتا، اور اوسطاً خواتین کو مردوں کے مقابلے میں صرف 64 فیصد قانونی تحفظ حاصل ہے۔ قومی پارلیمانوں میں خواتین کی نمائندگی تقریباً 27 فیصد اور انتظامی عہدوں پر ان کا حصہ تقریباً 28 سے 30 فیصد ہے۔ خواتین گھریلو اور دیکھ بھال کے بلا معاوضہ کاموں پر مردوں سے اوسطاً ڈھائی گنا زیادہ وقت صرف کرتی ہیں، اور اب بھی ہر پانچ میں سے تقریباً ایک لڑکی کی شادی 18 سال سے پہلے ہو جاتی ہے۔ ورلڈ اکنامک فورم کی گلوبل جینڈر گیپ رپورٹ 2025 کے مطابق دنیا اب تک صنفی فرق کا تقریباً 69 فیصد ختم کر سکی ہے، اور اسی رفتار سے مکمل برابری تک پہنچنے میں تقریباً 123 سال لگ سکتے ہیں۔

پاکستان نے ان اہداف کو اپنانے میں پہل کی۔ فروری 2016 میں قومی اسمبلی نے متفقہ قرارداد کے ذریعے انہیں قومی ترقیاتی ایجنڈا قرار دیا اور ان کی نگرانی کے لیے پارلیمانی ٹاسک فورس اور SDGs سیکرٹریٹ قائم کیے۔ پاکستان 1996 سے خواتین کے خلاف امتیاز کے خاتمے کے عالمی معاہدے (CEDAW) کا رکن ہے، اور یورپی یونین کی GSP+ تجارتی رعایت بھی اسی سمیت 27 عالمی معاہدوں پر عمل درآمد سے مشروط ہے۔ 1973 کا آئین بھی صنفی برابری کی مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے۔

آرٹیکل 25 سب شہریوں کو قانون کی نظر میں برابر قرار دے کر صرف جنس کی بنیاد پر امتیاز سے روکتا ہے، آرٹیکل 27 سرکاری ملازمتوں میں ایسے امتیاز کی ممانعت کرتا ہے، آرٹیکل 32 اور 34 مقامی حکومتوں اور قومی زندگی کے ہر شعبے میں خواتین کی شرکت کو یقینی بنانے کا تقاضا کرتے ہیں، اور آرٹیکل 35 اور 37 ماں، بچے اور ملازمت پیشہ خواتین کو تحفظ دیتے ہیں۔ قومی اسمبلی میں 60، سینیٹ میں 17 اور صوبائی اسمبلیوں میں بھی خواتین کے لیے نشستیں مخصوص ہیں۔

انہی بنیادوں پر کئی اہم قوانین بنے، جن میں کام کی جگہ پر ہراسانی سے تحفظ کا قانون (2010، ترمیم 2022)، تیزاب گردی کے خلاف قانون (2011)، سندھ، بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں گھریلو تشدد کے خلاف قوانین، پنجاب تحفظِ نسواں ایکٹ (2016)، غیرت کے نام پر قتل کے خلاف ترمیمی قانون (2016)، الیکشنز ایکٹ 2017 جس کے تحت سیاسی جماعتوں کے لیے جنرل نشستوں پر کم از کم 5 فیصد ٹکٹ خواتین کو دینا لازم ہے، خواتین کے حقِ جائیداد کے نفاذ کے قوانین اور انسدادِ عصمت دری ایکٹ (2021) شامل ہیں۔
ان کوششوں کے مثبت نتائج بھی سامنے آئے ہیں۔ جامعات میں طالبات کی تعداد تقریباً طلبہ کے برابر ہو چکی ہے اور میڈیکل سمیت کئی شعبوں میں لڑکیاں آگے ہیں۔ قومی کمیشن برائے وقارِ نسواں، صوبائی کمیشن، انسدادِ ہراسانی کے محتسب، خواتین کا پارلیمانی کاکس، ویمن پروٹیکشن سیل، ملتان میں تشدد کا شکار خواتین کا مرکز اور 1099 و 1043 جیسی ہیلپ لائنز خواتین کی داد رسی کر رہی ہیں، جبکہ 2022 میں قومی صنفی پالیسی فریم ورک بھی متعارف کرایا گیا۔ 1994 سے جاری لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام کی 90 ہزار سے زائد کارکنان دیہات میں ماں اور بچے کی صحت، خاندانی منصوبہ بندی اور پولیو سمیت حفاظتی ٹیکوں کی مہمات میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں

۔ بینظیر انکم سپورٹ پروگرام 2008 سے مالی امداد براہِ راست گھر کی خاتون کو دیتا ہے؛ اس سے تقریباً ایک کروڑ خاندان فائدہ اٹھا رہے ہیں اور لاکھوں خواتین کو پہلی بار شناختی کارڈ اور بینکاری تک رسائی ملی ہے۔ اسٹیٹ بینک کی "بینکنگ آن ایکویٹی" پالیسی (2021) بھی خواتین کی مالی شمولیت بڑھانے کی ایک اہم کوشش ہے۔ قیادت کے میدان میں بینظیر بھٹو کسی مسلم اکثریتی ملک کی پہلی منتخب خاتون وزیرِ اعظم بنیں، جبکہ ڈاکٹر فہمیدہ مرزا پہلی خاتون اسپیکر قومی اسمبلی، لیفٹیننٹ جنرل نگار جوہر پہلی خاتون تھری اسٹار جنرل، جسٹس عائشہ ملک سپریم کورٹ کی پہلی خاتون جج اور مریم نواز کسی صوبے کی پہلی خاتون وزیرِ اعلیٰ بنیں۔

تاہم ان کامیابیوں کے باوجود منزل ابھی دور ہے۔ ورلڈ اکنامک فورم کے گلوبل جینڈر گیپ انڈیکس 2025 میں پاکستان 148 ممالک میں آخری نمبر پر رہا۔ ملک میں صرف 21 سے 24 فیصد خواتین لیبر فورس کا حصہ ہیں، جبکہ عالمی اوسط تقریباً 47 فیصد ہے۔ کام کرنے والی زیادہ تر خواتین زراعت، گھریلو صنعت اور غیر رسمی شعبے سے وابستہ ہیں جہاں نہ مناسب اجرت ملتی ہے نہ سماجی تحفظ، اور بہت سی تعلیم یافتہ خواتین ڈگری لینے کے بعد بھی ملازمت تک نہیں پہنچ پاتیں۔ ڈے کیئر کی کمی، محفوظ سفری سہولت کا فقدان اور ہراسانی کا خوف اس راہ کی بڑی رکاوٹیں ہیں۔ مالی شمولیت میں بھی فرق نمایاں ہے: تقریباً 13 فیصد خواتین کے پاس بینک یا موبائل اکاؤنٹ ہے جبکہ عالمی سطح پر یہ شرح تقریباً 74 فیصد ہے، اور موبائل انٹرنیٹ کے استعمال میں صنفی فرق کے لحاظ سے بھی پاکستان دنیا کے نمایاں ممالک میں شامل ہے۔

سیاست میں مخصوص نشستوں کی بدولت پارلیمان میں خواتین کا حصہ تقریباً 20 فیصد ہے، مگر براہِ راست انتخاب جیتنے والی خواتین بہت کم ہیں اور جماعتیں عموماً ٹکٹوں کی قانونی کم از کم حد سے آگے نہیں بڑھتیں۔ 2024 کے انتخابات کے وقت مرد اور خواتین ووٹرز کی تعداد میں تقریباً ایک کروڑ کا فرق تھا، جبکہ کابینہ، اعلیٰ عدلیہ اور اعلیٰ سول سروس میں بھی خواتین کی تعداد کم ہے۔

تعلیم اور صحت کے اشاریے بھی تشویشناک ہیں۔ 2023 کی مردم شماری کے مطابق مردوں میں خواندگی کی شرح تقریباً 68 فیصد اور خواتین میں 53 فیصد ہے، اور دیہات میں یہ فرق اور بھی زیادہ ہے۔ اڑھائی کروڑ سے زائد بچے اسکول سے باہر ہیں جن میں لڑکیوں کی تعداد زیادہ ہے، اور بہت سی لڑکیاں پرائمری کے بعد تعلیم چھوڑ دیتی ہیں

۔2019 کے سروے کے مطابق زچگی کے دوران اموات کی شرح فی ایک لاکھ پیدائشوں پر 186 ہے، جو خطے کے کئی ممالک سے زیادہ ہے، جبکہ 2018 کے قومی غذائی سروے کے مطابق تقریباً 42 فیصد خواتین خون کی کمی کا شکار تھیں۔ پاکستان ڈیموگرافک اینڈ ہیلتھ سروے (PDHS 2017-18) کے مطابق تقریباً 28 فیصد شادی شدہ خواتین کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا، غیرت کے نام پر قتل کے سینکڑوں واقعات ہر سال رپورٹ ہوتے ہیں اور ایسے مقدمات میں سزا کم ہی ملتی ہے۔ تقریباً ہر چھ میں سے ایک لڑکی کی شادی 18 سال سے پہلے ہو جاتی ہے؛ سندھ (2013) اور اسلام آباد (2025) میں شادی کی کم از کم عمر 18 سال مقرر ہو چکی ہے، مگر باقی صوبوں میں لڑکیوں کے لیے یہ اب بھی 16 سال ہے۔

اسی طرح اسلامی تعلیمات اور ملکی قانون دونوں خواتین کو وراثت کا حق دیتے ہیں، مگر سماجی دباؤ، زمین کے ریکارڈ کی پیچیدگیوں اور طویل عدالتی کارروائیوں کی وجہ سے بہت سی خواتین اپنے حصے سے محروم رہ جاتی ہیں، اور جائیداد نہ ہونے کے باعث قرض اور کاروبار کے مواقع بھی ان کی پہنچ سے دور رہتے ہیں۔

ان مسائل کا حل ایک جامع حکمتِ عملی میں ہے۔ لڑکیوں کی ثانوی تعلیم جاری رکھنے کے لیے وظائف، محفوظ ٹرانسپورٹ، اسکولوں میں بنیادی سہولیات اور خواتین اساتذہ فراہم کی جائیں۔ کام کی جگہوں پر ڈے کیئر، لچکدار اوقاتِ کار اور زچگی کی چھٹی کے قوانین پر عمل ہو، خواتین کاروباری افراد کو آسان قرضے اور گھر بیٹھ کر کام کرنے والی خواتین کو قانونی تحفظ ملے

۔زمین کا ریکارڈ مکمل طور پر ڈیجیٹل کر کے وراثتی انتقال میں خواتین کا نام لازمی درج کیا جائے، جنرل نشستوں پر خواتین کے ٹکٹ بتدریج بڑھائے جائیں، پورے ملک میں شادی کی کم از کم عمر 18 سال مقرر ہو، اور صنفی تشدد کے مقدمات کے لیے خصوصی عدالتیں اور فرانزک سہولیات مضبوط کی جائیں

۔لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام کی توسیع، خواتین کی ڈیجیٹل و مالی شمولیت، صنفی بنیاد پر الگ اعداد و شمار، صنفی لحاظ سے حساس بجٹ سازی، اور میڈیا، نصاب، علمائے کرام اور مردوں کو شراکت دار بنا کر سماجی سوچ میں تبدیلی بھی اتنی ہی ضروری ہے

۔پاکستان کے پاس آئینی ضمانتیں، قوانین اور کامیاب مثالیں موجود ہیں؛ اصل امتحان ان پر سنجیدہ عمل درآمد کا ہے۔ 2030 کی منزل قریب ہے، اور جو قوم اپنی آدھی آبادی کو تعلیم، معاشی خودمختاری، جائیداد کی ملکیت اور فیصلہ سازی میں حقیقی حصہ دے گی، وہی ترقی کی منزل پا سکے گی۔



12 اکتوبر – جوڑوں کے درد کا عالمی دن (World Arthritis Day)

اور پاکستان اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات کا جائزہ

ورلڈ آرتھرائٹس ڈے (World Arthritis Day) یعنی جوڑوں کے درد کا عالمی دن ہر سال 12 اکتوبر کو منایا جاتا ہے یہ دن Arthritis and Rheumatism International (ARI) نامی ایک بین الاقوامی تنظیم کی کوششوں سے 1996 میں قائم کیا گیا۔ بعد میں یورپ کی بڑی طبی تنظیم EULAR (یورپین الائنس آف ایسوسی ایشنز فار ریوماٹولوجی) اور امریکہ کے Arthritis Foundation سمیت دنیا بھر کے اداروں نے اس مہم کو آگے بڑھایا۔ سے اپنے پہلے ہی سال یعنی 1996ء میں بین الاقوامی سطح پر تسلیم کر کے "عالمی دن" کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ تب سے لے کر آج تک ہر سال 12 اکتوبر کو دنیا بھر کے تمام ممالک، بشمول پاکستان، میں ڈاکٹرز، مریض اور طبی ادارے مل کر اس بیماری کے خلاف شعور بیدار کرتے ہیں۔ آرتھرائٹس کی 100 سے زیادہ اقسام ہیں، لیکن ان میں سب سے عام آسٹیو آرتھرائٹس (Osteo arthritis) ہے، جو بڑھتی عمر یا وزن کی وجہ سے جوڑوں کی لچکدار ہڈی (Cartilage) گھسنے سے ہوتی ہے

۔دوسری عام قسم ریوماٹائڈ آرتھرائٹس (Rheumatoid Arthritis) ہے، جو ایک آٹوامیون بیماری ہے؛ اس میں انسان کا اپنا ہی مدافعت عامہ کا نظام جوڑوں کو نقصان پہنچانے لگتا ہے۔ اس کی عام علامات میں جوڑوں میں شدید درد، سوجن، اکڑن (خاص طور پر صبح کے وقت) اور حرکت کرنے میں دشواری شامل ہیں۔

عالمی سطح پر گھٹنوں کے درد اور آسٹیوارتھرائٹس (Osteoarthritis) کے کیسز میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی سطح پر گھٹنے کے آسٹیوارتھرائٹس (KOA) کے مریضوں کی تعداد 374.7 ملین (تقریباً 37 کروڑ 47 لاکھ) سے زیادہ ہے۔ اگر مجموعی طور پر جوڑوں کے درد (Osteoarthritis) کی بات کی جائے تو یہ تعداد 595 ملین سے تجاوز کر چکی ہے، جس میں سب سے بڑا حصہ گھٹنے کے درد کا ہے۔

دنیا میں گھٹنوں کے درد کے سب سے زیادہ مطلق کیسز (Absolute cases) چین، بھارت اور امریکہ میں پائے جاتے ہیں، جس کی بڑی وجہ ان ممالک کی بڑی آبادی اور موٹاپا ہے۔

سب سے زیادہ شرح :(Prevalence Rate) اگر آبادی کے تناسب (فیصد) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو جنوبی کوریا اور ہانگ کانگ ایشیا پیسیفک کے خطے سب سے اوپر ہیں

دنیا بھر میں مردوں کے مقابلے میں خواتین گھٹنوں کے درد کا شکار زیادہ ہوتی ہیں: اور ان کی شرح تقریباً 60٪ سے 62٪ ہے جبکہ مردوں کی شرح 38٪ سے 40٪ کے قریب ہے۔

خواتین میں مردوں کے مقابلے میں گھٹنے کے درد کا خطرہ 1.69 گنا زیادہ ہوتا ہے۔ (تاہم، 45 سال سے کم عمر میں یہ مردوں میں زیادہ دیکھا گیا ہے، لیکن 45 سال کے بعد خواتین میں یہ کثرت سے پایا جاتا ہے)۔

گھٹنوں کا درد عمر بڑھنے کے ساتھ بڑھتا ہے اور اس کا سب سے بڑا رسک گروپ 50 سال سے زائد عمر کے افراد ہیں۔ عالمی اعداد و شمار کے مطابق گھٹنے کے درد کے 73٪ مریضوں کی عمر 55 سال سے زیادہ ہے۔ تاہم، حالیہ برسوں میں موٹاپے (High BMI) اور سست طرزِ زندگی کی وجہ سے 40 سے 59 سال (مڈل ایج) کے لوگوں میں بھی یہ درد تیزی سے عام ہو رہا ہے۔

پاکستان میں گھٹنوں کے درد اور جوڑوں کے امراض کی صورت حال بھی تشویشناک حد تک بڑھ رہی ہے: گلوبل برڈن آف ڈیزیز (GBD) کے ڈیٹا کے مطابق پاکستان میں جوڑوں کے امراض (Osteoarthritis) کے مریضوں کی تعداد 1990 میں 2.85 ملین تھی جو بڑھ کر اب 8.49 ملین (تقریباً 85 لاکھ) ہو چکی ہے، اور اس میں 61 فیصد سے زائد حصہ صرف گھٹنے کے درد (Knee OA) کا ہے۔ پاکستان میں بھی خواتین اس سے شدید متاثر ہیں۔

رپورٹ کے مطابق پاکستان میں خواتین میں اس کی شرح 7,179 فی ایک لاکھ ہے، جبکہ مردوں میں یہ شرح 4,645 فی ایک لاکھ ہے، یعنی پاکستانی خواتین مردوں کے مقابلے کہیں زیادہ گھٹنوں کے درد کا شکار ہیں۔ اس کی بڑی وجوہات میں گھریلو کام کاج کا انداز، ورزش کی کمی، اور وزن کا بڑھنا شامل ہیں۔

پاکستان میں مقامی طبی تحقیقات کے مطابق 40 سے 54 سال اور 45 سے 75 سال کے عمر کے گروپوں میں گھٹنوں کے درد کی سب سے زیادہ شرح (تقریباً 46٪ تک) ریکارڈ کی گئی ہے۔
پاکستان میں سب سے زیادہ شرح اسلام آباد (ICT) میں دیکھی گئی ہے جبکہ سب سے کم شرح صوبہ خیبر پختونخوا میں رپورٹ ہوئی ہے۔
اس دن کو شروع کرنے کے بنیادی مقاصد درج ذیل تھے
آگاہی پھیلانا: آرتھرائٹس (گھٹیا/جوڑوں کا درد) اور اس سے جڑی 200 سے زائد ہڈیوں اور پٹھوں کی بیماریوں (RMDs) کے بارے میں دنیا بھر میں لوگوں کو آگاہ کرنا۔
برقت تشخیص :(Early Diagnosis) لوگوں کو یہ بتانا کہ اگر جوڑوں کے درد کی علامات کو وقت پر پہچان کر علاج شروع کر دیا جائے، تو معذوری سے بچا جا سکتا ہے۔
مریضوں کی مدد: آرتھرائٹس سے متاثرہ لاکھوں مریضوں کے مسائل کو اجاگر کرنا اور حکومتوں پر زور دینا کہ وہ ان کے علاج اور دیکھ بھال کے لیے بہتر پالیسیاں بنائیں۔

ورلڈ آرتھرائٹس ڈے کا مقصد ہر سال ایک مخصوص تھیم کے تحت لوگوں میں شعور بیدار کرنا ہوتا ہے۔ یہ مہمات زیادہ تر اس بات پر زور دیتی ہیں کہ آرتھرائٹس کے مریضوں کو کام کی جگہوں اور معاشرے میں برابر کے حقوق ملیں، اور طبی عملہ ان کی ذہنی و جسمانی صحت کو بہتر بنانے کے لیے جدید ترین علاج فراہم کرے۔ بروقت تشخیص اور طرزِ زندگی میں مثبت تبدیلیاں (جیسے متوازن غذا اور ہلکی ورزش) اس بیماری کے اثرات کو کافی حد تک کم کر سکتی ہیں۔

آرتھرائٹس (جوڑوں کے درد) سے بچاؤ، اس کے گھریلو علاج، مفید غذاؤں اور ورزشوں کی تفصیل درج ذیل ہے۔
جوڑوں۔ کے درد کو کم کرنے اور ہڈیوں کو مضبوط بنانے کے لیے غذائی تبدیلیاں اور گھریلو علاج بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔
اپنی روزمرہ خوراک میں اومیگا 3 فیٹی ایسڈ سے بھرپور چیزیں جیسے مچھلی، اخروٹ اور السی کے بیج شامل کریں، کیونکہ یہ جوڑوں کی سوجن کو کم کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہلدی اور ادرک میں قدرتی طور پر سوجن کش (anti-inflammatory) خصوصیات پائی جاتی ہیں، جنہیں دودھ یا چائے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ہڈیوں کی مضبوطی کے لیے کیلشیم اور وٹامن ڈی (جو دھوپ اور انڈے کی زردی سے ملتا ہے) کا متوازن استعمال بھی انتہائی ضروری ہے۔

جسمانی طور پر متحرک رہنا اور ہلکی ورزشیں کرنا جوڑوں کی اکڑن کو ختم کرنے کے لیے لازم ہے۔ آرتھرائٹس کے مریضوں کے لیے واک (پیدل چلنا)، تیراکی (Swimming)، اور سائیکل چلانا بہترین ورزشیں ہیں، کیونکہ ان سے جوڑوں پر زیادہ دباؤ نہیں پڑتا اور پٹھے مضبوط ہوتے ہیں۔ صبح کے وقت جوڑوں کی اکڑن دور کرنے کے لیے گرم ٹکور (Hot Compress) اور شدید درد یا سوجن کی صورت میں برف کی ٹکور (Cold Compress) کرنے سے فوری آرام ملتا ہے۔ وزن کو کنٹرول میں رکھنا آرتھرائٹس کے علاج کا سب سے اہم حصہ ہے کیونکہ زیادہ وزن گھٹنوں اور کولہوں کے جوڑوں پر دباؤ بڑھا دیتا ہے۔

پاکستان اور بالخصوص پنجاب میں حکومتی سطح پر جوڑوں کے درد (Arthritis/Rheumatology) اور ہڈیوں کے امراض کے علاج کے لیے مختلف پروگرامز اور طبی سہولیات دستیاب ہیں، تاہم ماہر ڈاکٹروں ریوماٹالوجسٹ (Rheumatologists) کی کمی کی وجہ سے مریضوں کا دباؤ اب بھی بہت زیادہ ہے۔

حکومتی اور نیم سرکاری سطح پر اس وقت درج ذیل صورتحال ہے:

1. سرکاری ہسپتالوں (ڈسٹرکٹ اور تحصیل ہیڈ کوارٹر (میں آرتھوپیڈک اور ریمیٹولوجی شعبہ جات فنکشنل ہیں اور ارتھوپیڈک سرجن تعنیات ہیں پنجاب کے بڑے سرکاری اور تدریسی ہسپتالوں جیسے لاہور میں میو ہسپتال، جناح ہسپتال، سروسز ہسپتال اور شیخ زاید ہسپتال میں ہڈیوں اور جوڑوں کے امراض کے لیے مخصوص اوپی ڈیز (OPDs) اور وارڈز موجود ہیں۔ ان ہسپتالوں میں جوڑوں کے درد کی ادویات سے لے کر جوڑ تبدیل کرنے (Joint Replacement/Knee Replacement) کی سرجریز بھی کی جاتی ہیں، جو نجی ہسپتالوں کے مقابلے میں انتہائی سستی یا مستحق مریضوں کے لیے بالکل مفت ہوتی ہیں۔

2. ہیلتھ کارڈ اور مفت ادویات کی فراہمی

مفت ادویات کی ہوم ڈیلیوری: حکومتِ پنجاب کی جانب سے شروع کیے گئے پروگرام کے تحت رجسٹرڈ دائمی مریضوں کو گھر کی دہلیز پر مفت ادویات فراہم کرنے کا سلسلہ جاری ہے، جس میں جوڑوں کے درد کی بنیادی ادویات بھی شامل ہیں۔

پنجاب ہیلتھ کنیکٹ پروگرام: پنجاب حکومت نے حال ہی میں پنجاب ہیلتھ کنیکٹ پروگرام شروع کیا ہے، جس کے تحت بیرون ملک مقیم پاکستانی اور غیر ملکی ماہر سرجنز اور ڈاکٹرز سرکاری ہسپتالوں میں آکر پیچیدہ امراض کے مفت آپریشنز کرتے ہیں اور مقامی ڈاکٹروں کو تربیت دیتے ہیں۔

3. پنجاب بیت المال اور مالی امداد

اگر کوئی غریب مریض سرکاری ہسپتال میں داخل ہو اور اسے جوڑوں کے علاج یا سرجری کے لیے مہنگی ادویات یا امپلانٹس (آلات) کی ضرورت ہو، تو پنجاب بیت المال کے ذریعے 50,000 روپے یا اس سے زائد کی یکمشت مالی امداد دی جاتی ہے۔ مریض اس کے لیے آن لائن یا ضلعی کمیٹی کے ذریعے اپلائی کر سکتے ہیں۔

4. فلاحی اور نیم سرکاری اشتراک (ٹرسٹ ہسپتال)۔ پاکستان میں جوڑوں کے درد کے علاج میں حکومتی سرپرستی

کے ساتھ ساتھ بڑے ٹرسٹ بھی اہم کردار ادا کر رہے ہیں:

گھر کی ٹرسٹ اینڈ ٹیچنگ ہسپتال (لاہور): یہ پاکستان میں ہڈیوں اور جوڑوں کے امراض کا سب سے بڑا اور جدید ترین مرکز مانا جاتا ہے، جہاں مستحق مریضوں کا علاج یا تو بالکل مفت کیا جاتا ہے یا انتہائی رعایتی نرخوں پر ہوتا ہے۔

آرتھرائٹس کیئر فاؤنڈیشن :(ACF) لاہور میں قائم یہ ٹرسٹ سرکاری ہسپتالوں (جیسے گنگارام ہسپتال) کے ساتھ مل کر غریب مریضوں کو جوڑوں کے درد کی انتہائی مہنگی حیاتیاتی ادویات (Biologics) اور مفت مشاورت فراہم کرتا ہے۔

اس وقت سرکاری سطح پر سب سے بڑا چیلنج ریمیٹولوجسٹس (جوڑوں کے امراض کے ماہرین) کی شدید کمی ہے۔ پورے پاکستان میں آبادی کے لحاظ سے ان ماہرین کی تعداد بہت کم ہے، جس کی وجہ سے سرکاری ہسپتالوں میں اپوائنٹمنٹ اور سرجری کے لیے مریضوں کو طویل انتظار کرنا پڑتا ہے

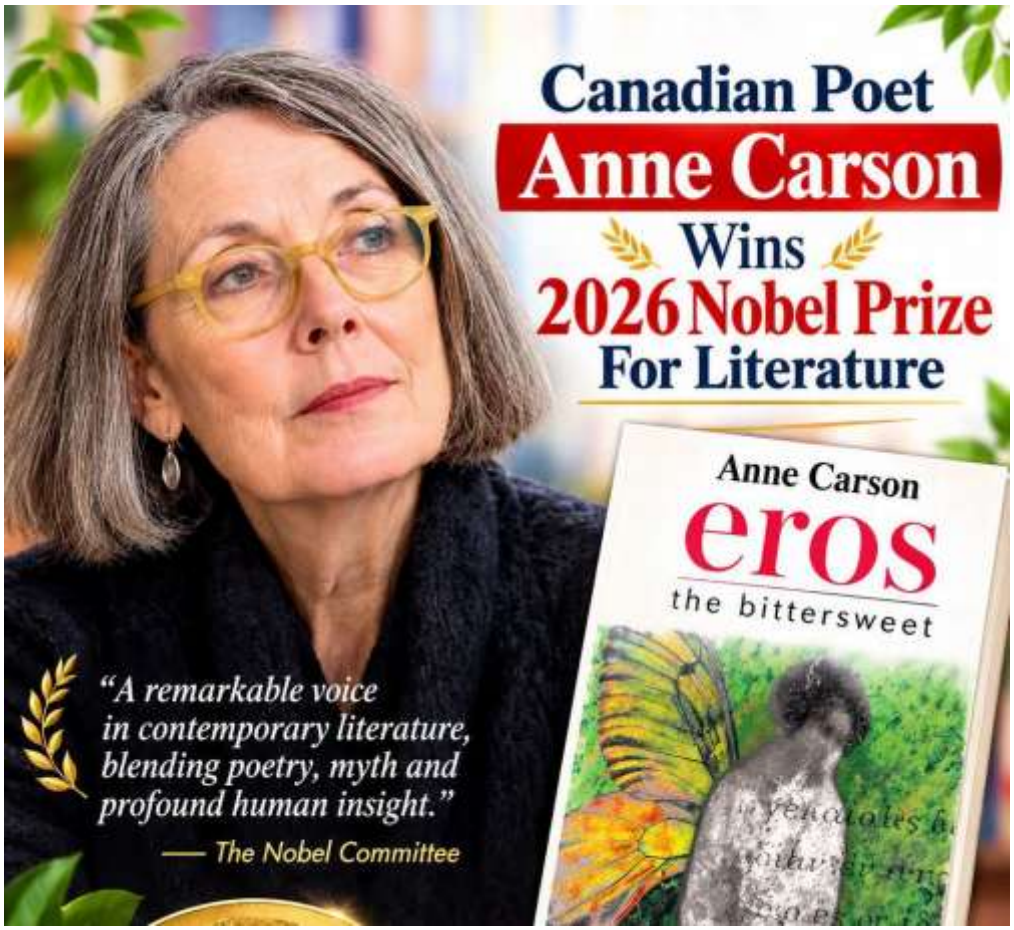

این کارسن- تلخ وشیریں کی شاعرہ-نوبیل انعام برائے ادب 2026 کے تناظر میں ایک ادبی مطالعہ

ادب کی تاریخ میں کچھ آوازیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی ایک صنف کے سانچے میں سمانے سے انکار کر دیتی ہیں۔ کینیڈا کی شاعرہ، مترجم اور کلاسیکی علوم کی ماہر این کارسن (Anne Carson) ایسی ہی ایک آواز ہیں۔ ۲۰۲۶ء کا نوبیل انعام برائے ادب انہیں ان کے زندگی بھر کے جرات مندانہ اور اختراعی ادبی کام کے اعتراف میں دیا گیا ہے۔ ان کی تحریریں بیک وقت نظم بھی ہیں اور مضمون بھی، ترجمہ بھی ہیں اور مکالمہ بھی؛ گویا ڈھائی ہزار برس پرانا یونان اکیسویں صدی کے کسی کمرے میں آ بیٹھا ہو اور آج کی زبان میں اپنے دکھ سنانے لگا ہو۔

این کارسن 21جون1950ء کو کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں پیدا ہوئیں۔ان کے والد بینک میں ملازم تھے اور تبادلوں کے سبب خاندان کا بچپن اونٹاریو کے مختلف قصبوں میں گزرا۔اسکول کے زمانے میں ایک استاد نے انہیں قدیم یونانی زبان سے متعارف کرایا،اور یہی لمحہ ان کی پوری زندگی کا رخ متعین کر گیا۔سیفو،ہومر اور یونانی المیہ نگار ان کے لیے محض نصاب نہیں رہے بلکہ ہم نشین بن گئے۔

انہوں نے یونیورسٹی آف ٹورنٹو سے کلاسیکی علوم میں بی اے،ایم اے اور ۱۹۸۱ء میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی،اور کچھ عرصہ اسکاٹ لینڈ کی سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی میں بھی زیرِ تعلیم رہیں۔بعد ازاں وہ پرنسٹن،مک گل،یونیورسٹی آف مشی گن اور نیویارک یونیورسٹی سمیت کئی ممتاز درس گاہوں میں کلاسیکی ادب اور تخلیقی تحریر کی تدریس کرتی رہیں۔ایک محقق کی باریک بینی اور ایک شاعر کی بے قراری کا یہی امتزاج ان کے اسلوب کی اصل پہچان ہے۔

سویڈش اکیڈمی عموماً کسی ایک تخلیق کے بجائے ادیب کی مجموعی ادبی خدمات اور اسلوب کو انعام کا معیار بناتی ہے۔این کارسن کے ہاں یہ اسلوب اپنی انفرادیت میں بے مثال ہے۔وہ کلاسیکی یونانی روایت کو عجائب گھر کی شے نہیں سمجھتیں بلکہ اس سے برابر کی سطح پر مکالمہ کرتی ہیں۔ان کے ہاں شاعری،نثر،ترجمہ،فلسفیانہ مضمون،ڈرامہ اور حتیٰ کہ تصویری کولاج بھی ایک دوسرے میں گھل مل کر ادب کی نئی صورتیں تراشتے ہیں

۔ان کے ترجمے بھی اسی تخلیقی جرأت کے آئینہ دار ہیں۔سیفو کے بکھرے ہوئے اشعار کو انہوں نے اس طرح انگریزی میں منتقل کیا کہ گم شدہ الفاظ کی جگہ خالی قوسیں چھوڑ دیں،تاکہ قاری اس خاموشی کو بھی پڑھ سکے جو وقت نے ان نظموں پر طاری کر دی ہے۔ان کے نزدیک ادھورا پن کوئی کمی نہیں،بلکہ معنی کا ایک دروازہ ہے؛اور یہی خیال آگے چل کر ان کی پوری فکر کا محور بنتا ہے۔

Autobiography of Red (1998)

یہ ان کا سب سے مشہور شاہکار اور منظوم ناول (Novel in Verse) ہے۔اس کی بنیاد قدیم یونانی شاعر اسٹی سیکورس کی ٹکڑوں میں باقی رہ جانے والی نظم پر ہے جس میں سرخ پروں والے عفریت گیریون کو ہیراکلیس قتل کر دیتا ہے۔کارسن اس اسطورہ کو پلٹ کر گیریون کو ایک حساس،تنہا،فوٹو گرافی کے شوقین نوجوان کی صورت میں پیش کرتی ہیں جو ہیراکلیس کی محبت میں گرفتار ہے۔یوں ایک قدیم دیومالا جدید دور کی شناخت،تنہائی اور محبت کی دل گداز داستان بن جاتی ہے

The Glass Essay (1995

یہ طویل نظم ان کے مجموعے Glass, Irony and God میں شامل ہے اور ان کی معروف ترین نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ اس میں ایک عورت محبت کے ٹوٹ جانے کے بعد شمال کے سرد میدانوں میں اپنی ماں کے پاس جاتی ہے اور ایملی برونٹے کی تحریروں کے آئینے میں اپنے جذباتی کرب کو سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہجر، یادداشت اور اپنی ذات سے سامنا اس نظم کے بنیادی موضوعات ہیں۔

ان کی دیگر اہم تصانیف میں The Beauty of the Husband (2001ء) شامل ہے جو ایک ٹوٹتی شادی پر انتیس منظوم "ٹینگو" پر مشتمل ہے

If Not, Winter (2002ء) سیفو کے اشعار کا ترجمہ ہے؛ اور Nox (2010ء) اپنے مرحوم بھائی کی یاد میں لکھا گیا مرثیہ ہے جو ایک بکس میں بند، ایک ہی طویل تہہ دار ورق کی صورت میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ Decreation، Red Doc>، Float اور یونانی المیوں کے متعدد ترجمے بھی ان کے ادبی سرمائے کا حصہ ہیں۔

نوبیل انعام سے پہلے بھی کارسن کا کام عالمی سطح پر سراہا جاتا رہا ہے۔ انہیں 2000ء میں میک آرتھر فیلوشپ ملی؛ 2001ء میں The Beauty of the Husband پر ٹی ایس ایلیٹ پرائز ملا اور وہ یہ انعام جیتنے والی پہلی خاتون بنیں؛ اسی برس Men in the Off Hours پر گریفن پوئٹری پرائز سے نوازا گیا؛ اور 2020ء میں انہیں اسپین کا پرنسس آف آسٹوریاس ایوارڈ برائے ادب دیا گیا۔

1986ء میں شائع ہونے والی کتاب Eros the Bittersweet کارسن کی پہلی کتاب ہے جو ان کے ڈاکٹریٹ کے مقالے سے پھوٹی۔ یہ روایتی معنوں میں کوئی نظم نہیں بلکہ ایک فلسفیانہ اور تنقیدی مضمون ہے، مگر اس کی نثر اس قدر شاعرانہ ہے کہ اسے پڑھتے ہوئے نظم کا گمان ہوتا ہے۔ اس کا مرکزی سوال یہ ہے: محبت، خواہش اور علم کے درمیان وہ کون سا فاصلہ ہے جو انسان کو بیک وقت سرشار بھی کرتا ہے اور زخمی بھی؟

اس سوال کی بنیاد سیفو کا وضع کردہ لفظ گلوکوپکروں Glukupikron ہے، یعنی "میٹھا کڑوا" یا تلخ و شیریں۔ سیفو نے محبت کو ایک ایسی "بے بس کر دینے والی مخلوق" کہا جو بیک وقت شیریں بھی ہے اور تلخ بھی۔ کارسن اسی ایک لفظ کو کھولتی چلی جاتی ہیں اور اس میں سے تین بنیادی نکتے برآمد کرتی ہیں:

خواہش کا مثلث: کارسن کے مطابق محبت کبھی دو لوگوں کے درمیان سیدھی لکیر نہیں ہوتی۔ اس کے ہمیشہ تین کونے ہوتے ہیں: عاشق، محبوب، اور ان کے درمیان حائل فاصلہ۔ اگر یہ فاصلہ مٹ جائے تو خواہش بھی دم توڑ دیتی ہے۔ خواہش زندہ ہی اس لیے ہے کہ کچھ ہے جو ابھی حاصل نہیں ہوا۔ خوشی اور درد کا ملاپ: محبت انسان کو زندگی کا شدید احساس دلاتی ہے، یہی اس کی شیرینی ہے؛ مگر وہ اس کی ذات کی سرحدیں بھی توڑ دیتی ہے اور اسے یاد دلاتی ہے کہ وہ نامکمل ہے، یہی اس کی تلخی ہے

علم اور محبت کا رشتہ: کارسن کا کہنا ہے کہ کسی کو چاہنے کی تڑپ اور کچھ جاننے کی تڑپ ایک ہی جذبے کی دو صورتیں ہیں۔ دونوں میں ذہن کسی نامعلوم کی طرف لپکتا ہے، اور دونوں میں وہ خلا ہی سب سے قیمتی ہے جو ابھی پُر نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ لکھنا اور پڑھنا بھی ان کے نزدیک عشق ہی کی ایک شکل ہے۔

"اگر ہم تلخی سے بچنے کے لیے خواہش ہی کو مار دیں، تو شیرینی بھی اسی کے ساتھ دفن ہو جائے گی۔"

کتاب کا اختتامی حصہ اپنی نثر کی لَے اور تمثیلی رنگ کے باعث ایک نثری نظم (Prose-Poem) کی طرح پڑھا جاتا ہے، اور اسے کتاب کا تخلیقی عروج سمجھا جاتا ہے۔ یہاں کارسن کی فکر ایک خیالی شہر کا نقشہ کھینچتی ہے، ایک ایسا شہر جہاں سے "ایروس" یعنی خواہش اور طلب کو ہمیشہ کے لیے جلاوطن کر دیا گیا ہو۔

اس شہر کی گلیاں پُرسکون ہیں۔ کوئی دریچہ کسی کی راہ نہیں تکتا، کوئی خط ادھورا نہیں رہتا، کوئی آنکھ ہجر میں نم نہیں ہوتی۔ کسی کو کسی شے کی کمی کا احساس نہیں ستاتا۔ پہلی نظر میں یہ امن و آسودگی کی کامل تصویر دکھائی دیتا ہے، ایک ایسی جنت جس کی آرزو ہر زخمی دل نے کبھی نہ کبھی کی ہو گی۔

مگر کارسن آہستہ آہستہ پردہ اٹھاتی ہیں، اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ سکون دراصل قبرستان کی خاموشی ہے۔ جس شہر میں کوئی کسی کو نہیں چاہتا، وہاں کوئی گیت بھی نہیں لکھا جاتا۔ جہاں کوئی سوال بے قرار نہیں کرتا، وہاں کوئی کتاب نہیں کھلتی، کوئی دریافت نہیں ہوتی، کوئی قدم آگے نہیں بڑھتا۔ خواہش کے ساتھ ہی تخلیق، شاعری، علم کی پیاس اور سفر کی سکت بھی رخصت ہو جاتی ہے

۔یہ شہر زندہ لوگوں کا نہیں، سانس لیتی ہوئی تصویروں کا شہر ہے۔

یہی اس تصور کا مرکزی پیغام ہے: انسان کو انسان بنانے والی شے اس کی تکمیل نہیں، اس کی تشنگی ہے۔ ہم جس فاصلے سے گھبراتے ہیں، وہی فاصلہ ہمیں حرکت دیتا ہے؛ جس ادھورے پن پر روتے ہیں، وہی ہمیں جینے، سوچنے اور تخلیق کرنے پر آمادہ رکھتا ہے۔ اگر ہم محبت کی تلخی سے بچنے کے لیے خواہش ہی کا گلا گھونٹ دیں، تو ہم زندگی کی اس خوبصورت دوڑ اور حرکت سے بھی محروم ہو جائیں گے جو ہماری روح کی دھڑکن ہے۔

یوں سیفو کا ڈھائی ہزار سال پرانا لفظ "تلخ و شیریں" کارسن کے ہاں ایک شکایت سے بدل کر ایک اقرار بن جاتا ہے: محبت کا تلخ و شیریں ہونا اس کا عیب نہیں، بلکہ زندگی کا اصل حسن ہے

۔

این کارسن کی تحریریں ہمیں سکھاتی ہیں کہ ماضی مرا نہیں، صرف ہماری توجہ کا منتظر ہے؛ کہ ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بھی مکمل نظم سے زیادہ کچھ کہہ سکتے ہیں؛ اور یہ کہ ہمارے دلوں کا خلا ہی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ نوبیل انعام اس آواز کا اعتراف ہے جس نے قدیم یونان کی سرگوشیوں کو آج کے انسان کی دھڑکن سے ہم آہنگ کر دیا، اور جس نے ہمیں یاد دلایا کہ چاہنا، چاہے کتنا ہی دکھ دے، زندہ ہونے کا دوسرا نام ہے۔



11 اکتوبر-بچیوں کا عالمی دن: پڑھی لکھی بیٹی -روشن پاکستان

بچیوں کا عالمی دن (International Day of the Girl Child) ہر سال 11 اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔ اس کا بنیادی مقصد لڑکیوں کے حقوق، تعلیم، صحت، تحفظ اور انہیں درپیش چیلنجز — خصوصاً کم عمری کی شادی اور صنفی امتیاز — کے بارے میں عالمی شعور بیدار کرنا ہے۔ اقوامِ متحدہ کے کنونشن برائے حقوقِ اطفال (UNCRC 1989) کے مطابق 18 سال سے کم عمر کا ہر انسان "بچہ" کہلاتا ہے۔ اس دن کی شروعات کا سہرہ بین الاقوامی تنظیم "پلان انٹرنیشنل" کے سر جاتا ہے جس نے 2007ء میں "Because I am a Girl" مہم شروع کی۔ بعد ازاں کینیڈا کی حکومت نے اس مقصد کو بین الاقوامی سطح پر اٹھایا اور وفاقی وزیر رونا ایمبروز کی سفارتی کوششوں کے نتیجے میں 19 دسمبر 2011ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد 66/170 منظور کی۔ یوں 11 اکتوبر 2012ء کو پہلا عالمی دن منایا گیا جس کا موضوع "بچپن کی شادی کا خاتمہ" رکھا گیا۔

پاکستان میں آئین پاکستان بچیوں کو تحفظ اور ترقی کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ آئین کا آرٹیکل 25 تمام شہریوں کی برابری اور ریاست کی جانب سے خواتین و بچوں کے لیے خصوصی اقدامات کا حق دیتا ہے۔ 2010ء کی 18ویں آئینی ترمیم کے بعد شامل کیے گئے آرٹیکل 25-اے کے تحت 5 سے 16 سال کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنا ریاست کی ذمہ داری قرار دی گئی۔ اس ترمیم کے بعد بچوں اور خواتین کی فلاح و بہبود اور قانون سازی کے بیشتر اختیارات صوبوں کو منتقل ہو گئے، جس سے بچیوں کی بہتری کے لیے صوبائی سطح پر اقدامات کی بنیاد رکھی گئی۔

آئینی ضمانتوں اور پیش رفت کے باوجود پاکستان میں بچیوں کی حالتِ زار تشویش ناک ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک میں ڈھائی کروڑ سے زائد بچے سکولوں سے باہر ہیں جن میں لڑکیوں کی اکثریت ہے، جبکہ ثانوی تعلیم تک پہنچتے پہنچتے سکول چھوڑنے کی شرح مزید بڑھ جاتی ہے

یونیسیف کے مطابق پاکستان میں تقریباً ہر چھ میں سے ایک خاتون کی شادی 18 سال سے کم عمر میں ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ عالمی اقتصادی فورم کی صنفی فرق کی رپورٹ (Global Gender Gap Report) میں پاکستان مسلسل نچلے درجوں میں شامل رہا ہے۔ غذائی قلت، زچگی کے خطرات اور قدرتی آفات بھی بچیوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتی ہیں۔ تاہم، بینظیر انکم سپورٹ پروگرام جیسے اقدامات کے ذریعے لڑکیوں کو زیادہ تعلیمی وظائف دے کر سکولوں میں داخلے کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے۔

آبادی کے لحاظ سے پاکستان کے سب سے بڑے صوبے پنجاب (آبادی تقریباً 12 کروڑ 77 لاکھ) کی صورتحال پورے ملک پر اثر انداز ہوتی ہے۔ پنجاب میں قانونی سطح پر اہم اصلاحات کی گئی ہیں؛

پنجاب میرج ریسٹرینٹ (ترمیمی) ایکٹ 2015ء کے تحت کم عمری کی شادی پر سزاؤں میں اضافہ کیا گیا، تاہم قانونی عمر بدستور 16 سال ہے۔ دیگر قوانین میں پنجاب مفت و لازمی تعلیم ایکٹ 2014ء، تحفظِ خواتین ایکٹ 2016ء (جس کے تحت ویمن پروٹیکشن اتھارٹی قائم ہوئی)، اور پنجاب ڈومیسٹک ورکرز ایکٹ 2019ء شامل ہیں جو 15 سال سے کم عمر بچوں کو گھریلو ملازمت سے روکتا ہے۔ مزید برآں، چائلڈ پروٹیکشن اینڈ ویلفیئر بیورو بے سہارا اور خطرے سے دوچار بچیوں کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔

پنجاب میں بچیوں کی خواندگی بڑھانے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔ 2004ء سے جاری "خواتین سکول وظیفہ پروگرام" کے تحت کم خواندگی والے اضلاع میں سرکاری سکولوں کی طالبات کو مالی معاونت فراہم کی جاتی ہے۔ اسی طرح "زیورِ تعلیم پروگرام" کے ذریعے جنوبی پنجاب کے پسماندہ اضلاع کی طالبات کے لیے مشروط وظائف رکھے گئے ہیں تاکہ ان کی سکول میں حاضری یقینی بنائی جا سکے۔ مزید برآں، پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن (PEF) پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ کے ذریعے کم آمدنی والے خاندانوں کی بچیوں کو مفت تعلیم کی سہولیات فراہم کر رہی ہے۔

ان تمام اقدامات کے باوجود پنجاب میں بچیوں کو تشویش ناک چیلنجز کا سامنا ہے۔ 2018ء میں قصور میں کمسن زینب سے زیادتی اور قتل کے المناک سانحے نے ملک بھر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا، جس کے بعد "زینب الرٹ ایکٹ" منظور ہوا۔ صوبے میں گھریلو ملازمہ بچیوں پر تشدد کے واقعات، بھٹہ خشت پر جبری مشقت، دیہی علاقوں میں لڑکیوں کے لیے مڈل وہائی سکولوں کی کمی، فاصلے اور محفوظ ٹرانسپورٹ کا نہ ہونا بڑے رکاوٹیں ہیں۔ مزید بر آں، صوبے میں شادی کی قانونی عمر 18 سال نہ ہونا بھی ایک بڑا مسئلہ ہے۔

2012ء کے بعد سے عالمی اور قومی سطح پر آگاہی میں اضافہ ہوا ہے، فرسودہ سماجی سوچ بدل رہی ہے اور سندھ و اسلام آباد میں شادی کی قانونی عمر 18 سال کی جا چکی ہے۔ تاہم پنجاب، خیبر پختونخوا اور بلوچستان میں بھی شادی کی کم از کم عمر 18 سال مقرر کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ بچیوں کے عالمی دن کا پیغام یہی ہے کہ بچیوں پر سرمایہ کاری دراصل ایک مضبوط اور خوشحال پاکستان پر سرمایہ کاری ہے۔ دیہی علاقوں میں سکولوں کا قیام، غذائیت کی بہتری، اور پیدائش و نکاح کی لازمی رجسٹریشن جیسے اقدامات سے ہی ہم اپنی بچیوں کو محفوظ اور بااختیار مستقبل دے سکتے ہیں۔۔



10 اکتوبر۔۔عالمی یوم ذہنی صحت-خاموش بحران سے قومی ترجیح تک: پاکستان میں ذہنی صحت کا مقدمہ

ہر سال 10 اکتوبر کو دنیا بھر میں عالمی یومِ ذہنی صحت (World Mental Health Day) منایا جاتا ہے، جس کا مقصد ذہنی صحت کے بارے میں شعور اجاگر کرنا، اس سے جڑی سماجی بدنامی کا خاتمہ کرنا اور معیاری علاج تک ہر شہری کی رسائی کے لیے آواز بلند کرنا ہے۔ ذہنی صحت سے مراد انسان کی جذباتی، نفسیاتی اور سماجی فلاح و بہبود (Well-being) ہے، جو یہ طے کرتی ہے کہ ہم کس طرح سوچتے، محسوس کرتے اور عمل کرتے ہیں، دباؤ کا کس طرح سامنا کرتے ہیں، دوسروں کے ساتھ تعلقات کیسے استوار کرتے ہیں اور زندگی کے اہم فیصلے کیسے کرتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق صحت محض بیماری کی عدم موجودگی کا نام نہیں بلکہ مکمل جسمانی، ذہنی اور سماجی بہبود کی حالت ہے۔ اسی طرح ذہنی صحت بھی صرف کسی عارضے کا نہ ہونا نہیں، بلکہ زندگی میں توازن، اندرونی سکون اور مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی صلاحیت کا نام ہے۔

ماہرین کے نزدیک ذہنی صحت چند بنیادی ستونوں پر کھڑی ہوتی ہے۔ پہلا ستون جذباتی صحت (Emotional Well-being) ہے، یعنی خوشی، غصہ، غم اور خوف جیسے جذبات کو پہچاننا، قبول کرنا اور مناسب انداز میں ظاہر کرنا۔ دوسرا نفسیاتی صحت (Psychological Well-being) ہے، جس میں مثبت سوچ، خود اعتمادی اور بدلتے حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت (Resilience) شامل ہیں۔ تیسرا سماجی صحت (Social Well-being) ہے، یعنی خاندان، دوستوں اور معاشرے کے ساتھ مضبوط اور صحت مند رشتے قائم رکھنا۔ چوتھا ستون تناؤ کا انتظام (Stress Management) ہے، جو زندگی کے دباؤ اور چیلنجز کا حوصلے اور درست حکمتِ عملی سے سامنا کرنے کی اہلیت ہے، جبکہ پانچواں ادراکی صلاحیت (Cognitive Functioning) ہے، یعنی توجہ مرکوز رکھنا، حالات کو درست طور پر سمجھنا اور بروقت درست فیصلے کرنا۔ ان میں سے کسی ایک ستون کی کمزوری پوری شخصیت اور روزمرہ کارکردگی کو متاثر کر سکتی ہے۔

اس دن کو منانے کا خیال سب سے پہلے ورلڈ فیڈریشن فار مینٹل ہیلتھ (WFMH) کے اس وقت کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل رچرڈ ہنٹر (Richard Hunter) نے پیش کیا، اور پہلی بار یہ دن 10 اکتوبر 1992ء کو منایا گیا۔ ابتدا میں یہ کوئی باقاعدہ مہم نہیں تھی بلکہ امریکی ریاست فلوریڈا کے شہر تالاہاسی (Tallahassee) سے ایک عالمی نشریات کی گئی جس میں سیٹلائٹ کے ذریعے مختلف ممالک کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کا پس منظر یہ تھا کہ بیسویں صدی کے اواخر تک جسمانی بیماریوں پر تو کھل کر بات ہوتی تھی، مگر ذہنی امراض کو شرمندگی اور ممنوعہ موضوع (Stigma) سمجھا جاتا تھا اور مریضوں کو ہمدردی کے بجائے تنہائی اور بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ 1992ء سے 1994ء تک یہ دن بغیر کسی مخصوص موضوع کے عام آگاہی کے لیے منایا گیا، جبکہ 1994ء میں فیڈریشن کے اس وقت کے سربراہ یوجین بروڈی (Eugene Brody) کی تجویز پر پہلی بار باقاعدہ عالمی تھیم

"دنیا بھر میں ذہنی صحت کی خدمات کے معیار کو بہتر بنانا "

مقرر کی گئی۔ عالمی ادارہ صحت کی سرپرستی کے بعد آج یہ دن 150 سے زائد ممالک میں سرکاری و غیر سرکاری سطح پر سیمینارز، آگاہی واکس اور مہمات کے ذریعے منایا جاتا ہے۔ حالیہ برسوں میں اس دن کے موضوعات بھی عصری ضرورتوں کی عکاسی کرتے رہے ہیں؛ 2024ء کا موضوع کام کی جگہ پر ذہنی صحت تھا، جبکہ 2025ء میں آفات اور ہنگامی حالات میں ذہنی صحت کی خدمات تک رسائی کو مرکزِ توجہ بنایا گیا۔

عام طور پر ذہنی امراض اور دماغی یا اعصابی امراض کو ایک ہی سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ طبی لحاظ سے ان میں فرق ہے۔ ذہنی یا نفسیاتی امراض میں ڈپریشن، اینگزائٹی (اضطراب)، بائی پولر ڈس آرڈر، شیزوفرینیا، او سی ڈی (وسواسی جبری عارضہ)، صدمے کے بعد کا دباؤ (PTSD) اور منشیات کی لت شامل ہیں، جن کا علاج ماہرینِ نفسیات اور کلینیکل سائیکالوجسٹ کرتے ہیں

دوسری جانب اعصابی امراض (Neurological Disorders) میں فالج (Stroke)، الزائمر اور پارکنسنز جیسے نیوروڈیجنریٹو امراض، دماغی رسولیاں (جن میں گریڈ 4 کا انتہائی مہلک گلیوبلاسٹوما شامل ہے)، گردن توڑ بخار (Meningitis) اور انسیفلائٹس جیسے انفیکشن، مِلٹیپل سکلیروسیس اور مرگی شامل ہیں، جن کا علاج عموماً نیورولوجسٹ کرتے ہیں۔ ان میں فالج دنیا بھر میں اموات اور معذوری کی بڑی وجوہات میں سے ایک ہے اور بروقت علاج نہ ملنے پر چند گھنٹوں میں ناقابلِ تلافی نقصان ہو سکتا ہے۔ یہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے جڑے بھی ہیں، کیونکہ فالج یا مرگی کے بیشتر مریض بعد میں ڈپریشن کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دو ہفتے سے زائد مسلسل اداسی، نیند اور بھوک میں نمایاں تبدیلی، دلچسپی کا ختم ہو جانا، لوگوں سے کٹ جانا اور خود کو نقصان پہنچانے کے خیالات ایسی علامات ہیں جن پر فوری طور پر ماہر سے رجوع کرنا چاہیے۔

عالمی ادارہ صحت کے تازہ اندازوں کے مطابق دنیا میں ایک ارب سے زائد افراد کسی نہ کسی ذہنی عارضے کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، جن میں ڈپریشن اور اینگزائٹی سب سے عام ہیں۔ ہر سال سات لاکھ سے زائد افراد خودکشی کے باعث جان کی بازی ہار جاتے ہیں اور یہ 15 سے 29 سال کے نوجوانوں میں اموات کی بڑی وجوہات میں شامل ہے۔ ڈپریشن اور اینگزائٹی کے باعث کام کی صلاحیت میں کمی سے عالمی معیشت کو سالانہ تقریباً ایک ٹریلین ڈالر کا نقصان ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بڑی کارپوریشنز اب ملازمین کی ذہنی صحت کو اپنی ترجیحات میں شامل کر رہی ہیں۔ اس کے باوجود بیشتر ممالک اپنے صحت کے بجٹ کا محض دو فیصد کے لگ بھگ ذہنی صحت پر خرچ کرتے ہیں۔ عالمی ادارہ صحت نے جامع مینٹل ہیلتھ ایکشن پلان (2013ء تا 2030ء) کے تحت حکومتوں پر زور دیا ہے کہ وہ ذہنی صحت کے لیے مناسب وسائل مختص کریں، علاج کو بنیادی صحت کے نظام کا حصہ بنائیں، کمیونٹی کی سطح پر خدمات فراہم کریں اور ڈیجیٹل تھراپی و ٹیلی میڈیسن جیسے جدید ذرائع کو فروغ دیں۔

پاکستان میں ذہنی صحت کی صورتحال انتہائی تشویشناک ہے۔ 2023ء کی مردم شماری کے مطابق 24 کروڑ سے زائد آبادی والے اس ملک میں اندازاً سوا تین کروڑ (32.4 ملین) سے زائد افراد ذہنی مسائل کا سامنا کر رہے ہیں

، جبکہ پورے ملک میں صرف 400 سے 500 کے قریب ماہرینِ نفسیات (Psychiatrists) موجود ہیں، یعنی تقریباً پانچ لاکھ افراد کے لیے ایک معالج۔ اندازوں کے مطابق ذہنی امراض میں مبتلا 90 سے 95 فیصد افراد مناسب علاج سے محروم ہیں، اور ضلعی ہسپتالوں و بنیادی مراکزِ صحت (BHUs) میں نفسیاتی علاج کا ڈھانچہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی، بے روزگاری، سیاسی و معاشی عدم استحکام، دہشت گردی کے واقعات، 2022ء کے تباہ کن سیلاب جیسی موسمیاتی آفات اور منشیات کا پھیلاؤ ذہنی دباؤ میں اضافے کی بڑی وجوہات ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ معاشرے میں آج بھی نفسیاتی مسائل کو "پاگل پن"، کمزور ایمان یا جن بھوت اور توہمات سے جوڑا جاتا ہے، جس کی وجہ سے لوگ ماہر کے پاس جانے کے بجائے عاملوں اور غیر مستند علاج کا رخ کرتے ہیں۔ خواتین گھریلو دباؤ اور سماجی پابندیوں، جبکہ نوجوان امتحانات، بے روزگاری اور سوشل میڈیا کے منفی اثرات کے باعث خاص طور پر متاثر ہو رہے ہیں۔

تقریباً پونے تیرہ کروڑ آبادی کے ساتھ پنجاب ملک کا سب سے بڑا صوبہ ہے، اس لیے قومی سطح پر ذہنی صحت کی بہتری کا انحصار بڑی حد تک پنجاب پر ہے۔ اٹھارہویں آئینی ترمیم کے بعد صحت صوبائی معاملہ بنی تو پنجاب نے 2014ء میں مینٹل ہیلتھ ایکٹ کے ذریعے مریضوں کے حقوق اور علاج کا قانونی ڈھانچہ وضع کیا۔ لاہور میں واقع پنجاب انسٹیٹیوٹ آف مینٹل ہیلتھ (PIMH)، جس کی تاریخ ایک صدی سے زائد پرانی ہے، ملک کے بڑے نفسیاتی علاج گاہوں میں شمار ہوتا ہے، جبکہ لاہور، راولپنڈی، فیصل آباد اور ملتان کے تدریسی ہسپتالوں میں نفسیات کے شعبے قائم ہیں۔ تاہم یہ سہولیات بڑے شہروں تک محدود ہیں اور جنوبی و دیہی پنجاب کے لاکھوں لوگوں کو علاج کے لیے طویل سفر کرنا پڑتا ہے۔ 2025ء میں راوی، ستلج اور چناب میں آنے والے شدید سیلاب نے لاکھوں افراد کو بے گھر کیا، جس سے صدمے، اضطراب اور ڈپریشن کے کیسز میں اضافے کا خدشہ ہے اور متاثرہ علاقوں میں نفسیاتی معاونت (Psychosocial Support) کی فوری ضرورت ہے۔ تعلیمی اداروں میں "آئس" سمیت منشیات کا بڑھتا رجحان بھی ایک سنگین چیلنج ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ دیہی و بنیادی مراکزِ صحت میں تربیت یافتہ سائیکالوجسٹ تعینات کیے جائیں، لیڈی ہیلتھ ورکرز کو ابتدائی نفسیاتی مدد کی تربیت دی جائے اور سکولوں و کالجوں میں کونسلنگ کا باقاعدہ نظام قائم کیا جائے۔

ان چیلنجز کے باوجود پاکستان میں مثبت پیش رفت بھی ہو رہی ہے۔ حکومت نے عالمی ادارہ صحت کے تعاون سے نیشنل مینٹل ہیلتھ پالیسی 2026ء تا 2035ء کا آغاز کیا ہے، جس کا مقصد سوا تین کروڑ سے زائد متاثرہ افراد تک بنیادی سہولیات پہنچانا ہے۔ دسمبر 2022ء میں اقدامِ خودکشی کو جرم کے زمرے سے نکالنا ایک تاریخی قدم تھا، جس سے متاثرہ افراد کو سزا کے بجائے علاج کی طرف لانے کی راہ ہموار ہوئی

۔برٹش ایشین ٹرسٹ (British Asian Trust) اور مقامی اداروں کے اشتراک سے فرنٹ لائن ورکرز کو تربیت دی جا رہی ہے اور سندھ مینٹل ہیلتھ اتھارٹی سمیت مختلف اداروں نے ہیلپ لائنز قائم کی ہیں۔ تاہم پائیدار تبدیلی کے لیے صحت کے بجٹ میں ذہنی صحت کا مناسب حصہ، بنیادی صحت کے نظام میں نفسیاتی علاج کی شمولیت، ٹیلی سائیکاٹری کا فروغ، میڈیا کی ذمہ دارانہ رپورٹنگ اور تعلیمی و دفتری اداروں میں ذہنی صحت کی پالیسیاں ناگزیر ہیں

۔انفرادی سطح پر بھی ہم بہت کچھ کر سکتے ہیں: اپنے پیاروں سے کھل کر بات کرنا، مناسب نیند، باقاعدہ ورزش، سکرین ٹائم میں اعتدال اور ضرورت پڑنے پر بلا جھجک ماہر سے رجوع کرنا۔ اس عالمی دن کا پیغام یہی ہے کہ ذہنی بیماری کمزوری نہیں بلکہ ایک قابلِ علاج طبی کیفیت ہے، اور ایک صحت مند پاکستان کا خواب ذہنی صحت کو قومی ترجیح بنائے بغیر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔

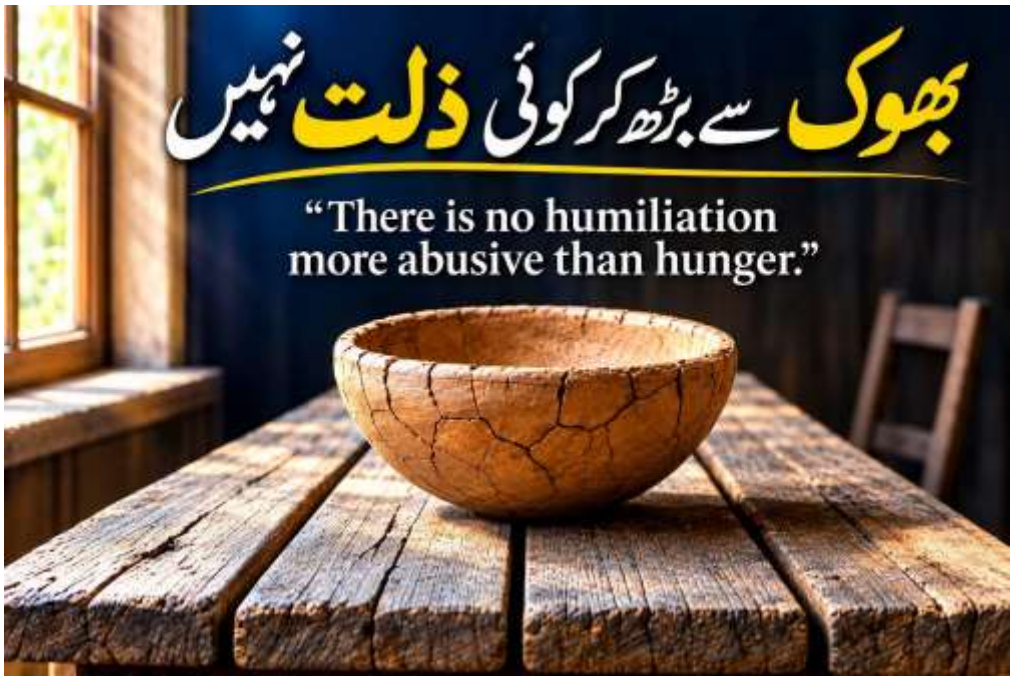

بھوک سے بڑی کوئی ذلت نہیں—پاکستان میں غربت، حکومتی اقدامات اور عوامی خوش حالی کا سوال؟؟

"There is no humiliation more abusive than hunger"،

"بھوک سے بڑھ کر کوئی ذلت نہیں "

محض ایک قول نہیں، بلکہ معاشرے کے ضمیر کو جھنجھوڑنے والی حقیقت ہے۔ بھوک انسان کی جسمانی قوت ہی نہیں چھینتی، بلکہ اس کی خودداری، امید اور بہتر مستقبل کے خوابوں کو بھی کھوکھلا کر دیتی ہے۔ بھوکا پیٹ بیمار جسم کو جنم دیتا ہے، بیمار جسم کمزور ذہن کو، اور کمزور ذہن نسل در نسل غربت کو۔

پاکستان جیسے زرعی وسائل، نوجوان افرادی قوت اور قدرتی صلاحیتوں سے مالامال ملک میں غربت کا مسئلہ محض وسائل کی کمی نہیں، بلکہ وسائل کی منصفانہ تقسیم، روزگار کے مواقع اور معاشی پالیسیوں کی افادیت سے جڑا ہوا ہے۔ یہ وہ ملک ہے جو گندم، چاول، گنے اور دودھ کی پیداوار میں دنیا کے بڑے ممالک میں شمار ہوتا ہے، مگر اس کے کروڑوں بچے پیٹ بھر کر غذائیت سے محروم ہیں۔

عالمی اداروں کے تازہ ترین اعداد و شمار کے مطابق، خطے میں ایران تقریباً$3,924 کی سالانہ فی کس آمدنی (GDP per capita) کے ساتھ سب سے آگے ہے، جس کے بعد بنگلہ دیش ($2,910 تا $2,960) اور بھارت ($2,810 تا $2,818) کا نمبر آتا ہے، جبکہ پاکستان تقریباً$1,595 تا$1,700 کی فی کس آمدنی کے ساتھ خطے میں چوتھے نمبر پر ہے۔ دنیا بھر میں پاکستان کی پوزیشن کی بات کی جائے تو نامنل (Nominal) لحاظ سے پاکستان دنیا کے ممالک میں تقریباً160 ویں نمبر پر آتا ہے، لیکن اگر مساوی قوتِ خرید (PPP) کے لحاظ سے دیکھا جائے تو پاکستان کا نمبر بہتر ہو کر تقریباً138 واں بنتا ہے۔

پاکستان میں غربت کے تازہ اعداد و شمار ایک تشویش ناک صورتِ حال کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تیل کی ہر روز بڑھتی قیمتوں نے سفید پوش طبقے کو بھی بھکاریوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے کیونکہ تیل کی قیمت بڑھنے کے ساتھ تمام اشیا کی قیمتوں میں اضافہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔

عالمی بینک کی ستمبر 2025 کی جامع جائزہ رپورٹ کے مطابق، پاکستان میں 2001-02 سے 2018-19 تک غربت کی شرح تقریباً64 فیصد سے گھٹ کر 21.9 فیصد پر آ گئی تھی، جو ایک بڑی کامیابی تھی

مگر پھر کووِڈ-19، بلند مہنگائی اور 2022 کے تباہ کن سیلابوں نے یہ پیش رفت الٹ دی، اور مالی سال 2023-24 میں یہ شرح بڑھ کر اندازاً 25.3 فیصد ہو گئی۔ مالی سال 2024-25 کے لیے عالمی بینک نے قومی خطِ غربت کے تحت تقریباً 22.5 فیصد کا تخمینہ پیش کیا۔

یہ فیصد محض ہندسے نہیں۔ 2023 کی مردم شماری کے مطابق پاکستان کی آبادی تقریباً24 کروڑ 15 لاکھ ہے، یعنی 22 سے 25 فیصد کا مطلب ہے کہ لگ بھگ ساڑھے پانچ سے چھ کروڑ انسان خطِ غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں—یہ تعداد کئی یورپی ممالک کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ مشرقِ وسطیٰ، شمالی افریقہ اور افغانستان و پاکستان پر مشتمل خطے میں انتہائی غریب افراد کی مجموعی تعداد کا تقریباً نصف پاکستان میں آباد ہے، اور حالیہ اخباری رپورٹس میں عالمی بینک کے حوالے سے یہاں تک کہا گیا کہ بعض پیمانوں پر پاکستان میں غربت کی شرح افغانستان سے بھی بڑھ گئی ہے

۔اس بگاڑ کی بڑی وجوہات واضح ہیں:

مئی 2023 میں مہنگائی کی شرح تقریباً 38 فیصد کی تاریخی بلندی پر پہنچی۔ غریب گھرانے اپنی آمدن کا نصف یا اس سے زیادہ صرف خوراک پر خرچ کرتے ہیں، اس لیے آٹے، گھی اور دال کی قیمت بڑھتے ہی سب سے پہلے انہی کی تھالی خالی ہوتی ہے۔
سیلاب 2022 میں تقریباً 3 کروڑ 30 لاکھ افراد متاثر ہوئے، نقصانات کا تخمینہ 30 ارب ڈالر کے قریب لگایا گیا، اور اندازاً 84 سے 91 لاکھ مزید افراد غربت میں دھکیلے گئے۔

• غیر زرعی شعبے میں تقریباً تین چوتھائی محنت کش غیر رسمی روزگار سے وابستہ ہیں، جہاں نہ مستقل اجرت ہے، نہ پنشن، نہ صحت کا تحفظ۔

موجودہ مالی سال کے لیے پاکستان کی معاشی شرحِ نمو 3.8 فیصد اور مالیاتی خسارہ 3.5 فیصد رہنے کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ مگر جب تک آبادی کی شرحِ اضافہ (تقریباً 2.5 فیصد سالانہ) کے مقابلے میں ترقی کی رفتار نمایاں طور پر زیادہ نہ ہو، فی کس آمدن میں حقیقی بہتری محسوس نہیں ہوتی۔

بھوک کا سب سے گہرا اور دیرپا زخم انسانی صحت پر لگتا ہے۔ پاکستان میں غذائی قلت اب محض غربت کی علامت نہیں رہی بلکہ ایک خاموش صحت ایمرجنسی بن چکی ہے، جس کی قیمت آنے والی نسلیں ادا کر رہی ہیں۔ قومی غذائی سروے 2018 کے نتائج اس المیے کی واضح تصویر پیش کرتے ہیں:

پانچ سال سے کم عمر بچے جن کا قد عمر کے لحاظ سے کم ہے (اسٹنٹنگ) 40 فیصد ہیں اور

پانچ سال سے کم عمر بچے جو اپنے قد کے لحاظ سے انتہائی کمزور ہیں (ویسٹنگ) 17.7 فیصد ہیں۔ اسی طرح پانچ سال سے کم عمر کم وزن بچے 28.9 فیصد ہیں

اب بچے کے ساتھ ماں کی حالت بھی دیکھ لیں۔ تولیدی عمر کی خواتین میں خون کی کمی کی شرح 41.7 فیصد ہے اور غذائی عدم تحفظ کا شکار گھرانے 36.9 فیصد ہیں

اسٹنٹنگ (stunning) کا مطلب صرف کم قد نہیں۔ ابتدائی ایک ہزار دنوں میں ناکافی غذا بچے کے دماغ کی نشوونما، سیکھنے کی صلاحیت اور بالغ عمری میں کمانے کی استعداد کو مستقل طور پر متاثر کرتی ہے۔ یوں ہر دس میں سے چار بچے زندگی کی دوڑ شروع ہونے سے پہلے ہی پیچھے رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح خون کی کمی کا شکار ماں کمزور بچے کو جنم دیتی ہے، اور غربت کا چکر ماں کے پیٹ ہی میں شروع ہو جاتا ہے۔

عالمی سطح پر بھی یہی تصویر سامنے آتی ہے۔ گلوبل ہنگر (بھوک) انڈیکس 2024 میں پاکستان 127 ممالک میں 109 ویں نمبر پر رہا اور اس کی صورتِ حال کو "سنگین" قرار دیا گیا۔ نومولود بچوں کی شرحِ اموات (تقریباً 50 فی ہزار زندہ پیدائش سے زائد) خطے کی بلند ترین شرحوں میں شمار ہوتی ہے، جبکہ زچگی کے دوران ماؤں کی اموات کی شرح تقریباً 186 فی ایک لاکھ زندہ پیدائش ہے۔ ان میں سے بڑی تعداد ایسی اموات کی ہے جو بہتر غذا، صاف پانی اور بروقت طبی سہولت سے روکی جاسکتی تھیں۔

غربت اور بیماری ایک دوسرے کو خوراک دیتی ہیں۔ پاکستان میں صحت پر سرکاری خرچ مجموعی قومی پیداوار کے محض ایک فیصد کے لگ بھگ ہے، اس لیے صحت کے اخراجات کا تقریباً نصف عوام اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں۔ ایک غریب گھرانے میں ایک سنگین بیماری اکثر قرض، زمین یا مویشیوں کی فروخت اور بچوں کی تعلیم چھوٹنے پر منتج ہوتی ہے۔ آلودہ پانی سے پھیلنے والے اسہال، ہیپاٹائٹس اور ٹی بی جیسے امراض بھی سب سے زیادہ انہی بستیوں کو نشانہ بناتے ہیں جہاں بھوک پہلے سے ڈیرہ ڈالے ہوئے ہے۔

بھوک صرف آج کو نہیں، کل کو بھی گروی رکھ دیتی ہے۔ پاکستان میں تقریباً 2 کروڑ 60 لاکھ بچے اسکول سے باہر ہیں، جو 5 سے 16 سال کی عمر کے بچوں کا لگ بھگ 39 فیصد بنتا ہے—یہ دنیا میں اسکول سے باہر بچوں کی بڑی ترین تعدادوں میں سے ایک ہے۔ ان میں بڑی اکثریت غریب گھرانوں کی بچیوں کی ہے۔

جب گھر میں روٹی پوری نہ ہو تو بچہ کتاب کے بجائے اوزار اٹھاتا ہے؛ ورکشاپ، اینٹوں کے بھٹے، کھیت یا کسی گھر میں مزدوری اس کا مقدر بنتی ہے۔ ملک میں خواندگی کی شرح اب بھی تقریباً 60 فیصد کے آس پاس ہے، اور غذائی قلت کا شکار بچہ اسکول پہنچ بھی جائے تو کمزور توجہ اور بار بار کی بیماری اس کی تعلیمی کارکردگی متاثر کرتی ہے۔ یوں بھوک، بیماری اور جہالت مل کر ایک ایسا دائرہ بناتے ہیں جس سے نکلنا نسل در نسل مشکل ہوتا جاتا ہے۔

حکومتِ پاکستان نے غربت اور معاشی محرومی کم کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں۔ بینظیر انکم سپورٹ پروگرام (BISP) کے کفالت پروگرام کے تحت تقریباً ایک کروڑ مستحق خاندانوں کو سہ ماہی مالی معاونت دی جارہی ہے، اور مالی سال 2025-26 کے بجٹ میں اس پروگرام کے لیے مختص رقم 700 ارب روپے سے تجاوز کر گئی۔ اس کے علاوہ:

- بینظیر تعلیمی وظائف: بچوں کو اسکول میں رکھنے کے لیے مشروط نقد معاونت۔
- بینظیر نشوونما پروگرام: حاملہ و دودھ پلانے والی ماؤں اور دو سال سے کم عمر بچوں کو خصوصی غذائی اجزاء اور نقد مدد، تاکہ اسٹنٹنگ کی روک تھام ہو

۔ • صحت سہولت پروگرام: مختلف صوبوں میں ہیلتھ کارڈ کے ذریعے مفت ہسپتال علاج۔

• پاکستان بیت المال کی امدادی سرگرمیاں، اور مختلف ادوار میں اشیائے ضروریہ پر ریلیف و سبسڈی۔

ان اقدامات سے کم آمدن والے خاندانوں کو فوری سہارا ملتا ہے، بچوں کی تعلیم جاری رکھنے میں مدد ملتی ہے اور ماں و بچے کی غذائیت پر توجہ بڑھی ہے۔ تاہم، عالمی بینک کے جائزے کے مطابق مہنگائی، کم پیداواری صلاحیت، غیر رسمی روزگار، محدود سرمایہ کاری اور بار بار کے معاشی جھٹکوں کے باعث غربت میں کمی کی رفتار برقرار نہیں رہ سکی۔ نقد امداد کی قدر مہنگائی کے سامنے تیزی سے گھٹ جاتی ہے، اور صحت و غذائیت پر مجموعی سرکاری خرچ ضرورت کے مقابلے میں اب بھی بہت کم ہے۔

مگر یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ حکومتی امدادی پروگرام غیر مؤثر ہیں؛ البتہ ان کی موجودہ افادیت غربت کے مستقل خاتمے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوئی۔ امداد زخم پر مرہم ہے، علاج نہیں۔

پاکستان میں غربت کے پائیدار خاتمے کے لیے محض مالی امداد کافی نہیں؛ ضروری ہے کہ باعزت روزگار، معیاری تعلیم، بنیادی صحت، فنی تربیت، چھوٹے کاروبار، زرعی پیداوار اور خواتین کے معاشی مواقع کو ترجیح دی جائے۔ صحت کے میدان میں خاص طور پر ماں اور بچے کی غذائیت، صاف پانی، حفاظتی ٹیکوں اور بنیادی مراکزِ صحت پر سرمایہ کاری سب سے زیادہ منافع دینے والی سرمایہ کاری ہے، کیونکہ ایک صحت مند بچہ ہی کل کا ہنر مند اور خوددار شہری بنتا ہے۔ صحت پر سرکاری خرچ کو جی ڈی پی کے ایک فیصد سے بتدریج بڑھانا اور اسکولوں میں غذائیت سے بھرپور کھانے جیسے پروگرام بھوک اور جہالت دونوں پر بیک وقت وار کر سکتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ملک کی ترقی کا اصل پیمانہ صرف اس کی مجموعی قومی پیداوار یا بلند عمارتیں نہیں، بلکہ یہ ہے کہ اس کا کوئی شہری بھوکا نہ سوئے، کوئی ماں غذائی کمی کے باعث جان سے نہ جائے، کوئی بچہ ناکافی خوراک کی وجہ سے ادھوری نشوونما کا شکار نہ ہو اور کوئی بچہ غربت کے باعث تعلیم سے محروم نہ رہے۔ جب تک ہر دس میں سے چار بچے ادھورے قد اور ادھورے خوابوں کے ساتھ پروان چڑھتے رہیں گے، ہماری ترقی کے دعوے بھی ادھورے رہیں گے۔

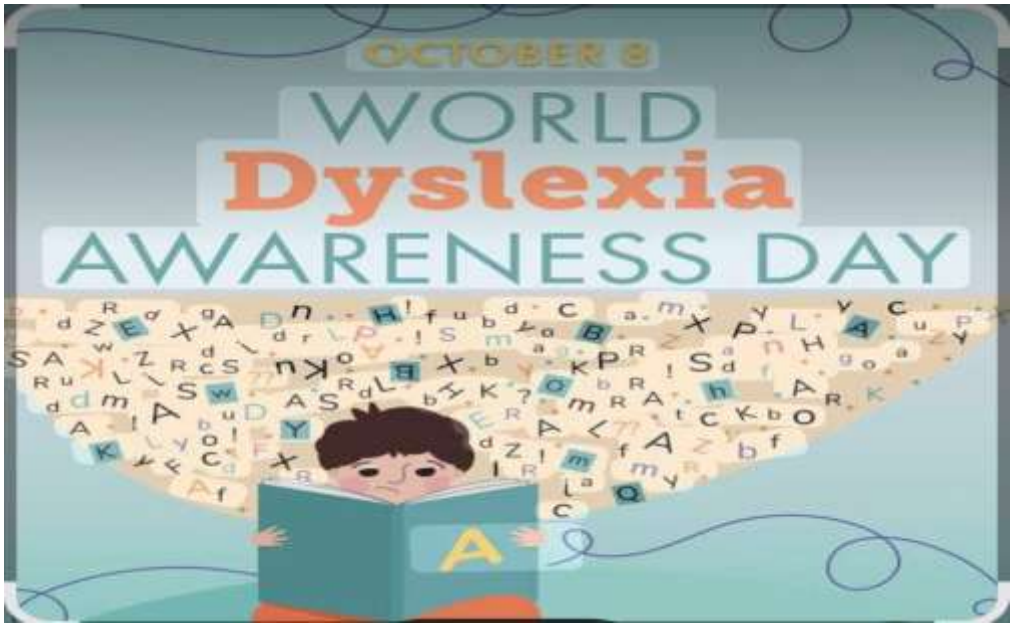

18اکتوبر" – (World Dyslexia Awareness Day) –پڑھنے لکھنے کی کمزوری "کی آگاہی کا عالمی دن)۔ حروف کی بھول بھلیاں۔ ڈسلیکسیا: کمزوری نہیں، سیکھنے کا ایک مختلف انداز۔

ہمارے ہاں ڈسلیکسیا کو عام طور پر "پڑھنے لکھنے کی کمزوری" کہا جاتا ہے، مگر سائنسی اعتبار سے اسے سستی، نالائقی یا محض کمزوری کہنا درست نہیں۔ یہ دماغی و اعصابی نشوونما سے تعلق رکھنے والی ایک مخصوص اکتسابی دشواری ہے، جس میں بچے کی ذہانت عموماً متاثر نہیں ہوتی، البتہ الفاظ کو درست اور روانی سے پڑھنے، حروف اور ان کی آوازوں کا باہمی رشتہ سمجھنے اور درست ہجے کرنے میں مستقل دشواری پیش آتی ہے۔

بین الاقوامی ڈسلیکسیا ایسوسی ایشن کی تعریف کے مطابق بھی ڈسلیکسیا ایک "مخصوص اکتسابی معذوری" ہے، جس کی جڑ زبان کی صوتی پرکھ میں دشواری ہے، اور جس کی بروقت شناخت اور ہدف شدہ تدریس سے بچے کی تعلیمی کارکردگی میں نمایاں بہتری لائی جاسکتی ہے۔

ڈسلیکسیا کم ذہانت کی علامت نہیں۔ دنیا کے بے شمار کامیاب سائنس دان، فن کار، کاروباری شخصیات اور قلم کار اس کیفیت کے ساتھ اعلیٰ مقام تک پہنچے ہیں

۔

اس دن کا تصور یورپی ڈسلیکسیا ایسوسی ایشن، بین الاقوامی ڈسلیکسیا ایسوسی ایشن اور مختلف تعلیمی و نفسیاتی تنظیموں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اکیسویں صدی کے آغاز سے کئی ممالک میں پورا اکتوبر "ماہِ آگاہیٔ ڈسلیکسیا" کے طور پر منایا جاتا رہا ہے، اور بعد ازاں یورپی ڈسلیکسیا ایسوسی ایشن کی تحریک پر 8 اکتوبر کو خاص طور پر عالمی یومِ آگاہیٔ ڈسلیکسیا کے طور پر منانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج یہ دن دنیا کے متعدد ممالک میں سکولوں، جامعات اور سماجی تنظیموں کی سطح پر منایا جاتا ہے، جبکہ اکتوبر کا پورا مہینہ بھی بدستور آگاہی کی سرگرمیوں کے لیے مخصوص ہے۔

- یہ واضح کرنا کہ ڈسلیکسیا کوئی بیماری یا ذہنی پسماندگی نہیں بلکہ سوچنے اور سیکھنے کا ایک مختلف انداز ہے۔
- کم عمری ہی میں اس کی شناخت کی اہمیت اجاگر کرنا، تاکہ متاثرہ بچوں کو روایتی طریقوں کے بجائے شمولیتی اور خصوصی تدریسی طریقے میسر آ سکیں۔
- سکولوں، جامعات اور دفاتر میں ایسے افراد کے لیے سازگار اور ہمدردانہ ماحول پیدا کرنا۔
- والدین اور اساتذہ کی تربیت کے ذریعے معاشرتی رویوں میں تبدیلی لانا۔

اس موقع پر دنیا بھر میں افراد اور ادارے سرخ رنگ کا استعمال کرتے ہیں اور بعض مقامات پر عمارتوں کو سرخ روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔ ایک عام وضاحت کے مطابق بچوں کی کاپیوں میں غلطیوں کی نشان دہی سرخ روشنائی سے کی جاتی تھی، اس لیے اسی رنگ کو مثبت پیغام کی علامت بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سکولوں اور جامعات میں اساتذہ اور والدین کے لیے تربیتی نشستیں اور آگاہی ورکشاپس بھی منعقد کی جاتی ہیں۔

ابتدائی عمر (تقریباً تین سے چھ سال) میں یہ علامات ہو سکتی ہیں

- بولنا شروع کرنے یا نئے الفاظ سیکھنے میں نسبتاً تاخیر۔
- ہم قافیہ الفاظ، آوازوں اور لفظ کے حصوں کو پہچاننے میں مشکل۔
- حروفِ تہجی اور ان کی آوازیں یاد رکھنے میں دشواری۔
- نام، دنوں، رنگوں یا کسی ترتیب کو یاد رکھنے میں غیر معمولی مشکل۔
- کہانی سنانے یا زبانی اظہار میں ہم عمر بچوں کے مقابلے میں کمزوری۔

سکول جانے کی عمر (تقریباً چھ سے بارہ سال

- پڑھتے ہوئے بار بار رکنا یا بہت آہستہ پڑھنا۔
- ملتے جلتے حروف اور الفاظ میں الجھن، مثلاً ب، ت، ث یا ج، چ، ح، خ۔
- ہجوں کی مسلسل غلطیاں، اور تحریر یا نقل کرنے میں دشواری۔
- سارا ذہنی زور الفاظ پڑھنے پر صرف ہو جانا، جس کے باعث مفہوم سمجھ میں نہ آنا۔
- ریاضی کے عبارتی سوالات پڑھنے یا ہدایات سمجھنے میں مشکل۔

ڈسلیکسیا عمر کے ساتھ لازماً ختم نہیں ہوتا، البتہ بہت سے افراد اپنی حکمتِ عملیوں کے ذریعے اسے بخوبی سنبھال لیتے ہیں۔ بالغ افراد میں عموماً یہ پہلو نمایاں ہوتے ہیں:

- طویل تحریر پڑھنے میں زیادہ وقت لگنا۔
- ہجوں کی غلطیاں اور بلند آواز سے پڑھنے سے گریز۔
- یادداشتیں لکھنے یا تحریری اظہار میں دشواری۔
- نئے ناموں اور اصطلاحات کو یاد رکھنے میں مشکل۔

ڈسلیکسیا کی کوئی ایک واحد وجہ اب تک معلوم نہیں۔ تحقیق بتاتی ہے کہ موروثی، اعصابی و حیاتیاتی اور نشوونما سے متعلق عوامل مل کر اس میں کردار ادا کرتے ہیں۔ ایسے افراد کے دماغ میں زبان اور مطالعے سے متعلق معلومات کی پروسیسنگ کا انداز مختلف ہو سکتا ہے۔ اس کا سب سے اہم پہلو "صوتی پرکھ" کی دشواری ہے، یعنی لفظ کو اس کی چھوٹی چھوٹی آوازوں میں تقسیم کرنا اور حروف کو ان آوازوں سے جوڑنا۔ یہ کیفیت اکثر خاندانوں میں نسل در نسل بھی دیکھی جاتی ہے۔

ڈسلیکسیا بچے کی سستی، کم ذہانت، عدم دلچسپی، والدین کی ناقص تربیت یا محض نظر کی کمزوری کا نتیجہ نہیں۔ اسی طرح ہجوں میں غلطی کرنے والا ہر بچہ لازماً ڈسلیکسیا کا شکار نہیں ہوتا؛ اس کے لیے باقاعدہ ماہرانہ تشخیص ضروری ہے۔ نظر اور سماعت کا معائنہ بھی ابتدا ہی میں کروا لینا چاہیے تاکہ دیگر وجوہات کو خارج کیا جا سکے۔

اس کیفیت میں مبتلا افراد کی دنیا بھر کے لیے کوئی قطعی تعداد موجود نہیں، کیونکہ مختلف زبانوں، تشخیصی معیارات اور تحقیقی طریقوں کی بنا پر اس کی شرح مختلف نکلتی ہے۔ پرائمری سکول کے بچوں پر کیے گئے متعدد مطالعات کے ایک جامع منظم جائزے اور شماریاتی تجزیے کے مطابق نشوونمائی ڈسلیکسیا کی مجموعی شرح تقریباً 7.1 فیصد پائی گئی، یعنی تقریباً ہر چودہ میں سے ایک بچہ۔

تاہم اس شرح کو براہِ راست پوری دنیا کی آبادی پر لاگو کر کے یہ کہنا کہ "اتنے کروڑ یا ارب افراد ڈسلیکسیا کا شکار ہیں" سائنسی طور پر درست نہیں، کیونکہ زیادہ تر مستند مطالعات بچوں کی مخصوص آبادیوں سے متعلق ہیں۔ بعض ادارے پڑھنے سے متعلق وسیع تر دشواریوں کی شرح پندرہ سے بیس فیصد تک بتاتے ہیں، مگر یہ باقاعدہ تشخیص شدہ ڈسلیکسیا کی شرح نہیں بلکہ ایک وسیع تر اندازہ ہے۔

پاکستان میں ڈسلیکسیا کی شرح کے بارے میں قومی سطح کا کوئی مستند سروے موجود نہیں، لہٰذا یہ کہنا ممکن نہیں کہ ملک میں ٹھیک کتنے افراد اس کیفیت کا شکار ہیں۔ البتہ چند مقامی مطالعات اس مسئلے کی سنگینی کی طرف اشارہ ضرور کرتے ہیں:

- لاہور: 2019ء میں 666 سرکاری و نجی سکولوں کے طلبہ پر کیے گئے ایک مطالعے میں جانچ فہرست کی بنیاد پر تقریباً 33 فیصد طلبہ میں ڈسلیکسیا کی علامات پائی گئیں۔ یہ ابتدائی جانچ کا نتیجہ تھا، باقاعدہ تشخیص کی قومی شرح نہیں۔
- سرائے عالمگیر: 837 پرائمری سکول کے بچوں کے مطالعے میں 20.7 فیصد بچے مخصوص اکتسابی دشواریوں کے خطرے میں پائے گئے، جبکہ طبی و نفسیاتی جائزے کے بعد 7.5 فیصد بچوں میں مختلف مخصوص اکتسابی دشواریوں کی تصدیق ہوئی۔

ان مطالعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا زیادہ درست ہے کہ مسئلہ موجود اور توجہ طلب ہے، مگر قومی سطح پر اس کی درست تعداد ابھی معلوم نہیں۔

پاکستان میں ڈسلیکسیا کا مسئلہ ایک بڑے تعلیمی بحران کے پس منظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ سرکاری تعلیمی اعداد و شمار کے مطابق ملک میں ڈھائی کروڑ سے زائد بچے سکول سے باہر ہیں، جبکہ عالمی بینک کے اندازوں کے مطابق دس سال کی عمر کے تقریباً تین چوتھائی سے زائد بچے عمر کے مطابق ایک سادہ عبارت پڑھ کر سمجھنے کے قابل نہیں۔ ایسے ماحول میں جہاں عمومی طور پر پڑھنے کی صلاحیت کمزور ہو، ڈسلیکسیا کے شکار بچے آسانی سے نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں اور انہیں "کند ذہن" یا "نالائق" سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ نتیجتاً بہت سے بچے مایوس ہو کر تعلیم ہی ادھوری چھوڑ دیتے ہیں۔ پاکستانی بچوں کو درپیش ایک منفرد پہلو اردو رسم الخط کی نوعیت ہے، جس پر ہمارے ہاں بہت کم توجہ دی جاتی ہے

- : شکل بدلتے حروف: اردو کے بیشتر حروف لفظ میں اپنے مقام کے لحاظ سے شکل بدلتے ہیں، جس سے حرف پہچاننے کا بوجھ بڑھ جاتا ہے۔
- نقطوں کا فرق: کئی حروف صرف نقطوں کی تعداد یا مقام سے الگ ہوتے ہیں، مثلاً ب، پ، ت، ٹ، ث؛ ڈسلیکسیا کے شکار بچے کے لیے یہ فرق خاص طور پر الجھن کا باعث بنتا ہے۔
- اعراب کی عدم موجودگی: عام تحریر میں زیر، زبر، پیش نہیں لکھے جاتے، چنانچہ قاری کو درست تلفظ کے لیے سیاق و سباق پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔

- ایک آواز، کئی حروف: س، ص، ث یا ز، ذ، ض، ظ اور ت، ط جیسے حروف ایک ہی آواز دیتے ہیں، جس سے ہجوں کی غلطیاں بڑھ جاتی ہیں۔
- کئی زبانوں کا بوجھ: پاکستانی بچہ بیک وقت اردو، انگریزی اور قرآنِ پاک کی عربی پڑھتا ہے، جبکہ اکثر اس کی مادری زبان پنجابی، سندھی، پشتو، بلوچی یا کوئی اور ہوتی ہے۔ مختلف رسم الخط اور صوتی نظاموں کا یہ امتزاج ڈسلیکسیا کے شکار بچے کے لیے دشواری کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔
- مقامی جانچ کے آلات کی کمی: تشخیص کے بیشتر معیاری پیمانے انگریزی زبان کے لیے تیار کیے گئے ہیں، جبکہ اردو اور علاقائی زبانوں کے لیے معیاری جانچ کے آلات اب بھی بہت محدود ہیں۔

اس حوالے سے پاکستان میں قانون سازی اور پالیسی کی سطح پر قابلِ ذکر پیش رفت ہوئی ہے:

- ڈسلیکسیا خصوصی اقدامات ایکٹ 2022ء: پارلیمان سے منظور ہونے والا یہ قانون بنیادی طور پر وفاقی دارالحکومت اسلام آباد کے تعلیمی اداروں پر لاگو ہوتا ہے اور اس کا مقصد ڈسلیکسیا کی ابتدائی جانچ، اساتذہ کی تربیت اور متاثرہ طلبہ کے لیے خصوصی تعلیمی سہولیات کو یقینی بنانا ہے۔
- وفاقی وزارتِ تعلیم: 2023ء میں وزارت نے ڈسلیکسیا قانون کے اجرا کی تقریب منعقد کی، جس میں بچوں کو ان کے سیکھنے کے انداز کے مطابق تعلیمی معاونت فراہم کرنے کے عزم کا اظہار کیا گیا۔
- قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی: جنوری 2026ء میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے وفاقی تعلیم و پیشہ ورانہ تربیت نے اس قانون پر عمل درآمد اور وزارت کے اقدامات کا جائزہ لینے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی قائم کی، جو اس امر کا ثبوت ہے کہ قانون کے نفاذ کو سرکاری سطح پر زیرِ غور رکھا جا رہا ہے۔
- معذور افراد کے حقوق کے صوبائی و وفاقی قوانین: سندھ (2018ء)، اسلام آباد (2020ء) اور پنجاب (2022ء) میں معذور افراد کے حقوق و بااختیاری سے متعلق قوانین موجود ہیں، جو شمولیتی تعلیم اور مساوی مواقع کی ضمانت کی بنیاد فراہم کرتے ہیں۔
- پنجاب: محکمۂ خصوصی تعلیم شمولیتی تعلیم، اساتذہ کی پیشہ ورانہ تربیت اور خصوصی تعلیمی سہولیات کے لیے اقدامات کر رہا ہے۔ 2026ء میں پنجاب حکومت اور یونیسف کے پالیسی مکالمے میں شمولیتی، خصوصی اور طالب علم کی ضروریات سے ہم آہنگ تعلیم، اساتذہ کی تربیت اور نصابی اصلاحات کو ترجیحات میں شامل کیا گیا۔

ڈسلیکسیا کے لیے اب تک کوئی ایسی دوا موجود نہیں جو اسے ختم کر دے، لیکن درست تعلیمی حکمتِ عملی کے ذریعے اسے بہت مؤثر انداز میں سنبھالا جا سکتا ہے اور بچے کی تعلیمی کارکردگی نمایاں طور پر بہتر بنائی جا سکتی ہے۔ سب سے مؤثر طریقۂ کار عموماً ان اجزا پر مشتمل ہوتا ہے:

- ابتدائی جانچ اور ماہرین کے ذریعے باقاعدہ تشخیص۔
- منظم، مرحلہ وار اور واضح انداز میں پڑھنے کی تدریس۔
- صوتی شعور کی تربیت، یعنی آوازوں کو پہچاننے، جوڑنے اور الگ کرنے کی مشق۔
- حرف اور آواز کے رشتے کی تعلیم اور لفظ کشائی کی مہارتوں کی مشق۔
- ہجوں اور تحریر کی خصوصی اور باقاعدہ مشق۔
- ضرورت کے مطابق ماہر گویائی و زبان، تعلیمی ماہر نفسیات یا خصوصی تربیت یافتہ استاد کی مدد۔
- امتحان میں اضافی وقت، سمعی مواد اور تحریری معاونت جیسی سہولیات۔

جتنی جلدی مسئلے کی شناخت ہو، اتنا ہی مؤثر علاج ممکن ہوتا ہے۔ جدید تحقیق بھی بروقت شناخت اور ہدف شدہ تدریس کی اہمیت پر زور دیتی ہے۔

- بچے کو ڈانٹنے، شرمندہ کرنے یا دوسروں سے موازنہ کرنے کے بجائے اس کی محنت کی حوصلہ افزائی کریں۔
- اگر بچہ مسلسل پڑھنے لکھنے میں پیچھے رہ رہا ہو تو اسے سستی پر محمول کرنے کے بجائے ماہر سے رجوع کریں۔
- پڑھائی میں دیکھنے، سننے اور چھونے کے طریقوں کو یکجا کریں، مثلاً ریت یا مٹی پر حروف بنوانا اور بلند آواز سے دہرانا۔
- بچے کی دیگر صلاحیتوں، جیسے تخلیقی سوچ، فن، کھیل یا زبانی اظہار کو پہچانیں اور پروان چڑھائیں۔
- اساتذہ کمرۂ جماعت میں بچے کو بلند آواز سے پڑھنے پر مجبور نہ کریں اور اسے کام مکمل کرنے کے لیے اضافی وقت دیں۔

ڈسلیکسیا روایتی معنوں میں کوئی متعدی مرض نہیں جسے دوا سے ختم کیا جا سکے؛ یہ دماغی نشوونما سے متعلق ایک اکتسابی دشواری ہے۔ اصل چیلنج ڈسلیکسیا سے زیادہ اس کی بروقت پہچان ہے۔ پاکستان میں قانون اور پالیسی کی سطح پر پیش رفت ضرور ہوئی ہے، مگر دستیاب شواہد بتاتے ہیں کہ قومی سطح پر جانچ کے نظام، اساتذہ کی تربیت، اردو اور علاقائی زبانوں میں مستند تشخیصی سہولیات اور وسیع پیمانے پر عوامی آگاہی کی اب بھی شدید ضرورت ہے۔

یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سکول، والدین، ماہرینِ تعلیم اور حکومت مل کر بچے کی "کمزوری" کو اس کی طاقت میں بدل سکتے ہیں۔ کیونکہ ہر بچہ سیکھ سکتا ہے، بس ہمیں اسے اس کے انداز میں سکھانا سیکھنا ہو گا۔۔

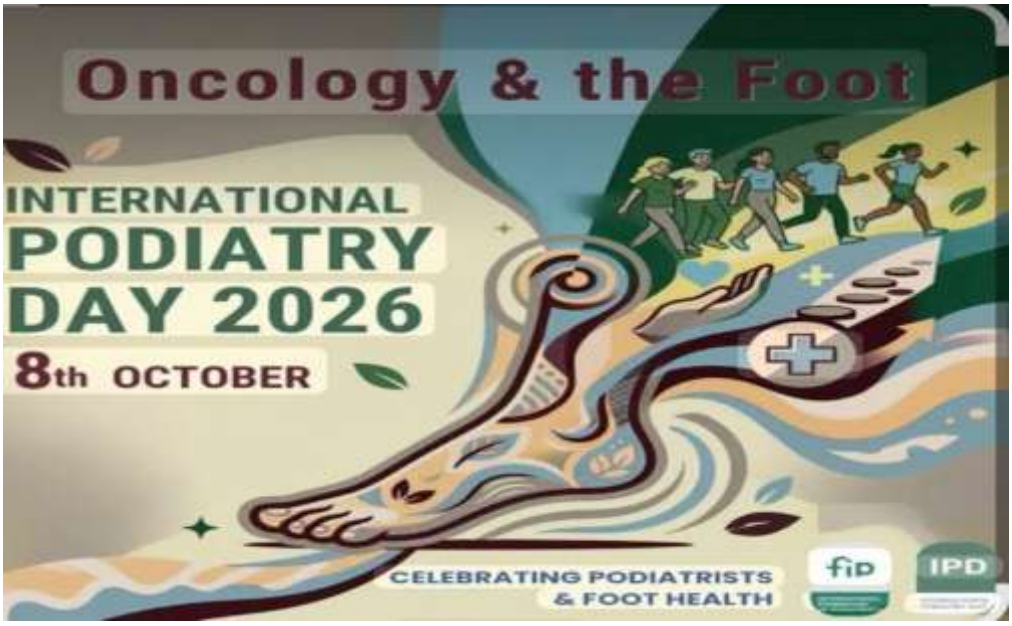

8 اکتوبر (International Podiatry Day) ' پاؤں کی دیکھ بھال کا عالمی دن (پاؤں کی صحت: ایک نادیدہ نعمت اور ذیابیطس کے دور میں اس کی حفاظت

8 اکتوبر کو عالمی سطح پر) International Podiatry Day پاؤں کی دیکھ بھال کا عالمی دن (منایا جاتا ہے .

ہماری روزمرہ زندگی کی تمام تر دوڑ دھوپ کا تمام تر بوجھ ہمارے پاؤں اٹھاتے ہیں، لیکن صحت کے معاملے میں سب سے زیادہ غفلت بھی انہی کے ساتھ برتی جاتی ہے

دنیا بھر میں ہر سال 8 اکتوبر کو "پاؤں کی دیکھ بھال کا عالمی دن (International Podiatry Day) "منانے کا مقصد بھی یہی ہے کہ عوام الناس کو اس اہم عضو کی نگہداشت اور اس سے جڑی بیماریوں کے بارے میں بیدار کیا جائے۔ پاؤں صرف چلنے پھرنے کا ذریعہ نہیں بلکہ انسان کی عمومی صحت اور معیارِ زندگی کے آئینے دار ہوتے ہیں۔

پاؤں کی صحت اور پوڈیاٹری (Podiatry) کی اہمیت اجاگر کرنے کا خیال International Federation of Podiatrists (FIP-IFP) کو آیا، جو دنیا بھر میں پوڈیاٹرسٹس (پاؤں کے ماہرینِ صحت) کی نمائندہ تنظیم ہے۔ FIP-IFP نے عالمی سطح پر اپنے رکن ممالک اور تنظیموں کے ساتھ مل کر اس دن کا آغاز کیا۔ ابتدائی طور پر اسے "World Podiatry Day" کے نام سے شروع کیا گیا جس کا مقصد عالمی سطح پر پاؤں کی صحت کے بارے میں شعور بیدار کرنا تھا۔ FIP-IFP نے 2018ء میں اس دن کو ہر سال 8 اکتوبر کو بین الاقوامی سطح پر باقاعدہ منائے جانے والے دن کے طور پر مقرر کیا۔

اس دن کو منانے میں دنیا کے 40 سے زائد ممالک (جن میں برطانیہ، امریکہ، آسٹریلیا، کینیڈا، یورپی ممالک اور ایشیا و لاطینی امریکہ کے مختلف ادارے شامل ہیں) اس میں حصہ لیتے ہیں۔ اس دن مفت میڈیکل کیمپس کا انعقاد (خاص طور پر شوگر / ذیابیطس کے مریضوں کے لیے) اور سوشل میڈیا واک، سیمینارز اور آؤٹ ریچ پروگرامز۔ اور ہسپتالوں اور کلینکس میں پاؤں کی دیکھ بھال کے بارے میں آگاہی مواد کی تقسیم کے تحت اس دن کی اہمیت کو اجاگر کیا جاتا ہے

ذیابیطس کے مریضوں کے لیے پاؤں کے مسائل سب سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں، جنہیں طبی زبان میں Diabetic Foot Disease کہا جاتا ہے۔ اس میں اہم بیماریاں یہ ہیں

ذیابیطس کا زخم :(Diabetic Foot Ulcer) پاؤں کے تلوے یا انگلیوں پر ناٹوٹنے والے گہرے زخم بننا۔

احساس کا ختم ہونا :(Diabetic Neuropathy) پاؤں کی نسیں (Nerves) متاثر ہونے کی وجہ سے درد، گرمی، سردی یا چوٹ کا احساس ختم ہو جانا۔

شارکوٹ فٹ :(Charcot Foot) نالیوں اور نسوں کی خرابی کی وجہ سے پاؤں کی ہڈیوں کا سڑنا، کمزور ہونا اور پاؤں کی ساخت کا یکسر بگڑ جانا۔

گینگرین :(Gangrene) خون کی گردش بند ہونے کی وجہ سے پاؤں کے کسی حصے (خصوصاً انگلیوں) کا کالے ہو کر مر جانا، جس کے بعد اکثر حصہ کاٹنا (Amputation) پڑتا ہے۔

ان کی اہم وجوہات میں بلڈ شوگر کا مسلسل تیز رہنا: جس سے پاؤں کی چھوٹے خون کی شریانیں اور نسیں تباہ ہو جاتی ہیں۔

احساس نہ ہونا: جوتا چبھنے، تنکا لگنے یا گرم پانی سے جلنے کا پتہ نہ چلنا، جو بعد میں بڑا زخم بن جاتا ہے۔
خون کی ناقص گردش :(Peripheral Artery Disease) زخم تک آکسیجن اور دوائیاں نہ پہنچنے کی وجہ سے زخم کا نہ بھرنا۔
خشک جلد: شوگر کی وجہ سے پاؤں کی جلد خشک ہو کر پھٹنے لگتی ہے اور جراثیم اندر داخل ہو جاتے ہیں۔
خواتین میں پاؤں کے بیشتر مسائل ان کے مخصوص جوتوں کے انتخاب اور ہارمونل تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ اور اہم بیماریوں میں بنین :(Bunion) پاؤں کے انگوٹھے کے جوڑ کا باہر کی طرف نکل آنا اور انگوٹھے کا اندر کی طرف مڑ جانا۔ اور ہیلوکس ویلگس / ہیمر ٹو :(Hammer Toe) تنگ جوتوں کی وجہ سے پاؤں کی انگلیاں مستقل طور پر مڑ جانا۔ نیز پلانٹر فیسائٹس / Plantar Fasciitis) ایڑھی کا درد): صبح اٹھتے ہی ایڑی میں شدید درد ہونا۔ اس کے علاوہ پھٹی ہوئی ایڑیاں :(Cracked Heels) جلد کی خشکی اور کھلے جوتوں کی وجہ سے ایڑیوں میں گہرے کٹ پڑنا۔ اور
ان گروئن نیل :(Ingrown Toenail) ناخن کا گوشت کے اندر رہنس کر درد اور پیپ پیدا کرنا شامل ہیں
اس کی اہم وجوہات میں اونچی ہیل (High Heels) اور تنگ جوتے ہیں۔ اونچی ہیل پاؤں کے اگلے حصے پر جسم کا تمام وزن ڈال دیتی ہے اور انگلیوں کو دباتی ہے۔
حمل (Pregnancy) کے دوران وزن بڑھنے اور ہارمونز (Relaxin) کے اثر سے پاؤں کے پٹھے ڈھیلے پڑ جاتے ہیں، جس سے پاؤں کا چپٹا ہونا (Flat Feet) یا ایڑی کا درد عام ہو جاتا ہے۔
مینوپاز :(Menopause) عمر کے ساتھ ایسٹروجن ہارمون کی کمی سے جلد خشک اور ایڑیوں کی قدرتی چکنائی ختم ہونے لگتی ہے۔
ذیابیطس کے باعث پاؤں کے زخموں اور مسائل کی شرح دنیا اور پاکستان دونوں جگہ تشویشناک حد تک زیادہ ہے۔ دنیا بھر میں ذیابیطس کے مریضوں میں سے تقریباً 19٪ سے 34٪ افراد کو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی پاؤں کے زخم (Diabetic Foot Ulcers) کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہر سال دنیا میں 1 کروڑ 86 لاکھ (18.6 Million) سے زائد افراد ذیابیطس کے پاؤں کے زخموں کا شکار ہوتے ہیں۔ دنیا میں ہر 20 سیکنڈ بعد ذیابیطس کی پیچیدگیوں کی وجہ سے ایک پاؤں یا ٹانگ کاٹنی پڑتی ہے۔
پاکستان میں مختلف طبی تحقیقوں اور میٹا اینالائسز (Meta-analysis) کے مطابق پاکستان میں ذیابیطس کے مریضوں میں پاؤں کے زخموں کی شرح 12٪ سے 18٪ کے درمیان ہے۔

چونکہ پاکستان میں ذیابیطس کے مریضوں کی کل تعداد 3 کروڑ 30 لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے، اس لیے پاکستان میں 30 لاکھ سے 50 لاکھ سے زائد افراد پاؤں کی شدید پیچیدگیوں یا زخموں کے خطرے سے دوچار ہے۔ وقت پر تشخیص اور علاج نہ ہونے کے باعث پاکستان میں ذیابیطس کے زخموں کے بعد پاؤں یا انگلی کاٹنے (Amputation) کی شرح دنیا کے کئی خطوں سے زیادہ (تقریباً 20٪ سے 21٪) ریکارڈ کی گئی ہے

پاؤں کی ان تمام بیماریوں اور پیچیدگیوں سے بچاؤ کا سب سے مؤثر طریقہ "احتیاط اور بروقت معائنہ" ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کو چاہیے کہ وہ روزانہ رات کو سونے سے پہلے شیشے کی مدد سے اپنے پاؤں کے تلووں اور انگلیوں کے درمیانی حصے کا جائزہ لیں۔ ذرا سی بھی سرخی، چھالا یا زخم نظر آنے پر فوری طور پر ڈاکٹر سے رجوع کریں اور کبھی ننگے پاؤں نہ چلیں۔ پاؤں کو صاف اور خشک رکھیں اور روزانہ نرم کرنے والی کریم کا استعمال کریں۔

اسی طرح خواتین کے لیے ضروری ہے کہ وہ فیشن کے ساتھ ساتھ اپنے پاؤں کی قدرتی ساخت اور آرام کو ترجیح دیں۔ روزمرہ کے کام کاج کے لیے نرم، چوڑے پنجے والے اور مناسب سائز کے جوتوں کا انتخاب کریں اور اونچی ہیل کا استعمال صرف خاص اور محدود مواقع تک ہی رکھیں تاکہ پاؤں کے جوڑوں اور پٹھوں پر غیر ضروری دباؤ نہ پڑے۔

پاؤں کی دیکھ بھال کے عالمی دن کے موقع پر اس عزم کی ضرورت ہے کہ ہم پاؤں کی صحت کو معمولی نہ سمجھیں۔ بروقت آگاہی، ذیابیطس کا کنٹرول اور صحیح جوتوں کا استعمال ہمیں زندگی بھر اپنے قدموں پر فعال، متحرک اور معذوری سے محفوظ رکھ سکتا ہے



7اکتوبر کپاس کا عالمی دن -(World Cotton Day) سفید سونا: پاکستان کی معیشت کی شہ رگ حقائق و مسائل کے آئینے میں

کپاس کو بجا طور پر "سفید سونا" کہا جاتا ہے۔ یہ دنیا کی اہم ترین قدرتی ریشہ دار فصل ہے جو کروڑوں کسانوں، مزدوروں اور صنعتی کارکنوں کے روزگار کا ذریعہ ہے۔ پاکستان کے لیے کپاس محض ایک فصل نہیں بلکہ ملکی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے، کیونکہ ملک کی سب سے بڑی صنعت یعنی ٹیکسٹائل کا پورا ڈھانچہ اسی پر کھڑا ہے۔ اسی اہمیت کے پیشِ نظر ہر سال 7اکتوبر کو دنیا بھر میں کپاس کا عالمی دن منایا جاتا ہے۔

اس دن کو منانے کی تجویز سب صحارا افریقہ کے کپاس پیدا کرنے والے چار ممالک نے دی تھی، جنہیں عالمی سطح پر Cotton-4 (C4) کہا جاتا ہے۔ ان میں بنین (Benin)، برکینا فاسو (Burkina Faso)، چاڈ (Chad) اور مالی (Mali) شامل ہیں۔ ان ممالک نے عالمی تجارت اور غریب کسانوں کی زندگیوں میں کپاس کی معاشی اہمیت اجاگر کرنے کے لیے یہ پہل کی۔

اس عالمی دن کا باقاعدہ آغاز 7 اکتوبر 2019 کو سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا میں ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (WTO) کے ہیڈ کوارٹر سے ہوا۔ اس موقع پر WTO کے ساتھ فوڈ اینڈ ایگریکلچر آرگنائزیشن (FAO)، انٹرنیشنل کاٹن ایڈوائزری کمیٹی (ICAC)، اقوامِ متحدہ کی تجارت و ترقی کانفرنس (UNCTAD) اور انٹرنیشنل ٹریڈ سینٹر (ITC) شریک تھے۔

بعد ازاں انہی C4 ممالک نے اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں باضابطہ قرارداد پیش کی، جسے اگست 2021 میں متفقہ طور پر منظور کر لیا گیا۔ یوں 7 اکتوبر اقوامِ متحدہ کے مستقل عالمی کیلنڈر کا باقاعدہ حصہ بن گیا۔

کپاس کا عالمی دن پانچ براعظموں کے 75 سے زائد ممالک میں منایا جاتا ہے جہاں کپاس کی کاشت یا ٹیکسٹائل صنعت موجود ہے، جیسے پاکستان، بھارت، چین، امریکہ، برازیل اور افریقی ممالک۔

اس موقع پر اقوامِ متحدہ کے ادارے FAO) اور WTO وغیرہ) ہر سال کسی میزبان ملک کے اشتراک سے بین الاقوامی کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں، جن میں پائیدار پیداوار، منڈی تک رسائی اور تجارتی پالیسیوں پر غور ہوتا ہے اور کپاس سے بنے قدرتی اور ماحول دوست کپڑوں کی نمائشیں ہوتی ہیں تاکہ مصنوعی ریشوں (Synthetics) کے مقابلے میں روئی کی افادیت اجاگر ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کے کروڑوں کسانوں اور چنائی کرنے والے مزدوروں—جن میں بڑی تعداد خواتین کی ہے—کی محنت کو خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے اور ان کی منصفانہ اجرت کے لیے آواز اٹھائی جاتی ہے۔

پاکستان میں: محکمہ زراعت، کاٹن ریسرچ ادارے اور ٹیکسٹائل ملز سیمینار اور ورکشاپس منعقد کرتے ہیں جن میں کاشتکاروں کو جدید ٹیکنالوجی، کیڑوں سے بچاؤ اور پیداوار بڑھانے کے طریقوں سے آگاہ کیا جاتا ہے۔

عالمی سطح پر کپاس کی سالانہ پیداوار تقریباً 116 سے 122 ملین گانٹھیں (بیلز) یعنی تقریباً 25 سے 26 ملین میٹرک ٹن ہوتی ہے۔

پیداوار کے لحاظ سے سرفہرست ممالک میں

چین سب سے آگے ہے اور عالمی پیداوار کا تقریباً 25 سے 29 فیصد حصہ پیدا کرتا ہے بھارت دنیا کا دوسرا بڑا پیدا کنندہ اور سب سے زیادہ رقبے پر کاشت کرنے والا ملک ہے اور

برازیل تیسرا بڑا پیدا کنندہ اور اس وقت دنیا کا سب سے بڑا برآمد کنندہ ملک بھی ہے جبکہ

پاکستان حالیہ برسوں میں پیداوار میں کمی کے باعث تقریباً چھٹے نمبر پر ہے

کپاس پاکستان کی سب سے اہم نقد آور فصل ہے۔ ٹیکسٹائل اور اس سے وابستہ مصنوعات ملک کی کل برآمدات کا تقریباً 55 سے 60 فیصد حصہ بناتی ہیں، اس لیے کپاس کو بالواسطہ طور پر ملکی زرمبادلہ کا سب سے بڑا ذریعہ کہا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ:

ٹیکسٹائل شعبہ ملک کی صنعتی افرادی قوت کے تقریباً 40 فیصد کو روزگار فراہم کرتا ہے، جبکہ لاکھوں کسان گھرانے براہِ راست کپاس کی کاشت سے وابستہ ہیں۔ کپاس کا بیج (بنولہ) ملک میں مقامی طور پر تیار ہونے والے خوردنی تیل کا بڑا ذریعہ ہے، اور اس کی کھل مویشیوں کی اہم خوراک ہے۔ یوں کپاس کا بحران خوردنی تیل اور لائیو اسٹاک شعبے کو بھی متاثر کرتا ہے

کپاس کی تحقیق و ترقی کے لیے پاکستان سینٹرل کاٹن کمیٹی (PCCC) اور سینٹرل کاٹن ریسرچ انسٹیٹیوٹ (CCRI) ملتان سمیت متعدد ادارے کام کر رہے ہیں۔

پاکستان نے 2004–05 میں 14 ملین گانٹھوں سے زائد کی ریکارڈ پیداوار حاصل کی تھی، جبکہ اب پیداوار اس کے نصف سے بھی کم رہ گئی ہے۔ اسی عرصے میں زیرِ کاشت رقبہ بھی تقریباً 3 ملین ہیکٹر سے کم ہو کر 2 ملین ہیکٹر کے لگ بھگ آ گیا ہے۔ کیونکہ کاٹن کے علاقوں میں شوگر ملز نے گنا کاشت کروانا شروع کر دیا جو ایک مستحکم فصل ہے

حالیہ سالوں (2025–2026) میں ناموافق موسم، سیلاب اور کیڑوں کے حملوں کی وجہ سے پاکستان میں کپاس کی پیداوار کم ہو کر تقریباً 4.9 سے 5.6 ملین بیلز تک رہ گئی ہے۔ا

پاکستان کی کپاس کی مجموعی پیداوار میں صوبوں کا حصہ وقت کے ساتھ تبدیل ہوتا رہتا ہے، لیکن تاریخی اور اوسط پیداواری اعداد و شمار کے مطابق ملکی پیداوار کا تقریباً 68٪ سے 70٪ حصہ پنجاب سے حاصل ہوتا ہے۔ (اگر 5.6 ملین بیلز کو بنیاد بنایا جائے تو یہ تقریباً 3.8 سے 3.9 ملین بیلز بنتا ہے)۔ اور سندھ کا حصہ تقریباً 28٪ سے 30٪ ہوتا ہے۔ (5.6 ملین بیلز میں سے یہ تقریباً 1.6 سے 1.7 ملین بیلز بنتا ہے)۔

تاہم بعض حالیہ سیزنز میں موسمیاتی تبدیلیوں اور پنجاب میں فصل کو پہنچنے والے نقصان کی وجہ سے سندھ کا حصہ عارضی طور پر بڑھ کر 50 فیصد سے بھی تجاوز کر گیا تھا۔ کپاس کی پیداوار کے لحاظ سے پاکستان کا ضلع سانگھڑ (صوبہ سندھ) پورے پاکستان میں کپاس کی کاشت اور پیداوار کا سب سے بڑا مرکز (Hub) مانا جاتا ہے، جو اکیلے ہی سندھ اور ملک کی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصہ فراہم کرتا ہے۔

پنجاب میں پیداوار کے لحاظ سے بہاولنگر، رحیم یار خان، اور بہاولپور سرفہرست اضلاع ہیں۔ رقبے اور برآمدی معیار کے لحاظ سے بہاولنگر پنجاب کا اہم ترین ضلع سمجھا جاتا ہے۔

تاہم یہ پیداوار بہت ہی کم ہے کیونکہ

پاکستان کی ٹیکسٹائل انڈسٹری اور اسپننگ ملز کو رواں رکھنے کے لیے سالانہ تقریباً10 سے 10.5 ملین بیلز کی ضرورت ہوتی ہے۔ مقامی پیداوار کم ہونے کی وجہ سے پاکستان کو اپنی ضرورت کا تقریباً50 فیصد خام مال باہر سے منگوانا پڑتا ہے۔ کیونکہ کپاس کاتنے میں پاکستان صلاحیت کے لحاظ سے دنیا میں تیسرے نمبر پر ہے۔

پاکستان بنیادی طور پر برازیل(Brazil)

امریکہ(United States) ،افغانستان (Afghanistan) چین (China) اور ترکیہ (Turkey) سے یہ خام کپاس درآمد کرتا ہے اور اس کے باعث پاکستان کا سالانہ کاٹن امپورٹ بل (درآمدی لاگت) تقریباً1.5 سے 2 ارب امریکی ڈالر (USD)تک پہنچ جاتا ہے، جو ملکی خزانے اور زرمبادلہ کے ذخائر پر ایک بڑا بوجھ بنتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود پاکستان اس کی پروسیسنگ کرکے ٹیکسٹائل اور ویلیو ایڈڈ (Value Added) مصنوعات کی شکل میں بھاری زرمبادلہ کماتا ہے۔ یہ شعبہ پاکستان کی کل برآمدی آمدنی کا تقریباً60٪ سے 61٪ حصہ تشکیل دیتا ہے، جس میں سے 80 فیصد سے زائد حصہ اعلیٰ ویلیو ایڈڈ مصنوعات کا ہے۔ مالیاتی سال 2025–26 کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق، کپاس اور ٹیکسٹائل سے وابستہ مجموعی برآمدات 17.93 ارب ڈالر تک پہنچ چکی ہیں جو کہ ملکی معیشت کی بنیادی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔

اس شعبے میں سب سے زیادہ زرمبادلہ نیٹ ویئر (Knitwear) سے حاصل ہوتا ہے جس کی سالانہ کمائی 5.1 سے 5.4 ارب ڈالر کے درمیان ہے۔ اس کے بعد ریڈی میڈ گارمنٹس سے 4.2 سے 4.5 ارب ڈالر، اور بیڈ ویئر (چادریں اور ہوم ٹیکسٹائل) سے 2.8 سے 3.0 ارب ڈالر کمائے جاتے ہیں۔ دیگر اہم اشیاء میں سوتی کپڑا (2.0 سے 2.2 ارب ڈالر)، تولیے (1.0 سے 1.1 ارب ڈالر)، اور بنیادی خام مال کی شکل میں سوتی دھاگہ (0.8 سے 1.0 ارب ڈالر) شامل ہیں جو مل کر پاکستان کے زرمبادلہ کے ذخائر کو مستحکم رکھتے ہیں۔

امریکہ پاکستانی ٹیکسٹائل کا سب سے بڑا واحد خریدار ملک ہے، جبکہ یورپی یونین (جرمنی، اسپین، نیدرلینڈز، اٹلی، فرانس وغیرہ) بحیثیت بلاک سب سے بڑی منڈی ہے۔ برطانیہ بھی ایک اہم خریدار ہے۔ یورپی یونین کی جی ایس پی پلس (GSP+) سہولت نے پاکستانی ٹیکسٹائل کو ڈیوٹی فری رسائی دے کر ان برآمدات میں نمایاں کردار ادا کیا ہے۔

اس وقت کپاس کے شعبے کو درپیش بڑے چیلنجز درج ہیں

- موسمیاتی تبدیلی: بڑھتا ہوا درجہ حرارت، گرمی کی لہریں، بے وقت بارشیں اور سیلاب (خصوصاً2022 کا سیلاب) فصل کو شدید نقصان پہنچاتے ہیں

● کیڑے اور بیماریاں: گلابی سنڈی (Pink Bollworm)، سفید مکھی (Whitefly) اور پتہ مروڑ وائرس (Cotton Leaf Curl Virus) پیداوار میں کمی کی بڑی وجوہات ہیں۔

● غیر معیاری بیج: تصدیق شدہ اور جدید بیج کی کمی، اور ناقص بیج کی کھلی فروخت فی ایکڑ پیداوار کو کم رکھتی ہے۔

● زیادہ لاگت اور کم منافع: کھاد، زرعی ادویات، ڈیزل اور بجلی کی بڑھتی قیمتوں کے مقابلے میں کسان کو مناسب نرخ نہیں ملتے۔

● آلودگی :(Contamination) چنائی کے دوران پولی پروپیلین، بال اور دیگر آلودگی پاکستانی روئی کی عالمی قیمت کم کر دیتی ہے۔

● فصلوں کی تبدیلی: کاٹن زون میں گنے کی ملوں اور گنے کی کاشت کا پھیلاؤ کپاس کے رقبے کو مسلسل کم کر رہا ہے۔

زرعی ماہرین اس شعبہ میں بہتری کے لیے درج تجاویز پیش کرتے ہیں

● تحقیق اور جدید بیج: موسمیاتی تبدیلیوں اور گرمی کو برداشت کرنے والی، کیڑوں کے خلاف مزاحم نئی اقسام کی تیاری پر سرمایہ کاری کی جائے۔

● امدادی قیمت: کاشت سے پہلے منافع بخش امدادی قیمت (Intervention Price) کا اعلان اور اس پر مؤثر عملدرآمد کیا جائے۔

● کاٹن زون کا تحفظ: کاٹن زون کو قانونی تحفظ دے کر وہاں گنے کی کاشت اور نئی شوگر ملوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

● صاف چنائی اور جننگ: چنائی کرنے والی خواتین کی تربیت، صاف چنائی اور جننگ فیکٹریوں کی جدید کاری سے روئی کا معیار بہتر بنایا جائے۔

● جدید ٹیکنالوجی: ڈرپ آبپاشی، مشینی کاشت، ڈیجیٹل زرعی مشاورت اور بیٹر کاٹن (Better Cotton) جیسے پائیدار طریقوں کو فروغ دیا جائے۔

● یکساں ٹیکس پالیسی: برآمدی صنعت کو مقامی کپاس خریدنے کی ترغیب دینے والی ٹیکس پالیسی بنائی جائے تاکہ درآمدی بل کم ہو۔

الختصر۔ کپاس کا عالمی دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ پاکستان کی معاشی خوشحالی کا راستہ کپاس کے کھیتوں سے ہو کر گزرتا ہے۔ اگر پاکستان اپنی پیداوار کو دوبارہ 10 سے 14 ملین گانٹھوں تک لے جائے تو نہ صرف ایک سے دو ارب ڈالر کا درآمدی بل بچ سکتا ہے بلکہ ٹیکسٹائل برآمدات میں بھی کئی گنا اضافہ ممکن ہے۔ اس کے لیے حکومت، تحقیقی اداروں، صنعت اور کسان سب کو مل کر "سفید سونے" کی کھوئی ہوئی چمک واپس لانی ہو گی۔

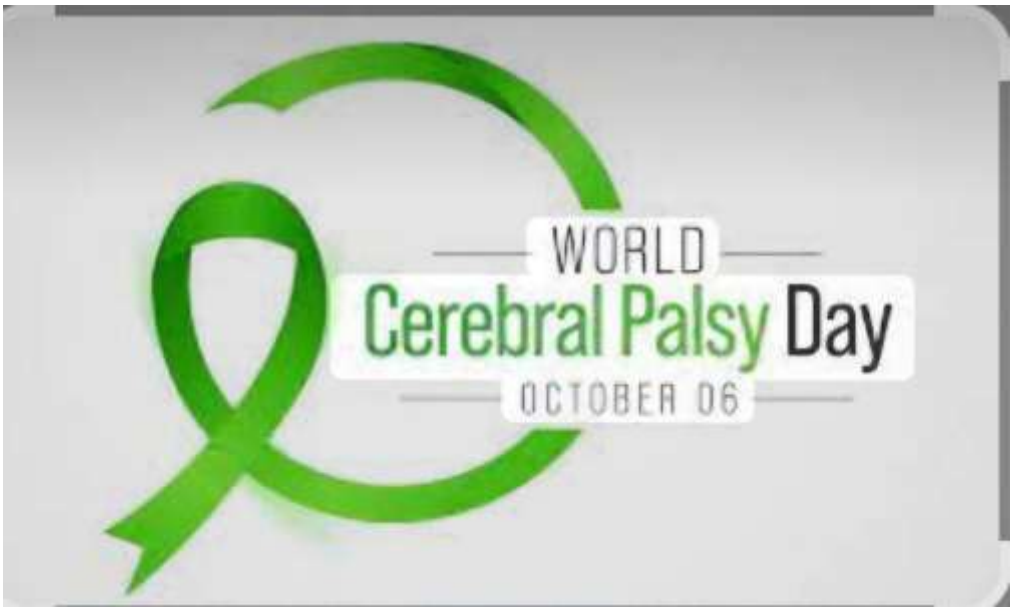

6اکتوبر -سیر یبرل پالسی (دماغی فالج،) کا عالمی دن اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات (ہمدردی نہیں، ہمقدمی چاہیے)۔

سیر یبرل پالسی (Cerebral Palsy) یعنی دماغی فالج کا عالمی دن ہر سال 6 اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کا آغاز 2012 میں آسٹریلیا کی تنظیم Cerebral Palsy Alliance نے امریکہ کی United Cerebral Palsy کے اشتراک سے کیا۔ ایک چھوٹی سماجی تحریک کے طور پر شروع ہونے والی یہ مہم آج دنیا کے 100 سے زائد ممالک تک پھیل چکی ہے۔ اس تحریک کی اصل طاقت متاثرہ افراد کے اہلِ خانہ اور مقامی سماجی کارکن (Grassroots Advocates) تھے، جو اپنے پیاروں کو معاشرتی تنہائی اور نظر اندازی سے نکالنا چاہتے تھے

۔2012 میں پہلی عالمی مہم) "Change My World in 1 Minute" ایک منٹ میں میری دنیا بدل دو) کے نام سے چلائی گئی، جس میں سی پی کے ساتھ زندگی گزارنے والے افراد سے ایسے خیالات اور ایجادات مانگی گئیں جو ان کی روزمرہ زندگی آسان بنا سکیں۔

اس دن کا پہلا مقصد شعور بیدار کرنا ہے، یعنی عام لوگوں، اساتذہ اور ڈاکٹروں کو سی پی کی علامات، وجوہات اور بروقت تشخیص کی اہمیت سے آگاہ کرنا۔ دوسرا مقصد شمولیت اور مساوی حقوق ہے، تاکہ سی پی سے متاثرہ بچوں اور بڑوں کو تعلیم، صحت، روزگار اور سماجی زندگی میں دوسروں جیسے مواقع مل سکیں۔

تیسرا مقصد ان افراد کی کامیابیوں کا جشن منانا ہے جو اس معذوری کے باوجود مختلف شعبوں میں نمایاں کارکردگی دکھا رہے ہیں۔

چوتھا مقصد حکومتوں اور سائنسدانوں کی توجہ تحقیق اور جدت کی طرف مبذول کروانا ہے، تاکہ بہتر وہیل چیئرز، معاون ٹیکنالوجی اور طبی تحقیق کے لیے وسائل فراہم ہوں۔

سیریبرل پالسی بچپن کی سب سے عام جسمانی (حرکتی) معذوری ہے۔ یہ نشوونما پاتے دماغ کو پہنچنے والے مستقل نقصان کا نتیجہ ہے، جو جسمانی حرکت، توازن اور بیٹھنے یا کھڑے ہونے کے انداز (Posture) کو متاثر کرتا ہے۔ یہ کوئی متعدی بیماری نہیں اور وقت کے ساتھ دماغی نقصان بڑھتا نہیں، البتہ مناسب دیکھ بھال نہ ہو تو پٹھوں اور جوڑوں کے مسائل بڑھ سکتے ہیں۔ علامات ہر بچے میں مختلف ہوتی ہیں؛ کسی میں معمولی تو کسی میں شدید۔ عام علامات میں پٹھوں کا بہت سخت (Stiff) یا بہت ڈھیلا (Floppy) ہونا، گردن سنبھالنے، بیٹھنے، رینگنے اور چلنے میں تاخیر، اور جسم کے ایک حصے کو زیادہ استعمال کرنا شامل ہیں۔ کئی بچوں کو بولنے، چبانے اور نگلنے میں دشواری، رال زیادہ ٹپکنے، اور ہاتھ پاؤں یا چہرے کی غیر ارادی حرکات کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ بعض بچوں میں مرگی کے دورے، نظر یا سماعت کی کمزوری اور سیکھنے میں دشواری بھی ساتھ پائی جاتی ہے۔

عام تاثر کے برعکس، زیادہ تر کیسز میں دماغی نقصان پیدائش سے پہلے یعنی حمل کے دوران ہوتا ہے؛ زچگی کے دوران آکسیجن کی کمی صرف ایک حصے کی وجہ بنتی ہے۔ حمل کے دوران ماں کو شدید انفیکشن، بچے کے دماغ تک خون یا آکسیجن کی فراہمی میں رکاوٹ اور بعض جینیاتی عوامل اہم وجوہات ہیں۔ وقت سے بہت پہلے پیدائش (Premature Birth) اور پیدائش کے وقت کم وزن سب سے بڑے خطرے کے عوامل ہیں، جبکہ پیدائش کے بعد شدید یرقان کا بروقت علاج نہ ہونا، گردن توڑ بخار (Meningitis) یا سر پر شدید چوٹ بھی اس کا سبب بن سکتی ہے۔

بچوں میں بروقت تشخیص سب سے قیمتی ہتھیار ہے، کیونکہ ابتدائی دو سال دماغ کی لچک کا سنہری دور ہوتے ہیں۔ چھ ماہ سے کم عمر بچے میں اگر اٹھاتے وقت گردن پیچھے کو ڈھلک جائے، جسم بہت اکڑا ہوا یا بالکل ڈھیلا محسوس ہو، یا بچہ اپنی ٹانگیں قینچی کی طرح ایک دوسرے پر چڑھا لے (Scissoring) تو یہ خطرے کی علامت ہے۔

چھ ماہ سے بڑے بچے کا کروٹ نہ لے پانا، دونوں ہاتھ آپس میں نہ ملا پانا، یا ایک ہاتھ استعمال کرتے ہوئے دوسرا مٹھی میں بند رکھنا توجہ طلب ہے۔

دس ماہ سے بڑا بچہ اگر سہارے کے بغیر بیٹھ نہ سکے، یا گھٹنوں کے بل چلنے کے بجائے کولہوں کے بل گھسٹ کر یا ٹیڑھے انداز میں آگے بڑھے، تو والدین کو فوراً چائلڈ اسپیشلسٹ یا پیڈیاٹرک نیورولوجسٹ سے رجوع کرنا چاہیے۔

سیریبرل پالسی کا کوئی مستقل علاج (Cure) موجود نہیں، لیکن بروقت شروع کی گئی تھراپیز بچے کو کافی حد تک خود مختار بنا سکتی ہیں۔ فزیو تھراپی اس کا بنیادی ستون ہے، جو پٹھوں کی سختی کم کرتی، طاقت بڑھاتی اور بیٹھنے، کھڑے ہونے اور چلنے میں مدد دیتی ہے۔ آکیوپیشنل تھراپی بچے کو روزمرہ کے کام سکھاتی ہے، جیسے خود کھانا کھانا، کپڑے پہننا، لکھنا اور چیزیں پکڑنا۔

اسپیچ تھراپی بولنے، چبانے اور نگلنے کے مسائل میں زبان اور چہرے کے پٹھوں کی مشقوں کے ذریعے مدد کرتی ہے۔ امدادی آلات جیسے خصوصی جوتے اور اسپلنٹس (AFOs)، واکر اور وہیل چیئر نقل و حرکت آسان بناتے ہیں۔ پٹھوں کی شدید سختی کے لیے ڈاکٹر ادویات یا بوٹولینم ٹاکسن کے انجکشن تجویز کر سکتے ہیں، اور بعض صورتوں میں ہڈیوں اور پٹھوں کو درست کرنے کے لیے آرتھوپیڈک سرجری کی جاتی ہے۔

عالمی تخمینوں کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 1 کروڑ 70 لاکھ سے 1 کروڑ 80 لاکھ افراد سی پی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ ان کے اہلِ خانہ اور نگہداشت کرنے والوں کو شامل کیا جائے تو تقریباً 35 کروڑ لوگ اس سے براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔

آسٹریلیا اور یورپ جیسے ترقی یافتہ خطوں میں یہ شرح تقریباً 1.6 فی ہزار زندہ پیدائشیں ہے، جبکہ جنوبی ایشیا سمیت کم اور متوسط آمدنی والے ممالک میں یہ 3 فی ہزار سے بھی زیادہ ریکارڈ کی گئی ہے۔ آبادی زیادہ ہونے کے باعث متاثرین کی سب سے بڑی تعداد بھارت، چین اور دیگر گنجان آباد ترقی پذیر ممالک میں ہے۔

پاکستان میں کوئی قومی سی پی رجسٹری موجود نہیں، اس لیے یہاں کی درست شرح یا عالمی درجہ بندی متعین نہیں۔ مختلف مقامی جائزوں کے اندازے تقریباً 2 سے 3 بچے فی ہزار زندہ پیدائشیں بتاتے ہیں۔ اس بلند شرح کی بڑی وجوہات میں گھروں پر غیر تربیت یافتہ ہاتھوں سے زچگی، قبل از وقت پیدائش، کم وزن بچے، نوزائیدہ یرقان کا دیر سے علاج اور بچپن کے دماغی انفیکشن شامل ہیں۔

وفاقی سطح پر پاکستان نے 2011 میں اقوامِ متحدہ کے معذور افراد کے حقوق کے کنونشن (UNCRPD) کی توثیق کی، جس کے بعد معذوری کو فلاح کے بجائے حقوق کا معاملہ سمجھا جانے لگا۔ 1981 کے معذور افراد (روزگار و بحالی) آرڈیننس کے تحت ملازمتوں میں کوٹہ مقرر ہوا، اور 2020 میں اسلام آباد کے لیے "معذور افراد کے حقوق کا ایکٹ" منظور ہوا۔ نادرا معذور افراد کو وہیل چیئر کے نشان والا خصوصی شناختی کارڈ جاری کرتا ہے، جبکہ بینظیر انکم سپورٹ پروگرام کے تحت مستحق معذور افراد کو مالی معاونت بھی دی جاتی ہے۔

پنجاب میں 2003 میں خصوصی تعلیم کا الگ محکمہ (Special Education Department) قائم کیا گیا، جو صوبے بھر میں خصوصی بچوں کے لیے سکول، مراکز اور مفت ٹرانسپورٹ فراہم کرتا ہے۔ صوبے نے سرکاری ملازمتوں میں معذور افراد کا کوٹہ 3 فیصد کیا، اور 2022 میں "پنجاب ایمپاورمنٹ آف پرسنز وِد ڈس ایبلٹیز ایکٹ" منظور کیا، جو تعلیم، صحت، روزگار اور عمارتوں تک رسائی کے حقوق کا قانونی تحفظ دیتا ہے۔ محکمہ سوشل ویلفیئر معذوری سرٹیفکیٹ جاری کرتا اور وہیل چیئرز و معاون آلات تقسیم کرتا ہے۔

حالیہ برسوں میں پنجاب حکومت نے "ہمقدم" پروگرام کے ذریعے معذور افراد کو باقاعدہ مالی وظیفہ دینا شروع کیا، جبکہ صحت کارڈ کے ذریعے سرکاری و نجی ہسپتالوں میں علاج کی سہولت دی گئی۔ چلڈرن ہسپتال لاہور اور دیگر ٹیچنگ ہسپتالوں میں چائلڈ ڈیولپمنٹ اور بحالی کے یونٹس قائم کیے گئے ہیں۔ چونکہ سی پی کی بڑی وجوہات حمل اور زچگی سے جڑی ہیں، اس لیے لیڈی ہیلتھ ورکرز پروگرام اور ماں و بچے کی صحت (MNCH) کے منصوبے، یعنی محفوظ زچگی، تربیت یافتہ دائیاں اور نوزائیدہ کی دیکھ بھال، بھی بالواسطہ طور پر اس کی روک تھام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ان اقدامات کے مثبت اثرات واضح ہیں: قانونی تحفظ ملنے سے معذوری حقوق کا موضوع بنی، خصوصی تعلیم کے اداروں میں ہزاروں بچے داخل ہوئے، اور وظائف و صحت کارڈ نے غریب خاندانوں کا مالی بوجھ کم کیا۔ لاہور جیسے بڑے شہروں میں جدید تشخیص اور تھراپی کی سہولیات اب نسبتاً سستی یا مفت دستیاب ہیں۔ اگر پنجاب کے دل لاہور کا ذکر کیا جائے تو اس شہر میں بحالی کے نمایاں مراکز یہ ہیں

دی چلڈرن ہسپتال اینڈ یونیورسٹی آف چائلڈ ہیلتھ سائنسز، فیروز پور روڈ، ملک میں بچوں کے بڑے ترین سرکاری ہسپتالوں میں سے ہے۔ یہاں پیڈیاٹرک نیورولوجی، چائلڈ ڈیولپمنٹ اور فزیو تھراپی کی سہولیات معمولی فیس یا مفت فراہم کی جاتی ہیں۔

پاکستان سوسائٹی فار ری ہیبلیٹیشن آف ڈفرنٹلی ایبلڈ (PSRD)، فیروز پور روڈ، کئی دہائیوں سے معذور افراد کی فزیو تھراپی، آرتھوپیڈک علاج، مصنوعی اعضا اور تعلیم و تربیت کے لیے خدمات انجام دے رہی ہے، اور مستحق خاندانوں کو خصوصی رعایت دیتی ہے۔

نجی شعبے میں واپڈا ٹاؤن کا Rehab Care Center فزیو، اسپیچ اور آکیوپیشنل تھراپی فراہم کرتا ہے،

جبکہ طارق گارڈن کا Occupational Therapy & Child Development Centre حسیاتی انضمام (Sensory Integration) اور کھانے پینے کے مسائل کے علاج کے لیے جانا جاتا ہے۔

تاہم چیلنجز بھی کم نہیں۔ دیہی علاقوں میں تربیت یافتہ فزیو، اسپیچ اور آکیوپیشنل تھراپسٹ کی شدید کمی ہے، اور اکثر خاندانوں کو علاج کے لیے بڑے شہروں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ ملازمتوں کے کوٹے پر مکمل عمل درآمد نہیں ہو پاتا، عمارتیں اور پبلک ٹرانسپورٹ اب بھی وہیل چیئر کے لیے موزوں نہیں، اور سماجی بدنامی کی وجہ سے کئی والدین بچوں کو چھپاتے یا دیر سے علاج شروع کرتے ہیں۔

آگے بڑھنے کے لیے قومی سی پی رجسٹری کا قیام، ہر ضلعی ہسپتال میں ابتدائی مداخلت (Early Intervention) یونٹ، نوزائیدہ بچوں کی باقاعدہ اسکریننگ، اور عام سکولوں میں شمولیتی تعلیم (Inclusive Education) کو فروغ دینا ناگزیر ہے۔ المختصر سیریبرل پالسی کے ساتھ جینے والے افراد کو ترس کی نہیں بلکہ برابری، رسائی اور مواقع کی ضرورت ہے۔ بروقت تشخیص، مسلسل تھراپی، مضبوط سرکاری پالیسی اور معاشرے کا مثبت رویہ مل کر ان کی زندگی بدل سکتے ہیں

۔6 اکتوبر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہمارا ایک منٹ کا شعور بھی کسی کی پوری دنیا بدل سکتا ہے۔



5 اکتوبر—اساتذہ کا عالمی دن. تعظیم کے پھول ۔فاقے کی تنخواہ۔پنجاب کے استاد کا المیہ

ہر سال 5 اکتوبر کو دنیا بھر میں اساتذہ کا عالمی دن (World Teachers' Day) منایا جاتا ہے۔ یہ دن کسی ایک فرد کی ذاتی تجویز نہیں بلکہ اقوامِ متحدہ کے دو بڑے اداروں، یونیسکو (UNESCO) اور بین الاقوامی ادارۂ محنت (ILO)، کی مشترکہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

5 اکتوبر 1966ء کو پیرس میں ایک خصوصی بین الحکومتی کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں اساتذہ کے حقوق، فرائض، تربیت، تنخواہوں اور معیارِ زندگی سے متعلق ایک تاریخی دستاویز "اساتذہ کی حیثیت سے متعلق سفارش نامہ " (Recommendation concerning the Status of Teachers) منظور کی گئی۔ بعد ازاں 1997ء میں اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کے لیے بھی ایک الگ سفارش نامہ منظور ہوا۔ اسی یادگار معاہدے کی مناسبت سے 1994ء میں یونیسکو نے باضابطہ طور پر 5 اکتوبر کو اساتذہ کا عالمی دن قرار دیا۔ آج یہ دن یونیسکو، آئی ایل او، یونیسف اور اساتذہ کی عالمی تنظیم ایجوکیشن انٹرنیشنل (Education International) کے اشتراک سے منایا جاتا ہے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ 1966ء کی سفارشات میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ استاد کی تنخواہ اتنی ہو کہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکے اور اسے ملازمت کا تحفظ حاصل ہو۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر آج پنجاب کے استاد کی حالت کو پرکھنا چاہیے۔

اس دن منانے پس پردہ بنیادی مقاصد میں معاشرے کی تعمیر و ترقی میں اساتذہ کی محنت اور قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا۔ طلبہ اور معاشرے میں استاد کی اہمیت اور اس کے بنیادی کردار کو اجاگر کرنا اساتذہ کو درپیش مسائل، جیسے حقوق، تنخواہوں اور کام کے حالات، کی طرف توجہ دلانا اور نئی نسل کے دلوں میں استاد کے لیے قدردانی اور احترام پیدا کرنا شامل ہیں

یہ دن 100 سے زائد ممالک میں، بشمول پاکستان، منایا جاتا ہے۔ کئی ممالک اپنا قومی یومِ اساتذہ الگ تاریخ پر بھی مناتے ہیں، جیسے بھارت میں 5 ستمبر، مگر 5 اکتوبر کی عالمی تاریخ پر بیشتر دنیا اساتذہ کو یاد کرتی ہے۔ پاکستان کے چھوٹے بڑے شہروں میں سکولوں، کالجوں، جامعات اور پریس کلبوں میں سیمینار اور تقریبات ہوتی ہیں۔ وزراء اور حکومتی شخصیات تعریفی پیغامات جاری کرتی ہیں، طلبہ اساتذہ کو پھول، کارڈ اور تحائف پیش کرتے ہیں، اور ریڈیو، ٹیلی ویژن اور سوشل میڈیا پر خصوصی پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ بعض اداروں میں نمایاں اساتذہ کو شیلڈیں اور اسناد بھی دی جاتی ہیں۔

اس دن کے منائے جانے اور تقریبات کی چمک دمک اپنی جگہ، مگر سوال یہ ہے کہ ان تین دہائیوں میں اس دن نے استاد کی زندگی میں عملاً کیا تبدیلی پیدا کی؟

اس دن کا ایک فائدہ ضرور ہے: معاشرے میں استاد کی عظمت کا احساس تازہ ہوتا ہے اور حکومتوں کی توجہ تنخواہوں، ملازمت کے تحفظ اور بنیادی سہولیات جیسے مسائل کی طرف دلائی جاتی ہے۔ اساتذہ کی آواز بھی اس دن زیادہ زور سے سنائی دیتی ہے۔ لیکن زمینی حقیقت تلخ ہے۔ پاکستان میں، خصوصاً پرائمری سطح، کم وسائل والے نجی سکولوں اور اب آؤٹ سورس کیے گئے سرکاری سکولوں کے اساتذہ کی معاشی حالت میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں آئی۔ مہنگائی نے ان کی محدود آمدن کو مزید بے وقعت کر دیا ہے۔ ایک دن کے پھول اور شیلڈیں پورے سال کے فاقوں کا مداوا نہیں کر سکتیں۔

حکومتِ پنجاب پبلک پرائیویٹ پارٹنر شپ (آؤٹ سورسنگ) پالیسی کے تحت اب تک تقریباً 13,000 سرکاری سکول نجی ہاتھوں میں دے چکی ہے۔ یہ عمل 2024ء میں پنجاب سکولز ری آرگنائزیشن پروگرام کے تحت شروع ہوا، اس سے قبل PSSP کے تحت 2016 میں دس ہزار سے زائد سکول (جس کا انتظام پنجاب ایجوکیشن انیشی ایٹوز مینجمنٹ اتھارٹی (PEIMA) کے پاس ہے) اس کے علاوہ ہیں۔ اب PEF کے تحت 13000 سکولز کے علاوہ تیسرے مرحلے میں حوالے کیے گئے 2,682 سکول اور بھی ہیں اور مجوزہ کل ہدف تقریباً 25,000 سکول ہے

۔اس کے علاوہ حکومت 555 سکول (5 سے کم طلبہ یا داخلے بڑھانے میں ناکام) کو بند کرنے یا ان کو قریبی 2 کلو میٹر کے اندر بڑے سکولوں میں ضم کرنے کے منصوبے پر بھی کام کر رہی ہے

۔حکومت اس کے علاوہ ایک متبادل منصوبہ کے تحت 10,000 سکولوں کی اپ گریڈیشن کر کے انہیں، "سکول آف ایمیننس" کا نام دیے رہی ہے اور اس پر بہت سا کام ہو چکا اور باقی جاری ہے

جو سکول نجی شعبے، این جی اوز اور انفرادی انٹرپرینیورز کے حوالے کیے جا رہے ہیں یا کئے جس چکے ہیں۔ ان سکولوں سے سرکاری اساتذہ کی مستقل اسامیاں ختم کی جا چکی ہیں؛ صرف پہلے مرحلے میں تقریباً 10 ہزار سکولوں کی مستقل سیٹیں ختم ہوئیں۔

حکومت کا مؤقف ہے کہ مستقل اساتذہ کو نوکری سے نہیں نکالا جا رہا بلکہ انہیں "سرپلس پول" میں ڈال کر دوسرے سرکاری سکولوں میں ایڈجسٹ کیا جا رہا ہے۔ نئے مالکان کو سکول چلانے کا مکمل اختیار اور نجی اساتذہ بھرتی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔ حکومت کا ارادہ ہے کہ کم داخلوں اور کمزور نتائج والے مزید سکول بھی اسی ماڈل کے تحت دیے جائیں، اور بچت شدہ وسائل دیگر سکولوں کی بہتری پر خرچ ہوں۔

اساتذہ تنظیموں کی تشویش یہ ہے کہ اس عمل سے سرکاری ملازمت کا دائرہ مسلسل سکڑ رہا ہے۔ ان سکولوں میں نئی سرکاری بھرتیوں کا دروازہ عملاً بند ہو چکا ہے، اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے باعزت سرکاری ملازمت کا راستہ تنگ ہوتا جا رہا ہے۔

آؤٹ سورس سکولوں کے نجی مالکان کو حکومت فی طالب علم ماہانہ تقریباً 1,200 روپے ادا کرتی ہے۔ مالکان کی شکایت ہے کہ اس رقم میں سے بھی مختلف بہانوں سے 25 فیصد تک کٹوتی کر لی جاتی ہے، اور ادائیگیاں اکثر تاخیر سے ہوتی ہیں۔ نتیجتاً عمارت، بجلی، صفائی اور عملے کے اخراجات بھی پورے نہیں ہو پاتے۔ ان سکولوں میں بی اے پاس استاد کی کم از کم تنخواہ 15,000 روپے ماہانہ رکھی گئی ہے۔ یہ حکومتِ پنجاب کی اپنی مقرر کردہ کم از کم اجرت (مالی سال 2025-26 میں 40,000 روپے) کے آدھے سے بھی کم ہے۔ یوں ریاست خود اپنے بنائے ہوئے قانون کی خلاف ورزی کو ممکن بنا رہی ہے۔

اس صورتِ حال کا ایک پہلو اکثر نظر انداز ہو جاتا ہے: ان سکولوں کے مالکان کی بڑی تعداد خود بھی اساتذہ یا تعلیم یافتہ نوجوان ہیں جنہوں نے روزگار کی امید میں یہ ذمہ داری لی۔ جب انہیں خود پوری رقم بروقت نہیں ملتی تو وہ اپنے عملے کو مناسب تنخواہ کیسے دے سکتے ہیں؟ جب تک حکومت فی طالب علم ادائیگی کم از کم 3,000 روپے نہیں کرتی، کٹوتیاں بند نہیں کرتی اور ہر ماہ بروقت ادائیگی یقینی نہیں بناتی، ان سکولوں کا استاد کسمپرسی کا شکار ہی رہے گا۔

پنجاب میں ہزاروں نجی سکول لاکھوں بچوں کو تعلیم دے رہے ہیں، جن میں بڑی تعداد گلی محلوں کے کم فیس والے سکولوں کی ہے۔ ان سکولوں کا بوجھ جن اساتذہ کے کندھوں پر ہے، ان کی اکثریت نوجوان خواتین ہیں، اور ان کا استحصال خاموشی سے جاری ہے۔ ان اساتذہ کو درپیش نمایاں مسائل یہ ہیں:

- انتہائی کم تنخواہ: بہت سے سکولوں میں ماہانہ 8 سے 15 ہزار روپے دیے جاتے ہیں، جو کم از کم اجرت کا ایک تہائی بھی نہیں۔
- تقرر نامہ اور معاہدے کا فقدان: اکثر اساتذہ کے پاس کوئی تحریری تقرر نامہ نہیں ہوتا، لہٰذا وہ کسی بھی وقت بغیر نوٹس فارغ کیے جاسکتے ہیں۔
- چھٹیوں کی تنخواہ کی ضبطی: گرمیوں کی تعطیلات میں کئی سکول تنخواہ روک لیتے ہیں یا اساتذہ کو فارغ کر کے نئے سیشن میں دوبارہ رکھ لیتے ہیں۔
- سماجی تحفظ سے محرومی: ای او بی آئی، سوشل سیکیورٹی، پنشن یا طبی سہولت کا تصور تقریباً نہیں۔
- کام کا بوجھ: بڑی کلاسیں، متعدد مضامین، اضافی ڈیوٹیاں اور ٹیوشن کا دباؤ، مگر کوئی اضافی معاوضہ نہیں۔
- تنظیم سازی کی مشکل: یونین یا نمائندہ تنظیم نہ ہونے کے باعث وہ اجتماعی طور پر اپنے حق کے لیے آواز نہیں اٹھا پاتے۔

پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن (PEF) کے پارٹنر سکولوں کی کہانی بھی مختلف نہیں۔ ان کے مالکان بھی فی طالب علم کم ادائیگی اور تاخیر کی شکایت کرتے ہیں، جس کا براہِ راست اثر اساتذہ کی تنخواہوں پر پڑتا ہے۔

قانونی طور پر کم از کم اجرت کا قانون نجی تعلیمی اداروں پر بھی لاگو ہوتا ہے، اور نجی سکولوں کی رجسٹریشن کے لیے ضلعی سطح پر نظام موجود ہے۔ مگر عملدرآمد نہ ہونے کے برابر ہے۔ رجسٹریشن کے وقت عمارت اور فیس تو دیکھی جاتی ہے، استاد کی تنخواہ کوئی نہیں دیکھتا۔

سرکاری اساتذہ کی حالت نجی شعبے سے بہتر ضرور ہے، مگر وہ بھی بے یقینی کا شکار ہیں۔ سرپلس پول میں ڈالے گئے اساتذہ کو دور دراز سکولوں میں ایڈجسٹ کیے جانے کا خدشہ رہتا ہے، اور ترقی کے مواقع محدود ہو رہے ہیں۔
حالیہ برسوں میں پنشن کے نظام اور لیو اِن کیشمنٹ سے متعلق تبدیلیوں پر بھی اساتذہ نے لاہور سمیت کئی شہروں میں احتجاج کیا۔ نئے بھرتی ہونے والوں کے لیے کنٹریکٹ اور انٹرن شپ طرز کی تقرریاں مستقل ملازمت کی جگہ لے رہی ہیں۔ اس کے علاوہ غیر تدریسی ڈیوٹیاں، جیسے انتخابات، مردم شماری، پولیو اور ڈینگی مہمات، اور آن لائن ڈیٹا کی بھرمار استاد کا اصل وقت، یعنی تدریس، چھین لیتی ہیں۔
اگر اس دن کو محض رسم کے بجائے حقیقی تبدیلی کا ذریعہ بنانا ہے تو حکومتِ پنجاب کو یہ اقدامات کرنے ہوں گے:
.1 آؤٹ سورس سکولوں کے لیے فی طالب علم ادائیگی کم از کم 3,000 روپے ماہانہ کی جائے۔
.2 غیر ضروری کٹوتیاں فوری بند ہوں اور ہر ماہ بروقت ادائیگی قانوناً لازم کی جائے۔

.3 آؤٹ سورس اور نجی سکولوں میں اساتذہ کی تنخواہ کم از کم سرکاری اجرت کے برابر ہو، اور یہ شرط معاہدے اور رجسٹریشن کا حصہ ہو۔

.4 ہر نجی استاد کو تحریری تقرر نامہ، تعطیلات کی تنخواہ اور ای او بی آئی و سوشل سیکیورٹی میں رجسٹریشن دی جائے۔

.5 تنخواہیں بینک کے ذریعے ادا کی جائیں تا کہ ادائیگی کا ریکارڈ رہے اور نگرانی ممکن ہو۔

.6 سرپلس اساتذہ کی ایڈجسٹمنٹ شفاف ہو اور انہیں رہائش کے قریب تعینات کیا جائے۔

.7 اساتذہ کو غیر تدریسی ڈیوٹیوں سے آزاد کیا جائے

تاہم بہت سی نیک نام این جی اوز (NGOS) جیسے پنجاب رورل سپورٹ پروگرام اس اندھیرے میں روشنی کی کرن ہیں ۔ PRSP اپنے زیر انتظام 500 سے زائد سکولوں میں پہلے دن سے ہی بنکنگ چینل کے ذریعے اساتذہ اور عملے کی تنخواہ ہر ماہ باقاعدگی سے ٹرانسفر کر رہی ہے خواہ اسے حکومت سے فنڈ کا اجرا ہو یا نہ ہو۔ اس کے علاوہ گروپ انشورنس۔ ای او بی آئی کے تحت ان کی رجسٹریشن اور باقائدہ ادائیگی بھی کر رہی ہے تا کہ یہ ملازم بڑھاپے کی پنشن بھی حاصل کر سکیں۔ تعلیم۔۔ سب کے لئے۔۔۔ یہ اس کا ماٹو ہے۔ اس لیئے اس نے ان بچیوں کے لئے جو پرائمری کے بعد دوسرے گاؤں نہیں جا سکتی تھیں ان کے لئے چھٹی کلاس سے اوپر کی کلاسیں بھی بلا کسی معاوضے کے شروع کرا رکھی ہیں۔ مگر پیف کے دوسرے پارٹنر کی طرح اسے بھی وہی مسائل درپیش ہیں۔

اس دن کے حوالے سے استاد کو پھول دینا آسان ہے، اسے باعزت روزی دینا مشکل۔ 1966ء کے عالمی سفارش نامے نے جس استاد کا تصور دیا تھا، وہ معاشی فکر سے آزاد ہو کر قوم کے بچوں کی تربیت کرتا ہے۔ پنجاب کا استاد آج بھی 15 ہزار روپے میں گھر چلانے کی جدوجہد میں ہے۔

جب تک استاد خود عزت کی روٹی نہیں کمائے گا، وہ کلاس روم میں عزتِ نفس کا سبق کیسے پڑھائے گا؟ اس یومِ اساتذہ پر اصل خراجِ تحسین یہ ہو گا کہ تقریروں کے بجائے تنخواہوں کی بات کی جائے۔

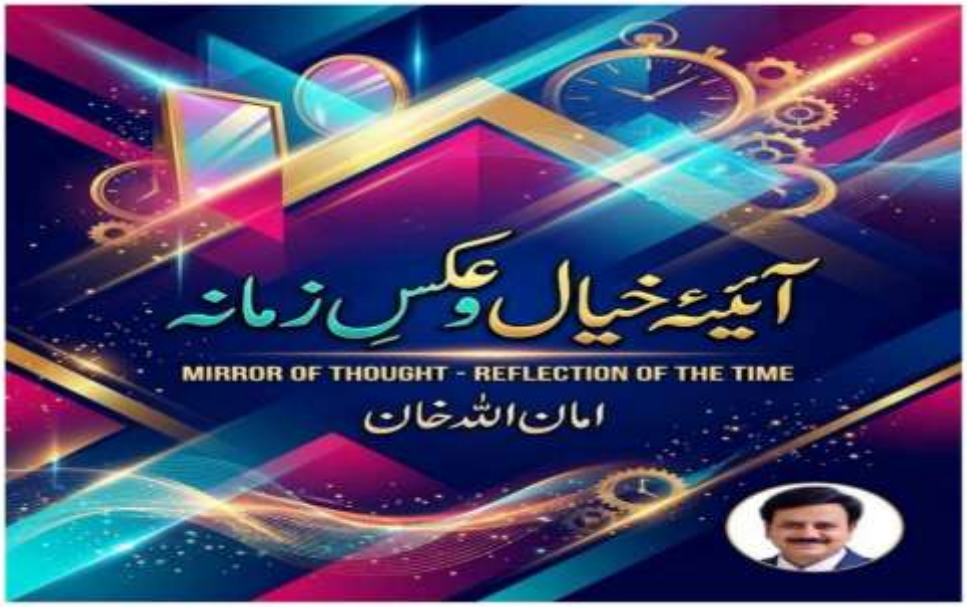

آئینہ خیال و عکس زمانہ

پیارے قارئین

جیسا کہ اپ کو اس امر کا بخوبی ادراک ہے کہ سوشل میڈیا کے اس تیز رفتار دور میں لفظ لمحوں میں لکھے جاتے ہیں اور لمحوں ہی میں اسکرین کی گہرائیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ آج جو تحریر ہزاروں نگاہوں کا مرکز ہوتی ہے، کل وہ ٹائم لائن کے انبار تلے دب کر فراموش ہو جاتی ہے۔

اس سے قبل جب جنوری 26 تا جولائی 26 تک فیس بک پر پوسٹ کئے گئے مضامین کو یکجا کر کے عالمی گونج GLOBAL) (ECHOES مرتب کی تو اس کے بعد پرانی فائلوں کے دیمک زدہ کاغذات سے "اخباری تراشوں نے کھولے بند ماضی کے دریچے "اور "اوراق ماضی۔ نصف صدی پر محیط فکر و قلم کا ائینہ " بھی وجود میں آ گئے۔

پھر خیال آیا کہ فیس بک پر تو 2010 سے کچھ نہ کچھ تو پوسٹ ہوتا ہی رہا ہے۔ جب سرچ کی تو جنوری 2012 سے دسمبر 2025 تک delete ہونے سے جو بچ گیا تو اسے محفوظ کرنے کا یہی احساس اس کتاب

"آئینہ خیال و عکس زمانہ" کی بنیاد بنا۔

زیرِ نظر کتاب ان اقوال، تصاویر اور مختصر تاثرات پر مشتمل ہے جو میں نے 2012ء سے 2025 کے دوران اپنے فیس بک صفحے پر وقتاً فوقتاً شیئر کیے۔ ان میں دنیا کے نامور مفکرین، فلسفیوں، ادیبوں اور ماہرینِ سماجیات کے وہ جملے شامل ہیں جنہوں نے مجھے سوچنے پر مجبور کیا۔ ان میں البرٹ آئن اسٹائن اور ونسٹن چرچل کی بصیرت ہے اور مارٹن لوتھر کنگ کا یقین۔ پاؤلو کوئلو، مہاتما بدھ اور مولانا رومی کی روحانی گہرائی ہے، زِگ زِگلر، جم رون، لائوزو اور دیپک چوپڑا کی عملی دانش ہے، اور مینڈی ہیل اور اسٹیون ایجیسن کی دل کو چھو لینے والی سادگی بھی۔ اس کے علاوہ "Lessons Learned in Life"، "Quotes and Thoughts" اور "Quotes Gate" جیسے صفحات اور اُس دور کے اخبارات سے منتخب تحریریں بھی اس کا حصہ ہیں۔

مگر یہ کتاب محض اقوالِ زریں کا مجموعہ نہیں۔ اس میں میرے شہر لاہور کے وہ مناظر بھی محفوظ ہیں جو اُس زمانے کی سچی تصویر ہیں۔ کتابوں کا دکانوں سے فٹ پاتھ پر آنا۔ کچی جھونپڑیوں میں رواں دواں پیٹ کی آگ بھرتی زندگیاں، عمر رسیدہ افراد کا روزی کے لئے پتھر کوٹنا۔ پٹرول کے بحران میں گھنٹوں قطاروں میں کھڑے شہری، اور کیچڑ زدہ زمین پر بیٹھ کر پڑھتے سرکاری اسکول کے بچے۔۔ نہتے شخص پر دو شیر دل جوان پولس والوں کا لاٹھی چارج۔ کچرے کے ڈھیر سے ٹماٹر تلاش کرتی سفید پوش خاتون اور رزق تلاش کرتے معصوم بچے۔ لنگر کے لئے ایک پلیٹ چاول کے حصول کے لئے ہجوم کی ہاتھا پائی۔ نشے کے ٹیکے لگواتے ہوئے نوجوان، تیز رفتار رکشے کے پیچھے سکیٹنگ کرتے کم عمر طالب علم۔ ٹرانسپورٹ کے مسلئے سے نبرد آزما معمر خاتون اور کالج کی بچیوں کا آج سے تیرہ چودہ سال قبل موٹر سائیکل چلانا اور گدھا گاڑی کی سواری۔ گنے کی ٹرالی سے گنے نکالتے سکول کے بچے ۔ گرمی سے تنگ لاہور کی نہیر میں چھلانگیں لگاتے نوجوان۔ سیلاب زدہ علاقوں سے نکلنے والوں کی یاسیت۔ اور بہت کچھ۔۔ یہ تصاویر یاد دلاتی ہیں کہ دانش کے بڑے جملے تبھی معنی رکھتے ہیں جب وہ ہمارے ارد گرد کی زندگی سے جڑ جائیں

قارئین محترم۔ میں ان اقوال میں کسی کا مصنف نہیں ہوں۔ جن کے نام سے یہ اقوال منسوب ہیں ان کا ذکر موجود ہے اور جو نامعلوم ہیں۔ انہیں ایسے ہی رہنے دیا۔ تاہم میری طرف سے ہر قول اور ہر تصویر کے ساتھ اردو میں ایک مختصر تبصرہ شامل کیا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ قاری محض پڑھ کر آگے نہ بڑھ جائے بلکہ لمحہ بھر رک کر سوچے اور اس خیال کو اپنی زندگی کے آئینے میں دیکھے۔ امید، معافی، شکر گزاری، دوستی، صبر اور خود شناسی وہ موضوعات ہیں جو ان صفحات میں بار بار لوٹ کر آتے ہیں۔

اس کتاب میں میرے دیرینہ دوست خالد غزالی کا تبصرہ بھی شامل ہے۔ خالد ایک بہترین سائنسدان کے ساتھ ایک حساس دل کا مالک قلمکار بھی ہے۔ اس کی تحریریں سوشل میڈیا کی زینت بنتی رہتی ہے۔ اسے میں نے صاحب کتاب بننے کا مشورہ دیا ہے ۔ دیکھیں وہ اس پر کتنا عمل کرتا ہے

میں ان تمام دوستوں اور قارئین کا بھی تہِ دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے ان پوسٹس کو سراہا، ان پر تبصرے کیے اور مجھے یہ حوصلہ دیا کہ ان بکھرے ہوئے موتیوں کو ایک لڑی میں پرو دوں۔ اگر یہ کتاب کسی ایک قاری کے دل میں بھی امید کا ایک چراغ روشن کر دے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

امان اللہ خان

بحریہ ارچرڈ لاہور

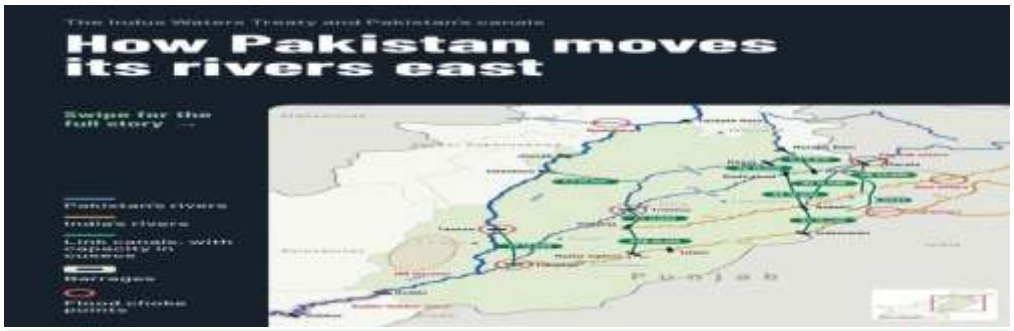

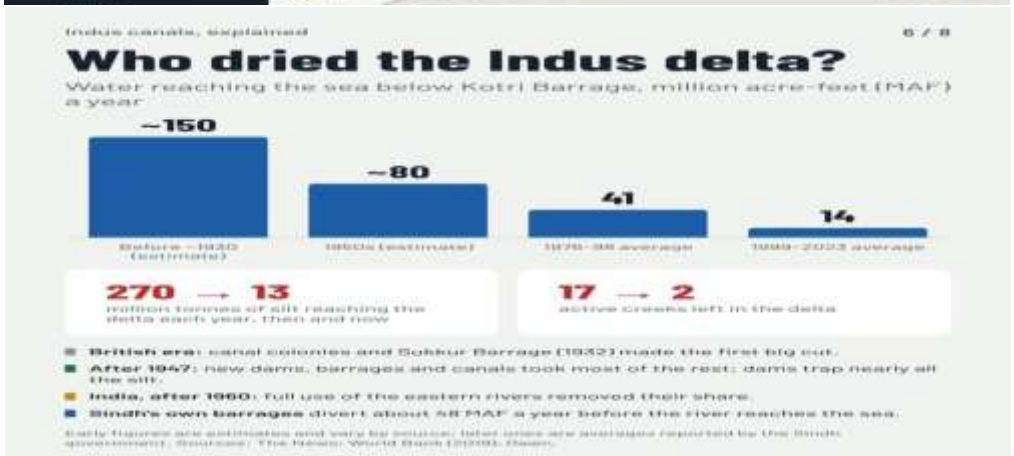



دریا بٹ گئے، حوصلے نہیں! پاکستان کے پانی کی کہانی، جو ہر پاکستانی کو جاننی چاہیے

کچھ ریگولر قارئین کرام کی خواہش پر کہ پاکستان کے خلاف انڈیا کی ابی دہشت گردی اور مسلئے کی سنگینی کے بارے میں معلومات درکار ہیں کیونکہ یہ سوال کم و بیش ہر امتحان میں کسی نہ کسی طریقے سے ہو چھا جاتا ہے

۔ان کے لئے اس کا ایک سرسری سا جائزہ پیش خدمت ہے اور ساتھ گراف بھی (جس کے لئے میں اویس خان کا مشکور ہوں۔ مزید معلومات کے لئے اپ ریفرنس بک سے مدد لے سکتے ہیں (۔یہ تمام معلومات پوائنٹ ٹو پوائنٹ پیش کی جارہی ہیں اور اسی ترتیب سے گراف بھی شامل پوسٹ ہیں۔شکریہ (امان اللہ خان)

1️⃣ایک معاہدہ، چھ دریا

1960 میں سندھ طاس معاہدے کے تحت سندھ طاس کے چھ دریا تقسیم ہوئے۔ پاکستان کے حصے میں تین مغربی دریا سندھ، جہلم اور چناب آئے، جن میں پورے نظام کا تقریباً 80 فیصد پانی بہتا ہے۔ بھارت کو تین مشرقی دریا راوی، بیاس اور ستلج ملے۔ سوال یہ تھا کہ جن نہروں کی زندگی راوی اور ستلج سے جڑی تھی، ان کا کیا ہو گا؟

2️⃣وہ دن جو سبق بن گیا

یکم اپریل 1948 کو بھارت نے مشرقی دریاؤں سے پنجاب کی نہروں کا پانی ایک بار روک دیا تھا۔ اس تجربے نے واضح کر دیا کہ پاکستان کو اپنے پانی کے لیے مضبوط اور خود مختار نظام درکار ہے۔ یہی سوچ ایک عظیم منصوبے کی بنیاد بنی۔💪

3️⃣انجینئرنگ کا شاہکار

سندھ طاس منصوبے (انڈس بیسن پراجیکٹ) کے تحت منگلا ڈیم (1967)، تربیلا ڈیم (1976)، پانچ بیراج، آٹھ لنک کینال اور ایک سائفن تعمیر کیے گئے۔ بھارت نے اس کے لیے 6 کروڑ 20 لاکھ پاؤنڈ ادا کیے، جبکہ باقی رقم عالمی بینک کی قیادت میں قائم کنسورشیم نے فراہم کی۔ یہ دنیا کے بڑے آبی منصوبوں میں شمار ہوتا ہے۔🏗️

4️⃣پانی کی ریلے دوڑ 🔁

لنک کینال کو ریلے دوڑ سمجھیے۔ ہر نہر مغربی دریا کے بیراج سے پانی لے کر مشرق میں اگلے دریا تک پہنچاتی ہے، اور پنجاب کی جنوب مغربی ڈھلوان کی بدولت یہ سارا کام کششِ ثقل خود کرتی ہے۔ شمالی ریلے رسول سے قادر آباد، بلوکی اور سلیمانکی تک جاتی ہے، اور جنوبی ریلے چشمہ سے تریموں، سدھنائی اور میلسی تک۔ میلسی پر نہر ستلج میں گرنے کے بجائے سائفن کے ذریعے اس کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔ کمال کی منصوبہ بندی ✨!

5️⃣معاہدہ آج کہاں کھڑا ہے؟ ⚖️

پہلگام حملے کے بعد بھارت نے 23 اپریل 2025 سے معاہدہ "معطل" رکھا ہوا ہے اور شرط رکھی ہے کہ پاکستان سرحد پار دہشت گردی کی حمایت ختم کرے۔ پاکستان ان الزامات کی تردید کرتا ہے۔ یکم ستمبر 2026 کو ثالثی عدالت نے متفقہ فیصلہ دیا کہ معاہدہ "مکمل طور پر نافذ العمل ہے"، مگر بھارت نے اسے مسترد کر دیا۔ 25 ستمبر کو اقوامِ متحدہ میں وزیرِ اعظم شہباز شریف نے کہا کہ پاکستان کے حصے کا پانی موڑنے کی کوئی بھی کوشش "اعلانِ جنگ تصور کی جائے گی"

6۔ سیلاب: خطرہ جو دستک دیتا ہے ⚠️

چناب، راوی اور ستلج بھارت سے آتے ہیں اور ہماری طرف ان پر کوئی کنٹرول نہیں۔ اب سیلاب کا ڈیٹا انڈس کمیشن کے ذریعے بھی نہیں مل رہا۔ تریموں اور پنجند کے سنگم، گڈو سے سکھر تک کا علاقہ، نوشہرہ اور کوہِ سلیمان کے رود کوہی نالے خاص طور پر حساس مقامات ہیں۔ بروقت تیاری ہی بہترین دفاع ہے۔

7 پیاسا ڈیلٹا🌿

1930 سے پہلے کوٹری سے نیچے سمندر تک سالانہ اندازاً 150 ملین ایکڑ فٹ پانی پہنچتا تھا، جو 1999 سے 2023 کے دوران اوسطاً صرف 14 ملین ایکڑ فٹ رہ گیا۔ پہلی بڑی کٹوتی انگریز دور کی نہروں نے کی، اور باقی زیادہ تر حصہ 1947 کے بعد بننے والے ڈیموں اور بیراجوں نے لیا۔ ڈیلٹا تک پہنچنے والی گاد بھی تقریباً 270 ملین ٹن سے گھٹ کر 13 ملین ٹن سالانہ رہ گئی ہے۔ کالا باغ ڈیم 1980 کی دہائی کے آخر سے التوا کا شکار ہے، اور چولستان کینال کو مشترکہ مفادات کونسل نے 28 اپریل 2025 کو صوبوں کے اتفاق تک روک دیا ہے۔ دونوں تنازعات کا اصل سوال ایک ہی ہے: کیا اضافی پانی موجود ہے، اور کیا نچلے صوبے پانی کا کنٹرول رکھنے والوں پر اعتماد کریں گے؟

8 اصل عدد، اصل چیلنج💧

پاکستان اپنے دریاؤں کا صرف تقریباً 30 دن کا پانی ذخیرہ کر سکتا ہے۔ یہی وہ عدد ہے جو ہمیں جگاتا ہے۔ جس قوم نے 1960 کی دہائی میں منگلا اور تربیلا کھڑے کیے، وہ آج بھی ذخیرہ بڑھا سکتی ہے، پانی بچا سکتی ہے اور صوبوں کے درمیان اعتماد قائم کر سکتی ہے۔ ہر بوند قیمتی ہے، اور ہر پاکستانی اس کا محافظ !



یکم اکتوبر—عالمی یومِ عمر رسیدہ افراد اور پاکستان و حکومت پنجاب کے اقدامات کا جائزہ

عالمی یومِ عمر رسیدہ افراد (International Day of Older Persons) ہر سال یکم اکتوبر کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی پیغام یہ ہے کہ عمر رسیدہ افراد محض معاشرے کی نگہداشت کے محتاج افراد نہیں بلکہ اپنے تجربے، علم، کردار اور زندگی بھر کی خدمات کے باعث خاندان اور معاشرے کا قیمتی سرمایہ ہیں۔ اقوام متحدہ کے مطابق 60 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کی عالمی تعداد 2025ء میں تقریباً 1.2 ارب تک پہنچ چکی ہے اور 2050ء تک یہ تعداد تقریباً 2.1 ارب ہونے کی توقع ہے۔ اس تیزی سے بدلتی آبادیاتی صورتِ حال نے صحت، پنشن، سماجی تحفظ، رہائش، تنہائی اور بزرگوں کے حقوق کو عالمی پالیسی کا اہم موضوع بنا دیا ہے۔

اس عالمی دن کی بنیاد دراصل 1982ء میں ویانا میں منعقد ہونے والی پہلی World Assembly on Ageing اور اس کے نتیجے میں مرتب ہونے والے Vienna International Plan of Action on Ageing سے پڑی۔ بعد ازاں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 14 دسمبر 1990ء کو قرارداد 45/106 کے ذریعے یکم اکتوبر کو باقاعدہ International Day of Older Persons قرار دیا اور یہ دن پہلی مرتبہ 1991ء میں منایا گیا۔

اسی سال اقوام متحدہ نے United Nations Principles for Older Persons بھی منظور کیے، جبکہ 2002ء میں میڈرڈ میں دوسری عالمی اسمبلی برائے عمر رسیدگی نے Madrid International Plan of Action on Ageing منظور کیا۔ یوں یہ دن محض رسمی تقریب کے بجائے وقار، خود مختاری، صحت، تحفظ اور انسانی حقوق کے عالمی عہد کی علامت بن گیا۔

پاکستان کی صورتِ حال قدرے مختلف ہے۔ 2023ء کی مردم شماری کے مطابق ملک میں 65 سال اور اس سے زائد عمر کے افراد تقریباً 3.55 فیصد ہیں، جبکہ 60 تا 64 سال کے افراد کو شامل کیا جائے تو 60 سال سے زائد عمر کی آبادی تقریباً 6 فیصد کے قریب بنتی ہے۔ پنجاب میں 65 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کا تناسب تقریباً 4 فیصد ہے۔ پاکستان بنیادی طور پر نوجوان آبادی والا ملک ہے؛ مردم شماری کے مطابق تقریباً 66.6 فیصد آبادی 29 سال سے کم عمر ہے۔ تاہم موجودہ نوجوان آبادی کو دیکھ کر بزرگوں کے بڑھتے ہوئے مستقبل کے چیلنج کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ آبادی کے عمر رسیدہ ہونے کا عمل بتدریج تیز ہو رہا ہے

پاکستان میں بزرگ شہریوں کے لیے مختلف سطحوں پر سماجی تحفظ اور سہولتوں کے اقدامات موجود ہیں۔ EOBI کے ذریعے رجسٹرڈ اداروں کے اہل کارکنوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد اولڈ ایج پنشن سمیت سماجی تحفظ فراہم کیا جاتا ہے۔ شناختی دستاویزات کے حوالے سے بھی حالیہ اہم پیش رفت ہوئی ہے: فروری 2026ء کی ترمیم شدہ قواعد کے تحت 60 سال یا اس سے زائد عمر کے شہریوں کے لیے مخصوص Senior Citizen logo کے ساتھ lifetime-validity شناختی کارڈ کی سہولت متعارف کرائی گئی، جس سے بار بار تجدید کی ضرورت کم ہوتی ہے۔

پنجاب میں اس حوالے سے ایک اہم پیش رفت 2025-26ء میں سامنے آئی۔ پنجاب Senior Citizens Welfare Bill 2025 کے بعد Punjab Senior Citizens Welfare Act نافذ کیا گیا، جس کے تحت 70 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کو senior citizens کے طور پر قانونی دائرے میں لایا گیا اور Punjab Senior Citizens Welfare Council اور مخصوص Senior Citizens Welfare Fund کے قیام کی بنیاد رکھی گئی۔ قانون میں مستحق بزرگوں کے لیے مالی معاونت، سرکاری ہسپتالوں میں طبی وgeriatric care ، قانونی معاونت، اولڈ ایج ہومز، الگ سروس کاؤنٹرز، عوامی مقامات پر رسائی، ٹرانسپورٹ سہولت اور toll-free helpline جیسے اقدامات کا فریم ورک شامل ہے۔ یہ پیش رفت اس لحاظ سے اہم ہے کہ بزرگوں کی فلاح کو محض خیرات کے بجائے ایک حقوق اور ریاستی ذمہ داری کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے

پنجاب کا محکمہ سوشل ویلفیئر و بیت المال پہلے ہی بزرگوں کے لیے Old Age Homes/Aafiat چلا رہا ہے۔ محکمہ کے مطابق لاہور میں پہلا Old Age Home 1975ء میں قائم کیا گیا تھا، جبکہ بعد میں فیصل آباد، ملتان، راولپنڈی، نارووال، ساہیوال اور ٹوبہ ٹیک سنگھ میں مراکز قائم کیے گئے؛ ان اداروں میں رہائش، خوراک، طبی، تفریحی، مذہبی اور حفاظتی سہولتیں فراہم کی جاتی ہیں، اور ترجیح بے سہارا، کمزور، بے اولاد یا بے وسیلہ بزرگوں کو دی جاتی ہے۔

تاہم اصل امتحان قانون اور ادارے بنانے سے آگے بڑھ کر ان سہولتوں کو مؤثر، باعزت، آسانِ رسائی اور پورے صوبے تک پہنچانے کا ہے۔

عالمی یومِ عمر رسیدہ افراد ہمیں یہ سوچنے کا موقع دیتا ہے کہ کسی معاشرے کی ترقی کا معیار صرف اس کی معاشی قوت یا جدید ٹیکنالوجی نہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتا ہے۔ پاکستان میں خاندانی نظام کی تبدیلی، مہنگائی، پنشن کی محدود رسائی، صحت کے بڑھتے اخراجات، تنہائی اور بعض صورتوں میں Elder Abuse جیسے مسائل پر سنجیدہ توجہ ضروری ہے۔ ہمارے بزرگ وہ نسل ہیں جنہوں نے خاندان، اداروں اور ملک کی تعمیر میں اپنی زندگیاں صرف کیں؛ اس لیے ان کی ضرورت صرف ایک دن کی تقریب نہیں بلکہ مستقل عزت، تحفظ، صحت، معاشی اطمینان اور خاندانی وابستگی ہے۔ حقیقی کامیابی تب ہو گی جب ہم یہ اصول عملی زندگی میں نافذ کریں: "بزرگوں کی خدمت ماضی کا شکریہ نہیں، اپنے مستقبل کی حفاظت ہے۔

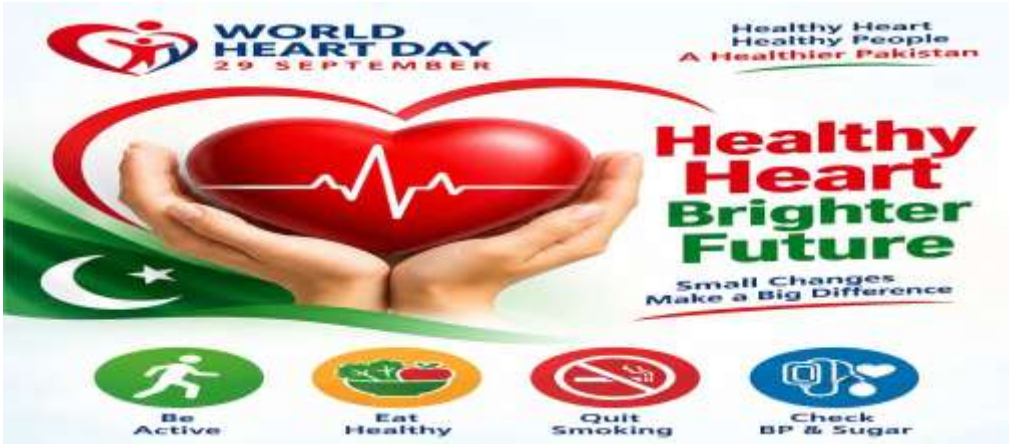

دل کی حفاظت، زندگی کی حفاظت — 29 ستمبر عالمی یومِ قلب اور پاکستان

29 ستمبر عالمی یومِ قلب (World Heart Day) دنیا بھر میں امراضِ قلب اور فالج کے بارے میں شعور اجاگر کرنے اور لوگوں کو دل کی صحت کے لیے عملی اقدامات کی ترغیب دینے کا اہم دن ہے۔

اس مہم کا تصور ورلڈ ہارٹ فیڈریشن کے صدر ڈاکٹر Antoni Bayés de Luna نے پیش کیا؛ ورلڈ ہارٹ فیڈریشن کے مطابق یہ مہم 1999ء میں عالمی ادارۂ صحت کے تعاون سے شروع ہوئی اور پہلی باقاعدہ عالمی تقریب 24 ستمبر 2000ء کو منعقد ہوئی۔ ابتدا میں یہ دن ستمبر کے آخری اتوار کو منایا جاتا تھا، تاہم 2011ء سے ہر سال 29 ستمبر کو منایا جا رہا ہے۔

دنیا کے لیے اس دن کی اہمیت اس حقیقت سے واضح ہوتی ہے کہ قلبی و عروقی امراض (Cardiovascular Diseases) آج بھی عالمی سطح پر موت کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ WHO کے تازہ ترین اعداد کے مطابق 2022ء میں تقریباً 19.8 ملین افراد ان امراض کے باعث جاں بحق ہوئے، جبکہ ان میں تقریباً 85 فیصد اموات دل کے دورے اور فالج سے منسلک تھیں۔ اگرچہ عمر ایک اہم عامل ہے، لیکن دل کی بیماری صرف بڑھاپے کا مسئلہ نہیں؛ بلند فشارِ خون، ذیابیطس، کولیسٹرول، تمباکو نوشی، غیر متوازن غذا، جسمانی عدم فعالیت، موٹاپا اور فضائی آلودگی خطرے کو نمایاں طور پر بڑھاتے ہیں۔

پاکستان میں صورتِ حال خصوصی توجہ کی متقاضی ہے۔ WHO کے پاکستان کے ہائپر ٹینشن پروفائل کے مطابق 2019ء میں 30 سے 79 سال کی عمر کے بالغ افراد میں تقریباً 32.2 ملین افراد بلند فشارِ خون کا شکار تھے، مگر ان میں صرف 11 فیصد کا بلڈ پریشر مؤثر طور پر کنٹرول میں تھا؛ اسی سال قلبی امراض سے تقریباً 450,000 اموات کا تخمینہ دیا گیا۔ WHO کے مطابق پاکستان میں اسکیمک ہارٹ ڈیزیز بھی موت کی نمایاں وجوہ میں شامل ہے۔

یہ اعداد ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ دل کا مسئلہ صرف ہسپتال یا ڈاکٹر کا موضوع نہیں بلکہ گھر، اسکول، دفتر اور پورے معاشرے کی صحت کا مسئلہ ہے۔ پاکستان میں تشویش کی ایک اور وجہ وہ طرزِ زندگی ہے جو تیزی سے شہری اور غیر فعال ہوتا جا رہا ہے۔ فاسٹ فوڈ اور نمک و چکنائی سے بھرپور غذا، جسمانی سرگرمی کی کمی، تمباکو نوشی، مسلسل ذہنی دباؤ، بے قابو بلڈ پریشر اور ذیابیطس دل کے لیے خطرات بڑھاتے ہیں

پاکستان سے متعلق ایک WHO-supported مطالعے میں بھی بلند فشارِ خون، ذیابیطس، وزن میں زیادتی اور جسمانی سرگرمی جیسے عوامل کا نمایاں بوجھ سامنے آیا۔ اس لیے کراچی، لاہور اور دوسرے بڑے شہروں ہی نہیں بلکہ چھوٹے شہروں اور دیہی علاقوں میں بھی ابتدائی تشخیص، باقاعدہ بلڈ پریشر، شوگر اور کولیسٹرول کی جانچ اور بروقت علاج کو صحتِ عامہ کا لازمی حصہ بنانا ضروری ہے۔

عالمی یومِ قلب کا اصل پیغام محض بیماری سے آگاہی نہیں بلکہ بیماری سے پہلے احتیاط ہے۔ روزانہ مناسب جسمانی سرگرمی، سبزیوں اور پھلوں سمیت متوازن غذا، نمک اور غیر صحت بخش چکنائی میں کمی، تمباکو سے مکمل اجتناب، مناسب وزن برقرار رکھنا اور بلڈ پریشر، شوگر اور کولیسٹرول کو قابو میں رکھنا دل کی حفاظت کے بنیادی اقدامات ہیں۔ WHO کے مطابق زیادہ تر قلبی امراض کے خطرے کو صحت مند طرزِ زندگی، خطرے کی بروقت شناخت اور مناسب علاج کے ذریعے نمایاں طور پر کم کیا جا سکتا ہے

اس 29 ستمبر کو عہد صرف یہ نہ ہو کہ ہم دل کے بارے میں بات کریں گے، بلکہ یہ ہو کہ ہم اپنے دل کے لیے کچھ کریں گے۔ ایک صحت مند معاشرہ صرف جدید ہسپتالوں سے نہیں بنتا؛ وہ ایسے باشعور افراد سے بنتا ہے جو بیماری کے انتظار کے بجائے احتیاط کو زندگی کا حصہ بناتے ہیں۔ اپنے بلڈ پریشر اور شوگر کی جانچ کروانا، سگریٹ چھوڑنا، روزانہ چلنا، خوراک میں احتیاط کرنا اور کسی مشتبہ علامت کی صورت میں فوری طبی مدد حاصل کرنا بظاہر چھوٹے فیصلے ہیں، مگر یہی فیصلے زندگی کے قیمتی سال بچا سکتے ہیں۔ دل کو وقت دیں، صحت کو ترجیح دیں—کیونکہ محفوظ دل ہی محفوظ زندگی کی بنیاد ہے۔





28 ستمبر—ورلڈ ریبیز ڈے—سگ گزیدگی سے تحفظ: پاکستان میں کیے گئے اقدامات کا جائزہ۔

28 ستمبر—عالمی یومِ ریبیز (World Rabies Day) ہر سال دنیا بھر میں اس مہلک مگر بڑی حد تک قابلِ تدارک بیماری کے بارے میں آگاہی، بروقت علاج اور جانوروں میں اس کی روک تھام کے عزم کی تجدید کے لیے منایا جاتا ہے۔ یہ دن عظیم فرانسیسی سائنس دان لوئی پاسچر (Louis Pasteur) کی برسی کی مناسبت سے 28 ستمبر کو منایا جاتا ہے

۔اس دن کا باقاعدہ آغاز 2007ء میں Global Alliance for Rabies Control (GARC) کی جانب سے ہوا، جسے عالمی ادارۂ صحت (WHO) اور دیگر بین الاقوامی شراکت داروں کی حمایت حاصل رہی۔ آج یہ دن دنیا کے 100 سے زائد ممالک میں مختلف آگاہی اور انسدادِ ریبیز سرگرمیوں کے ذریعے منایا جاتا ہے۔

ریبیز ایک وائرل اور زونوٹک بیماری ہے جو ممالیہ جانوروں سے انسانوں میں منتقل ہو سکتی ہے اور مرکزی اعصابی نظام کو متاثر کرتی ہے۔ دنیا بھر میں انسانی ریبیز کی تقریباً 99 فیصد اموات کتوں سے منتقلی سے وابستہ ہیں

۔متاثرہ جانور کے لعاب کے ذریعے وائرس عموماً کاٹنے سے منتقل ہوتا ہے، تاہم خراش یا لعاب کا کسی کھلے زخم، آنکھ، ناک یا منہ کی جھلی سے براہِ راست رابطہ بھی خطرناک ہو سکتا ہے۔ بلی، لومڑی، گیدڑ اور بعض علاقوں میں چمگادڑ بھی وائرس منتقل کر سکتے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ انڈے دینے والے جانور ریبیز کا قدرتی ذریعہ نہیں ہیں؛ یہ بیماری ممالیہ جانوروں سے متعلق ہے۔

ریبیز کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ علامات ظاہر ہونے کے بعد بیماری تقریباً ہمیشہ مہلک ثابت ہوتی ہے، لیکن علامات ظاہر ہونے سے پہلے بروقت طبی مداخلت سے اس سے بچاؤ ممکن ہے۔

عالمی سطح پر کتوں کے کاٹنے کے درست سالانہ کیسز کا کوئی ایک حتمی عالمی عدد دستیاب نہیں ہے کیونکہ کئی غریب ممالک میں ڈیٹا ریکارڈ نہیں ہوتا، تاہم ماہرین کے مطابق یہ تعداد کروڑوں (Tens of millions) میں ہے۔ صرف امریکہ میں ہر سال تقریباً 45 لاکھ افراد کو کتے کاٹتے ہیں اور دنیا بھر میں ہر سال تقریباً 59,000 افراد ریبیز کی وجہ سے مر جاتے ہیں اور ان میں سے 99 فیصد اموات پاگل یا ہلکے ہوئے کتوں کے کاٹنے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

دنیا بھر میں ریبیز سے ہونے والی اموات کا 36 فیصد اکیلے بھارت میں ہوتا ہے، جہاں ہر سال لگ بھگ 20,000 افراد آوارہ کتوں کے کاٹنے اور ریبیز کی وجہ سے جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ مجموعی طور پر ریبیز کے 95 فیصد کیسز ایشیا اور افریقہ کے غریب اور ترقی پزیر ممالک میں سامنے آتے ہیں۔

پاکستان میں آوارہ کتوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور کتے کے کاٹنے کے واقعات ایک عوامی ہیلتھ ایمرجنسی کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ مختلف طبی رپورٹس اور ماہرینِ صحت کے مطابق، پاکستان میں ہر سال اندازاً 2,000 سے 5,000 افراد ریبیز (ہلڑ کپن) کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں کے ریکارڈ کے مطابق روزانہ 50 سے 70 کیسز رپورٹ ہوتے ہیں۔ اور پنجاب سب سے زیادہ متاثرہ صوبہ ہے۔ پنجاب محکمہ صحت کے حالیہ اعداد و شمار کے مطابق گزشتہ دو سے ڈھائی سالوں میں صرف پنجاب میں 5 لاکھ سے زائد کتے کے کاٹنے کے کیسز رپورٹ ہوئے ہیں۔ سندھ میں بھی صورت حال تشویشناک ہے جہاں حالیہ برسوں میں سالانہ 2 لاکھ 85 ہزار سے زائد کیسز سامنے آئے ہیں اور کراچی جیسے بڑے شہر میں روزانہ درجنوں لوگ اس کا شکار بنتے ہیں۔ خیبر پختونخوا میں بھی کتے کے کاٹنے کے کیسز میں سالانہ ہزاروں کا اضافہ دیکھا گیا ہے جبکہ بلوچستان میں ویکسین کی عدم دستیابی یا تاخیر سے اموات ریکارڈ کی گئی ہیں

ریبیز کے خلاف انسانی ویکسین کی تاریخ میں لوئی پاسچر کا کردار سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ 6 جولائی 1885ء کو انہوں نے ایک نو سالہ فرانسیسی بچے جوزف مائیسٹر (Joseph Meister) کو تجرباتی ویکسین دی، جسے ایک متاثرہ کتے نے متعدد مرتبہ کاٹا تھا۔ بچے کی زندگی بچ گئی اور اس واقعے نے جدید ریبیز سے بچاؤ کی بنیاد مضبوط کی۔ ابتدائی ویکسین اعصابی بافتوں سے تیار ہوتی تھی اور آج کی ویکسین کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ اور تکلیف دہ تھی؛ بعد میں سائنسی تحقیق کے نتیجے میں زیادہ محفوظ Cell-culture vaccines وجود میں آئیں، جو آج دنیا بھر میں استعمال ہوتی ہیں۔

جدید طب میں ریبیز سے بچاؤ کے لیے سب سے اہم اصول یہ ہے کہ کتے یا کسی مشتبہ ممالیہ جانور کے کاٹنے کو معمولی نہ سمجھا جائے۔ زخم کو فوراً اور مسلسل تقریباً 15 منٹ تک صابن اور بہتے ہوئے پانی سے اچھی طرح دھونا چاہیے، پھر جلد از جلد طبی مرکز پہنچ کر ڈاکٹر سے Post-Exposure Prophylaxis (PEP) کے بارے میں فیصلہ کروانا چاہیے۔ ضرورت کے مطابق Anti-Rabies Vaccine (ARV) اور بعض شدید نوعیت کے زخموں میں Rabies Immunoglobulin (RIG) بھی دیا جاتا ہے۔ روایتی طور پر مشہور "ناف کے گرد 14 انجکشن" یا مرچیں، تیل اور دیگر گھریلو طریقے سائنسی علاج کا متبادل نہیں ہیں۔

پاکستان کے لیے مؤثر حکمتِ عملی صرف آوارہ کتوں کو مارنے تک محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ One Health کے اصول کے تحت انسانی صحت، حیوانی صحت اور ماحول کو ایک مربوط نظام کے طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ کتوں کی ویکسینیشن، آبادی میں سائنسی طریقے سے کمی، نس بندی (Neutering)، ذمہ دارانہ پالتو جانور پالنے، کچرے کے مؤثر انتظام اور bite surveillance کو مربوط کیا جائے تو بیماری کے پھیلاؤ کو کم کیا جا سکتا ہے۔ دنیا میں Dog vaccination کو انسانی ریبیز کے خاتمے کی بنیادی حکمتِ عملی سمجھا جاتا ہے، جبکہ WHO اور دیگر عالمی اداروں کا ہدف 2030 تک کتوں سے منتقل ہونے والی انسانی ریبیز کی اموات کا خاتمہ ہے۔

28 ستمبر کا پیغام دراصل ایک سادہ مگر زندگی بچانے والے عمل کا پیغام ہے: "کاٹا ہے تو انتظار نہیں، فوراً اقدام کریں۔" پاکستان میں اس دن اسکولوں، اسپتالوں، کمیونٹی مراکز اور ویٹرنری اداروں کے ذریعے عوام کو آگاہ کیا جا سکتا ہے کہ مشتبہ جانور کے کاٹنے کے بعد گھریلو ٹوٹکوں یا تاخیر کے بجائے فوراً زخم دھویا جائے اور طبی مرکز سے رجوع کیا جائے۔ اسی کے ساتھ جانوروں کی ویکسینیشن، ذمہ دارانہ نگہداشت اور سائنسی آبادی کنٹرول کو فروغ دینا ضروری ہے

۔ریبیز ایک ایسی بیماری ہے جس میں موت کو تقدیر نہیں، بروقت احتیاط سے روکا جا سکتا ہے — اور یہی عالمی یومِ ریبیز کا سب سے اہم انسانی پیغام ہے

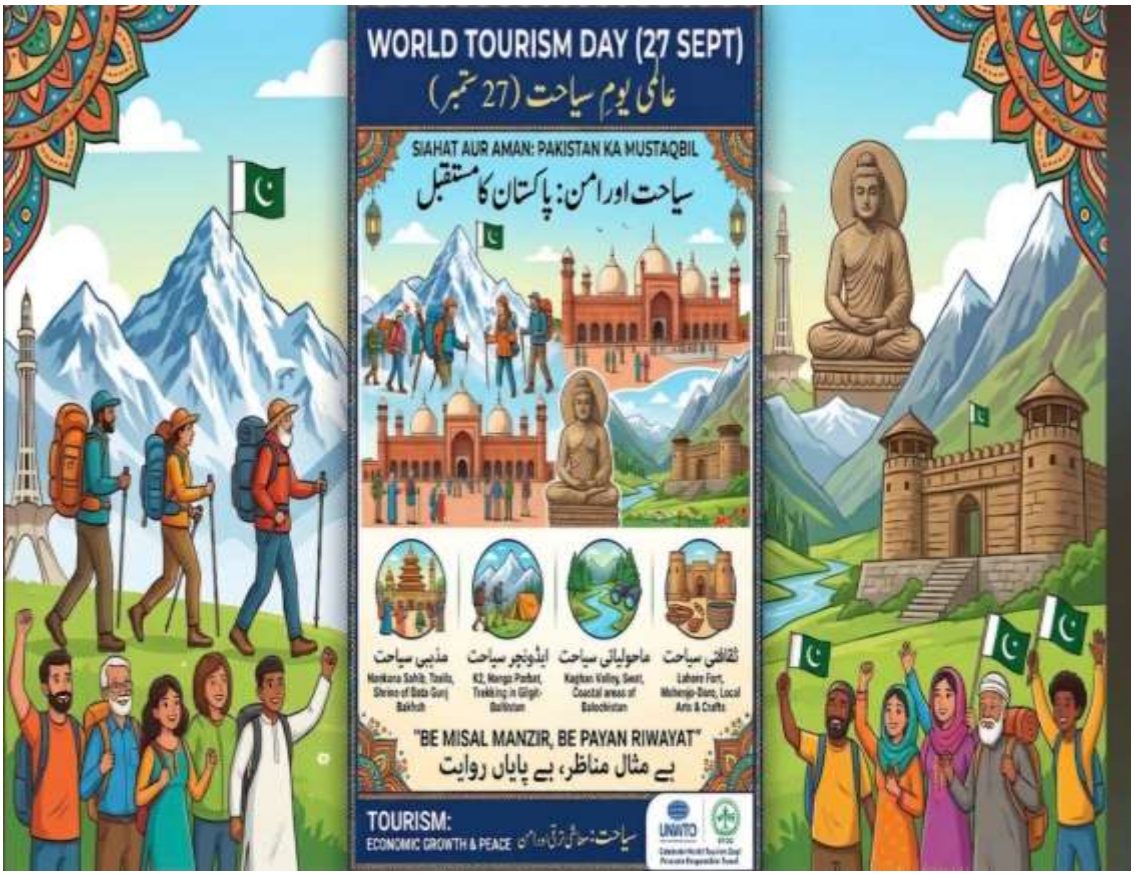

27 ستمبر–عالمی یومِ سیاحت: تاریخ، اہمیت اور پاکستان میں سیاحتی امکانات

ہر سال 27 ستمبر کو اقوامِ متحدہ کی عالمی سیاحتی تنظیم (UN Tourism) کے زیرِ اہتمام دنیا بھر میں عالمی یومِ سیاحت منایا جاتا ہے، جس کا مقصد عالمی برادری کو سیاحت کی معاشی، ثقافتی اور اجتماعی اہمیت سے روشناس کرانا ہے۔

اس دن کی تاریخ کا بنیادی پس منظر 27 ستمبر 1970 سے جڑا ہوا ہے، جب اس بین الاقوامی تنظیم کے آئین کو باقاعدہ منظور کیا گیا تھا؛ جبکہ ستمبر کا آخری ہفتہ عالمی سطح پر ایک ایسے موڑ کی نمائندگی کرتا ہے جہاں شمالی نصف کرہ میں سیاحتی سیزن کے اختتام اور جنوبی نصف کرہ میں اس کے آغاز کا وقت ہوتا ہے۔

اس دن کو عالمی سطح پر منانے کی بنیاد نائیجیریا سے تعلق رکھنے والے اگنیشیس ایٹیگبی (Ignatius Atigbi) کی تحرک اور تجویز پر رکھی گئی، جو انہوں نے 1971 میں انقرہ کے ایک اجلاس میں پیش کی تھی۔ بعد ازاں، 1979 میں اسپین میں منعقدہ جنرل اسمبلی میں اقوامِ متحدہ نے اس تجویز کو رسمی منظوری دی اور 27 ستمبر 1980 کو پہلا باضابطہ عالمی یومِ سیاحت منایا گیا آج یہ دن دنیا کے 160 سے زائد ممالک میں ایک خاص تھیم، تعلیمی سیمینارز، ثقافتی میلوں اور تاریخی سائٹس پر مفت یا رعایتی اینٹری جیسے اقدامات کے ساتھ منایا جاتا ہے

--

عالمی یومِ سیاحت کے انعقاد سے دنیا بھر میں یہ شعور اجاگر ہوا ہے کہ سیاحت محض تفریح نہیں بلکہ عالمی جی ڈی پی کا تقریباً 10 فیصد فراہم کرنے والی ایک عظیم معاشی صنعت ہے جو ہر دس میں سے ایک فرد کو روزگار فراہم کرتی ہے۔ اس دن کی بدولت ممالک کے مابین بین الثقافتی ہم آہنگی، باہمی امن اور مقامی برادریوں بالخصوص دیہی آبادیوں کی بااختیاری کو فروغ ملا ہے، نیز ماحولیاتی تحفظ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پائیدار اور ماحول دوست سیاحت (Eco-tourism) کے جدید رجحانات نے پرورش پائی ہے۔

عالمی سطح پر سیاحوں کی سالانہ آمد کے لحاظ سے فرانس، اسپین، امریکہ، ترکیہ اور اٹلی سیاحت کی صنعت کے سرِفہرست ممالک ہیں، جہاں فرانس سالانہ 100 ملین کے قریب بین الاقوامی سیاحوں کی میزبان بنتا ہے جبکہ امریکہ سیاحت سے حاصل ہونے والی معاشی درآمدات میں دنیا پر حکمرانی کر رہا ہے۔ ان ممالک نے جدید انفراسٹرکچر، بہترین برانڈنگ اور اعلیٰ سفری سہولیات کے ذریعے سیاحت کو اپنی قومی معیشت کا بنیادی ستون بنا رکھا ہے۔

عالمی تناظر کے مقابلے میں اگر پاکستان کا جائزہ لیا جائے تو یہ دنیا کے ٹریول اینڈ ٹورزم ڈیولپمنٹ انڈیکس میں 101 ویں نمبر پر کھڑا ہے، جہاں سالانہ تقریباً 10 لاکھ بین الاقوامی سیاح آتے ہیں۔ اگرچہ حالیہ برسوں میں آن لائن ویزا (e-Visa) کی سہولت اور امن و امان کی بہتر ہوتی صورتِ حال سے صورت حال میں بہتری آئی ہے، لیکن ملک کے پاس موجود جغرافیائی اور ثقافتی خزانوں کی روشنی میں یہ اعداد و شمار پاکستان کی حقیقی صلاحیت سے کہیں کم ہیں۔

پاکستان میں سیاحت کا سب سے بڑا اور پائیدار ستون اس کی مذہبی و تاریخی سیاحت ہے۔ سکھ برادری کے لیے گوردوارہ دربار صاحب کرتارپور اور ننکانہ صاحب جیسے مقدس ترین مقامات موجود ہیں، جبکہ بدھ مت کے پیروکاروں کے لیے ٹیکسلا، سوات اور مردان کے گندھارا آثارِ قدیمہ عالمی کشش رکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ملتان، لاہور اور پاکپتن کے صوفیانہ مزارات پر سالانہ لاکھوں زائرین کی آمد ملکی و علاقائی سیاحت کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہے۔

سیاحت کا دوسرا اہم رخ ایڈونچر اور قدرتی سیاحت ہے، جہاں شمالی علاقہ جات بشمول گلگت بلتستان اور خیبر پختونخوا دنیا بھر کے کوہ پیماؤں اور ایڈونچر کے شوقین افراد کی توجہ کا مرکز ہیں۔ دنیا کی 14 بلند ترین چوٹیوں میں سے 5 چوٹیاں (بشمول K2 اور نانگا پربت) پاکستان میں واقع ہیں، جن کے ساتھ ساتھ ہنزہ، اسکردو، وادیِ کاغان اور بلوچستان کی قدرتی ساحلی پٹی (مکران اور گوادر) ملکی و غیر ملکی سیاحوں کو ششدر کر دینے کا قدرتی حسن رکھتے ہیں۔

پاکستان میں سیاحت کا مستقبل بے حد روشن اور امکانات سے بھرپور ہے، بشرطیکہ چند بنیادی چیلنجز پر قابو پایا جائے۔ اگر حکومت اور نجی شعبہ شمالی اور ساحلی علاقوں میں بہترین روڈ نیٹ ورک، پائیدار ہوٹلنگ، بین الاقوامی معیار کی برانڈنگ اور قدرتی سائٹس کے ماحولیاتی تحفظ کو یقینی بنائیں، تو سیاحت کا یہ شعبہ انکم اور روزگار کی فراہمی کے ساتھ ساتھ پاکستان کی معیشت کے لیے سب سے بڑا غیر ملکی زرِ مبادلہ کمانے والا ذریعہ بن سکتا ہے۔



26- ستمبر-خرگوشوں کا عالمی دن۔اور پاکستان میں اس کاروبار کا مستقبل

خرگوشوں کا عالمی دن یعنی International Rabbit Day ہر سال ستمبر کے چوتھے ہفتے (Saturday) کو منایا جاتا ہے، جو کہ سال 2026 میں 26 ستمبر کو آرہا ہے۔ اس دن کو منانے کا اصل مقصد پالتو اور جنگلی خرگوشوں کے حقوق، ان کے تحفظ اور فلاح و بہبود کے بارے میں شعور بیدار کرنا ہے۔

اس دن کا آغاز باقاعدہ طور پر 1998ء میں برطانیہ (UK) کی ایک فلاحی تنظیم 'The Rabbit Charity' کی جانب سے کیا گیا تھا۔ بعد میں 'House Rabbit Society' اور دیگر عالمی تنظیموں نے بھی اسے اپناتے ہوئے پوری دنیا میں پھیلایا۔ اس کے منانے کا مقصد یہ بھی تھا کہ خرگوش دنیا کے معصوم ترین جانوروں میں شمار ہوتے ہیں لیکن انہیں کاسمیٹکس وادویات کی ٹیسٹنگ، گوشت اور فر/Fur) کھال) کے لیے بڑے پیمانے پر نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ یہ دن لوگوں کو یاد دلاتا ہے کہ خرگوشوں کو تجربہ گاہوں کے ظلم اور بے جا شکار سے بچایا جائے۔

چین دنیا بھر میں خرگوشوں کی پیداوار اور گوشت کی تیاری میں سب سے پہلے نمبر پر ہے، جہاں عالمی پیداوار کا تقریباً 50٪ سے زائد حصہ حاصل کیا جاتا ہے۔ اسی طرح شمالی کوریا: گوشت کی پیداوار اور کھپت کے لحاظ سے ایشیا کا دوسرا بڑا ملک ہے اور یورپی ممالک میں فرانس، اسپین اور اٹلی یورپی یونین میں خرگوش کی پیداوار اور استعمال میں سرفہرست ہیں۔ علاوہ ازیں مصر اور نائجیریا: افریقہ میں سب سے زیادہ پیداوار دینے والے ممالک ہیں

، خرگوش دنیا بھر میں بڑے پیمانے پر بطور خوراک (گوشت) استعمال ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ حیران کن ہو سکتا ہے، لیکن خرگوش کا گوشت ایک باقاعدہ کمرشل انڈسٹری کی شکل اختیار کر چکا ہے۔ صحت کے لحاظ سے اس کے گوشت کو بہت مفید مانا جاتا ہے کیونکہ یہ لوفیٹ (کم چربی) اور کم کولیسٹرول والا سفید گوشت ہے۔ اس میں پروٹین، وٹامن B12 اور آئرن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے اور اسلامی تعلیمات کے مطابق خرگوش کا گوشت حلال ہے اور پاکستان سمیت کئی مسلم ممالک میں بھی اسے کھایا جاتا ہے۔

مختلف ممالک میں خرگوشوں کو درج ذیل مقاصد کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے:

.1 کھل اور فر (Fur Industry) میں خرگوش کی نرم اور گرم کھال (فر) کو لباس، جیکٹس، ٹوپیاں، دستانے اور فیشن کی دیگر اشیاء بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ چین اور یورپی ممالک میں اس کی باقاعدہ صنعت موجود ہے۔

.2 امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں خرگوش کو کتے اور بلی کے بعد تیسرا سب سے مقبول پالتو جانور مانا جاتا ہے۔ ان کے معصوم مزاج کی وجہ سے لوگ انہیں گھروں میں شوق سے رکھتے ہیں۔

.3 خرگوشوں کو حیاتیاتی اور طبی لیبارٹریوں میں نئی ادویات، ویکسینز، اور کاسمیٹکس (آرائشی سامان) کی جانچ اور ریسرچ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے، کیونکہ ان کا مدافعتی نظام انسانوں سے مماثلت رکھتا ہے۔

.4 خرگوش کا فضلہ نائٹروجن اور فاسفورس سے بھرپور ہوتا ہے۔ فارمنگ کرنے والے ممالک میں اسے کھیتوں اور باغات کے لیے بہترین نامیاتی کھاد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

خرگوش فارمنگ ان لوگوں کے لیے ایک بہترین موقع ہے جو محدود جگہ اور محدود وسائل سے اپنا کاروبار شروع کرنا چاہتے ہیں۔ خرگوش نسبتاً کم جگہ میں پالے جاسکتے ہیں نیوزی لینٹ اور کیلیفورنیا نسل کے خرگوشوں کی فارمنگ دنیا بھر میں پسند کیا جانے والا لذیذ اور دل کے لیے مفید گوشت کا انوکھا کاروبار ہے۔ جاپان کے خوبصورت علاقے ہیروشیما میں واقع ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے جسے دنیا بھر میں 'Rabbit Island' یعنی 'خرگوشوں کا جزیرہ' کے نام سے جانا جاتا ہے

پاکستان میں خرگوش نہ صرف ایک پسندیدہ پالتو جانور ہے بلکہ اب یہ معاشی طور پر بھی ایک ابھرتی ہوئی صنعت بن رہا ہے :

پاکستان (خصوصاً پنجاب اور خیبر پختونخوا) میں حالیہ برسوں میں ماڈرن ریبٹ فارمنگ میں تیزی سے اضافہ ہوا ہے۔ خرگوش بہت تیزی سے نسل بڑھاتے ہیں (ایک مادہ سال میں 6 سے 8 بار بچے دے سکتی ہے)، جس کی وجہ سے یہ کم لاگت میں زیادہ منافع بخش کاروبار بن چکا ہے۔ پاکستان زرعی تحقیقاتی کونسل (PARC) نے نیپال سے انگورا خرگوش (Angora Rabbits) منگوا کر مری، ہزارہ اور دیگر پہاڑی علاقوں کی خواتین میں تقسیم کیے تھے۔ ان خرگوشوں کی انتہائی نرم اور قیمتی اون (Wool) سے شالیں اور گرم کپڑے تیار کیے جاتے ہیں جو مقامی معیشت کو مضبوط کر رہے ہیں۔

پاکستان میں پالتو اور تجارتی سطح پر پائے جانے والے خرگوشوں میں نیوزی لینڈ وائٹ (New Zealand White)، ڈچ (Dutch)، فلیمش جائنٹ (Flemish Giant) اور لائن ہیڈ (Lionhead) سب سے زیادہ مقبول ہیں۔ اور کم سرمایہ کاری سے ایک منافع بخش کاروبار شروع کرنے کے لیے ریبٹ فارمنگ ایک بہترین اور جدید رجحان بن چکا ہے اور یہ کاروبار گھر کی چھت، بیک یارڈ یا ایک چھوٹے کمرے سے بھی شروع کیا جاسکتا ہے۔ ان کی خوراک پر پولٹری (مرغیوں) کے مقابلے میں بہت کم خرچ آتا ہے۔ خرگوش کا گوشت ہائی پروٹین اور لو کولیسٹرول ہونے کی وجہ سے دل اور شوگر کے مریضوں کے لیے بہترین ہے۔ پاکستان کے بڑے شہروں کے بڑے مارکیٹس اور ہوٹلوں میں اس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ خوبصورت نسل کے بچے (جیسے لائن ہیڈ یا ڈچ) پیٹ شاپس پر اچھے داموں بکتے ہیں۔

انگورا خرگوش کی اون مارکیٹ میں بہت مہنگی فروخت ہوتی ہے جس سے گرم کپڑے بنتے ہیں۔

بزنس شروع کرنے کے لیے عام طور پر 10 مادائیں (Females) اور 2 نر (Males) کا سیٹ بہترین مانا جاتا ہے۔ انہیں رکھنے کے لیے ہوادار لوہے کے پنجرے (Cages) استعمال کیے جاتے ہیں تاکہ صفائی آسانی سے ہوسکے۔

خرگوش ایک حساس جانور ہے، اس کی صحت کے لیے درج ذیل باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے:

1۔ خوراک کے بارے میں بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ خرگوش صرف گاجر کھاتا ہے، جو کہ ایک غلط فہمی ہے۔ گاجر میں شوگر زیادہ ہوتی ہے، اس لیے اسے صرف کبھی کبھار بطور ٹریٹ (Treat) دینا چاہیے۔ خرگوش کی 80٪ خوراک خشک گھاس (جیسے لوسرن Alfalfa / یا ٹموتھی گھاس) ہونی چاہیے۔ یہ ان کے ہاضمے اور دانتوں کو گھسنے کے لیے زندگی بھر ضروری ہے۔ اس کے علاوہ پودینہ، دھنیا، مولی کے پتے، اور بند گوبھی کے بیرونی پتے (کم مقدار میں) استعمال کئے جاسکتے ہیں۔

مارکیٹ میں خرگوشوں کی مخصوص فیڈ ملتی ہے، جو روزانہ آدھا کپ دی جاسکتی ہے۔

پنجرے میں ہر وقت صاف اور تازہ پانی کا برتن یا نوزل والی بوتل ہونی چاہیے۔

خرگوش سردی برداشت کرسکتے ہیں لیکن گرمی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوسکتی ہے۔ پاکستان میں گرمیوں کے موسم میں انہیں ٹھنڈی اور سایہ دار جگہ پر رکھیں، اور پنجرے کے پاس پنکھے یا ٹھنڈی بوتلیں ضرور رکھنی چاہیں۔ پنجرے کو روزانہ صاف کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ خرگوش کی پیشاب میں امونیا گیس ہوتی ہے، جو زیادہ جمع ہونے سے انہیں سانس کی بیماری دے سکتی ہے۔

اگر خرگوش کو چبانے کے لیے سخت گھاس یا لکڑی نہ ملے، تو اس کے دانت اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دیتا ہے۔

خرگوش بلیوں کی طرح خود کو چاٹ کر صاف رکھتے ہیں۔ انہیں نہلانے سے وہ شدید خوف (Shock) میں آسکتے ہیں جو ان کے لیے خطرناک ہے۔



25 ستمبر۔ پھیپھڑوں کا عالمی دن اور پاکستان۔

ہر سال 25 ستمبر کو پھیپھڑوں کا عالمی دن (World Lung Day) منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد پھیپھڑوں کی صحت کے بارے میں عوامی شعور اجاگر کرنا اور سانس کی مختلف بیماریوں سے بچاؤ کے لیے اقدامات کرنا ہے۔

یہ دن منانے کی شروعات 2016 میں فورم آف انٹرنیشنل ریسپیریٹری سوسائٹیز (Forum of International Respiratory Societies – FIRS) کی جانب سے کی گئی تھی۔ اس تنظیم نے پہلی بار دنیا بھر کے طبی اداروں اور عوام کو پھیپھڑوں کی صحت پر توجہ دینے کے لیے یکجا کیا۔ اس کے بعد سے ہر سال 25 ستمبر کو باقاعدگی سے یہ دن منایا جاتا ہے۔

اس دن کو منانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کیونکہ دنیا بھر میں دل کی بیماریوں یا کینسر کے مقابلے میں پھیپھڑوں اور سانس کی بیماریوں کو کافی حد تک نظر انداز کیا جاتا تھا، جبکہ یہ بیماریاں عالمی سطح پر اموات کی بڑی وجوہات میں شامل ہیں۔

پھیپھڑوں کی بیماریاں (جیسے COPD ، دمہ، نمونیا، اور پھیپھڑوں کا کینسر) دنیا بھر میں اموات کی بڑی وجوہات میں شامل ہیں۔

عالمی ادارہ صحت (WHO) اور دیگر تحقیقاتی اداروں کے مطابق، عالمی سطح پر دائمی پھیپھڑوں کے امراض (جیسے COPD) اور پھیپھڑوں کے کینسر کے باعث سالانہ تقریباً 40 سے 50 لاکھ افراد ہلاک ہو جاتے ہیں

۔صرف COPD دنیامیں موت کی تیسری بڑی وجہ ہے. آبادی اور پھیپھڑوں کے امراض کی شرح (Mortality Rate) کے لحاظ سے پھیپھڑوں کی بیماریوں سے سب سے زیادہ متاثرہ اور سرفہرست ممالک یہ ہیں

بھارت :(India) بھارت پھیپھڑوں کی بیماریوں (بشمول دمہ اور (COPD سے ہونے والی اموات میں دنیا بھر میں پہلے نمبر پر ہے، جہاں سالانہ لاکھوں اموات ہوتی ہیں۔

چین :(China) تمباکو نوشی اور فضائی آلودگی کی بلند شرح کی وجہ سے یہاں پھیپھڑوں کے کینسر اور COPD کے مریضوں اور اموات کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

امریکا :(United States) یہاں پھیپھڑوں کا کینسر اور دائمی نزلہ وزکام Chronic lower respiratory) diseases) اموات کی بڑی وجہ ہیں۔

جاپان :(Japan) پھیپھڑوں کے کینسر اور عمر رسیدہ آبادی کے سبب پھیپھڑوں کے امراض سے ہونے والی اموات میں نمایاں ہے۔

ترکیہ / (Turkey) روس :(Russia) تمباکو نوشی کی اعلیٰ شرح کے باعث یہ ممالک بھی سرفہرست پانچ ممالک کی فہرست میں شامل ہیں۔

طبی تحقیقی رپورٹس (جیسے Global Burden of Disease Study) کے مطابق: دنیا بھر میں مجموعی طور پر تقریباً 57 کروڑ (570 ملین) افراد پھیپھڑوں کے دائمی امراض (Chronic Respiratory Diseases) میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے صرف دمہ (Asthma) کے مریضوں کی تعداد تقریباً 26 سے 35 کروڑ ہے۔ جبکہ) COPD پھیپھڑوں کی شدید سوزش) کے مریضوں کی عالمی تعداد 20 سے 30 کروڑ کے قریب ہے۔

پاکستان پھیپھڑوں کے امراض، خصوصاً فضائی آلودگی (Smog) اور تمباکو نوشی کی وجہ سے شدید متاثرہ ملک ہے۔

World Life Expectancy

ڈیٹا کے مطابق، پاکستان میں پھیپھڑوں کی بیماریوں کے باعث سالانہ تقریباً 86,968 سے زائد اموات ہوتی ہیں، جو ملک میں ہونے والی کل اموات کا تقریباً 5.96٪ بنتا ہے۔ اس لحاظ سے پاکستان پھیپھڑوں کی بیماریوں سے اموات کے معاملے میں دنیا میں 8ویں نمبر پر ہے۔

پاکستان میں پھیپھڑوں کے امراض (خصوصاً دمہ، دائمی برونکائٹس اور (COPD کے مریضوں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔ ایک اندازے کے مطابق، ملک کی تین سے پانچ فیصد آبادی کسی نہ کسی حد تک پھیپھڑوں کے دائمی امراض کا شکار ہے۔ صرف پھیپھڑوں کے کینسر کے ہر سال 22,000 سے زائد نئے کیسز سامنے آتے ہیں اور 19,000 اموات ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ نمونیا (Pneumonia) کے باعث بھی بچوں میں اموات کی شرح کافی تشویشناک ہے۔

پاکستان اور دنیا بھر میں ان امراض کی سب سے بڑی وجہ تمباکو نوشی، شہروں میں بڑھتی ہوئی فضائی آلودگی (صنعتی دھواں اور اسماگ) اور بائیوماس ایندھن (لکڑی اور اوپلوں کا دھواں) کا استعمال ہے۔

پھیپھڑوں کے عالمی دن کے اہم مقاصد درج ذیل ہیں :

شعور و آگاہی: عام عوام کو پھیپھڑوں کے افعال اور ان کی حفاظت کی اہمیت سے واقف کروانا۔

تمباکو نوشی کا خاتمہ: سگریٹ، ویپ (Vape) اور دیگر نشہ آور اشیاء کے پھیپھڑوں پر تباہ کن اثرات کے بارے میں لوگوں کو خبردار کرنا اور انہیں تمباکو نوشی چھوڑنے کی ترغیب دینا۔

فضائی آلودگی کے خلاف مہم: صاف ہوا کے حق کے لیے آواز اٹھانا کیونکہ ماحول اور فیکٹریوں کا دھواں پھیپھڑوں کی بیماریوں کی بنیادی وجہ ہے۔

علاج تک مساوی رسائی: دنیا بھر کے پسماندہ علاقوں میں سانس کی بیماریوں کی سستی تشخیص (جیسے اسپائرومیٹری ٹیسٹ) اور ادویات کی فراہمی کو یقینی بنانے کے لیے حکومتوں پر زور دینا۔ اس سال پھیپھڑوں کے عالمی دن کے لیے

"A Lifetime of Lung Health"

پھیپھڑوں کی صحت، عمر بھر کے لیے) تھیم منتخب کی گئی ہے

۔یہ تھیم اس بات پر زور دیتی ہے کہ پھیپھڑوں کی حفاظت زندگی کے کسی ایک حصے تک محدود نہیں ہونی چاہیے ۔ بچپن میں پھیپھڑوں کی نشوونما سے لے کر جوانی اور بڑھاپے تک، ہر عمر میں سانس کی صحت کا خیال رکھنا ہم سب کی مشترکہ ذمہ داری ہے تاکہ پھیپھڑوں کی بیماریوں سے قبل از وقت بچا جا سکے۔

پھیپھڑوں کی صلاحیت (Capacity) کو برقرار رکھنے اور انہیں بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے روزمرہ زندگی میں درج ذیل عادات کو اپنایا جا سکتا ہے:

تمباکو نوشی سے مکمل پرہیز: پھیپھڑوں کو نقصان پہنچانے والی سب سے بڑی وجہ سگریٹ اور ویپ (Vape) کا دھواں ہے ۔ نہ صرف خود تمباکو نوشی سے بچیں بلکہ دوسروں کے سگریٹ کے دھوئیں (Passive Smoking) سے بھی دُور رہیں ۔

باقاعدگی سے ورزش اور گہرے سانس لینا: چہل قدمی، دوڑنا، سائیکل چلانا یا تیراکی جیسی سرگرمیاں پھیپھڑوں کی آکسیجن جذب کرنے کی صلاحیت کو بڑھاتی ہیں ۔روزانہ چند منٹ گہرے سانس لینے کی مشق (Deep Breathing Exercises) پھیپھڑوں کے پٹھوں کو مضبوط کرتی ہے۔

آلودگی سے بچاؤ: فضائی آلودگی، دھول مٹی اور کیمیکلز کے دھوئیں سے بچنے کے لیے باہر نکلتے وقت ماسک کا استعمال کریں ۔ گھر کے اندر آلودگی کم کرنے کے لیے صفائی کا خیال رکھیں اور وینٹیلیشن (ہوا کی آمد و رفت) کو بہتر بنائیں

-

صحت بخش غذا کا استعمال: اینٹی آکسیڈنٹس سے بھرپور غذائیں جیسے ہری سبزیاں، پھل (خصوصاً سیب اور بیریز)، گری دار میوے (Nut) اور مچھلی پھیپھڑوں کی سوزش کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں ۔

ویکسینیشن (حفاظتی ٹیکے): پھیپھڑوں کو شدید انفیکشن سے بچانے کے لیے نمونیا (Pneumonia) اور فلو (Flu) کی ویکسین وقت پر لگوائیں، خصوصاً بچوں اور بزرگوں کے لیے یہ بہت ضروری ہے

پانی کا زیادہ استعمال: روزانہ مناسب مقدار میں پانی پینے سے پھیپھڑوں کی جھلی میں موجود بلغم پتلا رہتا ہے، جس سے سانس لینے میں آسانی ہوتی ہے اور پھیپھڑے اپنا کام بہتر طریقے سے کرتے ہیں۔



24 ستمبر — عالمی یومِ بحریہ - سمندر سے معیشت تک — بحری راستوں کی حفاظت، انسانیت کی خوش حالی - پاکستان کے تناظر میں

عالمی یومِ بحریہ (World Maritime Day) ہر سال ستمبر کی آخری جمعرات کو منایا جاتا ہے اور 2026 میں یہ دن 24 ستمبر کو منایا جارہا ہے

دنیا کی معیشت کا ایک بڑا حصہ ان راستوں سے گزرتا ہے جو نقشے پر اکثر دکھائی نہیں دیتے۔ سمندر بظاہر خاموش اور وسیع دکھائی دیتا ہے، مگر حقیقت میں یہی سمندری راستے عالمی تجارت، خوراک، توانائی، خام مال اور روزمرہ استعمال کی بے شمار اشیا کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک پہنچانے کا بنیادی ذریعہ ہیں۔ بین الاقوامی میری ٹائم آرگنائزیشن (IMO) کے مطابق عالمی تجارت کا 80 فیصد سے زیادہ حصہ سمندری نقل و حمل کے ذریعے منتقل ہوتا ہے،

اس لیے محفوظ، مؤثر اور ماحول دوست جہاز رانی عالمی معیشت کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ ایک عالمی ادارے سے عالمی دن کی تاریخ (International Maritime Organization (IMO کے قیام سے جڑی ہوئی ہے

6-مارچ 1948 کو جنیوا میں اقوام متحدہ کی سرپرستی میں ہونے والی بین الاقوامی بحری کانفرنس میں IMO کے قیام کا کنونشن منظور ہوا اور مطلوبہ ریاستوں کی توثیق مکمل ہونے کے بعد یہ کنونشن 17 مارچ 1958 کو نافذ العمل ہوا۔

آئی ایم او کا پہلا اجلاس جنوری 1959 میں لندن میں ہوا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد بین الاقوامی جہاز رانی کے لیے ایسے عالمی معیارات وضع کرنا تھا جو سمندری سفر کو محفوظ، مؤثر، ماحول دوست اور باقاعدہ بنائیں۔ اسی تاریخی پس منظر میں IMO کی اسمبلی نے 1977 میں World Maritime Day قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور پہلا عالمی یوم بحریہ 17 مارچ 1978 کو منایا گیا، جو IMO کنونشن کے نافذ ہونے کی 20ویں سالگرہ بھی تھی۔

تاہم 1979 میں فیصلہ کیا گیا کہ اس دن کو مارچ کے بجائے ستمبر کے آخری ہفتے میں منایا جائے، تاکہ رکن ممالک اپنی سہولت کے مطابق اس ہفتے میں تقریبات منعقد کر سکیں۔ بعد ازاں آخری جمعرات اس عالمی دن کے لیے معمول کی تاریخ بن گئی

۔ یہ دن صرف جہازوں کا نہیں، انسانوں کا دن بھی ہے عالمی یوم بحریہ کا مقصد محض بحری جہازوں یا بندر گاہوں کی اہمیت اجاگر کرنا نہیں بلکہ ان لاکھوں Seafarers ، پورٹ ورکرز، شپ آپریٹرز، انجینئرز، نیویگیشن ماہرین اور دیگر کارکنوں کی خدمات کو تسلیم کرنا بھی ہے جو عالمی تجارت کا پہیہ رواں رکھتے ہیں۔ سمندری سفر میں انسانی جانوں کا تحفظ، جہازوں اور بندر گاہوں کی سلامتی، حادثات کی روک تھام، ملاحوں کی تربیت اور فلاح، سمندری آلودگی میں کمی اور عالمی سپلائی چین کا تسلسل اس دن کے بنیادی موضوعات ہیں

۔ IMO کے موجودہ مؤقف میں بھی یہ واضح کیا گیا ہے کہ بین الاقوامی قواعد کی اصل قدر اس وقت سامنے آتی ہے جب وہ عملی طور پر جہاز، بندر گاہ اور قومی نظام میں نافذ ہوں

27 -2026 کے لئے اس دن کے کئے خصوصی Theme بھی دیا گیا ہے۔ جس کا عنوان ہے

" World Maritime Day

“From Policy to Practice: Powering Maritime Excellence”

”پالیسی سے عملی جامہ پہناتے ہوئے بحری عمدگی کو فروغ دینا“۔

یہ IMO کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہے کہ عالمی یومِ بحریہ کا ایک ہی موضوع مسلسل دو سال، یعنی 2026 اور 2027، کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اس کا بنیادی پیغام نہایت واضح ہے: صرف قوانین، معاہدے اور پالیسیاں بنانا کافی نہیں؛ ان پر مؤثر عمل درآمد، قومی قانون سازی، نگرانی، تربیت، تکنیکی معاونت اور روزمرہ بحری کارروائیوں میں عملی نفاذ ضروری ہے۔ IMO اس مقصد کے لیے بالخصوص ترقی پذیر ممالک کی استعداد بڑھانے، تربیت، تکنیکی تعاون اور علم کے تبادلے پر زور دے رہا ہے

۔یہ موضوع موجودہ عالمی حالات میں مزید اہم ہو جاتا ہے، کیونکہ بحری تجارت کو جغرافیائی سیاسی کشیدگی، سمندری سلامتی کے خطرات، موسمیاتی تبدیلی، آلودگی، نئی ٹیکنالوجی اور توانائی کی منتقلی جیسے چیلنجز کا سامنا ہے۔ IMO کے مطابق مستقبل کی بحری صنعت کو محفوظ، پُرامن، مؤثر اور ماحولیاتی طور پر پائیدار بنانے کے لیے بین الاقوامی اصولوں کو حقیقی نتائج میں تبدیل کرنا ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ 2026 کا پیغام محض "پالیسی بنانے" کے بجائے "پالیسی پر عمل کرنے" کو اصل کامیابی قرار دیتا ہے
پاکستان کے لیے عالمی یومِ بحریہ محض ایک عالمی دن نہیں بلکہ قومی معاشی امکانات پر غور کرنے کا موقع بھی ہے۔ پاکستان کی تقریباً 1,050 کلومیٹر طویل ساحلی پٹی اور وسیع سمندری حدود اسے بحرِ عرب اور بحرِ ہند کے اہم تجارتی ماحول سے جوڑتی ہیں۔ کراچی پورٹ، پورٹ قاسم اور گوادر پورٹ پاکستان کی بیرونی تجارت اور علاقائی رابطوں میں بنیادی کردار رکھتے ہیں

۔ سرکاری پاکستانی ذرائع کے مطابق ملک کے تقریباً 95 فیصد تجارتی حجم کی نقل و حمل سمندر کے ذریعے ہوتی ہے۔ پاکستان کے لیے اس شعبے کی اہمیت صرف بندرگاہوں اور درآمد و برآمد تک محدود نہیں۔ Blue Economy کے وسیع دائرے میں ماہی گیری، جہاز رانی، بندرگاہی خدمات، شپ بلڈنگ و شپ ری سائیکلنگ، ساحلی سیاحت، سمندری تحقیق اور دیگر بحری وسائل شامل ہیں۔
حکومتِ پاکستان نے بھی حالیہ برسوں میں میری ٹائم سیکٹر کی ترقی، بندرگاہوں کی ڈیجیٹلائزیشن، جہاز سازی، آبی زراعت اور ساحلی سیاحت کے امکانات پر توجہ کا اظہار کیا ہے کہ سمندر کو وسیلہ بھی سمجھیں اور ذمہ داری بھی۔
پاکستان کے سامنے اس شعبے میں مواقع کے ساتھ چیلنجز بھی موجود ہیں۔ ساحلی آلودگی، پلاسٹک اور صنعتی فضلے کا سمندر میں اخراج، موسمیاتی تبدیلی، سطحِ سمندر میں اضافہ، ساحلی کٹاؤ، سمندری حیات کا تحفظ، جدید بندرگاہی ٹیکنالوجی، انسانی وسائل کی تربیت اور بین الاقوامی بحری معیارات کا مؤثر نفاذ ایسے معاملات ہیں جن پر مسلسل توجہ درکار ہے۔

پاکستان کی ساحلی اور سمندری حیاتیاتی دولت موسمیاتی اور انسانی دباؤ کے باعث خطرات سے دوچار ہے، اس لیے معاشی ترقی اور ماحولیاتی تحفظ کو ایک دوسرے کا مخالف نہیں بلکہ ایک دوسرے کا لازمی ساتھی سمجھنا ہو گا۔

۔عالمی یومِ بحریہ 2026 کا سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ ترقی صرف منصوبے بنانے سے نہیں، انہیں دیانت داری، اہلیت اور تسلسل کے ساتھ عملی شکل دینے سے حاصل ہوتی ہے۔ سمندر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ راستے بظاہر الگ ہوں تو بھی منزلیں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں

۔اگر پاکستان اپنی ساحلی پٹی، بندرگاہوں، سمندری وسائل، انسانی صلاحیت اور جغرافیائی محلِ وقوع کو مؤثر حکمتِ عملی، جدید ٹیکنالوجی اور مضبوط ادارہ جاتی نظم کے ساتھ استعمال کرے تو سمندر محض ہماری سرحد نہیں رہتا بلکہ معاشی ترقی، روزگار، علاقائی تجارت اور قومی خوش حالی کا دروازہ بن سکتا ہے

یہی 2026 کے عالمی یومِ بحریہ کا اصل پیغام ہے: پالیسی کاغذ پر نہیں، عمل میں نظر آنی چاہیے—کیونکہ حقیقی بحری عمدگی وہی ہے جو انسان، معیشت اور سمندر، تینوں کے مستقبل کو محفوظ بنائے۔



23 ستمبر — بین الاقوامی یومِ اشارتی زبان: خاموشی نہیں، ایک مکمل زبان اور ایک مکمل شناخت

ہر سال 23 ستمبر کو بین الاقوامی یومِ اشارتی زبان (International Day of Sign Languages) منایا جاتا ہے۔ یہ دن محض اشاروں کے ذریعے گفتگو کی اہمیت اجاگر کرنے کا موقع نہیں بلکہ دنیا کو یہ یاد دلانے کا دن ہے کہ سماعت سے محروم افراد بھی زبان، تعلیم، روزگار، صحت، انصاف اور سماجی زندگی میں برابر کے حقوق رکھتے ہیں

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے قرارداد A/RES/72/161 کے ذریعے 19 دسمبر 2017ء کو 23 ستمبر کو یہ عالمی دن قرار دیا، جس کا باقاعدہ آغاز 2018ء سے ہوا۔ اس دن کی تجویز World Federation of the Deaf (WFD) نے دی تھی، جو دنیا بھر کی ڈیف کمیونٹی کے حقوق کی نمائندہ عالمی تنظیم ہے۔ 23 ستمبر کا انتخاب بھی علامتی ہے، کیونکہ اسی تاریخ کو 1951ء میں روم، اٹلی میں WFD قائم ہوئی تھی۔ اشارتی زبان کی تاریخ کسی ایک شخص کی ایجاد کی تاریخ نہیں؛ مختلف معاشروں میں سماعت سے محروم افراد نے قدرتی طور پر ہاتھوں، چہرے کے تاثرات اور جسمانی حرکات کے ذریعے ابلاغ کے طریقے پیدا کیے۔ تاہم اسے منظم تعلیمی شکل دینے میں کئی تاریخی شخصیات کا کردار رہا

۔

۔ سولہویں صدی کے اسپین میں Pedro Ponce de León نے بہرے بچوں کی تعلیم میں اشاروں کے منظم استعمال کی بنیاد رکھنے والوں میں اہم کردار ادا کیا۔ بعد ازاں Juan Pablo Bonet نے 1620ء میں دستی حروفِ تہجی (Manual Alphabet) کے بارے میں ایک اہم کتاب شائع کی۔ اٹھارہویں صدی میں فرانس کے Abbé Charles-Michel de l'Épée نے پیرس میں بہرے بچوں کے لیے باقاعدہ تعلیم کا ادارہ قائم کیا اور مقامی قدرتی اشاروں کو منظم تعلیمی نظام سے جوڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یوں اشارے محض جسمانی حرکات نہیں رہے بلکہ تعلیم اور ابلاغ کا باقاعدہ ذریعہ بننے لگے

ایک اور اہم مرحلہ بیسویں صدی میں آیا جب امریکی ماہرِ لسانیات William C. Stokoe نے 1960ء میں American Sign Language پر اپنی تاریخی تحقیق پیش کی۔ ان کی تحقیق نے اس تصور کو چیلنج کیا کہ اشاروں کی زبان صرف اشاروں یا نقل و حرکت کا مجموعہ ہے۔ انہوں نے واضح کیا کہ اس میں بھی زبان کی طرح ساخت، قواعد اور باقاعدہ لسانی اصول موجود ہیں۔ بعد میں Stokoe ، Dorothy Casterline اور Carl Croneberg نے 1965ء میں American Sign Language کی ایک اہم لغت بھی مرتب کی۔ اس علمی پیش رفت نے دنیا بھر میں اس تصور کو مضبوط کیا کہ Sign Languages حقیقی، قدرتی اور پیچیدہ زبانیں ہیں جو تجریدی خیالات، جذبات اور پیچیدہ معلومات بھی بیان کر سکتی ہیں۔

23 ستمبر کے عالمی دن کا مقصد بھی اسی بنیادی حقیقت کو اجاگر کرنا ہے کہ زبان صرف آواز کا نام نہیں۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق اشارتی زبانوں کا تحفظ لسانی اور ثقافتی تنوع کا حصہ ہے اور ان تک رسائی سماعت سے محروم افراد کے انسانی حقوق کے مکمل حصول کے لیے اہم ہے

۔ دنیا میں مختلف قومی اشارتی زبانیں موجود ہیں؛ ہر ملک کی Sign Language لازماً دوسری زبانوں جیسی نہیں ہوتی۔

WFD کے مطابق دنیا بھر میں 70 ملین سے زیادہ Deaf افراد کی نمائندگی اس عالمی تحریک کے ذریعے ہوتی ہے۔

اس دن کے موقع پر مختلف ممالک میں آگاہی پروگرام، تعلیمی سرگرمیاں، سیمینارز، Sign Language learning sessions اور عوامی مقامات پر علامتی سرگرمیاں منعقد ہوتی ہیں؛ WFD نے عوامی عمارتوں اور landmarks کو نیلی روشنی سے روشن کرنے کی اپیل بھی کی ہے

پاکستان میں بھی (Pakistan Sign Language (PSL نے گزشتہ برسوں میں خاصی ترقی کی ہے۔ پاکستان میں سرکاری Special Education ادارے بھی بہرے بچوں کی تعلیم میں sign language ، lip-reading اور خصوصی تربیت کو استعمال کرتے ہیں؛ مثال کے طور پر خیبر پختونخوا کے سرکاری اعداد و شمار میں 2025-26ء کے دوران Deaf & Dumb اداروں میں 1,338 طلبہ کے اندراج کا ذکر موجود ہے۔

دوسری جانب Deaf Reach/FESF جیسے اداروں نے PSL کی لغت، ویڈیو وسائل، موبائل ایپس، اساتذہ کی تربیت، والدین کی رہنمائی اور vocational training کے ذریعے Sign Language کو عام کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔ اس پلیٹ فارم کے مطابق اس کے ڈیجیٹل PSL وسائل میں 7,500 سے زائد signs شامل ہیں اور ملک بھر میں سیکڑوں PSL Learning Units تک رسائی پیدا کی گئی ہے۔

پاکستان میں ایک اہم قانونی پیش رفت Access to Media (Deaf) Persons Act, 2022 ہے۔ اس قانون کے تحت قومی اور نجی الیکٹرانک میڈیا پر خبروں اور بعد ازاں دیگر پروگراموں میں پاکستان Sign Language interpreters کی فراہمی کے لیے قانونی تقاضے مقرر کیے گئے

۔ تاہم اصل چیلنج قانون بنانے کے بعد اس پر مؤثر اور یکساں عمل درآمد ہے۔ 2025ء میں وفاقی سطح پر Pakistan Sign Language کی Standardization کے لیے قومی مشاورت اور بعد ازاں 948 PSL signs کی standardization کی اطلاع بھی سامنے آئی، جبکہ حکومت نے interpreter training ، نصاب اور عوامی خدمات میں PSL کے فروغ کے لیے قومی سطح کے اقدامات کا ذکر کیا۔

پاکستان کے لیے اس دن کا پیغام اس لیے بھی اہم ہے کہ ہمیں سماعت سے محرومی کو محض ایک طبی یا جسمانی مسئلہ سمجھنے کے بجائے ابلاغ، تعلیم اور مواقع تک رسائی کے مسئلے کے طور پر بھی دیکھنا ہو گا۔ اگر ایک بچہ اپنی ابتدائی عمر ہی میں قابلِ فہم زبان سے محروم رہ جائے تو اس کے تعلیمی اور سماجی امکانات متاثر ہو سکتے ہیں

۔ اس لیے ضرورت ہے کہ اسکولوں، اسپتالوں، عدالتوں، سرکاری دفاتر، پولیس، ہنگامی خدمات اور میڈیا میں تربیت یافتہ Sign Language interpreters دستیاب ہوں؛ اساتذہ اور والدین کو PSL سیکھنے کے مواقع ملیں؛ اور Deaf افراد کو صرف امداد کا مستحق نہیں بلکہ صلاحیت، ہنر اور فیصلہ سازی رکھنے والے شہری سمجھا جائے۔

اقوامِ متحدہ کے CRPD Committee نے بھی پاکستان کے بارے میں حالیہ سفارشات میں sign-language interpreters کی پیشہ ورانہ تربیت اور عدالتی، طبی اور تعلیمی خدمات میں ان کی دستیابی پر زور دیا ہے۔

بین الاقوامی یومِ اشارتی زبان ہمیں خاموشی کو سمجھنے کا ہنر سکھاتا ہے۔ ایک مہذب معاشرہ وہ نہیں جہاں صرف بولنے والوں کی آواز سنی جائے، بلکہ وہ ہے جہاں بول نہ سکنے والے کی زبان بھی سمجھی جائے، اس کی صلاحیت کو تسلیم کیا جائے اور اسے آگے بڑھنے کے برابر مواقع دیے جائیں۔ پاکستان میں PSL کو صرف Deaf community تک محدود رکھنے کے بجائے عام تعلیمی نظام، میڈیا اور روزمرہ سماجی زندگی کا حصہ بنانا ایک زیادہ جامع معاشرے کی بنیاد بن سکتا ہے

۔**زبان کسی انسان کو جوڑنے کا وسیلہ ہے، دیوار بنانے کا نہیں؛ اس لیے ہاتھوں کے یہ اشارے دراصل ایک ایسی آواز ہیں جسے سننے کے لیے کان نہیں، صرف احساس اور سمجھ کی ضرورت ہے۔ **



22 ستمبر ــــ ورلڈ روز ڈے - گلاب جو امید، محبت اور انسانیت کا پیغام بن گیا

ہر سال 22 ستمبر کو World Rose Day / Day for the Welfare of Cancer Patients منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد کینسر کے مریضوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی، ان کی دلجوئی، حوصلہ افزائی اور ان کی زندگی میں امید کی روشنی پیدا کرنا ہے۔ گلاب یہاں محض ایک پھول نہیں بلکہ محبت، زندگی، احترام اور امید کی علامت بن جاتا ہے۔ کینسر کے علاج کے مشکل مراحل سے گزرنے والے مریضوں کو یہ احساس دلانا کہ معاشرہ ان کے ساتھ کھڑا ہے، اس دن کا بنیادی انسانی پیغام ہے ۔۔روز ڈے کی تاریخ کے بارے میں دستیاب معتبر ریکارڈ کے مطابق Cancer Patients Aid Association (CPAA)، بھارت نے 22 ستمبر 1994 کو Rose Day کا آغاز کیا اور اس تصور کے پیچھے Joan Shenoy کا اہم کردار تھا۔

اس اقدام کا مقصد کینسر کے مریضوں تک محبت، توجہ اور جذباتی سہارا پہنچانا تھا۔ بعد ازاں یہ تصور مختلف کینسر کیئر اداروں، ہسپتالوں اور فلاحی تنظیموں تک پھیلتا گیا۔ چنانچہ اسے اقوامِ متحدہ یا عالمی ادارۂ صحت کا باقاعدہ سرکاری عالمی دن سمجھنے کے بجائے ایک معروف سماجی و فلاحی عالمی observance کے طور پر دیکھنا زیادہ درست ہے

۔اس دن کے ساتھ Melinda Rose کی داستان بھی بڑی شدت سے منسوب کی جاتی ہے۔ کینیڈا کی 12 سالہ Melinda کو 1994 میں Askin's tumour نامی ایک نایاب مہلک رسولی کی تشخیص ہوئی۔

طبی اعتبار سے Askin's tumour کو محض خون کا کینسر کہنا درست نہیں؛ یہ Ewing sarcoma family سے متعلق ایک نایاب malignant tumour ہے۔ دستیاب روایات کے مطابق شدید بیماری کے باوجود Melinda نے اپنے آخری مہینوں میں دوسرے کینسر کے مریضوں کو خطوط، نظمیں اور حوصلہ افزا پیغامات بھیجے اور ان کے چہروں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی۔ 1996 میں اس کی وفات کے بعد اس کی ہمت، مثبت سوچ اور دوسروں کے لیے محبت کی داستان نے Rose Day کے انسانی پیغام کو مزید معنویت دی۔

۔روز ڈے کا اصل مقصد صرف مریض کو گلاب پیش کرنا نہیں بلکہ اس کی تنہائی کم کرنا اور اسے انسان کی حیثیت سے توجہ، عزت اور محبت دینا ہے۔ کینسر کا علاج بعض اوقات سرجری، کیموتھراپی، ریڈیوتھراپی اور دیگر پیچیدہ مراحل پر مشتمل ہوتا ہے، جو جسمانی کے ساتھ جذباتی دباؤ بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ ایسے میں خاندان، دوستوں، رضاکاروں اور طبی عملے کا تعاون مریض کے لیے اہم سہارا بن سکتا ہے۔ تاہم یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ گلاب، حوصلہ افزائی اور جذباتی مدد طبی علاج کا متبادل نہیں بلکہ اس کے ساتھ فراہم کیا جانے والا انسانی سہارا ہیں

۔یہ دن کینسر کے بارے میں بروقت تشخیص اور مستند طبی مشورے کی اہمیت اجاگر کرنے کا بھی ایک موقع ہے۔ مختلف اقسام کے کینسر کی علامات مختلف ہو سکتی ہیں، اس لیے غیر معمولی یا مسلسل جسمانی علامات کو نظر انداز کرنے کے بجائے مستند ڈاکٹر سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح کینسر کے مریض کے ساتھ ہمدردی کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسے غیر سائنسی دعووں، غیر ثابت شدہ علاج یا خوف پھیلانے والی معلومات کے بجائے قابلِ اعتماد طبی رہنمائی فراہم کی جائے

۔پاکستان کے تناظر میں 22 ستمبر کا پیغام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کینسر کے مریض اور ان کے خاندان علاج کے اخراجات، طویل علاج، ذہنی دباؤ اور بعض اوقات بیماری سے وابستہ معاشرتی خوف کا سامنا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ دن ہسپتالوں اور کینسر کیئر اداروں کے لیے مریضوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ عوام میں آگاہی، بروقت تشخیص، علاج تک رسائی اور مریضوں کے خاندانوں کی معاونت کا پیغام عام کرنے کا موقع بھی ہے۔ گلاب پیش کرنے کے ساتھ اگر ہم کسی ضرورت مند مریض کے علاج میں مدد، کسی خاندان کی دلجوئی یا کسی شخص کو بروقت طبی مشورے کی طرف متوجہ کر سکیں تو اس دن کا مقصد کہیں زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔

روز ڈے ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ بیماری انسان کی شناخت نہیں؛ مریض سب سے پہلے ایک انسان ہے، جسے امید، احترام اور محبت کی ضرورت ہے۔ ایک گلاب شاید کینسر کا علاج نہ کر سکے، مگر یہ ایک دل کو یہ احساس ضرور دلا سکتا ہے کہ وہ اکیلا نہیں۔ اسی جذبے کے ساتھ 22 ستمبر ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم کینسر کے مریضوں کے لیے صرف ہمدردی کے الفاظ نہ کہیں بلکہ اپنی استطاعت کے مطابق امید بنیں، حوصلہ بنیں اور انسانیت کا سہارا بنیں۔ یہی ایک چھوٹا سا گلاب، انسانیت کی ایک بڑی علامت بن سکتا ہے۔



سعودی عرب اور یمن کا حوثی تنازع: تاریخی پس منظر، -پاکستان اور سعودی عرب کے دفاعی معاہدے کے پس منظر میں ایک تجزیہ

حوثی تحریک، جسے رسمی طور پر "انصار اللہ" کہا جاتا ہے، کی بنیاد 1990ء کی دہائی میں یمن کے شمالی اور پہاڑی خطے صعدہ میں رکھی گئی۔ اس تحریک کے بانی حسین بدر الدین الحوثی تھے، اور اس کا بنیادی مقصد یمن میں زیدی شیعہ برادری کی مذہبی، ثقافتی اور سیاسی شناخت کا تحفظ تھا۔ یمن میں زیدی شعیوں کی تعداد 35 سے 40 فی صد تک ہے۔

یمن میں زیدی شیعہ ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک حکمران رہے ہیں۔ یہ حضرت امام علی بن الحسین (امام زین العابدینؑ) کے پوتے اور امام محمد باقرؑ کے سوتیلے بھائی حضرت زید بن علی کی طرف منسوب ہیں۔ انہوں نے سنہ 122 ہجری میں اموی حکمران ہشام بن عبد الملک کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا۔ یمن کی آبادی کا ایک بڑا حصہ زیدی شیعہ پر مشتمل ہے اور یہیں ان کی تاریخ اور حکومتیں رہی ہیں

۔ زیدی شیعہ کو اثنا عشری (بارہ امامی) شیعوں کے مقابلے میں سب سے معتدل شیعہ فرقہ مانا جاتا ہے، اور ان کے فقہی و عقائدی اصول اہل سنت کے کافی قریب ہیں۔ یہ اثنا عشری شیعوں کی طرح بارہ اماموں کے قائل نہیں ہیں، اور نہ ہی ان کے نزدیک امام معصوم ہوتے ہیں (سوائے پنجتن پاک کے)

۔یہ حضرات پہلے تینوں خلفاء(حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ،اور حضرت عثمانؓ) کی خلافت کو درست مانتے ہیں اور صحابہ کرامؓ کی تکفیر یاان پر تبرا نہیں۔ان کے نزدیک امام کوئی معصوم ہستی نہیں بلکہ عام انسان ہوتا ہے،البتہ امامت کے لیے حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہونا(سید ہونا)اور ظالم حکمران کے خلاف تلوار اٹھانا(قیام کرنا)شرط رہا ہے۔

سعودی عرب کی سرحد یمن سے ملتی ہے۔حوثیوں(زیدیوں)کے برسر اقتدار آنے اور یمن پر کنٹرول حاصل کرنے سے سعودی عرب کو اپنے جنوب میں ایک ایسے عسکری اور سیاسی حریف کا خطرہ ہے جو ایرانی اثر ورسوخ کا حامل مانا جاتا ہے

۔:سعودیہ کا مؤقف ہے کہ حوثی باغیوں کو ایران کی عسکری اور مالی پشت پناہی حاصل ہے، جس کی وجہ سے یمن خلیجی ریاستوں اور بالخصوص سعودی عرب کے لیے سلامتی کا بڑا خطرہ بن چکا ہے۔

۔حوثی قیادت کا ابتدائی موقف یہ تھا کہ یمن کی مرکزی حکومت اور سعودی عرب کی مالی معاونت سے چلنے والے سلفی مدرسے ان کے روایتی عقائد اور سٹریٹجک حقوق کو نقصان پہنچا رہے ہیں، جس کی وجہ سے یہ تحریک ایک مقامی مذہبی وسیاسی دھارے سے بڑھ کر ایک جنگجو مسلح تنظیم میں تبدیل ہو گئی۔

۔2011 میں عالم اسلام کو اپنی لپیٹ میں لینے والی "عرب بہار" کی لہر یمن بھی پہنچی، جس کے نتیجے میں یمن کے طویل المدتی صدر علی عبداللہ صالح کو استعفیٰ دینا پڑا۔ان کے بعد نائب صدر عبدربہ منصور ہادی نے اقتدار سنبھالا، جنہیں سعودی عرب اور عالمی برادری کی کھلی حمایت حاصل تھی۔ تاہم، ہادی حکومت بدعنوانی، معاشی بحران اور انتظامی ناکامیوں کا شکار ہو گئی۔ ستمبر 2014ء میں حوثیوں نے عوام کی بددلی اور معاشی ناہمواری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے سابقہ حریف علی عبداللہ صالح سے عارضی اتحاد کیا اور یمن کے دارالحکومت صنعاء پر قبضہ کر لیا۔انہوں نے صدر ہادی کو پہلے نظر بند کیا اور بعد میں ہادی ملک چھوڑ کر سعودی عرب پناہ لینے پر مجبور ہو گئے

۔سعودی عرب کے لیے یمن میں ایک شیعہ حوثی حکومت کا قیام قومی سلامتی کے لیے ایک بڑا خطرہ تھا۔ سعودی عرب اور یمن کے درمیان تقریباً1800 کلومیٹر طویل مشترکہ سرحد ہے،اور ریاض کو اندیشہ تھا کہ حوثی حکومت اس کے جنوبی بارڈر پر مسلسل کشیدگی کا باعث بنے گی

۔چنانچہ مارچ 2015ء میں سعودی ولی عہد(موجودہ ولی عہد) محمد بن سلمان کی قیادت میں 10 عرب ممالک پر مشتمل ایک فوجی اتحاد بنایا گیا اور سعودی عرب کی قیادت میں یمن کے حوثی باغیوں کے خلاف شروع ہونے والے فوجی اتحاد کے پہلے مرحلے کو "آپریشن ڈیسیسو اسٹورم / Operation Decisive Storm) "عاصفۃ الحزم)کا نام دیا گیا تھا۔اس آپریشن کی سیاسی اور فوجی قیادت درج ذیل اہم شخصیات کے ہاتھ میں تھی

1:۔ **سیاسی اور اسٹریٹجک کمانڈ (Political Command)** سلمان بن عبدالعزیز آل سعود (سعودی فرمانروا): اتحاد کے قیام اور فوجی کارروائی کا حتمی سیاسی فیصلہ شاہ سلمان کا تھا۔ انہوں نے یمن کے صدر عبدربہ منصور ہادی کی درخواست پر اس آپریشن کی منظوری دی۔ شہزادہ محمد بن سلمان (سعودی وزیرِ دفاع): اس وقت کے نومنتخب وزیرِ دفاع (اور موجودہ ولی عہد) محمد بن سلمان اس پورے آپریشن کے مرکزی سیاسی اور اسٹریٹجک نگران تھے۔ انہوں نے اتحاد کی تشکیل اور مہم کے سیاسی و سفارتی مقاصد کو آگے بڑھایا

۔ **شہزادہ محمد بن نائف (نائب ولی عہد و وزیرِ داخلہ)**: وہ بھی کمانڈ سینٹر میں محمد بن سلمان کے ساتھ مل کر آپریشن کی نگرانی اور داخلی سلامتی کے امور سنبھال رہے تھے۔ عبدربہ منصور ہادی (یمنی صدر): سیاسی طور پر اس اتحاد کو قانونی حیثیت دینے والے یمن کے جلاوطن صدر تھے، جن کی بحالی اس آپریشن کا بنیادی ہدف تھی۔

2۔ **فوجی اور عسکری کمانڈ (Military Command)** شہزادہ محمد بن سلمان (کمانڈر ان چیف / وزیرِ دفاع): عسکری کمانڈ کے لحاظ سے بھی تمام آپریشنز براہِ راست وزیرِ دفاع کے ماتحت کام کر رہے تھے، اور وہ کمانڈ سینٹر سے بذاتِ خود فضائی حملوں کی نگرانی کر رہے تھے

۔ **لیفٹیننٹ جنرل فہد بن ترکی آل سعود**: وہ سعودی رائل لینڈ فورسز کے اہم کمانڈر تھے اور بعد میں انہیں مشترکہ افواج (Coalition Forces) کا باضابطہ فوجی کمانڈر بھی مقرر کیا گیا

۔ **بریگیڈیئر جنرل احمد عسیری** (فوجی ترجمان اور آپریشنل کوآرڈینیٹر): عسکری محاذ پر میڈیا اور آپریشنل اپ ڈیٹس کے لیے بریگیڈیئر جنرل احمد عسیری اس اتحاد کا سب سے نمایاں چہرہ تھے۔ وہ روزانہ کی بنیاد پر ریاض کے کمانڈ سینٹر سے فوجی کارروائیوں کی تفصیلات اور اسٹریٹجی سامنے لاتے تھے۔

اس آپریشن کا ظاہری مقصد حوثیوں کی پیش قدمی کو روکنا اور صدر ہادی کی عالمی سطح پر تسلیم شدہ حکومت کو دوبارہ قائم کرنا تھا، لیکن یہ جنگ چند ہفتوں کی توقعات کے برعکس ایک طویل المیعاد دلدل میں بدل گئی

اور اس تنازع میں علاقائی طاقتوں کے اپنے اپنے مفادات شامل ہو گئے۔

ایران نے حوثیوں کو اپنے "محورِ مقاومت (Axis of Resistance)" کے حصے کے طور پر دیکھا اور انہیں مالی، سیاسی اور جدید ہتھیاروں (بیلسٹک میزائل اور ڈرون ٹیکنالوجی) کی فراہمی شروع کر دی، جس سے سعودی عرب کو شدید سکیورٹی چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔

دوسری جانب چین نے اپنا منفی یا محض تماشائی کردار ادا کرنے کے بجائے سفارت کاری کا راستہ اختیار کیا۔ مارچ 2023ء میں بیجنگ معاہدے کے ذریعے چین نے سعودی عرب اور ایران کے درمیان تاریخی مصالحت کروائی، جس سے یمن میں عارضی جنگ بندی مستحکم ہوئی اور دونوں ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات کی بحالی سے یمن میں پائیدار امن کی امیدیں پیدا ہوئیں۔
اس جنگ نے نہ صرف یمن اور سعودی عرب کو تباہ کیا بلکہ پورا خطہ اس سے متاثر ہوا۔ یمن انسانی تاریخ کے بدترین بحران کا شکار ہوا جہاں فاقہ کشی اور بیماریاں عام ہو گئیں۔ حوثیوں نے اپنے حملوں کا دائرہ کار بڑھاتے ہوئے سعودی عرب کی تیل کی تنصیبات (مثلاً 2019ء میں آرامکو پر حملہ) اور متحدہ عرب امارات (ابو ظہبی) کو نشانہ بنایا۔ غزہ تنازع کے بعد حوثیوں نے اسرائیل اور اس سے منسلک بین الاقوامی تجارتی جہازوں کو بحیرہ احمر میں نشانہ بنانا شروع کیا۔ اس کے نتیجے میں نہر سویز کی آمدنی گھٹنے سے مصر معاشی طور پر متاثر ہوا، جبکہ امریکہ اور برطانیہ کو بحیرہ احمر کی حفاظت کے لیے اپنی بحری افواج بھیجنی پڑیں، جس نے اس تنازع کو عالمی چیلنج بنا دیا

یمن کی جغرافیائی اہمیت کی سب سے بڑی وجہ باب المندب کی تنگ بحری راہداری ہے، جو بحیرہ احمر کو بحر ہند سے جوڑتی ہے۔ دنیا کی کل بحری تجارت کا تقریباً 12 سے 15 فیصد اور خام تیل کی ایک بڑی مقدار اسی راستے سے گزرتی ہے۔ حوثیوں نے ڈرون اور میزائل حملوں کے ذریعے اس تجارتی راستے کو شدید متاثر کیا۔ تجارتی جہازوں کو ایشیا سے یورپ جانے کے لیے افریقہ کے گرد (Cape of Good Hope) چکر لگا کر لمبا راستہ اختیار کرنا پڑا، جس سے سفر کی مدت میں 10 سے 14 دن کا اضافہ ہوا، مال برداری کے اخراجات (Shipping Costs) بڑھ گئے اور عالمی مارکیٹ میں اشیاء اور توانائی کی قیمتوں میں اضافہ دیکھنے کو ملا۔

حالیہ عرصے میں حوثیوں نے الزام عائد کیا کہ سعودی عرب اور اتحادی فورسز نے یمن پر اقتصادی ناکہ بندی برقرار رکھی ہے اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں کی ادائیگی میں رکاوٹیں ڈال رہے ہیں۔ اس کے ردِ عمل میں حوثیوں نے یمن کے ساحلی اور اسٹریٹجک خطوں (مثلاً مخا اور باب المندب کی بندرگاہوں) پر تیز رفتار پیش قدمی (Lightning Offensive) کی اور مأرب کے تیل سے مالا مال علاقوں کی طرف دباؤ بڑھا دیا۔ اس وقت جنگی محاذ پر حوثیوں کا پلڑا واضح طور پر بھاری نظر آتا ہے؛ کیونکہ انہوں نے نہ صرف زمینی کنٹرول کو مضبوط کر لیا ہے بلکہ باب المندب کے ذریعے عالمی بحری راستوں پر قبضہ اور ناکہ بندی قائم کر کے بین الاقوامی طاقتوں کو معاشی دباؤ میں لا کھڑا کیا ہے

مارچ 2015 میں شروع ہونے والی اس طویل جنگ نے سعودی عرب کی معیشت اور دفاع پر بھاری بوجھ ڈالا ہے اور دفاعی مبصرین اور بین الاقوامی رپورٹس کے مطابق، سعودی عرب کو اس جنگ اور ایران-یمن فرنٹ پر اب تک لگ بھگ 150 ارب ڈالر سے زائد کا مالی نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اس میں فوجی ساز و سامان کی تباہی، پیٹریاٹ میزائل دفاعی نظام کے بھاری اخراجات، اور سعودی تیل کی تنصیبات اور پائپ لائنز پر ہونے والے ڈرون و میزائل حملوں سے ہونے والا نقصان شامل ہے۔ (یمنی حکام کے دعوے اس سے کہیں زیادہ کھربوں ڈالر میں ہیں۔ ان حملوں میں اب تک سینکڑوں سعودی فوجی اور سرحدی علاقوں (جیسے جازان، نجران، اور طائف) میں درجنوں عام شہری ہلاک اور زخمی ہو چکے ہیں۔

حالیہ لڑائی میں سعودی فضائیہ کا ایک جدید ترین F-15SA لڑاکا طیارہ بھی مار گرایا گیا ہے۔ انصار اللہ نے حالیہ برسوں میں اپنی عسکری طاقت اور جغرافیائی اہمیت کے بل بوتے پر عالمی سطح پر ایک اہم پوزیشن حاصل کر لی ہے اور ستمبر 2026 کی تازہ ترین صورتحال کے مطابق، انصار اللہ نے یمن کے مغربی ساحل اور تزویراتی طور پر انتہائی اہم باب المندب (Strait of Bab-el-Mandeb) اور موخا (Mocha) بندرگاہ پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا ہے

عالمی سطح پر اب انہیں محض ایک "باغی گروپ" نہیں بلکہ بحیرہ احمر (Red Sea) کی ایک فیصلہ کن قوت سمجھا جا رہا ہے، جو اسرائیل، امریکہ اور اب سعودی عرب کے بحری جہازوں کی ناکہ بندی کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے عالمی منڈی میں خام تیل کی قیمتیں 100 ڈالر فی بیرل سے تجاوز کر چکی ہیں۔ انصار اللہ اب عالمی سطح پر ایران کے "محورِ مزاحمت" (Axis of Resistance) کے سب سے مضبوط اور متحرک دھڑے کے طور پر ابھرے ہیں

اگست 2026 میں پاکستان، سعودی عرب اور ترکیہ کے درمیان "مکہ مشترکہ دفاعی معاہدہ (Makkah Joint Defence Agreement)" طے پایا ہے، جو نیٹو (NATO) کے آرٹیکل 5 کی طرح ہے، یعنی کسی ایک پر حملہ سب پر حملہ تصور ہو گا۔ اس معاہدے کے تحت وزارتِ دفاع اور دفتر خارجہ نے واضح کیا ہے کہ یہ معاہدہ خالصتاً دفاعی نوعیت کا ہے۔ پاکستان اپنی افواج کو یمن کے اندر کسی جارحانہ کارروائی یا جنگ کے لیے نہیں بھیجے گا۔ تاہم اگر یمن کا تنازع سعودی عرب کی اندرونی سرحدوں میں داخل ہوتا ہے یا ارضِ مقدس (مکہ و مدینہ) کو کوئی براہِ راست خطرہ لاحق ہوتا ہے، تو پاکستان مکہ معاہدے کے تحت سعودی عرب کے دفاع کے لیے "کسی بھی حد تک" جانے اور فوجی امداد فراہم کرنے کا پابند ہے۔

پاکستان نے پہلے ہی سعودی عرب کے دفاع کے لیے اپنے لڑاکا طیارے کنگ عبدالعزیز ایئربیس پر تعینات کر رکھے ہیں پاکستان کا بنیادی مائنڈ سیٹ عسکری محاذ آرائی سے بچنا ہے۔ پاکستان پس پردہ سعودی عرب کا پیغام ایران تک پہنچانے اور اس خطے میں جنگ بندی کے لیے سفارتی کردار ادا کر رہا ہے تاکہ معاملے کو مذاکرات کے ذریعے حل کیا جا سکے

--

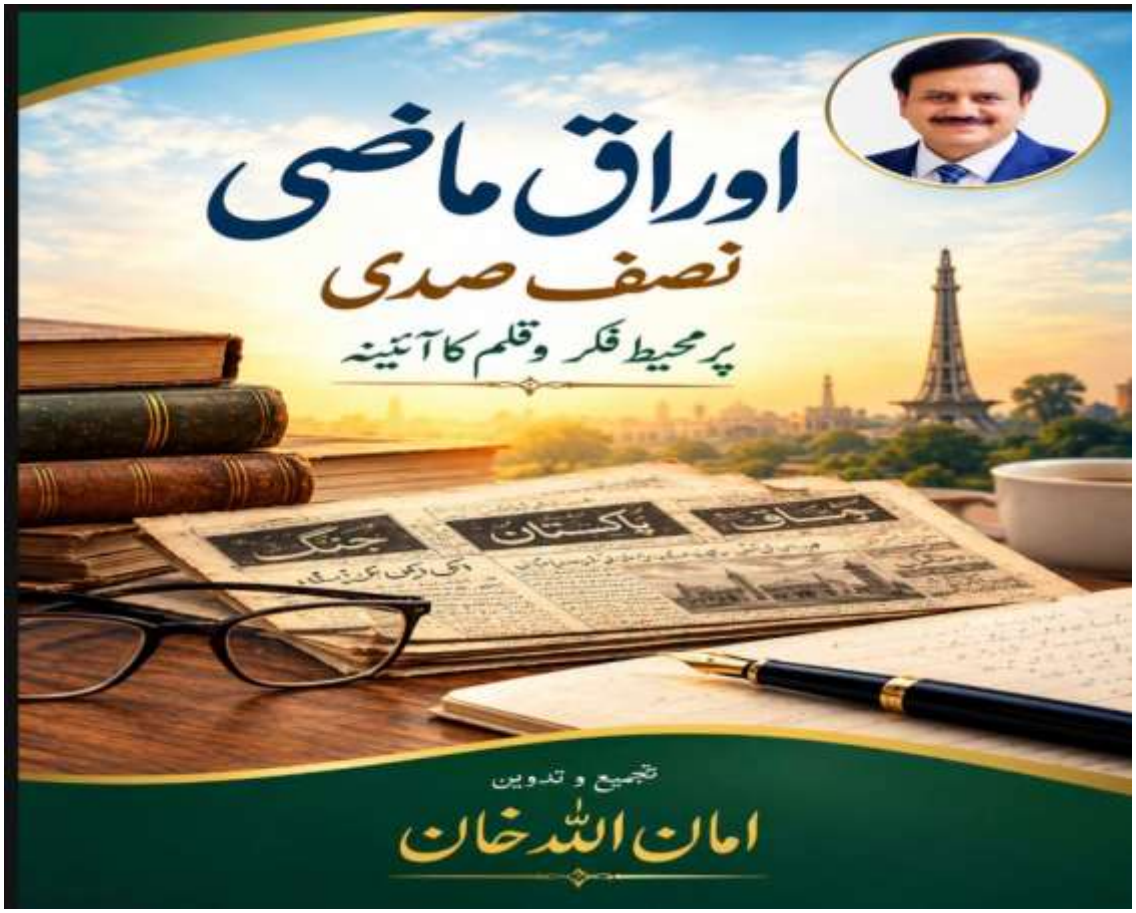

اوراق ماضی 'نصف صدی پر محیط فکر و قلم کا ائینہ

قارئین محترم! دوروز قبل "اخباری تراشوں نے کھولے ماضی کے بند دریچے "لانچ کرتے وقت —(جو میری مختلف نوعیت کی سرگرمیوں کے بارے میں اخبارات میں شائع شدہ خبروں پر مبنی تھی (میں نے ان مضامین کا بھی ذکر کیا تھا جو ان پرانے کاغذات سے نکلے۔ ان اخباری مضامین کے تراشوں کو یکجا کر کے ایک کتابچے کی شکل دے دی گئی ہے۔

یہ میرے 1976ء سے شروع کیے گئے سفر کے ارتقائی عمل کی عکاس بھی ہے۔ فیس بک پر آپ روزانہ کسی نہ کسی موضوع پر میری پوسٹنگ دیکھتے رہتے ہیں، مگر شاید کم ہی احباب کو معلوم ہو کہ یہ سلسلہ کوئی نیا نہیں بلکہ ایک طویل سفر کا تسلسل ہے جس کی جڑیں چار دہائیوں سے زیادہ پرانی ہیں

۔جب میں نے 1976ء میں لکھنے کا سلسلہ شروع کیا تھا، تو اس وقت نہ سوشل میڈیا کا تصور تھا، نہ فوری اظہارِ خیال کی کوئی سہولت۔ اس دور میں کسی موضوع پر اپنی رائے قوم تک پہنچانے کا واحد ذریعہ اخبار ہی ہوا کرتا تھا، اور وہ بھی اس وقت جب ادارتی صفحہ پر جگہ پانا کسی اعزاز سے کم نہ سمجھا جاتا تھا۔ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، روزنامہ پاکستان، وفاق اور سیاست جیسے موقر اخبارات میں شائع ہونے والی یہ تحریریں دراصل ایک نوجوان قلم کار کی اس جستجو کا نتیجہ تھیں جو اپنے معاشرے کے مسائل کو سمجھنے اور ان پر آواز اٹھانے کی خواہش رکھتا تھا

جب میں نے برسوں بعد یہ زرد اور بوسیدہ تراشے دوبارہ ہاتھ میں لیے، تو عجیب سی کیفیت طاری ہوئی۔ کچھ مضامین پڑھ کر ایسا لگا جیسے یہ کل کی بات ہو، اور کچھ پر یہ احساس ہوا کہ وقت نے میری سوچ کو کس قدر جِلا بخشی ہے۔ تعلیم، معاشرت، قومی نظریہ، مذہبی اقدار اور روزمرہ زندگی کے مسائل — یہ سب موضوعات ایسے ہیں جن پر میں نے نوجوانی کے ایام میں بھی قلم اٹھایا اور بعد کے برسوں میں بھی، بلکہ آج بھی فیس بک کی وساطت سے انہی جیسے موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں۔ یہی تسلسل دراصل اس بات کا ثبوت ہے کہ کچھ مسائل معاشرے سے کبھی رخصت نہیں ہوتے، البتہ ان سے نبرد آزما ہونے کا انداز اور فہم وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے

۔اس کتابچے کو مرتب کرنے کا خیال دراصل ایک جذباتی اور تاریخی، دونوں نوعیت کا محرک رکھتا ہے۔ جذباتی اس لحاظ سے کہ یہ میری اپنی فکری زندگی کا ابتدائی نقشِ قدم ہے، اور تاریخی اس لحاظ سے کہ یہ تحریریں پاکستانی معاشرے کے ایک مخصوص دور کی عکاسی کرتی ہیں — وہ دور جب تعلیمی ادارے، صحافت، اور سماجی رویے ایک خاص کروٹ لے رہے تھے۔

میری خواہش ہے کہ یہ تراشے، جو برسوں الماریوں میں دبے رہے، اب ایک مرتب شکل میں محفوظ ہو جائیں تاکہ نہ صرف میرے احباب اور خاندان بلکہ ہر وہ قاری بھی ان سے استفادہ کر سکے جو پاکستانی صحافت اور سماجی فکر کی تاریخ میں دلچسپی رکھتا ہے

۔میں اس موقع پر ان تمام قارئین اور فیس بک احباب کا بھی شکر گزار ہوں جو برسوں سے میری تحریروں کو پڑھتے، سراہتے اور ان پر رائے دیتے رہے ہیں۔ آپ کی یہی پذیرائی ہے جس نے مجھے اس بات پر آمادہ کیا کہ ماضی کے یہ اوراق دوبارہ سے سمیٹے جائیں اور ایک مربوط انداز میں پیش کیے جائیں۔ امید ہے کہ یہ کتابچہ آپ کو نہ صرف ماضی کی سیر کرائے گا بلکہ اس بات کا بھی احساس دلائے گا کہ فکر و قلم کا سفر کبھی رکتا نہیں — بس اس کے اظہار کے وسیلے بدلتے رہتے ہیں۔ تو قارئین محترم حسب سابق اپ کی قیمتی آراء کا انتظار رہے گا

امان اللہ خان

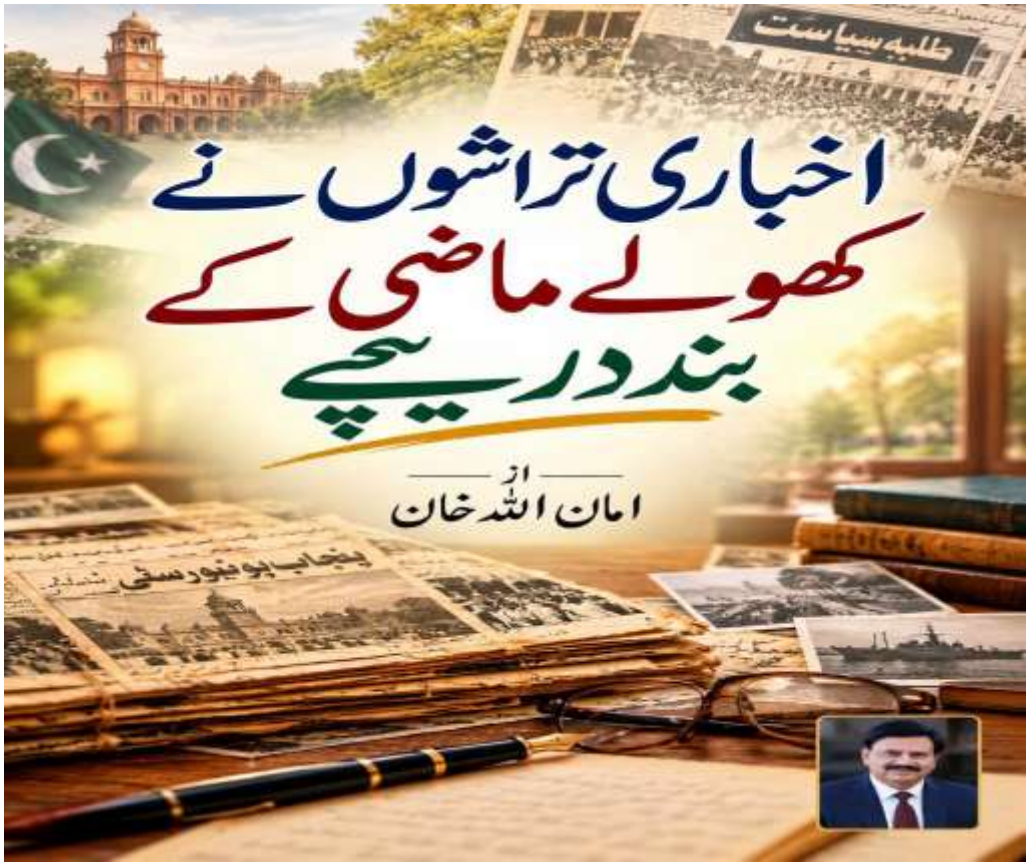

اخباری تراشوں نے کھولے ماضی کے بند دریچے

کچھ عرصہ قبل پرانے کاغزات کی صفائی کرتے دو لفافوں میں بوسیدہ حالت میں پڑے اخباری تراشوں پر نظر پڑی۔۔ تو ذہن نصف صدی پیچھے سے گھومنا شروع ہو گیا۔

پنجاب یونیورسٹی۔ طلبا سیاست۔ بیان بازی اور ہنگامہ خیز لمحات۔ پھر کراچی۔ پاک بحریہ سے ہوتے ہوئے بورے والا وہاڑی بہاول پور ملتان میں بطور انتظامی مجسٹریٹ فرائض منصبی ادا کرتے ہوئے پریس رپورٹنگ اور مختلف تراشے۔ جو وقت کی دھول میں اپنی سیاہی تک چھوڑ چکے تھے۔ کچھ جو حوادث زمانہ اور ماحولیاتی الودگی سے بچ گئے تھے سامنے پڑے تھے (کچھ مضامین کی شکل میں کچھ خبروں کی صورت)

"یہ ماضی کی یادیں ہیں۔ انہں محفوظ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہیں سکین کر کے پی ڈی ایف میں منتقل کر دیں اور تمام مواد دور جدید کے تقاضوں کے مطابق دو انچ کی یو ایس بی میں اجائے گا کسی بچے نے مشورہ دیا"

۔(مشورہ معقول تھااور مشیر کو ہی یہ کام کرنا پڑ)

جب یہ کام مکمل ہوا تو محمد احمد خان بھٹی صاحب کو ارسال کر دیا۔ احمد خان بھٹی ایک بہت بڑا قلمکار ہے اور اس نے ان بوسیدہ تراشوں سے ایک شخصی خاکہ بھی بنالیا۔۔۔اس دوران انہوں نے پوچھا کہ یہ تو صرف لاہور۔(طالب علمی کے دور)اور پھر مجسٹریسی دور کے تراشے ہیں۔باقی اسسٹنٹ کمشنری۔ڈی سی شپ، ہیلتھ پراجیکٹ ہیلتھ فاونڈیشن پنجاب رورل سپورٹ پروگرام اور اور دیگران۔۔۔وہ کہاں؟

جواب کچھ یوں تھا۔۔۔بعد کے دور کے سنبھالے ہی نہیں۔۔کیوں؟؟

وہ احمد فراز نے کہا تھا

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز

دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

تو یہاں بھی کچھ یوں تھا طلباء سیاست اور پھر پہلی پہلی مجسٹریسی۔۔کام کرنے کا عزم بھی تھا۔کتابی علم کو عملی جامہ پہنانے کا موقع بھی تھا(خود نمائی کا لاشعوری جذبہ بھی)۔لہٰذا جو سنبھالنا تھا۔ محفوظ ہے اور بعد میں ضرورت ہی نہیں رہی کہ وقت کی گرد نے خود نمائی کے جذبے کے ساتھ خودی بھی ختم کر دی تھی کہ سروس بھی غلامی کی جدید شکل ہے(

میرے سروس میں سینئر افسر محترم فیاض تحسین صاحب(ادبی حلقوں کا ایک بڑا اور محترم نام)نے پوچھا کہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا تھا ۔میرا جواب یہی تھا کہ

"سول سروس میں اکر قلم بند کر دیا اور پھر ڈنڈا پکڑ لیا اور پھر یہ ڈنڈا ہی پہچان بن کر رہ گیا"

اب میری اپنی پہچان کیا ہے۔۔۔دھونڈ رہا ہوں؟؟

ہہ کتابی شکل دے تو دی ہے۔۔مگر پھر خود غرضی آڑے ارہی ہے۔۔۔۔کہ ڈیجیٹل فارم میں رکھ لی۔

تو میرے محترم قارئین۔۔بس یہی قصہ ہے اس چھوتے سے بلاترتیب مجموعے کا

امان اللہ خان

بحریہ ارچرڈ لاہور

18-9-2026



18 ستمبر-پانی کی نگرانی کا عالمی دن (World Water Monitoring Day) اور پاکستان میں بڑھتے ہوئے خدشات۔

ہر سال 18 ستمبر کو دنیا بھر میں ورلڈ واٹر مانیٹرنگ ڈے (World Water Monitoring Day) یعنی پانی کی نگرانی کا عالمی دن منایا جا

اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد عام شہریوں، اسکولوں اور برادریوں میں پانی کے تحفظ اور اس کی آلودگی کے حوالے سے شعور بیدار کرنا ہے۔ اس دن لوگوں کو اس بات پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ خود اپنے مقامی دریاؤں، جھیلوں اور ندی نالوں کے پانی کی کوالٹی کی بنیادی مانیٹرنگ (جیسے اس کی تیزابیت (pH)، درجہ حرارت، اور آکسیجن کی مقدار کا معائنہ) کریں تاکہ پانی کے ذخائر کو آلودگی سے بچایا جاسکے۔

اس دن کو منانے کا خیال سب سے پہلے امریکہ کی ایک غیر منافع بخش تنظیم امریکاز کلین واٹر فاؤنڈیشن (America's Clean Water Foundation - ACWF) نے پیش کیا تھا۔ اس فاؤنڈیشن کی صدر اور سی ای او روبرٹا سیوتج (Roberta Savage) نے اس عالمی مہم کی بنیاد رکھی۔

پہلی بار یہ دن 2002 میں امریکہ میں قومی سطح پر منایا گیا تھا۔ تاہم، باقاعدہ طور پر اسے ایک بین الاقوامی تعلیمی آؤٹ ریچ پروگرام کے طور پر 2003 میں لانچ کیا گیا، جس کے بعد یہ دنیا بھر میں پھیل گیا۔ شروع میں یہ دن ہر سال 18 اکتوبر کو منایا جاتا تھا۔ یہ تاریخ اس لیے چنی گئی تھی کیونکہ 18 اکتوبر 1972 کو امریکی کانگریس نے پانی کے تحفظ کا مشہور قانون 'کلین واٹر ایکٹ' (Clean Water Act) منظور کیا تھا

بعد میں یہ دیکھا گیا کہ اکتوبر کے مہینے میں دنیا کے کئی سرد ممالک میں درجہ حرارت بہت کم ہو جاتا ہے اور وہاں کے پانی کے ذخائر (ندیاں اور جھیلیں) جمنا شروع ہو جاتی ہیں، جس کی وجہ سے لوگ پانی کی مانیٹرنگ میں حصہ نہیں لے پاتے تھے۔ چنانچہ زیادہ سے زیادہ ممالک اور لوگوں کی شرکت کو یقینی بنانے کے لیے 2007 میں اس دن کی تاریخ مستقل طور پر بدل کر 18 ستمبر کر دی گئی۔

وقت کے ساتھ ساتھ اس دن کی باقاعدہ دیکھ بھال اور انتظام مختلف عالمی اداروں کے پاس رہا۔ 2006 میں اس کی ذمہ داری 'واٹر انوائرمنٹ فیڈریشن (WEF) 'اور 'انٹرنیشنل واٹر ایسوسی ایشن (IWA) 'کو دی گئی۔ 2015 سے اب تک اس عالمی مہم کی نگرانی ارتھ ایکو انٹرنیشنل (EarthEcho International) نامی ماحولیاتی تنظیم کر رہی ہے، جس نے اب اسے ایک وسیع ترپروگرام "EarthEcho Water Challenge" کی شکل دے دی ہے

۔ آج اس مہم کے تحت دنیا کے لگ بھگ 150 ممالک کے لاکھوں لوگ اپنے اپنے علاقوں میں پانی کے معیار کو جانچنے اور اسے صاف رکھنے کا عہد کرتے ہیں۔ ورلڈ واٹر مانیٹرنگ ڈے اور اس کے مقاصد کی اہمیت اب صرف رسمی نہیں رہی، بلکہ یہ ملک کے بقا کے مسائل سے جڑ چکی ہے۔

پاکستان اس وقت دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جو ماحولیاتی تبدیلیوں اور پانی کی شدید کمی (Water Scarcity) کا شکار ہیں۔ پاکستانی تناظر میں اس دن اور اس کے مقاصد کی تکمیل کو مختلف اہم پہلوؤں سے دیکھا جا رہا ہے۔

پاکستان اس وقت "پانی کی کمی کا شکار (Water Stressed) "ملک بن چکا ہے اور ماہرین کے مطابق یہ تیزی سے "پانی کی نایابی (Water Scarce) "کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس دن کے تناظر میں، شہریوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ پانی کی صرف دستیابی ہی نہیں، بلکہ اس کا معیار اور مانیٹرنگ کتنی ضروری ہے تاکہ دستیاب پانی کو ضائع یا زہریلا ہونے سے بچایا جا سکے۔ اس کے علاوہ پاکستان میں پینے کے صاف پانی کا بحران سنگین ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان کی ایک بہت بڑی اکثریت کو پینے کا صاف پانی میسر نہیں، اور ہسپتالوں میں داخل ہونے والے تقریباً 40 سے 50 فیصد مریض پانی سے پیدا ہونے والی بیماریوں (جیسے ہیضہ، ٹائیفائیڈ، اور ہیپاٹائٹس) کا شکار ہوتے ہیں

اس دن کا مقصد (پانی کے معیار کو خود جانچنا) پاکستان کے لیے اس لیے اہم ہے تاکہ مقامی سطح پر آلودہ پانی کی بروقت نشاندہی ہو سکے۔ لاہور، کراچی، اور اسلام آباد جیسے بڑے شہروں میں زیرِ زمین پانی کی سطح تیزی سے نیچے گر رہی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ صنعتی فضلہ اور گٹر کا پانی ندی نالوں (جیسے لاہور میں راوی اور کراچی میں لیاری ندی) میں بغیر ٹریٹمنٹ کے بہایا جا رہا ہے، جس سے زیرِ زمین پانی بھی زہریلا ہو رہا ہے۔

مانیٹرنگ ڈے کے مقاصد پاکستان میں ان صنعتی اداروں اور عوام کو بیدار کرنے کے لیے استعمال کیے جارہے ہیں کہ وہ پانی کے ان ذخائر کو آلودہ نہ کریں۔ حالیہ برسوں میں پاکستان کے مختلف تعلیمی اداروں (یونیورسٹیوں) اور ماحولیاتی تنظیموں (NGOs) نے اس دن کے مقاصد کے تحت نوجوانوں کو متحرک کیا ہے۔ نوجوان مختلف ندیوں اور نہروں سے پانی کے نمونے لے کر ان کا ٹیسٹ کرتے ہیں

حکومتِ پاکستان نے پانی کے بحران سے نمٹنے کے لیے قومی واٹر پالیسی تو بنائی ہے، لیکن اس دن کے اصل مقاصد (یعنی عوام کی سطح پر مانیٹرنگ اور شعور) کی تکمیل اب بھی بہت پیچھے ہے۔ سرکاری سطح پر پانی کی مانیٹرنگ کے لیے 'پاکستان کونسل آف ریسرچ ان واٹر ریسورسز (PCRWR) 'کام تو کر رہی ہے، لیکن وسائل کی کمی کے باعث یہ نگرانی صرف بڑے شہروں تک محدود ہے۔

پاکستان کے تناظر میں اس دن کو صرف ایک "عالمی دن" کے طور پر نہیں، بلکہ ایک وارننگ اور ضرورت کے طور پر دیکھا جارہا ہے۔ جب تک پاکستان کا عام شہری اپنے گھر، گلی اور شہر کے پانی کی نگرانی اور اسے صاف رکھنے کی مہم میں خود حصہ نہیں لے گا، تب تک اس دن کے مقاصد کی حقیقی تکمیل ممکن نہیں ہے۔ پاکستان میں پانی کی مانیٹرنگ اور کوالٹی کو بہتر بنانے کے لیے کئی سرکاری ادارے اور ماحولیاتی ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔ تاہم، حالیہ رپورٹس اور اعداد و شمار ملک میں پانی کی آلودگی کی ایک تشویشناک تصویر پیش کرتے ہیں

پاکستان کونسل آف ریسرچ ان واٹر ریسورسز (PCRWR) وزارتِ آب و بجلی (Ministry of Water Resources) کے تحت کام کرنے والا سب سے اہم ادارہ ہے۔ اس کا بنیادی کام ملک بھر میں پانی کے ذخائر پر تحقیق کرنا، 'نیشنل واٹر کوالٹی مانیٹرنگ پروگرام' چلانا، اور پینے کے پانی کی کوالٹی کی جانچ کرنا ہے۔ اس کا نیٹ ورک پاکستان کے 70 سے زائد شہروں تک پھیل چکا ہے

پاکستان انوائرمنٹل پروٹیکشن ایجنسی (Pak-EPA) وفاقی اور صوبائی سطح پر ماحولیاتی قوانین (جیسے انڈسٹریل ویسٹ کو پانی میں بہانے پر پابندی) کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ یہ ایجنسی پانی کے پلانٹس اور فلٹریشن سسٹمز کی کیمیائی اور بائیولوجیکل مانیٹرنگ کرتی ہے۔

واسا (WASA – Water and Sanitation Agency) لاہور، کراچی (KWSC)، فیصل آباد، اور راولپنڈی جیسے بڑے شہروں میں عوام تک صاف پانی پہنچانے اور سیوریج کے نظام کو مانیٹر کرنے کا بنیادی طور پر ذمہ دار ہے

وزارتِ ماحولیاتی تبدیلی (Ministry of Climate Change) پانی کے بحران کو ماحولیاتی تبدیلیوں اور گلیشیئرز کے پگھلنے کے تناظر میں مانیٹر کرتی ہے تاکہ مستقبل کی حکمتِ عملی بنائی جاسکے

حالیہ سائنسی جائزوں اور PCRWR کی رپورٹس کے مطابق پاکستان کی تقریباً80 فیصد آبادی کسی نہ کسی سطح پر غیر محفوظ یا آلودہ پانی استعمال کرنے پر مجبور ہے۔ دیہی علاقوں میں یہ شرح اور بھی زیادہ ہے۔ علاوہ ازیں پاکستان کے پینے کے پانی میں سب سے بڑا خطرہ بیکٹیریا (Fecal Contamination) ہے، جو سیوریج کا پانی پینے کے پانی کی لائنوں میں مکس ہونے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ زہر آلود کیمیکلز جیسے آرسینک (سنکھیا)، سوڈیم، اور نائٹریٹ کی مقدار بھی پینے کے پانی میں منظور شدہ حد سے کہیں زیادہ پائی گئی ہے

حکومتی ہدایت پر PCRWR کی حالیہ مانیٹرنگ رپورٹ میں مارکیٹ میں دستیاب 29 مشہور بوتلڈ واٹر برانڈز کو انسانی استعمال کے لیے غیر محفوظ قرار دیا گیا ہے۔ ان برانڈز کے پانی میں مہلک کلسٹر بائیولوجیکل جراثیم اور سوڈیم یا ٹی ڈی ایس (TDS) کی مقدار بہت زیادہ پائی گئی۔ پاکستان میں پیدا ہونے والے صنعتی اور شہری فاضل پانی (Wastewater) کا 90 فیصد سے زائد حصہ بغیر کسی ٹریٹمنٹ یا صفائی کے براہِ راست دریاؤں، نہروں اور سمندر میں بہا دیا جاتا ہے، جو ورلڈ واٹر مانیٹرنگ ڈے کے بنیادی قوانین کی کھلی خلاف ورزی ہے

۔ سرکاری ادارے جیسے PCRWR اپنے تئیں لیبارٹری ٹیسٹنگ تو کر رہے ہیں، لیکن پاکستان میں مانیٹرنگ ڈے کا اصل مقصد یعنی "عوام کا خود اپنے پانی کی نگرانی کرنا" ابھی تک کمزور ہے۔ جب تک عام شہری اور بلدیاتی ادارے مل کر پانی کی لائنوں کی لیکیج اور آلودگی کی مانیٹرنگ نہیں کریں گے، تب تک پینے کے صاف پانی کی فراہمی ممکن نہیں ہو سکتی

۔پانی کے معیار کو بنیادی طور پر پرکھنے کے لیے مارکیٹ میں سستی ٹی ڈی ایس (TDS) میٹرز اور پی ایچ (pH) سٹرپس دستیاب ہیں جن سے پانی میں نمکیات اور تیزابیت کی مقدار سیکنڈوں میں معلوم ہو جاتی ہے، جبکہ پانی کی بو، رنگت یا ذائقے میں تبدیلی بھی آلودگی کی واضح علامت ہے۔ پینے کے پانی کو جراثیم سے پاک کرنے کا سب سے پرانا اور موثر طریقہ اسے 20 منٹ تک ابالنا ہے، لیکن اگر پانی میں کیمیائی آلودگی یا مٹی زیادہ ہو تو گھروں میں ریورس اوسموسس (RO) فلٹر یا ایکٹیویٹڈ کاربن فلٹرز کا استعمال لازمی کرنا چاہیے تاکہ آرسینک اور بھاری دھاتوں کا خاتمہ ممکن ہو سکے



17 ستمبر-عالمی یومِ تحفظِ مریض پاکستان کے تناظر میں

عالمی یومِ تحفظِ مریض (World Patient Safety Day) ہر سال 17 ستمبر کو دنیا بھر میں منایا جاتا ہے۔
اور اس دن کو منانے کا خیال عالمی ادارہ صحت (WHO) اور اس کے رکن ممالک کو طبی دنیا کی بڑھتی ہوئی پیچیدگیوں اور ہسپتالوں میں ہونے والی غیر ارادی غلطیوں کے سبب آیا۔
تحقیقات سے یہ ہولناک حقیقت سامنے آئی کہ دنیا بھر میں ہسپتالوں کے اندر ہر 10 میں سے 1 مریض کسی نہ کسی غیر ارادی غلطی یا غفلت (جیسے غلط دوا، غلط تشخیص یا انفیکشن) کی وجہ سے نقصان اٹھاتا ہے۔ کم اور درمیانی آمدنی والے ممالک میں اس کے نتیجے میں سالانہ 26 لاکھ اموات ہوتی ہیں۔
ماہرین کا ماننا تھا کہ ان نقصانات میں سے 50 فیصد سے زائد ایسے تھے جن سے تھوڑی سی احتیاط اور بہتر نظام کے ذریعے بچا جا سکتا تھا۔
لہزہ اس پر غور و فکر شروع ہوئی اور ابتدائی عالمی وزارتی کانفرنسوں کا سلسلہ برطانیہ (لندن، 2016ء) اور جرمنی (بون، 2017ء) میں شروع ہو گیا پھر مئی 2019ء میں ہونے والی ہیلتھ اسمبلی میں ایک اہم قرارداد (action on patient safety")
منظور کی گئی
۔اس قرارداد کے تحت 17 ستمبر کو باقاعدہ طور پر ڈبلیو ایچ او کا آفیشل ہیلتھ ڈے قرار دیا گیا، تاکہ پوری دنیا میں مریضوں کی حفاظت کے متعلق عوامی شعور کو اجاگر کیا جا سکے اور صحت کے نظام کو محفوظ بنایا جا سکے ۔
اس کا بنیادی خیال طب کے قدیم ترین اور بنیادی اصول
"سب سے پہلے، مریض کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ (First, do no harm) " پر مبنی ہے

اقوام متحدہ اس دن کے حوالے سے ہر سال ایک THEME دیتا ہے تا کہ اس سال ان بیماریون کو ٹارگٹ کیا جائے۔ سال 2026ء کا تھیم") غیر متعدی بیماریوں کے لیے محفوظ دیکھ بھال (" قرار دیا گیا ہے

۔ان میں خاص طور پر غیر متعدی بیماریوں (NCDs) جیسے کہ دل کے امراض، کینسر، ذیابیطس (شوگر)، اور دمہ کو ہدف بنایا گیا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ بیماریاں طویل مدتی ہوتی ہیں اور مریضوں کو عمر بھر بار بار ہسپتالوں، ڈاکٹروں اور مختلف ادویات سے واسطہ پڑتا ہے ۔بار بار کے اس رابطے کی وجہ سے ان مریضوں میں غلط علاج، غلط ادویات یا دیکھ بھال میں ہم آہنگی کی کمی کے باعث نقصان اٹھانے کا خطرہ بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے ۔اس لیے 2026ء کی مہم کے ذریعے یہ پیغام دیا جا رہا ہے کہ ان دائمی مریضوں کو ہر مرحلے پر محفوظ علاج فراہم کیا جائے۔

اس عالمی دن کی مناسبت سے دنیا بھر کی مشہور یادگاروں اور عمارتوں کو نارنجی (Orange) رنگ کی روشنیوں سے منور کیا جاتا ہے، جو مریضوں کے تحفظ کے لیے یکجہتی کی علامت ہے۔

یہ سلوگن کہ

"زندگی کے لیے محفوظ دیکھ بھال"!

عالمی یومِ تحفظِ مریض حکومتوں، شراکت داروں اور برادریوں کو ایک جگہ جمع کرتا ہے تا کہ مریضوں کی سلامتی پر توجہ مرکوز کی جاسکے اور صحت کی دیکھ بھال میں قابلِ تلافی / قابلِ بچاؤ نقصانات کو کم کرنے کے لیے اقدامات کو تیز کیا جاسکے۔ بنیادی صحت (Primary Health Care) کے ذریعے ہیلتھ سسٹم کو مضبوط بنانا اور ان عوامل کا مقابلہ کرنا ضروری ہے جو نقصان کے خطرے کو بڑھاتے ہیں۔ یہ مہم ان لوگوں کی عملی شمولیت کی اہمیت پر بھی زور دیتی ہے جو ان بیماریوں کا سامنا کر رہے ہیں، تا کہ وہ خدمات کی منصوبہ بندی اور اپنے علاج میں خود شامل ہو سکیں

۔اس سلسلے میں، عالمی ادارہ صحت (WHO) نے مارچ 2026 کے اوائل میں ایک ورکنگ گروپ کا اجلاس طلب کیا جس میں تمام ڈبلیو ایچ او ریجنز کے 12 ماہرین نے شرکت کی۔ اہم نکات میں یہ بات شامل تھی کہ غیر متعدی بیماریوں میں مبتلا افراد کو محض "مریض" کے بجائے "شراکت دار" سمجھا جائے اور محفوظ دیکھ بھال کو صرف ہسپتالوں تک محدود رکھنے کے بجائے روزمرہ کی زندگی سے جوڑا جائے

۔عالمی یومِ تحفظِ مریض 2026 کے مقاصد یہ ہیں

1۔: آگاہی میں اضافہ: بنیادی صحت کے نظام کے ذریعے غیر متعدی بیماریوں کے علاج میں پیش آنے والے سلامتی کے چیلنجز پر عالمی سطح پر آگاہی پیدا کرنا

2۔۔ مریضوں کی شمولیت: بیماریوں کا شکار افراد اور برادریوں کو خطرات کی نشاندہی اور حل کی تلاش میں ڈاکٹروں اور پالیسی سازوں کے ساتھ فعال طور پر شامل کرنا

3۔پالیسی میں ادخال: تمام متعلقہ اداروں کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ مریضوں کی سلامتی کے اصولوں کو قومی پالیسیوں، قوانین اور پروگراموں کا حصہ بنائیں

4۔طبی عملے کی معاونت: ہیلتھ ورکرز کی مدد کرنا تاکہ وہ محفوظ تشخیص، ادویات کے محفوظ استعمال اور مریضوں کے ساتھ بہتر تعاون کو یقینی بنا سکیں

۔17 ستمبر 2026 کے موقع پر دنیا بھر میں آگاہی مہمات، سیمینارز اور مختلف سرگرمیاں منعقد کی جائیں گی۔ اس دن دنیا بھر کی مشہور عمارتوں کو نارنجی (Orange) روشنی سے منور کیا جائے گا جو مریضوں کی سلامتی سے یکجہتی کا نشان ہے

پاکستان میں غیر متعدی بیماریاں (NCDs) جیسے کہ ذیابیطس، بلڈ پریشر، دل کے امراض، کینسر اور سانس کی بیماریاں صحت کے شعبے پر شدید بوجھ ڈال رہی ہیں۔ پاکستان میں کل اموات کا تقریباً 60٪ سے زائد حصہ غیر متعدی بیماریوں کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پاکستان دنیا میں ذیابیطس کے مریضوں کی تعداد کے لحاظ سے سب سے بڑے ممالک میں شمار ہوتا ہے۔ علاج کے دوران سلامتی کے چیلنجز میں غلط یا تاخیر سے تشخیص شامل ہے بنیادی مراکزِ صحت (BHUs/RHCs) میں جدید آلات اور ماہرین کی کمی کی وجہ سے بیماریوں کی بروقت تشخیص نہیں ہو پاتی۔ مریضوں میں خود سے دوا لینے (Self-medication) اور جعلی یا غیر معیاری ادویات کے استعمال سے مریضوں کی سلامتی کو سخت خطرات لاحق رہتے ہیں۔ پاکستان میں پرائمری ہیلتھ کیئر کا مربوط نظام کمزور ہونے کی وجہ سے مریض اکثر ہسپتالوں کے درمیان مسلسل علاج سے محروم ہو جاتے ہیں

۔پاکستان کے لیے اہم اقدامات جس میں: پرائمری ہیلتھ کیئر کی مضبوطی ، دیہی اور بنیادی مراکزِ صحت پر غیر متعدی بیماریوں کی سکریننگ اور ادویات کی مسلسل فراہمی کو یقینی بنانا۔ قومی پالیسی میں شامل کرنا ضروری ہے

۔ "پاکستانی ہیلتھ کیئر کمیشنز" (مثلاً پنجاب ہیلتھ کیئر کمیشن وغیرہ) کے ذریعے تمام سرکاری و نجی ہسپتالوں میں Patient Safety Protocols کا لازمی نفاذ۔ اور عوام میں یہ شعور اجاگر کرنا کہ بلڈ پریشر اور شوگر کی ادویات کو باقاعدگی سے لینا اور طبی مشورے پر عمل کرنا زندگی کی سلامتی کے لیے ضروری ہے۔۔



16 ستمبر—عالمی یومِ تحفظِ اوزون: انسان نے آسمان کا زخمی حصار کیسے بچایا؟ اوزون کی تہہ کیا ہے اور خطرہ کہاں سے آیا۔۔ پاکستان کا ماحولیاتی الودگی ختم کرنے میں کردار؟؟

(قارئین محترم اس دن کے حوالے سے بات کرنے سے قبل اوزون کے بارے میں جاننا ضروری ہے جو میرے بہت سے قارئین کے نقطہ نظر سے اہم ہو گا)

اوزون (O_3) فضا کے اوپری حصے یعنی Stratosphere میں موجود ایک قدرتی حفاظتی تہہ ہے جو سورج کی خطرناک بالائے بنفشی شعاعوں (UV-B) کی بڑی مقدار کو زمین تک پہنچنے سے روکتی ہے۔ 1970 کی دہائی میں سائنس دانوں نے خبردار کیا کہ انسان کی بنائی ہوئی Chlorofluorocarbons (CFCs)، جو ریفریجریٹرز، ایئر کنڈیشنرز، ایروسول اسپرے اور بعض صنعتی مصنوعات میں استعمال ہوتی تھیں، اوزون کے سالمات کو تباہ کر رہی ہیں۔

1974 میں سائنس دان Sherwood Rowland اور Mario Molina نے CFCs کے اس خطرے کی نشاندہی کی؛ بعد میں Paul Crutzen کی تحقیق نے بھی فضا میں اوزون کی کیمسٹری کو سمجھنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

اوزون کے خطرے کی سنگینی 1985 میں اس وقت پوری دنیا کے سامنے آئی جب British Antarctic Survey کے سائنس دانوں نے انٹارکٹیکا کے اوپر ہر موسمِ بہار میں بڑے پیمانے پر اوزون کی کمی، یعنی "Ozone Hole" ، کی نشاندہی کی۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر CFCs اور دیگر Ozone-Depleting Substances (ODSs) کا استعمال جاری رہا تو انسانی صحت، زراعت، سمندری حیات اور پورے ماحولیاتی نظام کو خطرناک UV شعاعوں کا سامنا بڑھ سکتا تھا۔ اسی بڑھتے ہوئے خطرے نے عالمی سطح پر مشترکہ کارروائی کی بنیاد رکھی۔

یہ سوال کہ اس دن کو منانے کا خیال کس کو آیا اور عالمی معاہدہ کیسے بنا؟ یہ کسی ایک شخص کا ایجاد کردہ "عالمی دن" نہیں تھا بلکہ سائنسی تحقیق سے پیدا ہونے والی عالمی تشویش کا نتیجہ تھا

۔1985 میں Vienna Convention for the Protection of the Ozone Layer نے بین الاقوامی تعاون کا فریم ورک فراہم کیا، جبکہ اس کے بعد 16 ستمبر 1987 کو کینیڈا کے شہر Montreal میں Montreal Protocol منظور کیا گیا، جس کا مقصد CFCs ، Halons اور دیگر اوزون تباہ کرنے والے کیمیکلز کی پیداوار اور استعمال کو مرحلہ وار ختم کرنا تھا۔ یہ معاہدہ 1 جنوری 1989 کو نافذ ہوا۔

اسی 16 ستمبر 1987 کی تاریخی تاریخ کو یاد رکھنے اور دنیا کو اوزون کے تحفظ کے لیے مسلسل متحرک رکھنے کے لیے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 19 دسمبر 1994 کو قرارداد 49/114 کے ذریعے 16 ستمبر کو

International Day for the Preservation of the Ozone Layer

قرار دیا اور فیصلہ کیا کہ اس کا باقاعدہ عالمی مشاہدہ 1995 سے شروع ہو گا لہٰذا پہلا عالمی یومِ اوزون 16 ستمبر 1995 کو منایا گیا۔

مونٹریال پروٹوکول کو دنیا کے تمام 198 ممالک / پارٹیز نے قبول کیا ہے اور 16 ستمبر کا دن اسی عالمی معاہدے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

2009 میں Vienna Convention اور Montreal Protocol اقوام متحدہ کے پہلے ایسے ماحولیاتی معاہدے بن گئے جنہیں عالمی سطح پر universal ratification حاصل ہوئی۔ مختلف ممالک میں اس موقع پر اسکولوں اور جامعات میں آگاہی پروگرام، سیمینارز، سائنسی نمائشیں، سرکاری مہمات، صنعت کے لیے تربیتی پروگرام اور ODS-free/energy-efficient cooling کے حوالے سے سرگرمیاں منعقد ہوتی ہیں

اس دن کے منانے اور عالمی توجہ کا حیرت انگیز نتیجہ نکلا ہے۔ دنیا نے صرف تقریریں نہیں کیں بلکہ CFCs اور دوسرے ODSs کے استعمال کو بڑے پیمانے پر ختم کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اوزون کی تہہ اب بحالی کی راہ پر ہے۔

موجودہ سائنسی جائزوں کے مطابق اگر Montreal Protocol پر مسلسل عمل ہوتا رہا تو اوزون کی مقدار تقریباً 2040 تک 60 °N سے 60 °S کے درمیانی عالمی خطے میں، 2045 کے قریب Arctic اور تقریباً 2066 میں Antarctic میں 1980 کی سطح تک واپس آنے کی توقع ہے۔ 2024 کا Antarctic ozone hole بھی حالیہ برسوں کے مقابلے میں نسبتاً چھوٹا تھا، جبکہ 2025 کا hole 1992 کے بعد پانچواں سب سے چھوٹا ریکارڈ ہوا۔

لیکن پھر یہ سوال بھی اہم ہے کہ کیا اوزون بچنے سے موسمیاتی تبدیلی بھی ختم ہو گئی

؟

نہیں — یہاں ایک اہم فرق سمجھنا ضروری ہے۔ اوزون کی تباہی اور Climate Change دو الگ مگر باہم جڑے ہوئے مسائل ہیں۔ بہت سے CFCs خود بھی انتہائی طاقتور greenhouse gases تھے۔ Montreal Protocol نے ان کے اخراج کو روک کر موسمیاتی تبدیلی کو بھی نمایاں طور پر سست کیا۔ UNEP کے مطابق 1990 سے 2010 کے دوران اوزون کے تحفظ کی کارروائیوں نے تقریباً 135 ارب ٹن CO_2-equivalent emissions سے بچاؤ کیا۔ مزید برآں 2016 کا Kigali Amendment HFCs کو مرحلہ وار کم کرنے کے لیے بنایا گیا، کیونکہ HFCs اوزون کو نقصان نہیں پہنچاتے لیکن بہت طاقتور greenhouse gases ہیں۔ مکمل عمل درآمد کی صورت میں Kigali Amendment اکیلا اس صدی کے آخر تک تقریباً 0.5 °C تک عالمی warming سے بچا سکتا ہے، اور توانائی کی بچت والی cooling کے ساتھ فائدہ مزید بڑھ سکتا ہے۔

یہاں ایک عام غلط فہمی دور کرنا ضروری ہے Ozone Hole : کسی مخصوص ملک کو "Red Zone" قرار نہیں دیتا۔ سب سے شدید اور مستقل موسمی اوزون depletion Antarctica کے اوپر ہوتی ہے، یعنی جنوبی قطبی خطے میں؛ بعض برسوں میں اس کا اثر جنوبی نصف کرہ کے قریبی علاقوں تک بھی پھیل سکتا ہے۔ Arctic میں بھی بعض انتہائی سرد موسموں میں شدید ozone depletion ہو سکتی ہے، لیکن Arctic کی صورتحال Antarctic کے مقابلے میں زیادہ متغیر ہے۔ 2026 کی تازہ سائنسی assessment ابھی مکمل ہونے کے مرحلے میں ہے، جبکہ 2025 کی WMO رپورٹ نے مجموعی recovery trend کی تصدیق کی تھی۔

اس لیےAustralia، New Zealand، Chile، Argentinaوغیرہ کے جنوبی حصے جغرافیائی طور پر Antarctic ozone holeکے نسبتاً قریب ہونے کی وجہ سے UV exposure کے اعتبار سے زیادہ حساس خطوں میں شمار ہوتے ہیں؛ لیکن انہیں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ مستقل "ozone red zone countries" ہیں۔ اصل "red zone" موسمی طور پر Antarctic ozone hole کا علاقہ ہے

پاکستان نے 18 دسمبر 1992 کو Vienna Convention اور Montreal Protocol میں شمولیت اختیار کی اور بعد میں اس کے اہم amendments بھی قبول کیے۔ سب سے تازہ اہم پیش رفت یہ ہے کہ پاکستان نے 22 اکتوبر 2025 کو Kigali Amendment کی بھی توثیق (ratification) کر دی۔ پاکستان میں اس معاہدے کا قومی focal point Ministry of Climate Change and Environmental Coordination کا National Ozone Unit ہے۔ پاکستان کے لیے اصل چیلنج اب صرف CFCs کا خاتمہ نہیں بلکہ refrigeration اور air-conditioning کے تیزی سے بڑھتے ہوئے شعبے کو climate-friendly بنانا ہے۔ ہمارے جیسے گرم ملک میں ACs ، refrigeratorsاور cooling systems کی طلب بڑھ رہی ہے؛ اس لیے HFCs کے phase-down کے ساتھ توانائی بچانے والی، کم-GWP refrigerants استعمال کرنے والی cooling technology ، technicians کی تربیت، پرانے equipment کی مناسب recovery/recycling اور غیر معیاری refrigerants کی روک تھام نہایت اہم ہیں۔

اس کے علاوہ روایتی ایندھن (جیسے کوئلہ، تیل اور گیس) کے مقابلے میں سولر انرجی (شمسی توانائی) کا استعمال کلائمیٹ (آب و ہوا) کے لیے انتہائی فائدہ مند ہے۔ یہ زمین پر بڑھتی ہوئی تپش (گلوبل وارمنگ) اور ماحولیاتی آلودگی کو کم کرنے کا ایک بہترین حل ہے۔ کیونکہ سولر انرجی گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں کمی کا باعث بنتی ہے اور بجلی بنانے کے لیے جب کوئلہ یا گیس جلائی جاتی ہے، تو بڑی مقدار میں کاربن ڈائی آکسائیڈ (CO_2) اور دیگر زہریلی گیسیں پیدا ہوتی ہیں جو ماحول کو گرم کرتی ہیں۔ جبکہ سولر پینلز سورج کی روشنی سے بالکل صاف اور بغیر کسی دھویں کے بجلی بناتے ہیں، جس سے کاربن کا اخراج نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے۔ نیز روایتی پاور پلانٹس سے نکلنے والا دھواں فضا میں اسموگ اور زہریلے ذرات پھیلاتا ہے، جو پھیپھڑوں اور دل کی بیماریوں کا سبب بنتا ہے۔ جبکہ سولر انرجی کے استعمال سے ہوا صاف رہتی ہے، جس سے انسانی صحت اور کلائمیٹ دونوں پر مثبت اثر پڑتا ہے۔ روایتی بجلی گھروں (تھرمل اور نیوکلیئر پاور پلانٹس) کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے کروڑوں گیلن پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ سولر پینلز کو بجلی بنانے کے لیے پانی کی بالکل ضرورت نہیں ہوتی، جس سے پانی کے قیمتی ذخائر محفوظ رہتے ہیں۔

پاکستان میں حالیہ برسوں کے دوران عوام کی سطح پر سولر انرجی (شمسی توانائی) کو اپنانے کے رجحان میں ریکارڈ اضافہ ہوا ہے، جس نے ملکی توانائی کے نظام کو یکسر بدل دیا ہے۔ مختلف تحقیقی رپورٹس کے مطابق، سال 2026 تک پاکستان میں عوام اور صنعتوں کی جانب سے لگائے گئے نیٹ میٹرڈ اور آف گرڈ سولر سسٹمز کی کل صلاحیت 20,000 میگاواٹ (20 گیگاواٹ) سے تجاوز کر چکی ہے۔ جہاں تک نیشنل گرڈ (سرکاری بجلی کے نظام) کا تعلق ہے، تو صرف باقاعدہ رجسٹرڈ نیٹ میٹرنگ (Net Metering) کے ذریعے عوام نے تقریباً 7,000 میگاواٹ (7 گیگاواٹ) سے زائد بجلی گرڈ اسٹیشنز کو سالانہ بنیادوں پر فراہم کرنا شروع کر دی ہے۔ اس بڑے نیٹ ورک کی بدولت ملک کی کُل بجلی کی طلب کا تقریباً 20 فیصد حصہ شمسی توانائی سے پورا ہو رہا ہے، جو کہ پاکستان کی معاشی تاریخ میں ایک تاریخی سنگِ میل ہے۔ مگر عوام کو حکومت سے شکایت ہے کہ سولر کی عوام دشمن پالیسیاں عوام میں بے چینی پیدا کر رہی ہیں

اور لوگ سولر سسٹم میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ کر رہے ہیں

۔حالانکہ ماحولیاتی اور کلائمیٹ تبدیلی کے نقطہ نظر سے، سولر کا یہ انقلاب پاکستان کے لیے ایک بہت بڑا پلس پوائنٹ ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی جانب سے گھروں پر بجلی پیدا کرنے سے ملک میں بجلی گھروں کے لیے درآمد کیے جانے والے مہنگے اور آلودہ تیل (فرنس آئل) اور ایل این جی (LNG) پر انحصار نمایاں طور پر کم ہوا ہے۔ گرین ہاؤس گیسوں کے اخراج میں اس کمی کی وجہ سے پاکستان کو سالانہ لاکھوں ٹن کاربن ڈائی آکسائیڈ فضا میں چھوڑنے سے نجات مل رہی ہے، جو کہ گلوبل وارمنگ کو روکنے میں مددگار ہے۔ مزید برآں، فوسل فیول (تیل و کوئلہ) جلانے میں کمی کے باعث بڑے شہروں میں زہریلے دھویں اور اسموگ (Smog) کے شدید مسائل پر قابو پانے کے لیے یہ ایک ٹھوس ماحولیاتی پیش رفت ہے، جس سے پاکستان کے کلائمیٹ کو بہتر اور ہوا کو صاف بنانے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

۔16 ستمبر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ ماحولیاتی بحران ناقابلِ حل نہیں ہوتے، بشرطیکہ سائنس کو سیاست پر فوقیت، عالمی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح اور معاہدوں کو عملی اقدامات میں تبدیل کیا جائے۔

دنیا نے اوزون کے بحران میں یہ کر دکھایا؛

اسی لیے آج اوزون کی تہہ تباہی کی طرف نہیں بلکہ بحالی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

لیکن Climate Change کے معاملے میں کامیابی ابھی حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ گرمی، heatwaves، گلیشیئرز کا پگھلنا، پانی کی کمی اور extreme weather ہمیں بتاتے ہیں کہ Montreal Protocol کی کامیابی کو Paris Agreement اور Kigali Amendment جیسے وسیع تر climate actions تک لے جانا ہو گا

-

پاکستان کے لیے پیغام بھی واضح ہے: ہم اوزون کے تحفظ کے عالمی سفر میں پیچھے نہیں، لیکن climate resilience کے میدان میں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ اگر پاکستان Kigali Amendment کو مؤثر طور پر نافذ کرتے ہوئے energy-efficient cooling، solar-powered cooling، بہتر building standards اور refrigerant management کو فروغ دے تو یہ بیک وقت اوزون، آب و ہوا، بجلی کے نظام اور عوامی صحت کے لیے فائدہ مند ہو گا

-

16 ستمبر کا اصل پیغام شاید یہی ہے: "انسان نے آسمان کا زخمی حصار بچانے کی صلاحیت ثابت کر دی ہے؛ اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنی زمین کا بدلتا ہوا موسم بھی بچا سکے گا؟ "



15 ستمبر—عالمی یومِ جمہوریت: تصور سے عالمی دن تک--

پاکستان میں جمہوریت؟؟(کہتی ہے خلق خدا غائبانہ کیا؟

ہر سال 15 ستمبر کو "عالمی یومِ جمہوریت (International Day of Democracy) "منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد صرف جمہوریت کا جشن منانا نہیں بلکہ دنیا بھر میں یہ جائزہ لینا ہے کہ عوام کی حکمرانی، آزادانہ سیاسی شرکت، بنیادی حقوق، آزادیِ اظہار، قانون کی حکمرانی، شفاف انتخابات اور جواب دہی جیسے جمہوری اصول کس حد تک عملی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ اقوامِ متحدہ کے مطابق یہ دن جمہوریت کی صورتحال کا جائزہ لینے اور اسے مضبوط بنانے کی کوششوں کو اجاگر کرنے کا موقع ہے۔

اس دن کے تصور کے پیچھے بنیادی کردار Inter-Parliamentary Union (IPU) کا تھا، جو دنیا کی پارلیمانوں کا عالمی ادارہ ہے۔ اس عمل کی ایک اہم بنیاد 16 ستمبر 1997 کو قاہرہ میں IPU کی جانب سے Universal Declaration on Democracy کی منظوری تھی۔ اس اعلامیے میں جمہوریت کو آزادی، مساوات، شفافیت، ذمہ داری اور عوام کی شرکت پر مبنی ایک عالمی قدر قرار دیا گیا۔

15 ستمبر کا انتخاب بھی اسی تاریخی پس منظر سے وابستہ ہے۔ 1997 کے اعلامیے کے تقریباً ایک دہائی بعد 8 نومبر 2007 کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اتفاقِ رائے سے قرارداد منظور کر کے 15 ستمبر کو International Day of Democracy قرار دیا۔ قرارداد میں حکومتوں پر زور دیا گیا کہ وہ جمہوریت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیے قومی پروگرام بنائیں اور عوام میں جمہوری شعور پیدا کریں۔

2008 میں پہلی مرتبہ یہ دن باقاعدہ طور پر منایا گیا۔ اس عالمی دن کا مقصد یہ احساس پیدا کرنا تھا کہ

"جمہوریت صرف ووٹ ڈالنے یا حکومت منتخب کرنے کا نام نہیں "

بلکہ عوام کو فیصلہ سازی میں مؤثر شرکت، سیاسی و شہری آزادیوں، مساوات، انسانی حقوق، آزاد میڈیا، قانون کی بالادستی اور حکمرانوں کے احتساب کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اقوامِ متحدہ کی قرارداد نے یہ بھی واضح کیا کہ دنیا میں جمہوریت کا کوئی ایک ہی "ماڈل" نہیں؛ مختلف معاشرے اپنی تاریخی، سیاسی اور ثقافتی خصوصیات کے مطابق جمہوری نظام تشکیل دے سکتے ہیں، بشرطیکہ بنیادی عالمی اصولوں کا احترام کیا جائے۔

یہاں اس دن کا سب سے اہم اور شاید سب سے تلخ سوال پیدا ہوتا ہے

کیا جمہوریت اپنے مطلوبہ مقاصد تک پہنچ چکی ہے؟

جواب مکمل طور پر "ہاں" میں نہیں دیا جا سکتا۔ دنیا کے بہت سے ممالک میں باقاعدہ انتخابات تو ہوتے ہیں، لیکن انتخابات کی شفافیت، سیاسی مخالفین کے حقوق، آزادیِ اظہار، آزاد عدلیہ، میڈیا کی آزادی، اقلیتوں اور کمزور طبقات کی مؤثر نمائندگی اور حکمرانوں کی جواب دہی اب بھی بڑے چیلنج ہیں۔ خود IPU اس دن کو دنیا میں جمہوریت کی حالت کا جائزہ لینے کا موقع قرار دیتا ہے۔ اس اعتبار سے 15 ستمبر جشن سے زیادہ احتساب اور خود احتسابی کا دن ہے۔

اس دن کو منانے کے لئے کوئی ایک لازمی عالمی طریقۂ کار نہیں۔ مختلف ممالک میں پارلیمانی مباحث، سیمینارز، کانفرنسیں، عوامی آگاہی پروگرام، نوجوانوں کے لیے ورکشاپس، اسکول و یونیورسٹی مباحثے، سول سوسائٹی کے پروگرام، میڈیا مباحث، نمائشیں اور عوامی مکالمے منعقد کیے جاتے ہیں۔ IPU کے مطابق دنیا بھر کی پارلیمانوں نے فوٹو مقابلوں، بچوں کی ورکشاپس، براہِ راست ٹیلی وژن مباحثوں، ریڈیو پروگراموں اور سول سوسائٹی سے ملاقاتوں سمیت مختلف سرگرمیوں کے ذریعے اس دن کو اجاگر کیا ہے۔

پاکستان کے لیے 15 ستمبر کی اہمیت غیر معمولی ہے، کیونکہ پاکستان کی تخلیق بھی ایک سیاسی و جمہوری جدوجہد کے نتیجے میں ہوئی۔ 1973 کا آئین پارلیمانی جمہوریت، بنیادی حقوق اور عوام کے منتخب نمائندوں کے ذریعے ریاستی اختیار کے تصور کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔ پاکستانی ریاستی بیانیے میں بھی جمہوریت کو عوامی شرکت، مساوات، سماجی انصاف، قانون کی حکمرانی اور بنیادی حقوق کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔

لیکن پاکستان میں 15 ستمبر کو محض تقاریر اور سیمینارز تک محدود رکھنے کے بجائے اسے قومی خود احتسابی کا دن بنانا زیادہ بامعنی ہو گا۔ ہمیں یہ سوال اٹھانا چاہیے کہ کیا انتخابات واقعی آزاد، منصفانہ اور شفاف ہیں؟ کیا پارلیمان مؤثر اور خود مختار ہے؟ کیا اختلافِ رائے کو جمہوریت کا لازمی حصہ سمجھا جاتا ہے؟ کیا میڈیا اور شہری آزادیوں کو مناسب تحفظ حاصل ہے؟ کیا سیاسی جماعتوں کے اندر بھی جمہوری کلچر موجود ہے؟ اور کیا عام شہری کی آواز انتخابات کے بعد بھی فیصلہ سازی تک پہنچتی ہے؟ بین الاقوامی ماہرین اور عالمی اداروں کے غیر جانبدارانہ تجزیوں کی روشنی میں، پاکستان میں جمہوریت کی موجودہ صورتحال اور عالمی درجہ بندی کا تین پہلوؤں سے احاطہ کیا جا سکتا ہے

1۔ عالمی درجہ بندی اور زمرہ بندی (International Rankings & Classification)

دی اکنامسٹ انٹیلی جنس یونٹ (EIU) کے 'ڈیموکریسی انڈیکس' اور فریڈم ہاؤس (Freedom House) کی رپورٹس کے مطابق، پاکستان کی جمہوریت عالمی سطح پر نچلے درجوں میں شمار ہوتی ہے۔ ای آئی یو نے پاکستان کو "ہائبرڈ رجیم" (مخلوط طرزِ حکومت) کے درجے سے تنزلی دے کر "غیر جمہوری / آمریت (Authoritarian) " کی زمرہ بندی میں برقرار رکھا ہے، جہاں کل 10 میں سے اس کا اسکور 2.84 کے قریب ہے۔ اسی طرح 'فریڈم ہاؤس' پاکستان کو شہری و سیاسی آزادیوں کے حوالے سے "جزوی طور پر آزاد (Partly Free) " قرار دیتا ہے۔ عالمی تجزیہ کاروں کے مطابق، باقاعدہ انتخابات کا انعقاد ایک مثبت پہلو ہے، لیکن سیاسی عمل میں یکساں مواقع اور شفافیت کی کمی اس کی عالمی درجہ بندی کو متاثر کرتی ہے۔

2۔ ساختی چیلنجز اور طاقت کا توازن (Structural Challenges & Institutional Power)

عالمی جریدوں اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں (مثلاً V-Dem انڈیکس) کا غیر جانبدارانہ تجزیہ بتاتا ہے کہ پاکستان میں جمہوری اداروں کی خود مختاری اور فیصلے سازی کے نظام میں غیر سیاسی و عسکری اثر و رسوخ انتہائی نمایاں ہے۔ منتخب نمائندوں کے پاس پالیسی سازی کا مکمل اختیار نہ ہونا، آئینی ترمیمات کے ذریعے عدلیہ کے اختیارات کی تقسیم، اور اپوزیشن جماعتوں پر سیاسی و قانونی دباؤ ایسے اہم عوامل ہیں جن کی وجہ سے عالمی برادری اسے خالص دستوری جمہوریت تصور نہیں کرتی بلکہ ایک ایسا سیاسی نظام سمجھتی ہے جہاں انتخابی کارروائی کے باوجود حقیقی جمہوری عمل کمزور رہتا ہے۔

3۔ عوامی شمولیت اور پائیداری کا تناظر (Public Engagement & Future Outlook)

تصویر کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ پاکستان میں عوام کی سیاسی بیداری، ووٹنگ کی خواہش اور آزاد میڈیا کے ساتھ ساتھ سوشل میڈیا کی ذریعے حقِ رائے دہی کا استعمال انتہائی طاقتور ہے۔ عالمی مبصرین اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ شدید سیاسی و معاشی بحرانوں اور رکاوٹوں کے باوجود عوام کا جمہوریت پر اعتماد اور انتخابی عمل میں حصہ لینا پاکستان کے جمہوری مستقبل کی سب سے بڑی امید ہے۔

عالمی سطح پر پاکستان کا شمار ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں جمہوریت کی بنیادیں اور عوامی روح تو موجود ہے، مگر اداروں کا عدم استحکام، قانون کی حکمرانی میں حائل رکاوٹیں اور انسانی حقوق کے مسائل اسے ایک مضبوط جمہوری ریاست بننے سے روکے ہوئے ہیں۔

پاکستانی پارلیمان کی جانب سے بھی گزشتہ برس اس دن کے موقع پر جمہوریت، پارلیمانی تسلسل، عوامی شرکت اور جمہوری جدوجہد میں سیاسی کارکنوں اور صحافیوں کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا۔

مگر جمہوریت کی اصل کامیابی اس وقت ہو گی جب "عوام کی حکومت" صرف آئینی عبارت نہیں بلکہ عام شہری کے روزمرہ تجربے میں بھی محسوس ہو۔ ویسے بھی جمہوریت دراصل ایک دن کا جشن نہیں، ہر دن کا طرزِ عمل ہے۔ ووٹ اس کا آغاز ہے، اختتام نہیں؛ اکثریت اس کا اصول ہے مگر اقلیت کے حقوق اس کی روح ہیں؛ حکومت کا انتخاب ضروری ہے مگر حکومت کا احتساب بھی اتنا ہی ضروری ہے

۔اگر 15 ستمبر ہمیں صرف یہ یاد دلائے کہ جمہوریت موجود ہے تو اس کی معنویت محدود ہے؛ لیکن اگر یہ دن ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کرے کہ ہماری جمہوریت کتنی آزاد، منصفانہ، شفاف، جواب دہ اور عوام دوست ہے تو یہی اس عالمی دن کا حقیقی مقصد ہے۔ **پاکستان کے لیے 15 ستمبر کا سب سے بڑا سوال شاید یہی ہے: "ہم نے جمہوریت کو صرف نظامِ حکومت بنایا ہے یا واقعی طرزِ زندگی بھی؟ **"



14 ستمبر - نیشنل سوبر ڈے (NATIONAL SOBER DAY)

اور پاکستان میں صورت حال

نیشنل سوبر ڈے ہر سال 14 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔

لفظ "سوبر (Sober) "انگریزی زبان کا لفظ ہے، جس کے اردو میں عام طور پر دو بڑے اور اہم معنی ہوتے ہیں: یعنی نشے سے دور ہونا (طبی اور سماجی معنی) اور حقیقی معنوں میں سوبر کا مطلب ہے جس شخص نے شراب، منشیات یا کسی بھی قسم کا نشہ نہ کیا ہو۔ اگر کوئی شخص نشے کی عادت چھوڑ چکا ہو، تو اسے بھی "سوبر" کہا جاتا ہے۔

۔ یہ دن خاص طور پر ان لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے وقف ہے جو نشے (بالخصوص الکحل یا شراب نوشی) سے پاک زندگی گزار رہے ہیں یا اس لت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر رہے ہیں

اس دن کا آغاز 2019ء میں امریکہ سے ہوا۔ اسے "Real Aligned Women" نامی ایک تنظیم (جو کہ نشے سے نجات پانے والی خواتین کا ایک سپورٹ گروپ ہے) کی بانی کورٹنی شلٹز (Courtney Schultz) نے شروع کیا تھا

کورٹنی نے اس دن کو منانے کے لیے 14 ستمبر کی تاریخ کا انتخاب دو وجوہات کی بنا پر کیا: ستمبر کا مہینہ امریکہ میں "نیشنل ریکوری منتھ" (نشے سے نجات کا مہینہ) کے طور پر منایا جاتا ہے، اس لیے یہ تاریخ اس مہم کے عین مطابق تھی۔ یہ ان کا ذاتی فیصلہ بھی تھا کیونکہ ان کی دونوں دادی / نانی کا انتقال مختلف سالوں میں اسی تاریخ (14 ستمبر) کو ہوا تھا۔

2019ء میں ہی 'نیشنل ڈے کیلنڈر' کے رجسٹرار نے اسے باقاعدہ طور پر ہر سال 14 ستمبر کو منانے کا اعلان کیا، اور اسے امریکی ادارے SAMHSA (Substance Abuse and Mental Health Services Administration) کی توثیق بھی حاصل ہے۔

اس دن کے بنیادی مقاصد درج ذیل ہیں :

1۔ نشے سے پاک زندگی کا جشن: ان لوگوں کی ہمت اور کامیابی کو سراہنا جنہوں نے نشہ چھوڑ کر ایک صحت مند زندگی کا انتخاب کیا۔

2۔ آگاہی پھیلانا: معاشرے میں الکحل اور دیگر نشہ آور اشیاء کے نقصانات اور ان کی لت کے بارے میں شعور بیدار کرنا

3۔ معاشرتی داغ (Stigma) کو ختم کرنا: عام طور پر نشے کے عادی افراد کو تنقید کا نشانہ بنایا جاتا ہے، یہ دن اس سوچ کو بدلنے اور ان کے ساتھ ہمدردی کا مظاہرہ کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ وہ بغیر کسی شرمندگی کے علاج کی طرف آسکیں

4۔ سپورٹ نیٹ ورک بنانا: نشے کا شکار افراد کو یہ احساس دلانا کہ وہ اس لڑائی میں اکیلے نہیں ہیں اور ان کی مدد کے لیے برادریاں موجود ہیں۔

بنیادی طور پر یہ امریکہ کا ایک قومی دن (National Day) ہے اور اس کا آفیشل نیٹ ورک وہیں پر ہے۔ تاہم، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا کے پھیلاؤ کی وجہ سے اب دنیا بھر میں نشے سے نجات پانے والے افراد، بحالی کے مراکز (Rehab Centers) اور سماجی تنظیمیں بین الاقوامی سطح پر اس دن کو مناتی ہیں۔ کینیڈا اور برطانیہ جیسے ممالک میں بھی اس طرز کی مہمات چلائی جاتی ہیں۔ لوگ اور تنظیمیں اس دن کو مختلف تعمیری طریقوں سے مناتے ہیں۔ جیسے سوشل میڈیا مہمات کے تحت لوگ #NationalSoberDay کے ہیش ٹیگ کے ساتھ نشے سے پاک زندگی کے اپنے سفر اور کامیابیوں کی کہانیاں شیئر کرتے ہیں تاکہ دوسروں کو امید مل سکے۔ اس کے علاوہ دوست اور خاندان والے ایسی تقریبات یا پکنک کا اہتمام کرتے ہیں جہاں شراب کی جگہ مختلف جوسز یا Mocktails (بغیر الکحل کے مشروبات) پیش کیے جاتے ہیں۔ نیز لوگ اپنے ان دوستوں یا رشتہ داروں کو فون یا میسج کر کے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں جو نشے سے بحالی کے عمل (Recovery) سے گزر رہے ہوں ۔ تعلیمی ادارے اور بحالی کے مراکز سیمینارز منعقد کرتے ہیں جہاں ذہنی صحت، نشے کے اثرات اور علاج کے طریقوں پر گفتگو کی جاتی ہے۔

بہت سے لوگ جو نشہ چھوڑنا چاہتے ہیں، وہ اس دن کو اپنے ایک نئے اور صحت مند سفر کے آغاز کا نقطہ بناتے ہیں۔
پاکستان میں سرکاری یا قومی سطح پر 14 ستمبر کو "سوبر ڈے (National Sober Day) "منانے کی کوئی روایت نہیں ہے۔
بنیادی طور پر یہ ایک بین الاقوامی یا مغربی دن ہے، جس کی شروعات خاص طور پر امریکہ سے ہوئی تھی۔ اس کا مقصد شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء سے پاک زندگی (Sobriety) گزارنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا اور منشیات کی لت کے خلاف شعور بیدار کرنا ہے۔
تاہم، پاکستان میں منشیات کے خلاف کام کرنے والی این جی اوز اور تنظیمیں اپنے طور پر اس دن یا اس سے ملتے جلتے ایام پر آگاہی مہم چلاتی ہیں۔
پاکستان میں براہِ راست "سوبر ڈے" کے نام سے بڑے پیمانے پر تقریبات تو نہیں ہوتیں، لیکن منشیات کی روک تھام اور بحالی کے لیے کام کرنے والے ادارے اس نوعیت کی سرگرمیوں کا اہتمام کرتے ہیں: جن میں

سرکاری سطح پر اینٹی نارکوٹکس فورس (ANF مختلف اوقات میں سیمینارز اور آگاہی واکس کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور پاکستان میں کام کرنے والے معروف ری ہیب سینٹرز (جیسے فاؤنڈیشنز اور ویلفیئر ٹرسٹ) اس دن اپنے سینٹرز میں زیرِ علاج مریضوں اور صحت یاب ہونے والے افراد کے لیے خصوصی سیشنز رکھتے ہیں۔ یونیورسٹیوں اور کالجوں میں کام کرنے والی مختلف فلاحی اور طلبہ تنظیمیں نوجوانوں کو نشے کی لعنت سے دور رکھنے کے لیے اس دوران سوشل میڈیا مہم اور لیکچرز کا انعقاد کرتی ہیں۔



13 ستمبر۔۔سیلیک (گلوٹین الرجی) کی بیماری کا قومی بیداری کا دن .

(National Celiac Disease Awareness Day

سیلیک کی بیماری کا قومی بیداری کا دن ہر سال 13 ستمبر کو منایا جاتا ہے۔اس دن کا بنیادی مقصد سیلیک بیماری (Celiac Disease) کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنا، مریضوں کی مدد کرنا اور اس کی جلد تشخیص کی اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔

سیلیک ایک ایسی موروثی اور آٹوامیون (autoimmune) بیماری ہے جس میں جب مریض گلوٹین کھاتا ہے، تو اس کا اپنا ہی مدافعتی نظام چھوٹی آنت کو نقصان پہنچانا شروع کر دیتا ہے۔

گلوٹین (Gluten) ایک پروٹین ہے جو گندم، جو اور رائی (Rye) جیسے اناج میں پایا جاتا ہے۔گلوٹین آٹے کو لچکدار بناتا ہے اور روٹی یا دوسری بیکری کی چیزوں کو پھولنے اور اپنی شکل برقرار رکھنے میں مدد دیتا ہے۔یہ عام طور پر روٹی، پاستا، کیک اور گندم یا جو سے بنی ہوئی اشیاء میں پایا جاتا ہے

اس دن کو منانے کے پیچھے ایک اہم تاریخ 13 ستمبر کا دن برطانوی طبیب اور بچوں کے ماہر ڈاکٹر سیموئیل جی کی تاریخ پیدائش (13 ستمبر 1839) کی مناسبت سے منتخب کیا گیا

ڈاکٹر سیموئیل جی دنیا کے وہ پہلے محقق اور ڈاکٹر تھے جنہوں نے 1888 میں سیلیک بیماری کی جدید طبی علامات پر ایک جامع مقالہ لکھا۔ انہوں نے ہی سب سے پہلے یہ دریافت کیا تھا کہ

"اس بیماری کا علاج اور انتظام صرف اور صرف مخصوص غذا (Diet) کے ذریعے ہی ممکن ہے"

اس دن کو باقاعدہ طور پر تسلیم کرنے میں امریکی سینیٹ کا بڑا ہاتھ ہے

۔سال 2005 میں پہلی بار امریکی سینیٹ نے متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت 13 ستمبر کو سیلیک بیماری کی بیداری کا دن قرار دیا گیا، اور بعد میں 2010 میں اسے باضابطہ طور پر سالانہ یادگار کے طور پر اپنایا گیا

۔اس اقدام کا مقصد دنیا بھر میں کروڑوں ایسے مریضوں کی آواز بننا تھا جن کی بیماری کی تشخیص نہیں ہو پاتی۔

عالمی اعداد و شمار کے مطابق دنیا بھر میں ہر 100 میں سے 1 شخص سیلیک بیماری کا شکار ہے، لیکن تشویشناک بات یہ ہے کہ لگ بھگ 70 سے 80 فیصد مریضوں کو معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس بیماری میں مبتلا ہیں۔

یہ دن لوگوں کو اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ بیماری کی علامات کو پہچانیں اور بروقت طبی معائنہ کروائیں۔

سیلیک بیماری کی عام علامات ہر مریض میں مختلف ہو سکتی ہیں

لیکن سب سے عام علامات یہ ہیں

پیٹ کی خرابیاں (اکثر پیٹ میں درد ہونا، گیس بننا، اور پیٹ کا پھولنا۔ اسہال یا قبض: مستقل رہنے والا اسہال (Diarrhea) یا شدید قبض

۔وزن میں کمی (مناسب خوراک کے باوجود وزن کا تیزی سے کم ہونا(

۔شدید تھکن: (جسم میں غذائیت جذب نہ ہونے کی وجہ سے ہر وقت کمزوری اور تھکن محسوس ہونا

۔خون کی کمی: فولاد (Iron) کی کمی کی وجہ سے اینیمیا (Anemia) ہونا

۔بچوں میں نشوونما کی کمی: بچوں کا قد اور وزن عمر کے حساب سے نہ بڑھنا

۔ہر وقت شدید تھکن اور کمزوری کا احساس

۔ہڈیوں اور جوڑوں میں درد، اور ہڈیوں کا کمزور ہونا(Osteoporosis)

۔جلد پر خارش زدہ دانے یا چھالے بننا(Dermatitis Herpetiformis)

۔منہ میں بار بار چھالے (Ulcers) بننا۔

اگر کسی کو شک ہو کہ وہ واقعی اس بیماری کا شکار ہے، تو گلوٹین فری غذا شروع کرنے سے پہلے ٹیسٹ کروانا لازمی ہے، ورنہ نتائج غلط آسکتے ہیں۔ سب سے پہلے خون کا ٹیسٹ کیا جاتا ہے جس میں tTG-IgA (Tissue Transglutaminase Antibodies) نامی اینٹی باڈیز کو دیکھا جاتا ہے۔ سیلیک کے مریضوں میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے

اگر بلڈ ٹیسٹ مثبت آئے، تو ڈاکٹر منہ کے راستے ایک چھوٹی ٹیوب (اینڈوسکوپی) ڈال کر چھوٹی آنت کے اندرونی حصے کا معائنہ کرتے ہیں اور وہاں سے ٹشو کا چھوٹا سا ٹکڑا (بائیوپسی) لے کر لیبارٹری بھیجتے ہیں۔ اس سے تصدیق ہوتی ہے کہ آنت کے اندرونی ریشے (Villi) کتنے متاثر ہوئے ہیں اسی طرح

HLA-DQ2 اور HLA-DQ8:

جینز کا پتہ لگانے کے لیے ٹیسٹ کیا جاتا ہے۔ اگر یہ جینز نہ ہوں، تو سیلیک بیماری ہونے کا امکان تقریباً نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے۔

سیلیک کے مریضوں کو ہر وہ چیز چھوڑنی پڑتی ہے جس میں گلوٹین (Gluten) شامل ہو۔ ان اشیاء سے سخت پرہیز ضروری ہے کیونکہ ادویات سے اس کا علاج نہیں ہو گا۔

گندم کی روٹی، نان، پراٹھا، دلیہ اور سوجی۔ جو کا دلیہ،

مالٹ (Malt) والی اشیاء اور بسکٹ، کیک، پیسٹری، پیزا، برگر، اور پاستا/نوڈلز

۔ مصنوعی چٹنی اور ساس: بازاری کیچپ، سویا ساس، اور بعض تیار شدہ مصالحے جن میں گندم کا نشاستہ شامل ہو۔

محفوظ اور اجازت یافتہ غذائیں سیلیک کے مریض بغیر کسی خوف کے کھا سکتے ہیں: ان میں چاول، مکئی، باجرہ، اور خاص طور پر تیار کردہ گلوٹین فری آٹا (Gluten-free flour) ہر قسم کا گوشت (مرغی، مچھلی، بڑا اور چھوٹا گوشت)، انڈے، اور دالیں۔ دودھ اور ڈیری: تازہ دودھ، دہی، مکھن، اور پنیر (Cheese) ۔ پھل اور سبزیاں: تمام تازہ پھل اور سبزیاں شامل ہیں پاکستان میں سیلیک کے مریض گندم کے آٹے کی روٹی یا بیکنگ کے لیے گندم کی جگہ چاول کا آٹا (Rice Flour) مکئی کا آٹا (Corn Flour/Cornmeal) چنے کا آٹا/بیسن (Gram/Chickpea Flour) کو مکس کر کے استعمال کر سکتے ہیں جو پروٹین سے بھرپور اور روٹی بائنڈ کرنے میں مدد گار ہے ۔ جوار اور باجرہ جیسے روایتی اناج طاقتور اور مکمل طور پر گلوٹین فری ہیں وہ بھی استعمال کر سکتے ہیں یا دوسرے اناجون میں مکس کر کے استعمال کر سکتے ہیں۔

پرہیز علاج سے بہتر ہے

اصل مسئلہ مرض کی تشخیص ہے۔



12 ستمبر-(قومی یوم حوصلہ افزائی National Day of Encouragement اور اس کے معاشرے پر اثرات۔

لفظ "حوصلہ افزائی" دو الفاظ کا مجموعہ ہے:

حوصلہ: یہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہمت، جرأت، بساط، ظرف، یا دل گردہ کے ہیں۔

افزائی: یہ فارسی زبان کے مصدر "افزودن" سے ہے، جس کے معنی بڑھانے، زیادہ کرنے، یا ترقی دینے کے ہیں۔

چنانچہ لغوی اعتبار سے حوصلہ افزائی کا مطلب "ہمت بڑھانا"، "جرأت پیدا کرنا" یا "دل بڑا کرنا" ہے۔ تاہم معنوی طور پر حوصلہ افزائی ایک ایسا نفسیاتی اور سماجی عمل ہے جس کے ذریعے کسی شخص کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو بیدار کیا جاتا ہے اور اسے آگے بڑھنے کا عزم دیا جاتا ہے۔ تسلیم شدہ نفسیاتی اور اخلاقی مفہوم میں اس کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے:

"کسی فرد کے اعمال، کوششوں، یا صلاحیتوں کی اس طرح تائید، تعریف اور پشت پناہی کرنا کہ اس کے اندر کا خوف یا مایوسی ختم ہو جائے، اور وہ دلی مسرت اور نئی امید کے ساتھ اپنے ہدف کو حاصل کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔"

حوصلہ افزائی کے تین بنیادی ستون:

امید دلانا: مایوس یا پریشان شخص کو یہ یقین دلانا کہ حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔

صلاحیت کا اعتراف: دوسرے شخص کو یہ احساس دلانا کہ وہ اس کام کے اہل اور قابل ہے۔

سہارا دینا :(Support) صرف الفاظ سے نہیں بلکہ اپنے رویے سے دوسرے کو محفوظ اور مضبوط محسوس کروانا۔

کسی کی حوصلہ افزائی کرنے سے انسان کی شخصیت پر گہرے اور مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں، جس سے اس کا اعتماد اور کارکردگی بہتر ہوتی ہے. اور پر اعتماد شخصیت پروان چڑھتی ہے اور انسان اپنے فیصلوں پر بھروسہ کرنا سیکھتا ہے۔ اور مثبت رویہ اختیار کرتا ہے.

اور اس کی برکت سے کام کرنے کی صلاحیت اور رفتار بڑھ جاتی ہے اور مشکلات کا سامنا کرنے کا حوصلہ ملتا۔

12۔ ستمبر کا) National Day of Encouragement قومی یوم حوصلہ افزائی

دراصل امریکہ سے شروع ہونے والا ایک نسبتاً جدید قومی دن ہے۔ اس کی خاص بات یہ ہے کہ اس کا تصور حکومت یا کسی بڑے ادارے نے نہیں بلکہ نوجوان طلبہ نے پیش کیا تھا۔

دستیاب تاریخی ریکارڈ کے مطابق اس کا آغاز 2007ء میں امریکی ریاست Arkansas کے شہر Searcy میں Harding University کے National Leadership Forum میں شریک ہائی اسکول کے طلبہ کے ایک گروپ نے کیا۔ ان طلبہ سے نوجوانوں کو درپیش بڑے مسائل کی نشاندہی اور ان کے حل تجویز کرنے کو کہا گیا تو انہوں نے محسوس کیا کہ "حوصلہ افزائی کی کمی "نوجوانوں اور معاشرے کے لیے ایک بنیادی مسئلہ ہے۔

اس دن کے لیے 12 ستمبر کی تاریخ کا انتخاب بھی غیر معمولی معنی رکھتا ہے۔ 11 ستمبر 2001ء کے دہشت گرد حملوں کے بعد امریکہ شدید صدمے، خوف اور مایوسی سے دوچار تھا، لیکن 12 ستمبر سے لوگوں میں ایک دوسرے کی مدد، یکجہتی، قربانی، امید اور حوصلہ بڑھانے کا جذبہ نمایاں ہوا۔ طلبہ نے اسی جذبے کو ایک مستقل مثبت پیغام میں تبدیل کرنے کے لیے 12 ستمبر کو منتخب کیا—یعنی 9/11 کی مایوسی کے بعد امید اور حوصلے کو زندہ رکھنے کا دن۔ امریکی سینیٹ کے ریکارڈ میں بھی یہی وضاحت موجود ہے کہ اس دن کا مقصد 12 ستمبر 2001ء کے بعد پیدا ہونے والے اتحاد، امید، بے لوثی اور حوصلہ افزائی کے جذبے کو دوبارہ اجاگر کرنا ہے

اس مہم کو سب سے پہلے Searcy کی میئر Belinda LaForce نے 22 اگست 2007ء کو باضابطہ proclamation کے ذریعے تسلیم کیا۔ اس کے بعد Arkansas کے گورنر Mike Beebe نے 12 ستمبر 2007ء کو ریاستی سطح پر State Day of Encouragement قرار دیا

۔اسی سال امریکی صدر George W. Bush کی طرف سے بھی 12 ستمبر کو National Day of Encouragement کے طور پر تسلیم کرنے کا اعلان کیا گیا۔ بعد ازاں امریکی سینیٹ نے Senate Resolution 264 کے ذریعے 13 ستمبر 2011ء کو 12 ستمبر کو National Day of Encouragement قرار دینے کی توثیق کی

(یہاں میں اپنے قارئین کرام پر یہ واضح کرتا چلوں کہ یہ امریکہ کا وفاقی سرکاری تعطیل (federal holiday) نہیں بلکہ ایک قومی /observance یادگاری دن ہے۔ یہ دن بنیادی طور پر امریکی قومی دن ہے، اس لیے اسے امریکہ کی طرح سرکاری قومی دن کے طور پر دنیا بھر میں نہیں منایا جاتا۔)

تاہم اس کا بنیادی تصور — کسی انسان کو امید دینا، اس کی کوشش کو سراہنا، مایوس شخص کا حوصلہ بڑھانا اور مثبت رویوں کو فروغ دینا — بین الاقوامی سطح پر مختلف kindness، mental well-being، youth development اور positive psychology کی سرگرمیوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔ امریکہ میں اس موقع پر گھر، اسکول، دفاتر اور کمیونٹی میں دوسروں کی حوصلہ افزائی، appreciation، supportive messages، فون کالز، خطوط، چھوٹے تحائف اور کسی کی کامیابی کو تسلیم کرنے جیسی سرگرمیاں کی جاتی ہیں۔ بعض ریاستوں اور مقامی اداروں نے بھی اس دن کو اپنے طور پر تسلیم کیا ہے؛ مثال کے طور پر New York State Legislature نے 2017ء میں 12 ستمبر کو Day of Encouragement کے طور پر منانے کی قرارداد منظور کی تھی۔

اس مہم کا بنیادی پیغام نہایت سادہ مگر گہرا تھا: صرف حوصلہ افزائی کے بارے میں سوچنا نہیں بلکہ کسی دوسرے انسان کی حوصلہ افزائی کے لیے عملی قدم اٹھانا۔ امریکی سینیٹ کے ریکارڈ میں بھی اس کا مقصد یہی بیان ہوا کہ لوگوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ کسی دوسرے شخص کی حوصلہ افزائی کے لیے کوئی خدمت، اچھا خط، مہربان جملہ یا مثبت عمل کریں۔ اس تصور کے مطابق کبھی ایک مسکراہٹ، کندھے پر ہاتھ، تعریف کا ایک جملہ یا یہ احساس کہ

"میں تمہاری کوشش دیکھ رہا ہوں"

بھی انسان کے اندر نئی توانائی پیدا کر سکتا ہے۔

اس دن کی کامیابی کو کسی ایک عدد یا عالمی پیمانے سے ناپنا مشکل ہے، کیونکہ یہ کوئی ایسا سرکاری پروگرام نہیں جس کے لیے عالمی targets مقرر کیے گئے ہوں۔ تاہم اس کا سب سے اہم اثر رویوں میں ایک مثبت تصور متعارف کرانا ہے: انسان کو صرف اس کی ناکامی، کمزوری یا غلطی یاد دلانے کے بجائے اس کی کوشش، صلاحیت اور پیش رفت کو بھی تسلیم کیا جائے۔ حوصلہ افزائی فرد میں خود اعتمادی، دوبارہ کوشش کرنے کا جذبہ اور تعلقات میں مثبت احساس پیدا کر سکتی ہے؛ اسی طرح حوصلہ دینے والا شخص بھی دوسروں کی کامیابی دیکھ کر خود تحریک حاصل کر سکتا ہے۔

پاکستان میں 12 ستمبر باضابطہ قومی دن نہیں ہے، لیکن اس کا پیغام ہمارے معاشرتی حالات میں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ ہمارے ہاں بچوں کی تعلیم، نوجوانوں کا مستقبل، بے روزگاری، معاشی مشکلات، مقابلے کا دباؤ اور بعض اوقات خاندان اور معاشرے کی طرف سے مسلسل تنقید انسان کے اعتماد کو متاثر کرتی ہے۔ ایسے ماحول میں ہمیں صرف "ناکامی پر تنقید" کے بجائے "کوشش پر حوصلہ افزائی" کی ثقافت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ والدین بچے کو، استاد طالب علم کو، افسر اپنے ماتحت کو، ادارہ اپنے کارکن کو اور معاشرہ اپنے باصلاحیت نوجوان کو یہ احساس دلائے کہ غلطی اختتام نہیں، سیکھنے کا ایک مرحلہ ہے ۔اسلامی نقطۂ نظر سے بھی حوصلہ افزائی کا تصور اجنبی نہیں۔ قرآن انسان کو مایوسی سے بچنے، نیکی میں ایک دوسرے کا تعاون کرنے اور خیر کی طرف سبقت لے جانے کی تعلیم دیتا ہے۔

اس لیے اگر 12 ستمبر کو پاکستان میں منانے کا کوئی بامعنی طریقہ ہو تو وہ محض سوشل میڈیا پر

"BE POSITIVE"

لکھ دینا نہیں، بلکہ کسی مایوس شخص کو امید دینا، کسی بچے کی صلاحیت کو پہچاننا، کسی محنت کش کی محنت کو سراہنا، کسی ناکام شخص کو دوبارہ اٹھنے کا حوصلہ دینا اور کسی خاموش انسان سے یہ کہنا کہ

"آپ کی کوشش قابلِ قدر ہے"

ہونا چاہیے۔ اصل سبق یہی ہے: بعض اوقات انسان کو راستہ دکھانے سے پہلے یہ یقین دلانا ضروری ہوتا ہے کہ وہ راستہ طے کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ یہی National Day of Encouragement کا بنیادی فلسفہ ہے—اور یہی وہ پیغام ہے جسے پاکستان سمیت ہر معاشرہ اپنے روزمرہ رویوں کا حصہ بنا سکتا ہے

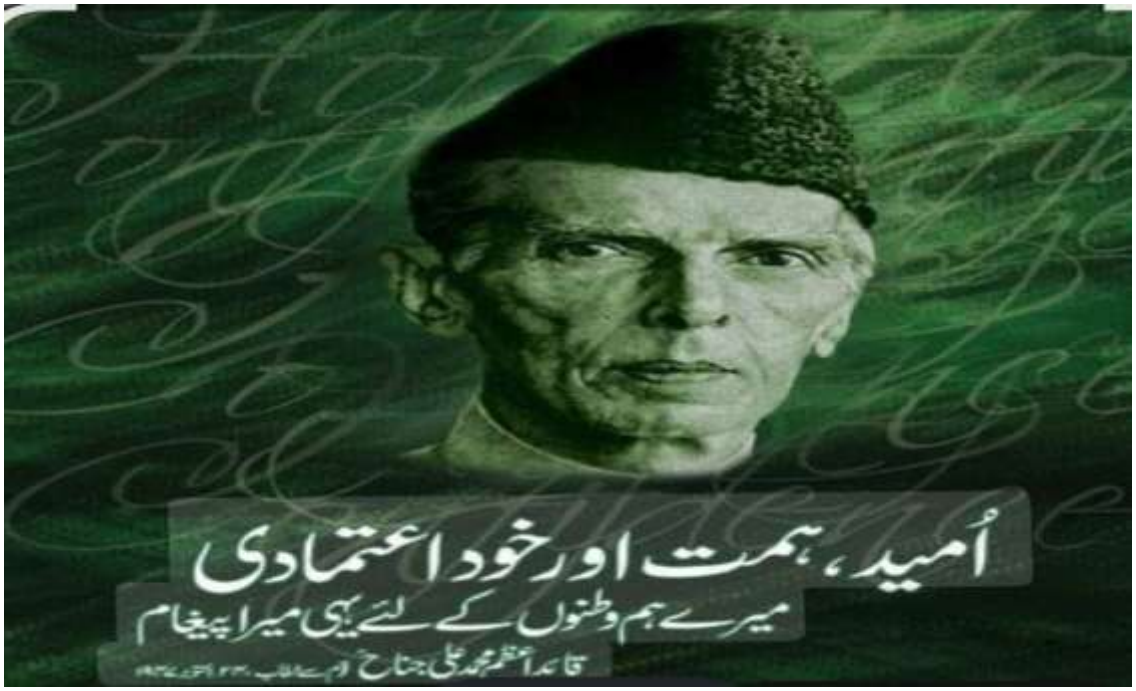

11 ستمبر یوم وفات۔ قائدِاعظم محمد علی جناح: بیماری، آخری ایام اور وفات — محترمہ فاطمہ جناح کا موقف یا حکومت وقت کے خلاف چارج شیٹ۔۔۔ایک جامع جائزہ

قائداعظم کو دق (سل Tuberculosis / کا عارضہ 1930ء کی دہائی کے اواخر میں لاحق ہوا تھا۔1940ء میں بمبئی کے معروف معالج ڈاکٹر پٹیل (Dr. Jal Patel) نے ان کے ایکسرے اور معاینے کے بعد اس بات کی تصدیق کی کہ وہ ٹی بی (Tuberculosis) کے شدید عارضے میں مبتلا ہیں۔ڈاکٹر پٹیل ان کا علاج 1940ء سے 1948ء (قائداعظم کی وفات) تک انتہائی رازداری کے ساتھ کرتے رہے

۔بیماری کی شدت کے باوجود قائداعظم نے قیامِ پاکستان کی تحریک اور بعد ازاں نئی مملکت کے معاملات کے لیے دن رات کام جاری رکھا۔ جولائی 1948ء میں ان کی طبیعت شدید بگڑنے پر انہیں کوئٹہ اور پھر زیارت منتقل کیا گیا، جہاں ڈاکٹر الٰہی بخش کی قیادت میں معالجین کی ٹیم ان کے زیرِ علاج رہی۔

قائداعظم کی بیماری کو قیامِ پاکستان کے مقصد کو نقصان سے بچانے کے لیے مکمل طور پر پوشیدہ رکھا گیا تھا۔ ان کی ہمشیرہ محترمہ فاطمہ جناح اس کی مکمل حقیقت سے واقف تھیں۔ اور اس کے علاوہ صرف ان کے ذاتی معالجین (خصوصاً بمبئی کے ڈاکٹر جلال پٹیل اور بعد میں زیارت میں ڈاکٹر الٰہی بخش) کو اس بیماری کی اصل نوعیت معلوم تھی۔

۔برطانوی حکومت (بشمول وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن) اور کانگریس یا دیگر سیاسی رہنماؤں میں سے کسی کو بھی اس کا علم نہیں تھا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بعد میں 1976 میں بی بی سی کو دیے گئے ایک انٹرویو میں تسلیم کیا تھا کہ اگر انہیں قائداعظم کی بیماری اور محدود زندگی کا علم ہوتا تو وہ تقسیمِ ہند کے عمل کو کچھ عرصے کے لیے التوا میں ڈال دیتے تاکہ قیامِ پاکستان کو روکا جا سکے۔

اسی طرح بھارت کے پہلے وزیرِ اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی بہن اور مشہور سفارت کار وجے لکشمی پنڈت کا بانیِ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سیاسی بصیرت، پختہ عزم اور قیادت کے بارے میں ایک قول تاریخ میں بہت مشہور ہے:

"اگر مسلم لیگ کے پاس ایک سو گاندھی، ایک سو نہرو، ایک سو پٹیل اور ایک سو ابوالکلام آزاد ہوتے اور کانگریس کے پاس صرف ایک لیڈر محمد علی جناح ہوتا، تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔ "

اس قول کے ذریعے انہوں نے یہ تسلیم کیا کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح اکیلے ہی کانگریس کے تمام بڑے رہنماؤں کی مشترکہ سیاسی طاقت پر بھاری تھے۔

قائداعظم محمد علی جناح کو 14 جولائی 1948ء کو شدید گرمی اور کراچی کے ماحول سے طبعی نقاہت کے بعد ڈاکٹروں کے مشورے پر آپ کو پہلے کوئٹہ اور پھر زیارت کی ٹھنڈی اور پُر سکون آب و ہوا میں لے جایا گیا تاکہ پھیپھڑوں کے عارضے (ٹی بی) میں کچھ افاقہ ہو۔ زیارت میں آپ کو مشہور تاریخی عمارت زیارت ریذیڈنسی (Quaid-e-Azam Residency) میں ٹھہرایا گیا۔ آپ کو سڑک کے راستے خصوصی گاڑی کے ذریعے کوئٹہ سے زیارت لایا گیا جہاں محترمہ فاطمہ جناح بھی آپ کے ساتھ تھیں۔

قائداعظم کے علاج کے لیے نامور معالجین کی ٹیم موجود تھی، جن میں ذاتی معیشت وطب کے ماہر ڈاکٹر الٰہی بخش اور دیگر فوجی و سول ڈاکٹر شامل تھے۔ ریذیڈنسی میں ہی طبی سہولتیں فراہم کرنے کی کوشش کی گئی، مگر اس وقت تک ان کی بیماری (تپ دق اور پھیپھڑوں کا سرطان) کافی حد تک پوشیدہ اور اخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ اگست 1948ء کے آغاز ہی سے قائد اعظم کی طبیعت زیادہ بگڑنے لگی تھی۔ زیارت کی بلندی (تقریباً 8 ہزار فٹ) اور سردی اب ان کے کمزور جسم کے لیے ساز گار نہیں رہی تھی۔

چنانچہ طبیعت زیادہ خراب ہونے پر 13 اگست کو انہیں زیارت سے واپس کوئٹہ لایا گیا جہاں ان کا علاج جاری رکھا گیا۔ مگر ستمبر کے پہلے ہفتے میں ان کی کمزوری انتہائی خطرناک حد کو چھونے لگی تھی۔ 10 ستمبر کو ڈاکٹروں نے واضح کر دیا تھا کہ اب وہ جانبر نہیں ہو سکتے، جس کے بعد انہیں فوری طور پر 11 ستمبر کو ائیر ایمبولینس کے ذریعے کراچی منتقل کرنے کے انتظامات کئے گئے ۔ جس نے چار بج کر پانچ منت پر لینڈ کیا۔ ان کا سفر اور آمد انتہائی خفیہ رکھی گئی تھی تاکہ عوام میں سراسیمگی نہ پھیلے۔

ان کو ماری پور (موجودہ مسرور) ایئرپورٹ سے گورنر جنرل ہاؤس لے جانے والی ایمبولینس میں سوار کرایا گیا۔ ماری پور ایئرپورٹ سے روانہ ہونے کے بعد ایمبولینس نے تقریباً 4 میل (قریباً 6.4 کلومیٹر) کا فاصلہ طے کیا تھا کہ اس کا انجن ہچکیاں لے کر بند ہو گیا

۔ محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب "مائی برادر" اور ڈاکٹر الٰہی بخش کی تحریر کے مطابق، ایمبولینس کا پٹرول ختم ہو گیا تھا اور انجن میں خرابی آگئی تھی۔ اس شدید گرمی اور حبس کے موسم میں قائداعظم کو سڑک کے کنارے دوسری ایمبولینس کا تقریباً ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کرنا پڑا۔

وہاں سے گزرنے والے عام شہریوں اور مہاجرین کو علم ہی نہیں تھا کہ پاکستان کا بانی اس ایمبولینس کے اندر زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہا ہے۔ ایمبولنس میں قائداعظم کے ساتھ محترمہ فاطمہ جناح اور سسٹر فیلس ڈن (Sister Phyllis Dunne) موجود تھیں۔ سخت گرمی، حبس اور مکھیوں کی بھرمار کے باعث قائداعظم کی حالت انتہائی غیر ہو گئی۔ فاطمہ جناح ان کو ہاتھ سے پنکھا جھلتی رہیں۔

دوسری ایمبولنس کا انتظام کرنے میں تقریباً ایک سے سوا گھنٹہ لگا۔ محترمہ فاطمہ جناح نے اپنی کتاب ("My Brother" میرا بھائی) کے ممنوعہ حصوں اور تحریروں میں لکھا کہ اس ہنگامی حالت کے باوجود متبادل سواری کا فوری انتظام نہیں تھا، جو حکومتی غفلت کو ظاہر کرتا ہے۔

اس واقعے پر اس وقت کے ذمہ داروں کے دو بنیادی موقف سامنے آتے ہیں

محترمہ فاطمہ جناح نے اسے شدید انتظامی غفلت، بے توجہی اور سازش قرار دیا۔ ان کے مطابق بابائے قوم کے لیے کوئی نعم البدل ایمبولنس، زاپاس گاڑیاں یا وزراء و اعلیٰ حکام کی موجودگی کا انتظام نہیں کیا گیا تھا، جبکہ وزیر اعظم لیاقت علی خان اور ان کی کابینہ کو ان کی آمد کی خبر تھی۔

وزائے اعظم اور پولیس حکام کا موقف تھا کہ آمد کو مکمل طور پر راز رکھا گیا تھا تاکہ عوام کا ہجوم نہ ہو اور سیکیورٹی رسک پیدا نہ ہو۔ کرنل الٰہی بخش (قائد کے معالج) اور چوہدری محمد علی کے مطابق یہ ایک غیر متوقع میڈیکل ہنگامی صورتحال اور حادثاتی خرابی تھی، نہ کہ عمدی غفلت۔

اگرچہ قائد اعظم کی صحت اس حد تک بگڑ چکی تھی کہ معالجین کے مطابق ان کی زندگی کے چند گھنٹے ہی باقی تھے، لیکن اس حادثے اور حکومتی انتظام کی ناقص منصوبہ بندی نے قائد اعظم کے آخری لمحات کو انتہائی دردناک بنایا اور اس نے ہمیشہ کے لیے ایک تاریخی تنازع کھڑا کر دیا۔۔

محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب "My Brother" کا وہ باب جس میں اس واقعے اور وزیر اعظم لیاقت علی خان سے متعلق تلخ حقیقتوں کا ذکر تھا، ریڈیو پاکستان کی سنسر شپ اور بعد میں کتاب کی اشاعت کے وقت حذف کر دیا گیا تھا، جو بعد میں دہائیوں بعد شائع ہوئی

)حقائق یہ تقاضا کرتے ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کی کتاب کے اصل سیاق وسباق قارئین تک لائے جائین۔ (ویسے بھی اس دور کے تمام کردار خالق حقیقی کے پاس جا چکے ہیں(

محترمہ فاطمہ جناح کا بنیادی موقف یہ تھا کہ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کو ان کے آخری ایام میں ان کے اپنے ہی قریبی ساتھیوں اور اس وقت کے حکومتی مقتدر حلقوں کی جانب سے شدید سرد مہری، بیگانگی اور بیوفائی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کا ماننا تھا کہ نئی مقتدرہ قائد اعظم کے حقیقی نظریات اور ان کی بیماری سے غافل ہو چکی تھی۔ اپنے اس موقف کو ثابت کرنے کے لیے انہوں نے تمام تلخ سچائیوں کو اپنی کتاب "مائی برادر" میں رقم کیا، لیکن ریاست کے سیاسی بیانیے کو بچانے کے لیے اس آواز کو تاریخ کے مختلف مراحل پر سنسر شپ کا نشانہ بنایا گیا۔

تاریخی ترتیب کے ساتھ ان تمام واقعات کی یکجا تفصیل درج ذیل ہے

1:۔ جولائی 1948ء: لیاقت علی خان کا اچانک دورہِ زیارت جب قائد اعظم شدید علالت کے باعث زیارت (بلوچستان) میں زیر علاج تھے، تو ایک شام اس وقت کے وزیر اعظم نواب لیاقت علی خان اور چوہدری محمد علی بغیر کسی پیشگی اطلاع کے وہاں پہنچے۔

محترمہ فاطمہ جناح کے مطابق، قائد اعظم نے ان کا مقصد بھانپتے ہوئے واضح الفاظ میں فرمایا تھا

" : یہ یہاں یہ دیکھنے آئے ہیں کہ میں زندہ رہوں گا یا مر جاؤں گا"۔

حکومتی عہدیداروں نے ڈاکٹر الٰہی بخش سے قائد کی صحت کی خفیہ معلومات لینے کی کوشش بھی کی، جسے ڈاکٹر نے مس جناح کی اجازت کے بغیر بتانے سے انکار کر دیا۔

11 ستمبر 1948ء: کراچی آمد اور خراب ایمبولینس (اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے) کا معاملہ اور طے شدہ انتظامی غفلت۔

۔11 ستمبر 1951ء: ریڈیو پاکستان پر مس جناح کی تقریر کی سنسر شپ۔ قائد اعظم کی تیسری برسی کے موقع پر جب محترمہ فاطمہ جناح ریڈیو پاکستان پر قوم سے خطاب کر رہی تھیں، تو مقتدرہ کے حکم پر ریڈیو انتظامیہ نے ان کے مائیکروفون کی بجلی عارضی طور پر بند کر دی۔ یہ سنسر شپ ٹھیک اس وقت کی گئی جب وہ لیاقت علی خان کی حکومت کے سرد رویے اور قائد کے آخری لمحات کی بدانتظامی کا ذکر کرنے والی تھیں۔ بعد میں ریڈیو کنٹرولر زیڈ اے بخاری نے اسے "تکنیکی خرابی" قرار دیا، تو مس جناح نے خط لکھ کر اس جھوٹ کا پردہ چاک کیا اور کہا کہ ٹرانسمیٹر صرف انہی جملوں پر فیل ہوئے جنہیں آپ حذف کروانا چاہتے تھے

قائدِ اعظم کی وفات 11 ستمبر 1948 کی رات کراچی میں ہوئی۔ ان کی وفات کے فوراً بعد حکومتِ پاکستان اور ان کے قریبی رفقاء نے کراچی کے وسط میں واقع ایگزبیشن گراؤنڈ (نمائش چورنگی) کے قریب ایک پہاڑی نما اونچے قطعہ زمین کو ان کی آخری آرام گاہ کے لیے منتخب کیا۔ یہ جگہ اس وقت کراچی کا دل سمجھی جاتی تھی اور وہاں ایک بڑی جامع مسجد (مجوزہ جمعہ مسجد) کی تعمیر کا منصوبہ بھی زیرِ غور تھا۔ یہاں مہاجرین کی کچی آبادیاں تھیں، جنہوں نے قائدِ اعظم کے احترام میں بخوشی اس جگہ کو خالی کر دیا۔ بعد ازاں اسی مقام پر موجودہ مزارِ قائد تعمیر کیا گیا۔

عوامی اور سرکاری نمازِ جنازہ سے قبل گورنر جنرل ہاؤس (گھر) کے اندر ایک نجی نمازِ جنازہ بھی ادا کی گئی تھی۔ یہ نجی نمازِ جنازہ معروف شیعہ عالمِ دین مولانا سید انیس الحسنین رضوی نے پڑھائی تھی۔ یہ نمازِ جنازہ گورنر جنرل ہاؤس کے ایک کمرے میں ادا کی گئی۔ محترمہ فاطمہ جناح کی فرمائش پر پہلے قائد اعظم کو اثنا عشری طریقے کے مطابق غسل دیا گیا اور پھر یہ نجی نمازِ جنازہ ہوئی۔

اس نجی نمازِ جنازہ میں چند قریبی اور اہم شخصیات نے شرکت کی، جن میں کراچی کے ایڈمنسٹریٹر سید ہاشم رضا، آئی جی پولیس سید کاظم رضا، سندھ کے وزیر اعلیٰ یوسف ہارون اور حاجی کلو شامل تھے۔

اس نجی جنازے کے بعد میت کو باہر لایا گیا، جہاں لاکھوں کے مجمعے میں علامہ شبیر احمد عثمانی نے ان کی سرکاری اور عوامی نمازِ جنازہ پڑھائی۔

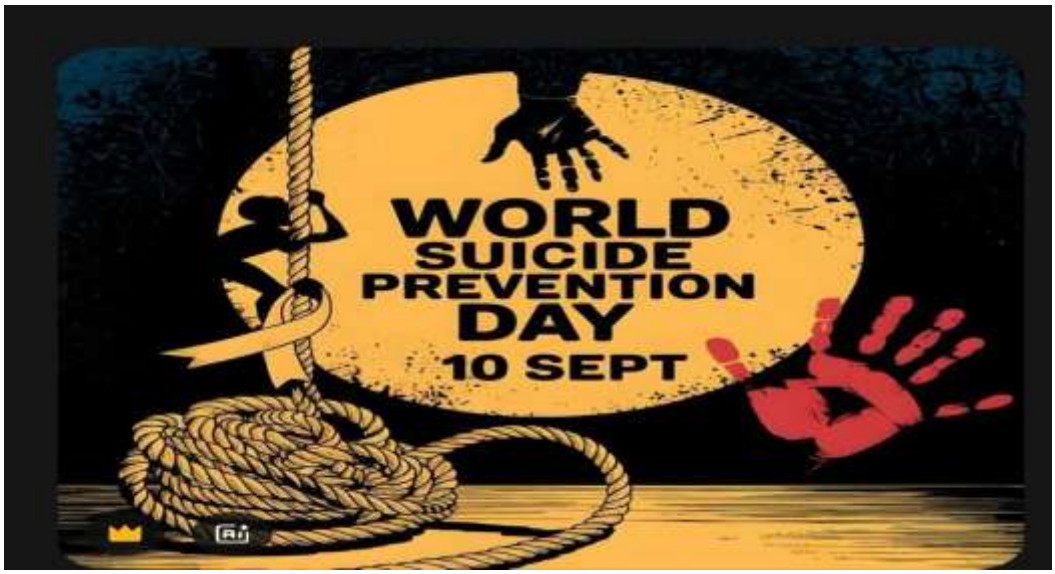

10 ستمبر۔۔عالمی یومِ انسدادِ خودکشی (World Suicide Prevention Day)۔عالمی اور پاکستان کے تناظر میں۔

عالمی یومِ انسدادِ خودکشی (World Suicide Prevention Day) ہر سال 10 ستمبر کو منایا جاتا ہے

اس دن کا آغاز 2003ء میں International Association for Suicide Prevention (IASP) نے World Health Organization (WHO) کے اشتراک سے کیا۔ بنیادی مقصد یہ تھا کہ خودکشی کو ایک ناقابلِ علاج یا ناگزیر المیہ سمجھنے کے بجائے اسے ایک قابلِ پیش گوئی اور قابلِ روک تھام عوامی صحت کے مسئلے کے طور پر دنیا کے سامنے لایا جائے، خودکشی سے متعلق خاموشی اور بدنامی کم کی جائے اور حکومتوں، طبی اداروں، تعلیمی اداروں، میڈیا، خاندانوں اور معاشرے کو مشترکہ اقدامات پر آمادہ کیا جائے۔

ائی اے ایس پی کے مطابق اب یہ دن 60 سے زائد ممالک میں مختلف نوعیت کی سینکڑوں سرگرمیوں کے ذریعے منایا جاتا ہے۔

اس وقت عالمی مہم کا تین سالہ موضوع ہے

"Changing the Narrative on Suicide"

یعنی خودکشی کے بارے میں سوچ اور گفتگو کا انداز تبدیل کر لیں

اسی طرح۔2026ء میں اس کا خصوصی پیغام

"Start the Conversation"

ہے۔ مقصد یہ ہے کہ خودکشی کو شرم، گناہ، کمزوری یا صرف ذاتی ناکامی کے طور پر دیکھنے کے بجائے انسان کی تکلیف، ذہنی دباؤ اور مدد کی ضرورت کے تناظر میں سمجھا جائے۔ عالمی ادارہ صحت کا پیغام ہے کہ خاموشی کے بجائے ہمدردانہ گفتگو، بروقت مدد اور مؤثر نظام قائم کیے جائیں۔

دنیا کے مختلف ممالک میں اس موقع پر آگاہی سیمینار، واکس، تعلیمی پروگرام، میڈیا مہمات، یونیورسٹی و اسکول سیشنز، یادگاری تقریبات، شمعیں روشن کرنا، عوامی مباحث، سوشل میڈیا مہمات اور ذہنی صحت کی خدمات سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ ائی اے ایس پی باقاعدہ پوسٹرز، سوشل میڈیا مواد اور سرگرمیوں کے رہنما اصول بھی فراہم کرتی ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کی تازہ ترین معلومات کے مطابق 2021ء میں تقریباً 727,000 افراد نے خودکشی کے نتیجے میں جان گنوائی اور عالمی سطح پر یہ شرح تقریباً 8.9 فی ایک لاکھ آبادی تھی۔

خودکشی 15–29 سال کے افراد میں دنیا بھر میں موت کی تیسری بڑی وجہ تھی۔ عالمی خودکشیوں میں تقریباً 73 فیصد کم اور متوسط آمدنی والے ممالک میں ہوئیں اور 56 فیصد اموات 50 سال سے کم عمر افراد میں ہوئی

خودکشی کی کوششیں اموات سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ WHO کے مطابق اوسطاً ہر ایک خودکشی کے مقابلے میں 20 سے زیادہ افراد خودکشی کی کوشش کرتے ہیں، تاہم یہ تناسب ملک، جنس، عمر اور طریقۂ کار کے لحاظ سے بہت مختلف ہوتا ہے۔ اس لیے اسے ہر ملک کے لیے ایک قطعی عدد سمجھنا درست نہیں۔

دنیا بھر میں مردوں کی خودکشی سے اموات خواتین کے مقابلے میں زیادہ ہیں، اگرچہ خواتین میں خودکشی کے خیالات اور کوششیں بعض معاشروں میں زیادہ رپورٹ ہوتی ہیں۔ WHO کے 2021ء کے اعداد کے مطابق 15–29 سال کے افراد میں خودکشی ایک انتہائی اہم مسئلہ ہے؛ اس عمر میں یہ خواتین میں موت کی دوسری اور مردوں میں تیسری بڑی وجہ تھی۔ لیکن عمر کے اعتبار سے مسئلہ صرف نوجوانوں تک محدود نہیں۔ خودکشی زندگی کے ہر مرحلے میں ہو سکتی ہے۔ تنہائی، بیماری، معاشی مشکلات، رشتوں کا ٹوٹنا، سوگ، سماجی تنہائی اور جسمانی تکلیف بعض عمر رسیدہ افراد میں بھی خطرہ بڑھا سکتی ہے

۔ WHO کے مطابق پہلے خودکشی کی کوشش کر چکا ہونا آئندہ خودکشی کا ایک نہایت اہم risk factor ہے۔ خودکشی کی وجوہات پر بات کرتے وقت یہ سمجھنا بہت ضروری ہے کہ عموماً کوئی ایک وجہ خودکشی کا سبب نہیں بنتی۔ اس کے پیچھے کئی عوامل ایک دوسرے سے جڑ سکتے ہیں، مثلاً شدید ڈپریشن یا دیگر ذہنی عوارض، مسلسل ذہنی دباؤ، تنہائی، گھریلو یا ازدواجی تنازعات، معاشی مشکلات، بے روزگاری، ناکامی کا احساس، جسمانی یا دائمی بیماری، تشدد یا بدسلوکی، کسی عزیز کی موت، امتیازی سلوک، نشہ، جنگ یا قدرتی آفات اور سماجی طور پر خود کو بے سہارا محسوس کرنا۔ بعض اوقات کوئی شخص شدید بحران کے چند لمحوں میں بھی انتہائی خطرناک فیصلہ کر سکتا ہے، اس لیے ہر خودکشی کو صرف کسی ایک ذہنی بیماری سے جوڑنا درست نہیں

۔ اہم بات یہ بھی ہے کہ خودکشی کے خیالات، منصوبہ بندی، خود کو نقصان پہنچانے کی کوشش اور بالآخر خودکشی ایک ہی چیز نہیں؛ لیکن یہ ایک continuum بن سکتے ہیں۔ اسی لیے ابتدائی علامات کو سنجیدگی سے لینا بہت ضروری ہے

پاکستان کے بارے میں سب سے بڑا مسئلہ قابلِ اعتماد قومی سطح کے اعداد و شمار کی کمی اور under-reporting ہے۔ WHO کی country estimates میں پاکستان کے لیے 2019ء کی عمر کے لحاظ سے معیاری شرح تقریباً 8.9 فی ایک لاکھ دی گئی، جبکہ ایک تحقیقی جائزے میں اسی WHO estimate کی بنیاد پر تقریباً 19,331 خودکشی اموات کا تخمینہ بیان کیا گیا ہے۔ مردوں کے لیے شرح تقریباً 13.3 فی ایک لاکھ اور خواتین کے لیے 4.3 فی ایک لاکھ بتائی گئی۔

تاہم ان اعداد کو پاکستان میں ہونے والی حقیقی اموات کی قطعی گنتی نہیں سمجھنا چاہیے۔ پاکستان میں مذہبی، سماجی، خاندانی اور قانونی حساسیت کے باعث بہت سے واقعات خودکشی کے طور پر درج نہیں ہوتے، بلکہ حادثہ، زہر خورانی یا کسی اور سبب کے طور پر رپورٹ ہو سکتے ہیں

۔ 2022ء میں خودکشی اور self-harm کو جرم قرار دینے والی سابقہ قانونی پوزیشن ختم کی گئی، لیکن اس کے باوجود سماجی stigma اور reporting کے مسائل برقرار ہیں۔

پاکستان میں عمر اور جنس کا ایک اہم تحقیقی نمونہ پاکستان کے 2019–2020ء کے اخباری ریکارڈ پر مبنی ایک تحقیقی مطالعے میں 2,295 مکمل شدہ خودکشیوں کی نشاندہی ہوئی۔ جن کیسز میں عمر دستیاب تھی، ان میں 21–30 سال کا گروپ سب سے زیادہ، یعنی 40.1 فیصد، جبکہ 10–20 سال کا گروپ 31.1 فیصد تھا۔ جنس معلوم ہونے والے تمام کیسز میں تقریباً 61.9 فیصد مرد اور 38.1 فیصد خواتین تھیں۔ لیکن اس مطالعے میں 41.5 فیصد کیسز کی عمر اور 51.1 فیصد کیسز کی ازدواجی حیثیت دستیاب نہیں تھی؛ لہٰذا ان اعداد کو قومی آبادی کا مکمل demographic profile نہیں سمجھنا چاہیے۔

پاکستان میں خودکشی کی کوششوں کا قومی قابلِ اعتماد سالانہ عدد دستیاب نہیں۔ مختلف ہسپتالوں اور مطالعات میں اعداد بہت مختلف ملتے ہیں۔ ایک شائع شدہ تحقیقی جائزے کے مطابق 2019ء کے لیے بعض اندازوں میں 200,000 سے 400,000 self-harm acts تک کا ذکر ملتا ہے، مگر یہ قومی surveillance system سے حاصل شدہ قطعی تعداد نہیں ہے۔ مزید اہم بات یہ ہے کہ پاکستان کے بعض clinical studies میں خواتین، خصوصاً poisoning اور burns سے متعلق cases، زیادہ تعداد میں نظر آتی ہیں؛ ایک حالیہ scoping review میں مختلف مطالعات کے اندر ایسے cases میں خواتین کا تناسب تقریباً 63–82 فیصد تک رپورٹ ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "خودکشی کی کوشش" اور "خودکشی سے موت" کے gender patterns ایک جیسے نہیں؛ اس لیے دونوں کو الگ الگ سمجھنا ضروری ہے۔

۔پاکستان میں مسئلے کی اصل سنگینی کہاں ہے؟

پاکستان کے لیے سب سے بڑا چیلنج صرف واقعات کی تعداد نہیں بلکہ خاموشی، stigma اور data gap ہے۔ ایک پاکستانی clinical study میں خودکشی کی کوشش کے بعد emergency department آنے والے 352 افراد میں سے 249 یعنی 70.7 فیصد میں کسی نہ کسی psychiatric morbidity کی نشاندہی ہوئی۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ایسے افراد کو صرف "کمزور ارادے" یا "غلط فیصلہ" کہہ کر چھوڑنے کے بجائے طبی اور نفسیاتی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکومتِ پاکستان نے 2026ء میں mental health کو بنیادی صحت، تعلیم اور سماجی تحفظ کے نظام سے مربوط کرنے، national mental-health data dashboard تیار کرنے اور mental-health services کو telemedicine تک پھیلانے کی سمت میں اقدامات پر زور دیا ہے۔ یہ پیش رفت اہم ہے، مگر پاکستان کو ابھی ایک مکمل، قابلِ اعتماد national suicide surveillance اور prevention system کی ضرورت ہے۔

۔خودکشی کی روک تھام کیسے ممکن ہے؟ WHO کا LIVE LIFE framework اس سلسلے میں چار بنیادی اور evidence-based اقدامات تجویز کرتا ہے

:خطرناک ذرائع تک رسائی محدود کرنا، تاکہ شدید بحران کے لمحے میں جان بچانے کے لیے وقت مل سکے۔

میڈیا کی ذمہ دارانہ رپورٹنگ—خودکشی کو سنسنی خیز، رومانوی یا تفصیلی انداز میں پیش نہ کرنا

۔نوجوانوں میں emotional اور socio-emotional skills پیدا کرنا تاکہ وہ بحران، ناکامی اور دباؤ سے بہتر طور پر نمٹ سکیں۔

خطرے میں موجود افراد کی بروقت شناخت، assessment، treatment اور follow-up کرنا۔

اس کے ساتھ پاکستان میں اسکول اور کالج counselling، خاندانوں کی تربیت، primary healthcare میں mental-health screening، trained psychologists اور psychiatrists کی تعداد میں اضافہ، tele-/helplines، mental health، نشہ اور domestic violence سے نمٹنا، نوجوانوں کے لیے محفوظ ماحول، معاشی و سماجی support systems اور reliable national data collection نہایت اہم ہیں

۔سب سے اہم انسانی پیغام یہ ہے کہ خودکشی کی روک تھام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ اکثر انسان اپنی زندگی ختم نہیں کرنا چاہتا بلکہ اپنی ناقابلِ برداشت تکلیف ختم کرنا چاہتا ہے—اور اگر اسے بروقت کسی ایسے شخص، ادارے یا professional تک پہنچا دیا جائے جو اس کی بات سن سکے اور مدد کر سکے تو بحران کا رخ بدل سکتا ہے۔

اسی لیے World Suicide Prevention Day کا موجودہ پیغام

"Start the Conversation"

محض ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک عملی حکمتِ عملی ہے: خاموشی توڑیں، فیصلہ سنانے کے بجائے سنیں، خطرے کو سنجیدگی سے لیں اور ضرورت پڑنے پر فوری پیشہ ورانہ مدد تک پہنچائیں

۔ WHO کا بنیادی مؤقف بھی یہی ہے کہ خودکشی قابلِ روک تھام ہے، ناگزیر نہیں۔



۔9 ستمبر 1881ء: عرابی تحریک اور مصری قومی بیداری کا نقطہ آغاز

9 ستمبر 1881ء مصر کی جدید تاریخ کا وہ اہم سنگِ میل ہے جب انگریزی اور یورپی استعمار اور اندرونی استبداد کے خلاف اولین منظم عوامی و فوجی آواز بلند ہوئی۔ اس روز مشہور قوم پرست رہنما کرنل احمد عرابی کی قیادت میں عابدین اسکوائر میں جو مظاہرہ ہوا، اس نے مصر کی سیاسی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا۔

مصر میں نہر سویز کی تعمیر کا باقاعدہ آغاز 25 اپریل 1859ء کو مصری حکمران محمد سعید پاشا کے دور میں ہوا، جبکہ اس کا باقاعدہ افتتاح 17 نومبر 1869ء کو ان کے جانشین خدیو اسماعیل پاشا کے عہد میں کیا گیا۔ اس عظیم الشان منصوبے کی مجموعی لاگت ابتدائی اندازوں سے دوگنی ہو کر تقریباً 100 ملین ڈالر (تقریباً 433 ملین فرانک) تک جا پہنچی تھی

۔اس رقم (سرمائے) کا بڑا حصہ فرانسیسی سفارت کار فرڈیننڈ ڈی لیسپس کی قائم کردہ "سوئز کینال کمپنی" کے ذریعے حاصل کیا گیا، جس میں فرانسیسی سرمایہ کاروں نے 52 فیصد اور مصری حکومت نے قرضے لے کر 44 فیصد شیئرز خریدے تھے۔ اس کے علاوہ، مصری حکومت نے نہر کی کھدائی کے لیے لاکھوں مقامی مزدوروں کو انتہائی سخت حالات میں بغیر اجرت (بیگار اور زبردستی) کام پر لگا کر افرادی قوت کی صورت میں بھی ایک بھاری قیمت ادا کی تھی۔

خدیو اسماعیل پاشا کے شاہانہ اخراجات، نہر سویز کی کھدائی کے لئے یورپی بینکوں سے لیے گئے بھاری سود در سود قرضوں کی وجہ سے مصر شدید مالی بحران کا شکار ہوا۔

1876ء میں جب مصر دیوالیہ ہوا تو برطانیہ اور فرانس نے مشترکہ طور پر "ڈوئل کنٹرول" کے تحت مصر کی معیشت اور آمدنی کا نصف حصہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ تمام تر معاشی بوجھ مقامی کسانوں اور عوام پر بھاری ٹیکسوں کی صورت میں ڈال دیا گیا۔ فوجی اور شہری انتظامیہ میں تمام اعلیٰ عہدے ترکی اور چرکیسی (Circassian) نژاد غیر ملکی اشرافیہ کے پاس تھے۔ مقامی مصریوں کی ترقی کے راستے بند تھے اور انہیں فوج سے بے دخل کیا جا رہا تھا۔

احمد عرابی، جو خود ایک غریب مصری کسان (فلاح) کے بیٹے تھے، نے اس ناانصافی کے خلاف آواز اٹھائی اور 9 ستمبر 1881ء کو اس کی قیادت میں مصری افواج اور عوام نے قاہرہ کے مشہور عابدین محل کا گھیراؤ کیا۔ خدیو توفیق محل سے باہر آیا تو عرابی پاشا نے گھوڑے پر سوار ہو کر قوم کے درج ذیل مطالبات پیش کیے:

وزیرِ اعظم ریاض پاشا کی کٹھ پتلی حکومت کی فوری برطرفی

۔آئین کی بحالی اور مجلسِ شوریٰ (پارلیمنٹ) کا قیام۔

مصری فوج کی تعداد بڑھا کر 18,000 کرنا

جب خدیو توفیق نے مغرورانہ انداز میں کہا کہ۔

"یہ ملک اور اس کے لوگ مجھے وراثت میں ملے ہیں"،

تو عرابی پاشا نے وہ تاریخی جملہ کہا جو عرب دنیا میں آزادی کا استعارہ بن گیا:

"خدا کی قسم! جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ہم اب نہ تو وراثت میں دیے جائیں گے اور نہ ہی کسی کی غلامی قبول کریں گے"!

خدیو کو مجبوراً مطالبات تسلیم کرنے پڑے۔ فروری 1882ء میں قائم ہونے والی قوم پرست حکومت میں احمد عرابی کو وزیرِ دفاع (وزیرِ جہاد) بنایا گیا۔

انہوں نے ملک میں اصلاحات شروع کیں، لیکن برطانیہ اور فرانس اس خدشے سے خوفزدہ ہو گئے کہ نئی حکومت نہر سویز کا کنٹرول سنبھال لے گی جس پر برطانیہ نے جون 1882ء میں اپنے جنگی بحری جہاز اسکندریہ بھیجے اور جولائی میں شہر پر ہولناک بمباری کر کے اسے تباہ کر دیا۔ خدیو توفیق انگریزوں کی پناہ میں چلا گیا، جس پر جامعہ الازہر کے علماء اور مفتیِ اعظم نے خدیو کی برطرفی اور اس کے غدار ہونے کا فتویٰ جاری کیا

انگریزی افواج نے جب ساحل سے پیش قدمی کی تو عرابی پاشا کی افواج نے "کفرالدوار" کے مقام پر انگریزوں کو شکستِ فاش دی اور انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا۔ اس پر۔ انگریزوں نے اپنا راستہ بدلا اور نہر سویز کے راستے اسماعیلیہ سے قاہرہ کی جانب پیش قدمی کی۔ 13 ستمبر 1882ء کو تل الکبیر کے مقام پر فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ برطانوی افواج نے رات کے اندھیرے میں اچانک حملہ کیا، اور مصری فوج کے کچھ غدار افسروں کی مخبری و بے وفائی کے باعث عرابی پاشا کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ قاہرہ پر برطانوی قبضہ ہو گیا اور مصر عملاً برطانوی مستعمرہ بن گیا

۔احمد عرابی پر مقدمہ چلا کر پہلے موت کی سزا سنائی گئی، جسے بعد میں عمر بھر کی جلاوطنی میں بدل دیا گیا۔ مئی 1883ء میں انہیں جزیرہ سریندیپ (موجودہ سری لنکا) بھیج دیا گیا۔ سری لنکا میں اپنے 20 سالہ دورِ جلاوطنی کے دوران انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی تعلیمی بیداری کے لیے تاریخی کام کیا۔ انہوں نے 1892ء میں کولمبو میں "المدارسۃ الزاہرہ" (موجودہ زاہرہ کالج) کی بنیاد رکھی، جو سری لنکا میں مسلم تعلیم کا سب سے بڑا مرکز بنا۔ 1901ء میں خدیو عباس حلمی دوم نے انہیں معافی دی اور وہ واپس مصر لوٹ آئے، جہاں 1911ء میں ان کا انتقال ہوا۔

اگرچہ عرابی تحریک کو ملکی غداروں اور برطانوی سامراج نے کچل دیا اور مصر پر 1956ء تک برطانوی تسلط قائم رہا، لیکن اس تحریک نے مصری قومیت اور خود مختاری کی بنیاد رکھی

۔ "مصر مصریوں کے لیے ہے"

کا وہ نعرہ جو عرابی پاشا نے بلند کیا تھا، آگے چل کر 1919ء کی سعد زغلول کی تحریک اور 1952ء کے جمال عبد الناصر کے انقلاب کی مشعلِ راہ بنا



8 ستمبر-عالمی یوم خواندگی-پاکستان کے تناظر میں۔ حکومت شرح خواندگی میں اضافہ بھی چاہتی ہے۔۔۔ مگر بغیر بجٹ کے۔ کیا یہ ممکن ہے

عالمی یوم خواندگی (International Literacy Day) ہر سال 8 ستمبر کو منایا جاتا ہے

بین الاقوامی معیار (یونیسکو) کے مطابق خواندہ وہ شخص ہے جو مختلف سیاق وسباق میں تحریری اور چھپے ہوئے مواد کو پڑھنے، سمجھنے، تشریح کرنے، لکھنے اور حساب کتاب (Numeracy) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

پاکستان میں 10 سال یا اس سے زائد عمر کا وہ شخص خواندہ مانا جاتا ہے جو کسی بھی زبان میں اخبار یا رسالے سے کوئی سادہ عبارت پڑھ سکے، ایک سادہ خط لکھ سکے، اور بنیادی ریاضیاتی حساب (گنتی، جمع اور تفریق) کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب دنیا کے کئی ممالک آزاد ہوئے، تو یہ بات شدت سے محسوس کی گئی کہ دنیا کی ایک بہت بڑی آبادی بنیادی طور پر پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ ناخواندگی کو غربت، بیماری، اور پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ قرار دیا گیا۔

ستمبر 1965ء میں ایران کے دارالحکومت تہران میں وزرائے تعلیم کی ایک عالمی کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں ناخواندگی کے خاتمے پر بحث کی گئی اور عالمی برادری کو یہ یاد دلانے کے لیے کہ تعلیم کوئی عیاشی نہیں بلکہ انسان کا بنیادی حق اور وقار کا مسئلہ ہے کسی ایک دن کو خواندگی کے لئے مخصوص کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔

اس کے بعد 26 اکتوبر 1966ء کو یونیسکو کی 14 ویں جنرل کانفرنس میں باقاعدہ طور پر ہر سال 8 ستمبر کو یہ دن منانے کی قرارداد منظور کی گئی

دنیا بھر میں پہلا عالمی یومِ خواندگی 8 ستمبر 1967ء کو منایا گیا۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک (بشمول ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک) میں یہ دن منایا جاتا ہے۔

موجودہ عالمی رپورٹس (جیسے کہ یونیسکو اور ورلڈ پاپولیشن ریویو کے 2026ء کے ڈیٹا) کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں تقریباً 739 ملین (73 کروڑ 90 لاکھ) بالغ افراد بنیادی طور پر پڑھنے اور لکھنے کی صلاحیت سے محروم یعنی ناخواندہ ہیں۔

دنیا کی مجموعی شرحِ خواندگی (Literacy Rate) اس وقت تقریباً 87.7٪ ہے،

دنیا میں سے کم شرحِ خواندگی والے ممالک افریقہ کے ساحلی اور جنگ زدہ خطوں میں ہیں، جہاں حالیہ تخمینوں کے مطابق صورتحال کچھ یوں ہے :

- جنوبی سوڈان: شرحِ خواندگی تقریباً 26.8٪
- چاڈ: شرحِ خواندگی تقریباً 30.6٪
- مالی :(Mali) شرحِ خواندگی تقریباً 31٪ سے 35.4٪
- نائجر :(Niger) شرحِ خواندگی تقریباً 37٪ سے 38٪
- افغانستان: شرحِ خواندگی تقریباً 37.2٪

دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جہاں شرحِ خواندگی 100٪ (یا 99.9٪) ہے اور وہاں ناخواندگی تقریباً نہ ہونے کے برابر ہے۔ ان میں سرِفہرست ممالک یہ ہیں :

🥇 ازبکستان 100٪ :(Uzbekistan)

🥈 ناروے 100٪ :(Norway)

🥉 شمالی کوریا: 100٪

🏅 فن لینڈ: 100٪

🏅 انڈورا / لکسمبرگ 100 ٪ :

پاکستان کے آفیشل اقتصادی سروے (Economic Survey 2025-26) کے مطابق، پاکستان میں 10 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کی مجموعی شرحِ خواندگی 63٪ ہے۔ مردوں میں شرحِ خواندگی 73٪ جبکہ خواتین میں صرف 54٪ ہے ۔پاکستان کا شمار دنیا کے کم خواندگی والے ممالک میں ہوتا ہے۔ اگر صرف جنوبی ایشیا (South Asia) کی بات کی جائے، تو بین الاقوامی تعلیمی ڈیٹا کے مطابق پاکستان اپنے خطے میں سب سے نیچے فال کرتا ہے، کیونکہ اس کے پڑوسی ممالک (جیسے بھارت، سری لنکا، اور مالدیپ) کی شرحِ خواندگی پاکستان سے نمایاں طور پر زیادہ ہے۔

شرحِ خواندگی کے لحاظ سے پاکستان میں صوبہ پنجاب: پہلے نمبر پر ہے، جہاں شرحِ خواندگی تقریباً 66٪ سے 68٪ ہے۔ سندھ: دوسرے نمبر پر ہے، جہاں یہ شرح تقریباً 58٪ ہے۔ خیبر پختونخوا :(KP) تیسرے نمبر پر ہے، جہاں شرحِ خواندگی تقریباً 51٪ سے 58٪ کے درمیان ریکارڈ کی گئی ہے اور بلوچستان: چوتھے (آخری) نمبر پر ہے، جہاں شرحِ خواندگی سب سے کم یعنی تقریباً 42٪ سے 49٪ ہے۔

پاکستان بیورو آف شماریات (PBS) کی ساتویں مردم شماری 2023 کے مطابق پاکستان کے 136 اضلاع میں شرحِ خواندگی کے لحاظ سے اسلام آباد 83.91٪ کے ساتھ پہلے، کراچی وسطی 83.65٪ کے ساتھ دوسرے، راولپنڈی 83.23٪ کے ساتھ تیسرے، گجرات 81.34٪ کے ساتھ چوتھے اور جہلم 80.63٪ کے ساتھ پانچویں نمبر پر ہے۔ یہ شرح 10 سال اور اس سے زائد عمر کی آبادی کو ظاہر کرتی ہے۔

اس دن کو منانے کے یونیسکو ہر سال ایک مخصوص تھیم (جیسے ڈیجیٹل دور میں خواندگی، پائیدار معاشروں کا قیام وغیرہ) جاری کرتا ہے، جس کے گرد تمام سرگرمیاں گھومتی ہیں۔ اور یونیسکو کی طرف سے دنیا بھر میں خواندگی کے لیے بہترین کام کرنے والی تنظیموں اور افراد کو انعامات دیے جاتے ہیں۔ اسکولوں، یونیورسٹیوں اور سماجی تنظیموں کی طرف سے مذاکرے، واک اور ریلیاں نکالی جاتی ہیں۔ اور کئی ممالک میں لوگ اس دن غریب بچوں کو کتابیں تحفے میں دیتے ہیں اور لائبریریوں کے لیے فنڈز جمع کرتے ہیں

پاکستان میں بھی یہ دن ہر سال سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر منایا جاتا ہے، لیکن یہاں کا تعلیمی پس منظر کافی تشویشناک رہا ہے :
پاکستان کے آئین کے آرٹیکل 25 A- کے تحت ریاست 5 سے 16 سال تک کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرنے کی پابند ہے۔

اس وقت بڑا چیلنج (آؤٹ آف اسکول بچے) ہیں حالیہ رپورٹس کے مطابق پاکستان میں 2 کروڑ 50 لاکھ سے زائد بچے اسکولوں سے باہر ہیں، جو کہ دنیا میں اسکول نہ جانے والے بچوں کی دوسری بڑی تعداد ہے۔

حکومتِ پاکستان اور پنجاب نے آؤٹ آف سکول بچوں کو خواندہ بنانے کے لیے متعدد اہم اقدامات کیے ہیں جن کے ملے جلے اثرات سامنے آئے ہیں۔ ان کوششوں میں 'پنجاب لٹریسی اینڈ نان فارمل بیسک ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ' کے تحت صوبہ بھر میں ہزاروں نان فارمل اسکولوں کا قیام، "تعلیمی ہنگامی حالت" کا نفاذ، 'بینظیر تعلیمی وظائف' کے ذریعے غریب خاندانوں کی مالی معاونت، اور نجی شعبے کے تعاون سے چلنے والا 'پنجاب ایجوکیشن فاؤنڈیشن '(PEF) کا نیٹ ورک شامل ہیں، جو لاکھوں محروم بچوں کو مفت تعلیم فراہم کر رہا ہے۔ ان اقدامات کے نتیجے میں دور دراز علاقوں، بالخصوص لڑکیوں اور اینٹوں کے بھٹوں پر کام کرنے والے بچوں کی اسکولوں تک رسائی میں واضح بہتری آئی ہے اور شرحِ خواندگی میں اضافہ ہوا ہے۔

تاہم، بڑھتی ہوئی آبادی، غربت، اور بجٹ کی کمی جیسے چیلنجز کے باعث اب بھی لاکھوں بچے اسکولوں سے باہر ہیں، جس کی وجہ سے ان پالیسیوں کے سو فیصد نتائج حاصل کرنے کے لیے مزید پائیدار اور وسیع تر اصلاحات کی ضرورت ہے۔

پنجاب حکومت نے مالی سال 2026-27 کے بجٹ میں تعلیم کے شعبے کے لیے مجموعی طور پر 750 ارب روپے (جبکہ محکمہ اسکول ایجوکیشن کے لیے قریباً 614 ارب روپے) مختص کیے ہیں، جو کہ فی طالب علم تقریباً 53,000 سے 62,500 روپے سالانہ بنتے ہیں۔

پنجاب کا کل تعلیمی بجٹ: 750 ارب روپے ہے جس میں غیر ترقیاتی اخراجات (تنخواہیں وغیرہ): 686 ارب 80 کروڑ روپے اور ترقیاتی بجٹ (انفراسٹرکچر اور بہتری): 63 ارب 30 کروڑ روپے ہے۔ اور محکمہ اسکول ایجوکیشن (SED) کا حصہ: قریباً 614 ارب روپے (جاری اور ترقیاتی اخراجات ملا کر) بنتا ہے۔

فی طالب علم شرح کا تخمینہ کے لئے مندرجہ زیل اعداد و شمار دلچسپی کے حامل ہیں اور ساتھ حکومت کی تعلیمی شعبے میں سنجیدگی کی سطح کو بھی ظاہر کرتے ہیں

پنجاب کے سرکاری اسکولوں میں زیرِ تعلیم بچوں کی تعداد تقریباً 1 کروڑ 20 لاکھ سے 1 کروڑ 40 لاکھ کے درمیان ہے اور کل تعلیمی بجٹ (750 ارب روپے) کو اگر اوسطاً طلباء کی اس تعداد پر تقسیم کیا جائے تو فی طالب علم سالانہ شرح 53,571 روپے سے 62,500 روپے بنتی ہے۔ جو پانچ ہزار روپے ماہانہ کے قریب ہے۔ اس میں اساتذہ کی تنخواہیں اور دیگر اخراجات بھی شامل ہیں

۔اب حکومت پنجاب PEF اور PEIMA کے تحت ان سکولوں کو ائوٹ سورس کر کے بچت کی عمدہ مثال قائم کر چکی ہے

۔اور ان نجی اداروں اور پرائیویٹ لائسنی کو صرف 1200 روپے فی طالب علم (ایک اچھی خاصی کتوتی کے بعد یہ رقم اوسطا " 700 تا 800 روپے رہ جاتی ہے (ادا کر کے اپنی زمہ داری پوری کر رہی ہے اور اس ذریعے سے کروزوں ائوت اف سکول بچوں کو خواندہ بنانے کے خواب بھی دیکھ رہی ہے



7 ستمبر: یومِ فضائیہ پاکستان—جب عددی برتری ایمان کے جذبوں سے ہار گئی !

61 سال قبل، 1965ء کی جنگِ ستمبر میں پاک فضائیہ (PAF) کے شاہینوں نے اپنے سے چار گنا بڑی بھارتی فضائیہ کے غرور کو خاک میں ملا کر فضائی شجاعت کی وہ تاریخ لکھی جس کی مثال دنیا کی فوجی تاریخ میں نہیں ملتی۔

1965ء کی پاک بھارت جنگ میں بھارتی فضائیہ کو پاکستان فضائیہ پر تقریباً 4:1 یا 5:1 کا عددی برتری کا تناسب حاصل تھا، بھارت کے پاس اس وقت تقریباً 460 سے 730 جنگی طیارے اور بڑا فضائی بیڑا موجود تھا جبکہ پاکستان کے پاس تقریباً 180 سے 280 جنگی طیارے (جن میں F-86 سیبر اور F-104 اسٹار فائٹر شامل تھے)۔

تاہم اس عددی تناسب کے باوجود اس تاریخی معرکے کی چند ایسی یادیں بھی ہیں جو ہر پاکستانی کا سر فخر سے بلند کر دیتی ہیں: ان میں

- ایم ایم عالم کا عالمی ریکارڈ سر فہرست ہے: اسکواڈرن لیڈر ایم ایم عالم نے سرگودھا کے محاذ پر اپنے ایف-86 سیبر طیارے سے دشمن کے 5 ہنٹر جنگی طیارے محض ایک منٹ (اور پہلے 4 طیارے صرف 30 سیکنڈ) کے اندر مار گرائے۔ یہ ناقابلِ یقین ورلڈ ریکارڈ آج بھی قائم ہے۔

🔷 سرفراز رفیقی شہید کی لازوال قربانی بھی قوم کے لئے سرمایہ افتخار ہے۔ دورانِ جنگ گنیں جام ہو جانے کے باوجود سرفراز رفیقی میدان سے پیچھے نہ ہٹے، بلکہ اپنے ساتھی پائلٹس کی جان بچانے کے لیے دشمن کے آگے ڈھال بن کر جامِ شہادت نوش کیا اور ہلالِ جرات پایا۔ اسی طرح سیف الاعظم کا منفرد اعزاز بھی اس جنگ کا اہم واقعہ ہے۔ وہ دنیا کے مایہ ناز پائلٹ جنہوں نے 1965ء میں بھارتی فضائیہ کا ایک فولینڈ نیٹ (Folland Gnat) طیارہ مار گرایا اور بعد میں عرب اسرائیل جنگ میں صرف 72 گھنٹوں میں اسرائیل کے 4 جنگی طیارے تباہ کیے۔

جدید آلات کی کمی کے باوجود، پاکستانی پائلٹس نے رات کے اندھیرے میں بھارت کے اندرونی فضائی اڈوں (ہلوارہ اور آدم پور) پر وہ ہولناک بمباری کی کہ دشمن دن میں بھی لڑنے کے قابل نہ رہا۔

7 ستمبر کو دشمن نے پاک فضائیہ کے سب سے بڑے مرکز پر پے در پے حملے کیے، لیکن ہمارے پائلٹس اور اینٹی ایئر کرافٹ گنرز نے سرگودھا کی فضاؤں کو بھارتی طیاروں کا قبرستان بنا دیا۔

اس جنگ میں اگر نقصانات کا تخمینہ لگایا جائے تو دنیا کو صرف یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ کس طرح کم وسائل کے باوجود پاکستانی افواج نے اپنے وطن کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ دشمن کو ایک تاریخی سبق بھی دیا۔

پاکستان کے مطابق اس جنگ میں بھارت کے 104 سے 110 (بعض روایات میں 135 تک) طیارے تباہ کیے گئے جن میں سے ایک بڑا حصہ زمین پر اور کچھ فضا میں گرائے گئے۔ جبکہ پاک فضائیہ کے اپنے ریکارڈ کے مطابق پاکستان کے صرف 19 طیارے ضائع ہوئے۔

جنگِ ستمبر 1965ء کے دوران پاک فضائیہ کے 10 افسران اور جوان شہید ہوئے تھے جبکہ بھارتی فضائیہ کے جانی نقصانات کے بارے میں مصدقہ اور متفقہ اعداد و شمار عام نہیں ہیں، تاہم پاکستان کے اعداد کے مطابق اگر 104 تا 110 طیارے تباہ کرنا تسلیم کیا جائے تو اس میں اس نسبت سے ہلاکتیں بھی شامل ہیں. البتہ غیر جانبدار ذرائع کے مطابق 60 سے زائد انڈیا کے طیارے تباہ ہوئے تھے جن میں ان کے پائلٹس اور عملے کا جانی نقصان بھی شامل تھا تاہم بھارتی ذرائع اور سرکاری ریکارڈ کے مطابق: بھارتی فضائیہ کے 59 طیارے تباہ ہوئے (جن میں سے ادھے سے زیادہ زمین پر تباہ کیے گئے)۔ بھارت کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے پاکستان کے 43 طیارے تباہ کیے۔ جو کہ ایک مبالغہ اور عوام میں اپنے تاثر کو بہتر رکھنا بھی ہو سکتا ہے کیونکہ . غیر جانبدار اور بین الاقوامی ذرائع کے مطابق بھارت کے تقریباً 60 سے 75 (یا اس سے زائد) طیارے تباہ ہوئے جبکہ پاکستان کے نقصانات کا اندازہ 20 سے زائد طیاروں کے درمیان لگایا گیا۔ جو پاکستان کے اپنے ریکارڈ کے قریب تر ہے۔ 7 ستمبر کا یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جنگیں صرف مادی وسائل سے نہیں، بلکہ غیرتِ ایمانی، سخت تربیت اور وطن سے سچی محبت سے جیتی جاتی ہیں۔ پاک فضائیہ کے ان تمام غازیوں اور شہیدوں کو سلام عقیدت جنہوں نے ہماری فضاؤں کو ہمیشہ کے لیے محفوظ بنا دیا



6 ستمبر یوم دفاع۔ جنگِ ستمبر 1965 ــــ قومی بیانیے سے آگے

تاریخی حقائق۔۔۔ کون جیتا۔ کون ہارا؟؟؟

اگر جنگِ ستمبر 1965 کو صرف قومی جذبات یا سرکاری پروپیگنڈے کے بجائے زمانی ترتیب، دونوں ممالک کے سرکاری عسکری ریکارڈ، اقوام متحدہ کے دستاویزات اور بعد کے تاریخی مطالعات کی روشنی میں دیکھا جائے تو ایک نسبتاً متوازن تصویر سامنے آتی ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ 6 ستمبر کو جنگ کا آغاز اور اگست / ستمبر سے جاری پاک بھارت عسکری تصادم کا آغاز دو الگ باتیں ہیں

1965 کی جنگ کو سمجھنے کے لیے 6 ستمبر سے کچھ ماہ پیچھے جانا ضروری ہے۔ 1965 کے اوائل میں پاکستان اور بھارت کے درمیان رَن آف کچھ کے سرحدی علاقے میں شدید جھڑپیں ہوئیں۔ پاکستان کا مؤقف تھا کہ بھارتی افواج متنازع علاقے میں داخل ہوئی تھیں، جبکہ بھارت پاکستان پر پیش قدمی کا الزام عائد کرتا تھا۔ اپریل میں لڑائی بڑھی، برطانوی ثالثی سے جنگ بندی ہوئی اور بعد ازاں معاملہ ثالثی کے لیے بھیجا گیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ خود بھارتی سرکاری تاریخ میں بھی رَن آف کچھ کے تنازعے کو 1965 کے واقعات کے باقاعدہ ابتدائی باب کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

پاکستانی ریکارڈ کے مطابق رَن آف کچھ میں پاکستانی کارروائی کے بعد حکومتِ پاکستان نے کشمیر کے مسئلے کو دوبارہ متحرک کرنے کے لیے اگست 1965 میں اپریشن جبرالٹر کا فیصلہ کیا۔ پاکستانی منصوبہ یہ تھا کہ مقبوضہ کشمیر میں مسلح افراد / تربیت یافتہ اہلکار داخل کیے جائیں، مقامی آبادی کو بھارتی حکومت کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا جائے اور کشمیر کے مسئلے کو دوبارہ بین الاقوامی سطح پر اجاگر کیا جائے۔ لیکن یہ منصوبہ اپنے بنیادی مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مقامی سطح پر وہ وسیع عوامی مزاحمتی تحریک نہ چل پائی جس کی پاکستان کو توقع تھی، جبکہ بھارتی افواج کو پاکستانی مداخلت کا علم ہو گیا۔ بھارتی حکومت کا سرکاری بیان بھی Operation Gibraltar کو جنگ کے اگلے مرحلے کا بنیادی سبب قرار دیتا ہے۔

اپریسن جبرالٹر کے بعد بھارتی افواج نے کشمیر میں جوابی کارروائیاں شروع کیں۔ اگست کے وسط سے دونوں طرف باقاعدہ فوجی لڑائی بڑھ گئی اور 15 سے 31 اگست کے دوران بھارتی افواج نے کشمیر کے مختلف سیکٹروں میں پیش قدمی کی اور حاجی پیر پر قبضہ کیا۔

یہ مرحلہ اس لحاظ سے اہم ہے کہ یہاں تک جنگ بنیادی طور پر کشمیر کے متنازع علاقے اور Ceasefire Line کے گرد مرکوز تھی۔ یعنی ابھی تک بھارت نے پاکستان کی بین الاقوامی سرحد عبور کر کے لاہور یا سیالکوٹ پر حملہ نہیں کیا تھا۔

پاکستان نے جنگ کو ایک نئے مرحلے میں داخل کیا یکم ستمبر 1965 کو پاکستان نے Operation Grand Slam شروع کیا۔ اس کا مرکزی ہدف چمب، جوریاں اور بالآخر اکھنور (Akhnoor) تھا۔ اکھنور کشمیر میں بھارتی افواج کے لیے ایک نہایت اہم مواصلاتی رابطہ تھا۔ پاکستانی فوجی منصوبہ بندی کے مطابق اکھنور پر قبضہ بھارتی افواج کے کشمیر سے زمینی رابطے کے لیے شدید خطرہ پیدا کر سکتا تھا۔ ابتدائی مرحلے میں پاکستانی فوج نے نمایاں کامیابی حاصل کی؛ چمب، پالانوالہ اور جوریاں کے علاقوں میں پیش قدمی ہوئی اور 5/6 ستمبر کی رات تک پاکستانی دستے اکھنور کے قریب پہنچ چکے تھے۔ پاکستان اسی مرحلے کو اہم کامیابی قرار دیتا ہے۔

جواب میں بھارت نے مقبوضہ کشمیر تک محدود رہنے کے بجائے لاہور اور سیالکوٹ کے شعبوں پر مکمل پیش قدمی کر کے اس مقامی تنازع کو ایک مکمل بین الاقوامی جنگ میں بدل دیا۔ 17 دن تک جاری رہنے والی اس جنگ میں دونوں جانب سے شدید زمینی و فضائی معرکے لڑے گئے غیر جانبدار بین الاقوامی تخمینوں کے مطابق اس جنگ میں دونوں اطراف کا بھاری جانی و مالی نقصان ہوا۔ پاکستان کے تقریباً 3,800 اور بھارت کے 3,000 سے 3,700 کے قریب فوجی ہلاک ہوئے، جبکہ دونوں جانبین کے سینکڑوں ٹینک اور درجنوں طیارے تباہ ہوئے۔ جنگ کے خاتمے پر پاکستان نے راجستھان اور چھمب کے علاقوں میں جبکہ بھارت نے لاہور اور سیالکوٹ کے سرحدی حصوں میں کچھ رقبے پر قبضہ کر رکھا تھا

1965ء کی جنگ میں پاکستان کی دفاعی حکمتِ عملی بنیادی طور پر "محدود وسائل کے ساتھ جارحانہ دفاع (Aggressive Defense)" پر مبنی تھی، جس کا مقصد اپنے سے کئی گنا بڑے دشمن کی پیش قدمی کو سرحدوں پر ہی روکنا تھا۔ جب بھارتی فوج

نے لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں پر اچانک بین الاقوامی سرحد عبور کی، تو پاک فوج نے بی آر بی (BRB) نہر کو ایک قدرتی دفاعی ڈھال کے طور پر استعمال کیا اور اس کے پلوں کو اڑا کر دشمن کی بھاری بکتر بند گاڑیوں کی پیش قدمی کو وہیں منجمد کر دیا۔ سیالکوٹ کے چونڈہ محاذ پر، جہاں دشمن نے ٹینکوں کے ذریعے بڑا حملہ کیا تھا

، پاکستان نے اپنی اسٹرٹیجک کور (Strategic Corps) کو متحرک کر کے تاریخ کا سب سے بڑا ٹینکوں کا دفاعی معرکہ لڑا اور دشمن کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ پاک فضائیہ نے اس حکمتِ عملی کے تحت فوری طور پر جارحانہ پوزیشن لی اور جنگ کے ابتدائی گھنٹوں میں ہی بھارتی فضائی اڈوں پر فضائی حملے (Air Strikes) کر کے دشمن کی فضائی قوت کو مفلوج کر دیا، جس سے زمینی فوج کو محفوظ فضائی چھتری میسر آئی۔ اس دفاعی حکمتِ عملی کی کامیابی میں انٹیلیجنس اور غیر معمولی فوجی شجاعت کا امتزاج شامل تھا، جس نے کم افرادی قوت کے باوجود دشمن کے "سرپرائز" کو ناکام بنایا۔ پاک بحریہ نے دفاع کو مزید مضبوط کرنے کے لیے "آپریشن دوارکا" کے ذریعے بھارتی حدود میں جا کر حملہ کیا، جس کا مقصد بھارتی بحریہ کی توجہ پاکستان کے ساحلوں اور کراچی بندرگاہ سے ہٹانا تھا۔ زمینی محاذ پر میجر راجہ عزیز بھٹی شہید جیسے کمانڈروں نے دفاعی چوکیوں پر آخری گولی اور آخری سانس تک لڑنے کی حکمتِ عملی اپنائی، جس نے دشمن کی عددی برتری کو نفسیاتی طور پر شکست دی۔ پاکستان کی اس کامیاب دفاعی پلاننگ اور جوانوں کی لازوال شہادتوں نے بین الاقوامی سطح پر یہ ثابت کر دیا کہ سائز میں چھوٹا ہونے کے باوجود پاکستان کا دفاعی نظام ناقابلِ تسخیر ہے۔

۔جنگ کو مزید پھیلنے سے روکنے کے لیے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے مداخلت کی اور 20 ستمبر 1965ء کو قرار داد نمبر 211 منظور کی، جس کے نتیجے میں 23 ستمبر کو فائر بندی عمل میں آئی۔ بعد ازاں سوویت یونین کی ثالثی میں 10 جنوری 1966ء کو ازبکستان کے شہر تاشقند میں صدر ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کے درمیان 'معاہدہ تاشقند' طے پایا۔ اس معاہدے کی بنیادی شرائط کے تحت دونوں ممالک اپنی افواج کو 5 اگست 1965ء کی سابقہ سرحدی موقعیت پر واپس بلانے، قیدیوں کے تبادلے، اور ایک دوسرے کے داخلی امور میں عدم مداخلت کے پابند ہوئے۔ معاہدہ تاشقند کے فوری بعد کے واقعات نے دونوں ممالک کی داخلی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ معاہدے پر دستخط کے اگلے ہی دن بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری کا ناگہانی انتقال ہو گیا، جبکہ بھارت نے اپنی دفاعی پالیسی پر از سرِ نو غور کرتے ہوئے فوجی جدید کاری کا آغاز کیا۔

پاکستان میں جنگ کے نتائج اور میڈیا کے بیانیے کے تضاد کے باعث عمومی عوامی سطح پر شدید مایوسی پھیلی۔ اس سیاسی تحرک کے نتیجے میں وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو ایوب خان سے الگ ہو گئے، جس نے آگے چل کر ایوب حکومت کے خاتمے اور نئی سیاسی صف بندیوں کی راہ ہموار کی۔

اس جنگ کے بین الاقوامی اور جیو پولیٹیکل نتائج بھی اہم رہے۔ جنگ کے بعد امریکہ اور برطانیہ نے دونوں ممالک پر اسلحے کی فراہمی پر پابندی (Arms Embargo) عائد کر دی۔ اس پابندی کا زیادہ اثر پاکستان پر پڑا جو مغربی دفاعی بلاک کا حصہ اور امریکی اسلحے پر انحصار کرتا تھا، جس کے بعد پاکستان کے سفارتی تعلقات کا جھکاؤ چین اور سوویت یونین کی طرف بڑھنے لگا۔ مشرقی پاکستان کے حوالے سے اس جنگ کے اثرات انتہائی حاسمانہ ثابت ہوئے۔ جنگ کے دوران جب تمام تر دفاعی حکمت عملی مغربی پاکستان پر مرکوز تھی، تو مشرقی پاکستان کی آبادی نے خود کو شدید سفارتی اور دفاعی تنہائی میں محسوس کیا۔ اس احساسِ محرومی اور غیر محفوظ ہونے کے تاثر نے وہاں کی سیاسی قیادت کو مزید الگ تھلگ کیا، جس نے 1966ء میں شیخ مجیب الرحمن کے چھ نکات اور بالآخر 1971ء کے بحران کے لیے ایک مضبوط سیاسی و معاشی بنیاد فراہم کی۔ مجموعی طور پر، 6 ستمبر 1965ء کی جنگ نے جہاں دونوں ممالک کی مسلح افواج کی دفاعی صلاحیتوں اور معرکوں کو نمایاں کیا، وہیں اس نے جنوبی ایشیا کی سیاسی، سفارتی اور جغرافیائی تاریخ پر ایسے عمیق نقوش چھوڑے جن کے اثرات دہائیوں تک خطے کی سیاست پر محیط رہے۔

ایک عام قاری کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ

کیا 1965 کی جنگ میں کوئی فاتح تھا؟ فوجی اعتبار سے اسے فیصلہ کن فتح کہنا مشکل ہے۔ پاکستان نے: کشمیر میں ابتدائی خفیہ کارروائی کی؛ Grand Slam کے ذریعے اکھنور کو شدید خطرے میں ڈالا؛ لاہور اور سیالکوٹ پر بھارتی حملے کو روکا؛ بعض بھارتی علاقوں پر قبضہ کیا؛ اور بھارت کو فوری طور پر اپنے بنیادی سیاسی مقصد یعنی کشمیر پر فیصلہ کن کامیابی حاصل کرنے سے روک دیا۔ لیکن پاکستان: کشمیر میں عوامی بغاوت پیدا نہ کر سکا؛ Operation Gibraltar ناکام ہوا؛ اکھنور پر قبضہ مکمل نہ کر سکا؛ اور جنگ کے نتیجے میں کشمیر کا بنیادی مسئلہ حل نہ ہوا۔

بھارت نے: کشمیر میں پاکستانی infiltration کو ناکام بنایا؛ حاجی پیر سمیت بعض اہم مقامات حاصل کیے؛ 6 ستمبر کو بین الاقوامی سرحد عبور کر کے جنگ کا دائرہ وسیع کیا؛ لاہور اور سیالکوٹ کے محاذوں پر پاکستانی فوج کو انگیج کر دیا؛ اور پاکستان کو کشمیر کا مسئلہ فوجی طاقت سے حل کرنے سے روکنے میں کامیابی حاصل کی۔ لیکن بھارت بپاکستان کو شکست نہ دے سکا اور نہ کوئی بڑا مستقل علاقائی یا سیاسی فائدہ حاصل کر سکا؛ کشمیر پر اپنا دعویٰ تبدیل نہ کرا سکا؛ اور جنگ کے دوران حاصل کیے گئے مقامات بالآخر واپس کر دیے۔

اسی لیے جدید تاریخی اصطلاح میں 1965 کی جنگ کو زیادہ مناسب طور پر "inconclusive war" یا فوجی تعطل (stalemate) کہا جاتا ہے۔ جنگ کا آخری علاقائی نتیجہ بھی بنیادی طور پر status quo ante یعنی جنگ سے پہلے کی پوزیشنوں کی طرف واپسی تھا۔



05 ستمبر - خیرات کا عالمی دن (International Day of Charity)

ہر سال 5 ستمبر کو خیرات کا عالمی دن (International Day of Charity) منایا جاتا ہے

۔اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد غریت کا خاتمہ، ضرورت مندوں کی مدد اور معاشرے میں ہمدردی کے جذبے کو فروغ دینا ہے۔

یہ دن مایہ ناز سماجی کارکن مدر ٹریسا کی برسی کے موقع پر منایا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی غریبوں، بیماروں اور بے سہارا لوگوں کی خدمت میں گزاری۔ 1979ء میں انہیں ان کی انسانی خدمات پر نوبل امن انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ ان کا انتقال 5 ستمبر 1997ء کو ہوا تھا۔

ان کی خدمات کے اعتراف میں اور ان کی یاد میں ہنگری کی سول سوسائٹی کی پیشکش (Motion) پر، اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2012ء میں باقاعدہ طور پر ایک قرارداد منظور کی جس کے تحت ہر سال 5 ستمبر کو خیرات کا عالمی دن منانے کا فیصلہ کیا ۔تاکہ دنیا بھر میں لوگوں، این جی اوز (NGOs) اور مخیر حضرات کو ضرورت مندوں کی مدد کے لیے متحد کیا جائے. یہ دن دنیا بھر کے ان تمام 193 ممالک میں منایا جاتا ہے جو اقوام متحدہ (UN) کے ارکان ہیں۔

اقوام متحدہ کے 2030ء کے ایجنڈے کے تحت غریبت کا خاتمہ، بھوک مٹانا، اور صحت و تعلیم کی سہولیات عام کرنا اس دن کے بنیادی اہداف ہیں اور یہ کہ لوگوں کو اس بات کا احساس دلانا کہ ان کا چھوٹا سا تعاون بھی کسی کی زندگی بدل سکتا ہے۔ نیز نوجوانوں اور معاشرے کے دیگر طبقات کو انسانیت کی خدمت اور رضاکارانہ کاموں (Volunteering) کی طرف مائل کرنا بھی اس دن کی اہمیت کو نمایاں کرتا ہے۔

اس دن کے منانے سے عوام میں آگاہی پیدا ہوتی ہے اور خیرات کے ذریعے غریب اور پسماندہ طبقات کو فوری مالی اور طبی امداد ملتی ہے، جس سے معاشرے میں جرم اور مایوسی کم ہوتی ہے

اس دن دنیا بھر میں فنڈز جمع کرنے کی بڑی مہمات چلائی جاتی ہیں، جس سے ہسپتالوں، یتیم خانوں اور اسکولوں کو مالی مدد حاصل ہوتی ہے۔

یہ دن نسل، رنگ اور مذہب سے بالاتر ہو کر صرف انسانیت کی بنیاد پر ایک دوسرے کے کام آنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

پاکستان میں بھی یہ دن ہر سال بھرپور طریقے سے منایا جاتا ہے۔ پاکستان دنیا کے ان چوٹی کے ممالک میں شمار ہوتا ہے جہاں کے لوگ سب سے زیادہ عطیات اور خیرات دیتے ہیں۔ عالمی رپورٹس کے مطابق پاکستانی شہری اپنی آمدنی کا اوسطاً 1.9 فیصد حصہ خیرات کرتے ہیں، جو عالمی اوسط سے کہیں زیادہ ہے۔

پاکستان میں یہ دن سرکاری، سماجی اور انفرادی سطح پر مختلف طریقوں سے منایا جاتا ہے جیسے مختلف سماجی اور فلاحی تنظیموں کی جانب سے آگاہی واکس، کانفرنسز اور سیمینارز کا انعقاد کیا جاتا ہے۔ ان پروگراموں میں غریبوں کی مدد کرنے اور معاشرے سے غربت کے خاتمے کی اہمیت پر زور دیا جاتا ہے۔ نیز فلاحی ادارے جیسے ایدھی فاؤنڈیشن، سیلانی ویلفیئر، شوکت خانم، اور اخوت وغیرہ اس دن خصوصی مہم چلاتے ہیں تاکہ مستحقین، یتیموں اور بیماروں کے علاج کے لیے فنڈز جمع کیے جا سکیں۔

پاکستانی نیوز چینلز، ریڈیو اور اخبارات اس دن کی مناسبت سے خصوصی پروگرام اور فیچرز نشر کرتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر ہیش ٹیگ #InternationalDayofCharity کے ذریعے سخاوت اور انسانی ہمدردی کے پیغامات شیئر کیے جاتے ہیں

چونکہ اسلام میں صدقہ، زکوٰۃ اور خیرات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے، اس لیے پاکستان میں لوگ اس دن کو مذہبی فریضہ سمجھ کر انفرادی طور پر بھی غریبوں میں کھانا بانٹتے ہیں، مساکین کی مالی مدد کرتے ہیں اور راشن تقسیم کرتے ہیں۔



جب روم جل رہا تھا تو کیا واقعی نیرو بانسری بجا رہا تھا۔؟؟؟

(میری فیس بک پوسٹ ("4 ستمبر: سن 476 - جب دنیا کی سب سے بڑی سلطنت خاموشی سے دم توڑ گئی — سقوطِ روم کی کہانی اور اس کے دنیا پر اثرات۔)

کے حوالے سے چند احباب نے یہ جاننا چاہا ہے کہ نیرو کون تھا اور روم کو جلا کر کیا وہ واقعی بانسری بجا رہا تھا؟؟

اس سوال کے جواب پر براہ راست جانے سے پہلے نیرو کے بارے میں تاریخی حقائق کا ادراک ضروری ہے۔
۔برٹش میوزیم میں "نیرو پروجیکٹ" کو تیار کرنے والی ماہر آثار قدیمہ فرانسسکا بولوگنا کے مطابق، نیرو 37 عیسوی کی 15 دسمبر کو پیدا ہوا۔ اس کا تعلق جولیو کلاڈیئن خاندان سے تھا۔ جو سلطنتِ روم کا پہلا شاہی خاندان تھا۔ اس خاندان نے 27 قبل مسیح (27 BCE) سے لے کر 68 عیسوی (68 CE) تک روم پر حکومت کی۔ نیرو اس خاندان کا آخری حکمران تھا، جس کی موت کے ساتھ ہی یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ نیرو نے خود 54 عیسوی سے 68 عیسوی تک (تقریباً 14 سال) اقتدار سنبھالا۔

نیرو کے دورِ حکومت میں رومن سلطنت مشرق میں آرمینیا اور پارتھیا کی سرحدوں سے لے کر مغرب میں برطانیہ اور آبنائے جبرالٹر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے دور میں برطانیہ کی بغاوت کو دبایا گیا اور پارتھیا کے ساتھ کامیاب سفارتی و عسکری معاہدے کیے گئے جن سے سلطنت کی سرحدیں محفوظ رہیں. نیرو کا ابتدائی دور نسبتاً بہتر اور عوام میں مقبول تھا۔ اس نے غریبوں میں غلہ تقسیم کیا اور ٹیکسوں میں کمی یا عارضی چھوٹ دی

۔ شہنشاہ نیرو کے دور حکومت میں 19 جولائی 64ء کو لگنے والی "روم کی عظیم آگ (Great Fire of Rome) "تاریخ کے تباہ کن ترین واقعات میں سے ایک ہے۔ قدیم تاریخی دستاویزات (جیسے مؤرخ تاسیتس کی تحریریں) کے مطابق اس ہولناک آگ میں ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے، تاہم ہلاکتوں کی کوئی حتمی یا قطعی تعداد قدیم تاریخ میں محفوظ نہیں ہے۔ آگ اتنی تیزی سے پھیلی کہ تنگ گلیوں اور لکڑی کے کثیر المنزلہ مکانات (Insulae) میں رہنے والے غریب لوگوں کی بڑی تعداد جھلس کر یا دم گھٹنے سے مارے گئے۔ اس سانحے میں لاکھوں کی آبادی والے شہر کے سینکڑوں ہزاروں لوگ بے گھر ہو گئے جنہیں کھلے میدانوں اور شاہی باغات میں پناہ لینی پڑی

۔ قدیم روم کو انتظامِ سلطنت کے لیے 14 اضلاع (Districts/Regions) میں تقسیم کیا گیا تھا: جس میں سے 3 اضلاع مکمل طور پر جل کر خاکستر ہو گئے اور وہاں ایک مکان بھی سلامت نہ بچا ۔ 7 اضلاع شدید متاثر ہوئے جہاں مکانات اور عمارتیں ملبے کا ڈھیر بن گئیں ۔ صرف 4 اضلاع ایسے تھے جو آگ کے اثرات سے محفوظ رہے۔ مجموعی طور پر شہر کا تقریباً دو تہائی (یا 70 فیصد سے زائد) حصہ تباہ ہوا جس میں ہزاروں نجی مکانات، اشرافیہ کے محلات، اور قدیم عبادت گاہیں شامل تھیں

۔ عہدِ قدیم میں آج کے دور کی طرح مالیاتی کرنسی میں نقصان کا کوئی درست مادی یا عددی تخمینہ (جیسے ڈالرز یا کروڑوں روپے میں) لگانا ناممکن تھا، لیکن اس کے ثقافتی اور اقتصادی اثرات بے پناہ تھے نیرو کا اپنا محل (Domus Transitoria) اور صدیوں پرانے رومن معابد (جیسے لونا، جپیٹر اور ویسٹا کے مندر) راکھ کا ڈھیر بن گئے۔ روم کے قدیم سرکاری اور تاریخی دستاویزات کے آرکائیوز جل گئے، جس سے روم کی قدیم تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہمیشہ کے لیے مٹ گئے

۔ شہر کی دوبارہ تعمیر (بشمول نیرو کے نئے عالیشان محل 'Domus Aurea' کی تعمیر) کے لیے نیرو نے پوری رومی سلطنت پر بھاری ٹیکس عائد کیے اور کرنسی کی قدر میں کمی کی، جس نے رومی سلطنت کو شدید معاشی بحران میں دھکیل دیا ۔

عوام اور بعد کے مؤرخین نے الزام لگایا کہ شہنشاہ نیرو نے نیا اور بڑا محل (Domus Aurea) بنانے کے لیے جان بوجھ کر شہر کو آگ لگائی اور وہ محل کی چھت پر یا ایک قریبی ٹاور پر بیٹھ کر بانسری بجا رہا تھا اور اس تباہی کے نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

جبکہ تاریخی تحقیق کے مطابق نیرو نے کبھی بانسری نہیں بجائی تھی۔ رومن دور میں بانسری عام استعمال کا ساز نہیں تھا، یہ بعد کے ادوار میں کہانیوں اور ضرب المثل کا حصہ بن گیا۔ رومن مؤرخ ٹیسی ٹس (Tacitus) کے مطابق، جب آگ لگی تو نیرو روم میں موجود ہی نہیں تھا بلکہ وہ اپنے شاہی محل سے 39 میل دور اینٹیم (Antium) میں تھا

جب نیرو کو آگ کا علم ہوا تو وہ فوری واپس آیا، اس نے بے گھر ہونے والے افراد کے لیے اپنے محلات کے دروازے کھول دیے، خوراک کی قیمتیں کم کیں اور خود امدادی کارروائیوں کی نگرانی کی

۔ آگ لگنے کی اصل وجہ حادثاتی تھی (کیونکہ روم کی گلیاں تنگ تھیں اور لکڑی کے مکانات تھے)، لیکن نیرو کی غیر مقبولیت اور اس کے سیاسی مخالفین نے اس سانحے کا ذمہ دار نیرو کو ٹھہرایا۔ تاہم ہولناک آگ کے بعد، جب شہر کا بڑا حصہ جل گیا تو نیرو نے عوام کی بحالی کے لیے کام کیا۔ اس نے شہر کے نقشے کو بہتر بنایا، کشادہ سڑکیں بنوائیں اور آگ سے بچاؤ کے لیے عمارات میں پائیدار مواد کے استعمال کو یقینی بنایا

نیرو کی شخصیت کا ایک منفی پہلو بھی تاریخ میں جابجا نظر آتا ہے۔ اس پر اپنے قریبی عزیزوں کے قتل کا الزام تھا۔ اس نے اپنی ماں (اگرپینا)، اپنی دو بیویوں (جن میں اکتاویا بھی شامل تھی) اور اپنے سوتیلے بھائی کو قتل یا مجبور کر کے مروادیا۔

64 عیسوی کے خوفناک آتش زدگی کے واقعے کے بعد جب عوام کا شک نیرو کی طرف گیا، تو اس نے الزام عیسائیوں پر ڈال دیا اور روم میں عیسائیوں پر شدید ترین مظالم ڈھائے۔

وہ فنونِ لطیفہ اور گلوکاری کا شوقین تھا اور دربار کے شاہانہ اصولوں کے برعکس خود اسٹیج پر گانے گاتا اور رتھ دوڑاتا تھا، جسے روم کا اعلیٰ طبقہ اپنی توہین سمجھتا تھا۔ @@ مسلسل ظلم، مالیاتی دباؤ اور فوج و سینیٹ کی ناراضی کی وجہ سے صوبوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں

۔68 عیسوی میں روم کی سینیٹ نے نیرو کو "عوام کا دشمن (Public Enemy) " قرار دے دیا اور اسے گرفتار کرنے کے احکامات جاری کیے۔ گرفتاری اور ذلت سے بچنے کے لیے نیرو نے 9 جون 68 عیسوی کو خودکشی کر لی۔ اور اس طرح تاریخ کا ایک متنازعہ باب بند ہوا۔



4 ستمبر: سن 476 - جب دنیا کی سب سے بڑی سلطنت خاموشی سے دم توڑ گئی — سقوطِ روم کی کہانی اور اس کے دنیا پر اثرات۔

ہمارے ہاں دو محاورے زبان زدِ عام ہیں:

"روم ایک دن میں تعمیر نہیں ہوا" اور

"سلطنتِ روم کا زوال۔"

پہلا محاورہ صبر، محنت اور مسلسل جدوجہد سے عروج کی داستان سناتا ہے، جبکہ دوسرا اس اٹل حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ دنیا کی سب سے مضبوط سلطنتیں بھی ہمیشہ قائم نہیں رہتیں۔ ان دونوں کہاوتوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ ہے، اور یہ فاصلہ عروج وزوال کے اس سبق سے بھرا ہوا ہے جو آج بھی اقوام کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

روم کی بنیاد 753 قبل مسیح میں دریائے ٹائبر کے کنارے ایک معمولی بستی کے طور پر رکھی گئی تھی۔ کسی نے تصور بھی نہ کیا ہو گا کہ یہی چھوٹا سا قصبہ ایک دن کولوزیم جیسی عظیم الشان عمارتیں تعمیر کرے گا، تین براعظموں پر حکمرانی کرے گا، اور اپنی زبان، قانون اور تہذیب سے پوری دنیا کو متاثر کرے گا۔ صدیوں کی مسلسل جدوجہد، فتوحات اور انتظامی مہارت نے روم کو تاریخِ انسانی کی عظیم ترین سلطنتوں میں شامل کر دیا۔ مگر عروج کی یہ داستان ابدی ثابت نہ ہوئی۔

ں سلطنت جتنی وسیع ہوتی گئی، اسے ایک مرکز سے سنبھالنا اتنا ہی دشوار ہوتا گیا۔ تیسری صدی عیسوی میں انتظامی مجبوریوں کے تحت روم کو دو حصوں — مشرقی اور مغربی — میں تقسیم کر دیا گیا۔ مشرقی حصہ، جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ تھا، تجارتی راستوں پر واقع ہونے کی وجہ سے مالی طور پر مستحکم اور محفوظ رہا۔ مغربی حصہ، جس کا مرکز روم اور بعد میں راوینا تھا، مسلسل سیاسی بحرانوں، کمزور معیشت اور بیرونی حملوں کی زد میں آ گیا۔

تین بڑے واقعات نے مغربی سلطنت کی کمر توڑ دی:

جنگِ ایڈریانوپل (378ء) میں گوتھ قبائل نے مشرقی رومی فوج کو بدترین شکست دی اور خود رومی شہنشاہ ویلنز کو میدانِ جنگ میں قتل کر ڈالا۔ اس شکست نے یہ تاثر توڑ دیا کہ رومی فوج ناقابلِ تسخیر ہے

۔410ء میں ویزگوتھ سردار المارک نے روم شہر پر قبضہ کر کے اسے تین دن تک لوٹا۔ آٹھ سو برس میں یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی بیرونی طاقت روم کی حدود میں داخل ہوئی — اس واقعے نے رومیوں کے خود پسندانہ اعتماد کو شدید دھچکا پہنچایا پھر

455ء میں وینڈل قبیلے نے سمندری راستے سے حملہ کر کے روم کو اس بے دردی سے تاراج کیا کہ آج تک تباہی پھیلانے والوں کے لیے "وینڈالزم" کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اسی دوران اتیلا دی ہن، جسے "خدا کا عذاب" کہا جاتا تھا، نے اپنی وحشیانہ مہمات سے رومی سرحدوں کو اتنا کمزور کر دیا کہ سلطنت سنبھلنے کے قابل نہ رہی۔

۔4 ستمبر 476ء وہ تاریخی دن ہے جب رومی فوج میں شامل جرمن نژاد سپاہیوں نے، زمینوں کے مطالبے پر، اپنے ہی سالار اوڈوآکر کی قیادت میں بغاوت کر دی۔ اوڈوآکر نے راوینا پر قبضہ کر کے محض 14–15 سالہ نوجوان شہنشاہ رومولس اگسٹولس کو تخت سے معزول کر دیا۔ رومولس، جسے اس کے والد نے تخت پر بٹھایا تھا، سیاسی و فوجی طاقت سے یکسر عاری ایک کٹھ پتلی حکمران تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اوڈوآکر نے خود کو رومی شہنشاہ قرار دینے کے بجائے شاہی نشانات مشرقی شہنشاہ زینو کو بھیج دیے اور خود کو "اٹلی کا بادشاہ" کہلوانا پسند کیا۔ یوں کسی بڑی جنگ کے بغیر، ایک اندرونی بغاوت کے نتیجے میں، مغربی رومی سلطنت کا وجود ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔

زوال کہیں ایک دن میں نہیں ہوا یہ خاتمہ دراصل صدیوں کی اندرونی خرابیوں کا نتیجہ تھا: مسلسل مہنگائی، بھاری ٹیکس، افرادی قوت کی کمی، خانہ جنگیاں، کرپشن اور نااہل قیادت نے مرکزی حکومت کو مفلوج کر دیا تھا۔ رومی فوج بھی اپنے شہریوں کے بجائے کرائے کے غیر ملکی سپاہیوں پر انحصار کرنے لگی تھی ایسے سپاہی جن کی وفاداری روم سے نہیں بلکہ اپنے مفاد سے جڑی تھی ۔یہی وجہ ہے کہ زوال کا یہ سبق آج بھی اہم ہے: کوئی بھی نظام، چاہے وہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو، اندرونی کمزوریوں سے کھوکھلا ہو کر ڈھے سکتا ہے

مغربی روما کے خاتمے نے یورپ کی تقدیر بدل ڈالی۔ مرکزی حکومت کے فقدان نے یورپ کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا اور تحفظ کی خاطر جاگیر دارانہ نظام وجود میں آیا۔ اسی خلا کو پاپائے روم اور عیسائی کلیسا نے پُر کیا—جرمن قبائل کے پاس کوئی تحریری قانون یا مضبوط انتظامی ڈھانچہ نہ تھا، چنانچہ چرچ نے انہیں عیسائیت کی طرف مائل کر کے اپنا اثر ورسوخ اس حد تک بڑھا لیا کہ قرونِ وسطیٰ میں بادشاہوں کی تاجپوشی بھی پاپائے روم کی مرضی سے ہونے لگی۔ لاطینی زبان کے زوال سے اطالوی، فرانسیسی، ہسپانوی اور پرتگالی جیسی جدید زبانیں جنم لینے لگیں۔ یوں ایک تہذیب کا خاتمہ دراصل کئی نئی تہذیبوں، زبانوں اور نظاموں کی بنیاد ثابت ہوا

جہاں مغربی روما زمین بوس ہو گیا، وہیں مشرقی رومی سلطنت—جسے تاریخ بازنطینی سلطنت کے نام سے یاد کرتی ہے—اگلے ایک ہزار سال تک قائم رہی۔ چھٹی صدی میں شہنشاہ جسٹینیان نے ایک عسکری مہم کے ذریعے اٹلی اور شمالی افریقہ کے کئی علاقے دوبارہ فتح کیے، اگرچہ یہ کامیابی وقتی ثابت ہوئی۔ جسٹینیان کا اصل کارنامہ اس کا قانونی ضابطہ "قانونِ جسٹینیان" تھا، جو آج بھی جدید یورپی قانونی نظام کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ بازنطینی سلطنت نے یونانی و رومی علم، فلسفہ اور ثقافت کو صدیوں تک محفوظ رکھا—وہی علمی ورثہ جو بعد میں یورپ کے دورِ بیداری (رینیسانس) کا محرک بنا۔ بالآخر 1453ء میں یہ سلطنت بھی سلطنتِ عثمانیہ کے ہاتھوں فتح ہو کر تاریخ کا حصہ بن گئی

۔سقوطِ روم محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ ایک ابدی سبق ہے: عظمت خودکار طور پر برقرار نہیں رہتی، اسے مسلسل انصاف، اتحاد، مضبوط قیادت اور اندرونی نظم کے ذریعے سنبھالنا پڑتا ہے۔ جو سلطنت کبھی دنیا پر راج کرتی تھی، وہ اندرونی خلفشار، کرپشن اور کمزور قیادت کے باعث چند صدیوں میں بکھر گئی—لیکن اسی راکھ سے نئی زبانیں، نئے نظام اور نئی تہذیبیں جنم لے کر آج کی دنیا کی بنیاد بنیں۔ یہی تاریخ کا سب سے بڑا سبق ہے: زوال کبھی خاتمہ نہیں ہوتا، بلکہ اکثر ایک نئے آغاز کا پیش خیمہ بن جاتا ہے





03 ستمبر۔1752۔برطانوی عوام کا احتجاج (ہمارے گیارہ دن واپس کرو)

جب برطانیہ میں 3 ستمبر تا 14 ستمبر کی تاریخیں غائب کر دی گئیں. کلنڈروں کی بدلتی ہوئی عالمی تاریخ پر ایک نظر۔

برطانیہ میں ستمبر 1752 ایسے سال کے طور پر سامنے اتا ہے، جس میں سرکاری طور پر 3 ستمبر سے 14 ستمبر تک کوئی ریکارڈ موجود نہیں۔نہ کوئی پیدا ہوا اور نہ کوئی فوت ہوا اور گیارہ دن کلنڈر سے غائب رہے

۔اس کی دلچسپ وجہ یہ تھی کہ برطانیہ میں گریگورین کیلنڈر سے پہلے جولین کیلنڈر (Julian Calendar) رائج تھا

۔ گریگورین کیلنڈر کو فروری 1582ء میں روم کے پوپ گریگوری سیز دہم (Pope Gregory XIII) نے متعارف کرایا تھا۔ اسے ایجاد کرنے کی بنیادی وجہ جولین کیلنڈر کی خامی تھی جس کے مطابق ایک سال کا دورانیہ 365.25 دن مانا جاتا تھا۔ لیکن حقیقت میں زمین سورج کے گرد اپنا چکر 365.2422 دن (تقریباً 365 دن، 5 گھنٹے اور 49 منٹ) میں پورا کرتی ہے۔ اس معمولی سے فرق کی وجہ سے جولین کیلنڈر میں ہر سال 11 منٹ زیادہ شمار ہو رہے تھے، جس سے ہر 128 سال بعد کیلنڈر قدرتی موسموں سے ایک دن آگے نکل جاتا تھا

پوپ گریگوری کے کیلنڈر ایجاد کرنے کی سب سے بڑی بنیاد عیسائیوں کے مذہبی تہوار ایسٹر (Easter) کی تاریخ کو درست کرنا بھی تھا۔ سنہ 325ء میں نیسیا کونسل نے طے کیا تھا کہ ایسٹر ہمیشہ موسم بہار کے آغاز (Spring Equinox) یعنی 21 مارچ) کے بعد آنے والے پہلے پورے چاند کے بعد والے اتوار کو منایا جائے گا۔ لیکن جولین کیلنڈر کی خرابی کی وجہ سے 1582ء تک موسم بہار کا یہ آغاز 21 مارچ کے بجائے 10 دن پیچھے یعنی 11 مارچ کو ہونے لگا تھا۔ اس خامی کو دور کرنے کے لیے پوپ گریگوری نے ماہرینِ فلکیات (جیسے الوئیسیئس لیلیئس اور کرسٹوفر کلاویئس) کی مدد سے نیا کیلنڈر بنایا۔ اس کیلنڈر کی بنیاد دو اہم اصولوں پر رکھی گئی

کیلنڈر کو دوبارہ موسموں کے عین مطابق لانے کے لیے پہلی بار 1582ء میں 10 دن حذف کیے گئے (4 اکتوبر 1582ء کے بعد اگلا دن سیدھا 15 اکتوبر شمار کیا گیا)۔

مستقبل میں اس فرق کو روکنے کے لیے قانون بنایا گیا کہ ہر وہ صدی کا سال (جیسے 1700، 1800، 1900) لیپ سال نہیں ہو گا، جب تک کہ وہ 400 پر پورا تقسیم نہ ہوتا ہو (جیسے سنہ 2000 لیپ سال تھا)۔

برطانیہ میں 11 دن کا فرق اس لئے پڑا کہ برطانیہ ایک پروٹسٹنٹ ملک تھا، اس لیے اس نے کیتھولک پوپ کے اس کیلنڈر کو شروع میں اپنانے سے انکار کر دیا۔ جب برطانیہ نے 1752ء میں اس کیلنڈر کو اپنانے کا فیصلہ کیا، تب تک جولین اور گریگورین کیلنڈر کا فرق بڑھ کر 11 دن ہو چکا تھا۔ اسی لیے برطانیہ کو اپنے کیلنڈر کو درست کرنے کے لیے 2 ستمبر 1752ء کے فوراً بعد اگلا دن 14 ستمبر مقرر کرنا پڑا

اگر دنیا میں کلنڈر کے حوالے سے دیکھا جائے تو قارئین کرام کے لئے یہ معلومات دلچسپی کی حامل ہوں گی کیونکہ

دنیا میں کیلنڈر (تقویم) کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ انسانی تہذیب۔ انسان نے شروع ہی سے وقت، فصلوں کی کاشت اور مذہبی تہواروں کا حساب رکھنے کے لیے چاند اور سورج کی حرکات پر نظر رکھنا شروع کر دی تھی

۔ماہرینِ آثارِ قدیمہ کو اسکاٹ لینڈ (Warren Field) میں ایک قبل از تاریخ کا کیلنڈر ملا ہے جو چاند کی بنیاد پر بنایا گیا تھا اور یہ تقریباً 8000 قبل مسیح کا ہے۔ یہ شکاری برادریوں نے بنایا تھا۔

تاریخ کا پہلا منظم اور تحریری کیلنڈر قدیم مصر (Egypt) اور میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق / سومیریا) میں برانزاتج (تقریباً 3000 سے 4000 قبل مسیح) میں ایجاد ہوا

مصر کا شمسی کیلنڈر دنیا کا پہلا باقاعدہ شمسی کیلنڈر (Solar Calendar) تھا جو مصری ماہرینِ فلکیات نے دریائے نیل میں آنے والے سیلابوں کا حساب رکھنے کے لیے بنایا تھا ۔ اس میں سال کے 365 دن ہوتے تھے
بابل اور سومیریا کے کیلنڈر کی بنیاد چاند پر تھی اور یہ قمری کیلنڈر (Lunar Calendar) کہلاتا تھا
قدیم دور سے اب تک کیلنڈر کئی شکلوں میں بدلتے رہے ہیں:
جولین کیلنڈر (Julian Calendar) رومن شہنشاہ جولیس سیزر نے 45 قبل مسیح میں بنایا تھا ۔ یہ پورے یورپ اور رومن سلطنت کے زیرِ اثر ممالک میں 1582ء تک رائج رہا

گریگورین کیلنڈر – Gregorian Calendar) موجودہ عیسوی کیلنڈر (جولین کیلنڈر کی ہی جدید اور تبدیل شدہ شکل ہے جسے پوپ گریگری XIII نے 1582ء میں بنایا تاکہ لیپ کے سال (Leap Year) کی غلطیوں کو ٹھیک کیا جاسکے۔ آغاز میں اسے صرف کیتھولک یورپی ممالک (اٹلی، اسپین، فرانس) نے اپنایا ۔ برطانیہ اور امریکہ نے اسے 1752ء میں قبول کیا۔ جاپان نے 1873ء، چین نے 1912ء، روس نے 1918ء اور ترکی نے 1926ء میں اسے اپنایا۔ آج یہ کیلنڈر دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں سرکاری اور کاروباری طور پر رائج ہے
ظہورِ اسلام کے وقت اور اس سے پہلے جزیرہ نما عرب میں کوئی ایک واحد مرکزی کیلنڈر نہیں تھا، بلکہ مختلف قبائل اپنے اپنے طریقے استعمال کرتے تھے: عرب عام طور پر چاند کی تاریخوں پر چلتے تھے اور ان کے ہاں 12 مہینے (جیسے محرم، صفر، رمضان وغیرہ) رائج تھے ۔ چونکہ قمری سال شمسی سال سے 11 دن چھوٹا ہوتا ہے، اس لیے عرب اپنے حج کے موسم اور تجارتی میلوں کو مخصوص موسموں (جیسے سردی یا گرمی) میں برقرار رکھنے کے لیے ہر دو یا تین سال بعد سال میں ایک تیرھواں (13واں) مہینہ جوڑ دیتے تھے، جسے "النسیء" کہا جاتا تھا ۔ اسلام نے بعد میں سورہ التوبہ میں اس طریقے کو ممنوع قرار دے کر خالص قمری کیلنڈر لازم کیا

اس کے علاوہ عربوں کے پاس سالوں کو گننے کے لیے کوئی مستقل سن (Era) جیسے 1، 2، 3 نہیں تھا ۔ وہ سال کا نام کسی بڑے واقعے پر رکھ دیتے تھے، مثلاً جس سال ابرہہ نے مکہ پر ہاتھیوں کے ساتھ حملہ کیا اسے "عام الفیل" (ہاتھی والا سال) کہا گیا

۔بعد میں حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت (17 ہجری) میں مشاورت کے بعد باقاعدہ ہجری کیلنڈر کا آغاز ہوا جس کی بنیاد نبی کریم ﷺ کی ہجرتِ مدینہ پر رکھی گئی ۔

جب اسلام دنیا میں پھیل رہا تھا (ساتویں صدی عیسوی)، تو اس وقت دنیا کی بڑی طاقتوں اور خطوں میں درج ذیل کیلنڈر استعمال ہو رہے تھے:

رومن اور بازنطینی سلطنت (Byzantine Empire) میں جولین کیلنڈر (Julian Calendar) رائج تھا۔

ساسانی سلطنت (ایران / فارس) زرتشتی کیلنڈر (Zoroastrian Calendar) استعمال کرتی تھیں جو کہ شمسی کیلنڈر تھا جس میں سال کے 365 دن ہوتے تھے۔ سال کا آغاز عام طور پر شہنشاہ کی تخت نشینی سے ہوتا تھا۔

۔ہندوستان (برصغیر) میں بکرمی اور شاکا کیلنڈر (Vikrami & Shaka) چندر-شمسی (Lunisolar) کیلنڈر رائج تھے، جو سورج اور چاند دونوں کی چال پر مبنی تھے اور ہندو راجاؤں کے ادوار سے منسوب تھے

روایتی چینی کیلنڈر بھی ایک چندر-شمسی (Lunisolar) کیلنڈر تھا جس میں مہینے چاند سے اور سال کا موسم سورج سے طے ہوتا تھا ۔

یہودیت (Jewish World) میں عبرانی کیلنڈر (Hebrew Calendar) یہ چاند اور سورج کے نظام کا ملا جلا کیلنڈر تھا جو تورات کے احکامات اور بابل کے نظام سے متاثر تھے۔





2 ستمبر 1666 جب لندن شہر جل کر راکھ ہو گیا۔ وجوہات اور بعد از سانحہ کئے گئے اقدامات جنہوں نے دنیا کو ایک نئی راہ دکھائی

لندن کی عظیم آگ (Great Fire of London) برطانیہ کی تاریخ کا خوفناک ترین سانحہ ہے، جو 2 ستمبر 1666ء بروز اتوار شروع ہوا اور مسلسل 4 دنوں تک (5 ستمبر تک) شہر کو اپنی لپیٹ میں لیے رہا۔ اس ہولناک آتش زدگی نے قرونِ وسطیٰ کے پورے لندن شہر کو جل کر راکھ کر دیا۔

سن 1666ء کا لندن ایک انتہائی گنجان آباد، مصروف اور تاریخی شہر تھا ۔ اس آگ کے لگنے سے محض ایک سال پہلے، یعنی 1665ء میں، لندن "عظیم طاعون (Great Plague) " کی لپیٹ میں تھا جس نے شہر کی ایک بڑی آبادی کو نگل لیا تھا۔ شہر ابھی اس صدمے اور معاشی بحران سے سنبھل ہی رہا تھا کہ اس دوسری بڑی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔

یہ آگ اتوار کی رات گئے پڈنگ لین (Pudding Lane) میں شاہی بیکر تھامس فارینر (Thomas Farriner) کی بیکری سے اوون (تندور) کھلا رہ جانے کے باعث حادثاتی طور پر شروع ہوئی۔ اس دور میں لندن کے بیشتر مکانات شاہ بلوط (Oak timber) کی لکڑی سے بنے تھے اور غریبوں کے گھروں پر واٹر پروفنگ کے لیے تارکول (Tar) کی تہہ چڑھی ہوتی تھی، جو آگ پکڑنے میں بارود کا کام کرتی ہے۔ شہر کی گلیاں انتہائی تنگ تھیں اور مکانات کی اوپری منزلیں ایک دوسرے کے اتنی قریب تھیں کہ وہ تقریباً آپس میں ملتی تھیں۔ اس وجہ سے آگ آسانی سے ایک گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہوتی گئی اس سال لندن میں شدید گرمی پڑی تھی اور ہفتوں سے بارش نہیں ہوئی تھی، جس کی وجہ سے تمام لکڑی کے ڈھانچے بالکل خشک ہو چکے تھے۔ آگ لگنے کے بعد مشرق سے چلنے والی تیز ہواؤں نے اسے بھڑکایا ۔ مزید یہ کہ ٹیمز ندی کے کنارے بنے گوداموں میں تیل، تارکول، شراب اور کوئلہ جیسی آتش گیر اشیاء موجود تھیں، جنہوں نے آگ کو بے قابو کر دیا۔

اس وقت لندن میں کوئی جدید فائر بریگیڈ یا آگ بجھانے کا باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا ۔ ابتدا میں لندن کے لارڈ میئر نے سستی دکھائی اور گھروں کو گرانے (فائر بریک بنانے) کی اجازت دینے میں تاخیر کی۔

اس تباہی کے نقصانات کو اگر دیکھا جائے تو یہ زمین بوس ہونے والے رقبے کے لحاظ سے بے پناہ تھے، تاہم جانی نقصان کے حوالے سے تاریخ دانوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

شہر کا تقریباً 80 سے 85 فیصد حصہ (تقریباً 436 ایکڑ رقبہ) جل کر خاکستر ہو گیا۔ 13,200 سے 13,500 نجی مکانات مکمل طور پر تباہ ہوئے۔ مذہبی و سرکاری عمارات جیسے تاریخی سینٹ پال کیتھیڈرل (St. Paul's Cathedral) ، 87 گرجا گھر (Churches)، گلڈ ہال (بلدیاتی دفتر) اور 44 تجارتی ہالز جل گئے

لندن کی کل آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ، یعنی تقریباً 70,000 سے 100,000 افراد بے گھر ہو کر شہر سے باہر کھلے میدانوں میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے

اس دور کے مطابق مالیت کا اندازہ 5 سے 10 ملین پاؤنڈز لگایا گیا تھا (جو آج کے اربوں پاؤنڈز کے برابر ہے) ۔ اس وقت لندن کی سالانہ معیشت کے مقابلے میں یہ رقم ناقابلِ تصور حد تک بڑی تھی۔ سرکاری ریکارڈ کے مطابق صرف 6 اموات درج کی گئیں ۔ تاہم، جدید تاریخ دان اس پر شدید شک کا اظہار کرتے ہیں ۔ ان کا ماننا ہے کہ آگ کی تپش (جو 2200 ڈگری فارن ہائیٹ تک پہنچ چکی تھی) اتنی زیادہ تھی کہ غریب شہریوں اور بے سہارا لوگوں کی لاشیں جل کر راکھ ہو گئیں اور ان کا کوئی نام و نشان یا ہڈیوں کے ٹکڑے تک باقی نہیں بچے، اس لیے اصل جانی نقصان سینکڑوں یا ہزاروں میں ہو سکتا ہے۔

آخر کار، بادشاہ چارلس دوم کے حکم پر فوج نے بارود کی مدد سے گھروں کی پوری قطاریں اڑا کر "فائر بریک" (آگ کے راستے میں خالی جگہ) بنائی۔ 5 ستمبر کی رات کو تیز ہواؤں کے تھمنے کے بعد آگ پر قابو پایا جا سکا

س بڑی تباہی کا ایک مثبت پہلو یہ نکلا کہ آگ نے طاعون پھیلانے والے چوہوں اور گندگی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ۔اس بھیانک تباہی سے برطانوی حکومت، معماروں اور عوام نے جو اہم ترین اسباق سیکھے، انہوں نے نہ صرف لندن بلکہ دنیا بھر میں جدید شہری منصوبہ بندی اور حفاظت کے اصولوں کو ہمیشہ کے لیے بدل کر رکھ دیا۔ جیسے

لکڑی کے بجائے اینٹ اور پتھر کا استعمال (تعمیراتی مواد میں تبدیلی) اور پارلیمنٹ نے 1667ء کا ری بلڈنگ ایکٹ پاس کیا۔ اس قانون کے تحت لندن میں لکڑی کے مکانات بنانے پر مکمل پابندی عائد کر دی گئی اور تمام نئی عمارتوں کے لیے اینٹ اور پتھر کا استعمال لازمی قرار دیا گیا۔

شہر کو دوبارہ بساتے وقت گلیوں کو چوڑا کیا گیا تاکہ اگر کسی عمارت میں آگ لگے بھی، تو وہ سامنے والی عمارت تک نہ پہنچ سکے۔ مکانات کی اوپری منزلوں کو باہر کی طرف نکالنے پر پابندی لگا دی گئی۔

اس تباہی کے بعد دنیا میں پہلی بار منظم اور پیشہ ور فائر بریگیڈز کا تصور ابھرا۔ ابتدا میں انشورنس کمپنیوں نے اپنے فائر فائٹرز رکھے، جو بعد میں چل کر موجودہ دور کے جدید فائر سروسز سسٹم کی بنیاد بنے۔

آگ کی وجہ سے ہزاروں کاروباری افراد اور عام لوگ سڑک پر آ گئے اور معیشت کو اربوں پاؤنڈز کا نقصان پہنچا۔ نقصان کی تلافی کا کوئی نظام موجود نہیں تھا۔ اس حادثے کے چند ہی سالوں بعد لندن میں دنیا کی پہلی فائر انشورنس کمپنی (The Fire Office) قائم ہوئی۔ اس نظام نے تاجروں اور شہریوں کو یہ تحفظ دیا کہ مستقبل میں ایسی کسی آفت کی صورت میں ان کا مالی نقصان پورا کیا جا سکے گا۔

اس وقت آگ بجھانے کے لیے ٹیمز کو دریائے تھیمز سے پانی لانا پڑ رہا تھا اور شہر کے اندر پانی کا کوئی ہنگامی ذخیرہ یا انتظام نہیں تھا۔ نئے قانون کے تحت شہر کے نیچے پانی کی پائپ لائنز بچھائی گئیں اور گلیوں میں ایسے پوائنٹس بنائے گئے جہاں سے آگ بجھانے کے لیے فوری پانی حاصل کیا جا سکے — یہ نظام آج کے فائر ہائیڈرنٹس (Fire Hydrants) کی ابتدائی شکل تھا۔





یکم ستمبر) -1969 جب معمر قذافی نے بغاوت کے بعد لیبیا کا اقتدار سنبھالا 42 (سالہ

امریت اور عروج وزوال کی داستان اور پاکستان کے ساتھ بدلتے تعلقات۔۔۔۔

یکم ستمبر 1969 کو صرف 27 سالہ فوجی کیپٹن معمر قذافی نے "فری آفیسرز موومنٹ" کے ساتھیوں سمیت ایک بغاوت کے ذریعے شاہ ادریس اول کا تختہ الٹ دیا۔ اس فوجی بغاوت میں کسی قسم کا جانی نقصان یا ہلاکتیں نہیں ہوئی تھیں۔ یہ بغاوت انتہائی تیزی اور خاموشی سے چند گھنٹوں میں مکمل ہو گئی تھی۔ اس تخت الٹائی کے دوران کوئی خون خرابہ یا لڑائی نہیں ہوئی تھی، لہٰذا اس میں کوئی شخص ہلاک نہیں ہوا۔ جس وقت یہ بغاوت ہوئی، شاہ ادریس علاج کی غرض سے ملک سے باہر (ترکی اور پھر یونان میں) موجود تھے۔

شاہ ادریس جب بیرون ملک تھے تو انہوں نے مصر کے صدر جمال عبد الناصر کی وساطت سے معمر قذافی کی نئی انقلابی کونسل سے رابطہ کیا۔ طے پایا کہ شاہ ادریس وطن واپس نہیں آئیں گے۔ اس کے بعد شاہ ادریس اور ان کی ملکہ کو بحری جہاز کے ذریعے یونان سے مصر جانے اور وہیں جلاوطنی کی زندگی گزارنے کی اجازت دے دی گئی۔ شاہ ادریس نے بعد میں اپنی زندگی مصر (قاہرہ) میں گزاری اور 1983ء میں وہیں وفات پائی۔ تاہم بغاوت کے ابتدائی روز شاہ ادریس کے خاندان اور قریبی شاہی رشتہ داروں (جیسے ولی عہد حسن بن الرضا) کو عارضی طور پر حراست میں لیا گیا تھا۔ تاہم بعد میں مذاکرات کے ذریعے شاہی خاندان کے تمام افراد کو بھی بحفاظت مصر جانے کی اجازت دے دی گئی

نومبر 1971ء میں لیبیا کی ایک عوامی عدالت نے شاہ ادریس پر ملک دشمنی اور بدعنوانی کے الزامات کے تحت مقدمہ چلا کر انہیں موت کی سزا سنائی تھی، لیکن اس وقت وہ عملی طور پر مصر میں مقیم تھے اور قذافی حکومت نے کبھی ان پر براہِ راست جسمانی تشدد نہیں کیا تھا۔

۔یکم ستمبر کی اس بغاوت کو "الفتح انقلاب" کا نام دیا گیا، اور اسی کے ساتھ لیبیا میں بادشاہت کا خاتمہ ہو کر "لیبین عرب جمہوریہ" کا قیام عمل میں آیا۔ قذافی انقلابی کمانڈ کونسل کے سربراہ بنے اور اگلے بیالیس برس تک، مختلف نظریاتی اور آئینی روپ بدلتے ہوئے، ملک پر اپنی گرفت مضبوط رکھی

۔اس بغاوت کے پیچھے کئی عوامل کارفرما تھے۔ قذافی جمال عبد الناصر کے عرب قوم پرستی (Pan-Arabism) کے نظریے سے شدید متاثر تھے اور لیبیا کو بھی اسی سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔

شاہ ادریس کے دور میں امریکہ اور برطانیہ کے فوجی اڈے لیبیا میں موجود تھے، جنہیں عوام خود مختاری پر حملہ تصور کرتے تھے۔ 1959 میں دریافت ہونے والی تیل کی دولت کا بیشتر حصہ شاہی خاندان اور غیر ملکی کمپنیوں کی جیب میں جا رہا تھا جبکہ عوام غربت میں تھے۔ اس پر مستزاد، 1967 کی چھ روزہ عرب اسرائیل جنگ میں عرب شکست نے عوام اور فوج میں شاہ کی مغرب نواز پالیسیوں کے خلاف غم و غصہ مزید بھڑکا دیا۔ اقتدار میں آتے ہی قذافی نے امریکی اور برطانوی فوجی اڈے بند کروائے، تیل کی صنعت کو قومی ملکیت میں لیا اور اس آمدنی سے مفت تعلیم، مفت علاج اور رہائش جیسی سہولیات مہیا کیں۔ صحرا میں پانی پہنچانے کے لیے دنیا کا سب سے بڑا زیرِ زمین پائپ لائن نظام "دی گریٹ میں میڈ ریور" بھی اسی دور کی نشانی ہے

۔تاہم دوسری طرف قذافی نے اپنے نظریے "جماہیریہ" (یعنی عوامی حکومت) کا پرچار کیا مگر عملاً تمام اختیارات اپنی ذات میں مرکوز رکھے، اپوزیشن پر مکمل پابندی لگائی، اور مختلف عالمی مسلح تحریکوں کی حمایت کے باعث بالخصوص 1988 کے لاکربی بم دھماکے کے بعد لیبیا برسوں بین الاقوامی پابندیوں اور تنہائی کا شکار رہا، جو بالآخر 2003 میں لیبیا کے جوہری پروگرام ترک کرنے کے بعد نسبتاً کم ہوئی۔

قذافی کے دور میں پاکستان کے ساتھ تعلقات میں کافی نشیب و فراز آئے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں دونوں رہنماؤں کے درمیان گہری دوستی رہی؛ 1974 میں لاہور میں منعقدہ اسلامی سربراہی کانفرنس کی یاد میں لاہور کے مشہور اسٹیڈیم کا نام "قذافی اسٹیڈیم" رکھا گیا، اور قذافی نے پاکستان کو مالی و سفارتی حمایت بھی فراہم کی۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے پاکستان کے جوہری پروگرام کے ابتدائی مراحل میں مالی معاونت بھی کی، اگرچہ اس دعوے کی حتمی سرکاری تصدیق موجود نہیں۔

1979 میں بھٹو کی پھانسی پر قذافی نے شدید ردعمل ظاہر کیا اور جنرل ضیاء الحق کی حکومت کی مذمت کرتے ہوئے کچھ عرصے کے لیے سفارتی تعلقات محدود کر دیے، تاہم بعد کے برسوں میں دونوں ممالک کے تعلقات بتدریج معمول پر آ گئے۔

قذافی کے 42 سالہ اقتدار کا خاتمہ 2011 کی عرب بہار کی لہر میں ہوا۔ تیونس اور مصر کے انقلابات سے متاثر ہو کر فروری 2011 میں بن غازی میں پرامن مظاہرے شروع ہوئے، جنہیں کچلنے کے لیے قذافی کی افواج نے طاقت کا بھرپور استعمال کیا اور احتجاج مسلح بغاوت میں بدل گیا۔ اقوامِ متحدہ نے شہریوں کے تحفظ کے لیے نو فلائی زون نافذ کیا، اور امریکہ، برطانیہ و فرانس کی قیادت میں نیٹو نے فضائی کارروائیاں کیں جس سے باغیوں کا پلہ بھاری ہوا۔

20 اکتوبر 2011 کو قذافی کے آبائی شہر سرت پر باغیوں کا قبضہ ہوا اور فرار کی کوشش کے دوران قذافی گرفتار ہو کر موقع پر ہی مارے گئے۔

2011ء میں لیبیا کے سابق صدر معمر قذافی کے خلاف ہونے والی بغاوت اور خانہ جنگی کے دوران مجموعی ہلاکتوں کی تعداد کے بارے میں مختلف اندازے لگائے گئے ہیں، تاہم زیادہ تر آزاد ذرائع اور بین الاقوامی اداروں کے مطابق اس آٹھ ماہ طویل تنازع میں تقریباً 15,000 سے 30,000 افراد ہلاک ہوئے تھے۔ بعد میں لیبیا کی وزارتِ شہدا و لاپتہ افراد کی ابتدائی تحقیقات میں انقلابیوں کی جانب ساڑھے چار ہزار سے زائد ہلاکتوں کا بتایا گیا تھا، جبکہ اتنی ہی ہلاکتیں قذافی کی حامی افواج کی طرف بھی ریکارڈ کی گئی۔

جہاں تک معمر قذافی کے خاندان کا تعلق ہے، اس بغاوت اور اس کے فوراً بعد قذافی کے علاوہ ان کے خاندان کے درج ذیل اہم ارکان ہلاک ہوئے:

معتصم قذافی :(Mutassim Gaddafi) یہ قذافی کے چوتھے بیٹے اور لیبیا کے قومی سلامتی کے مشیر تھے۔ انہیں 20 اکتوبر 2011ء کو سرت شہر میں اپنے والد معمر قذافی کے ساتھ ہی باغیوں نے حراست میں لینے کے بعد ہلاک کر دیا تھا۔

خمیس قذافی :(Khamis Gaddafi) قذافی کے سب سے چھوٹے بیٹے اور ایک اہم فوجی بریگیڈ (خمیس بریگیڈ) کے کمانڈر تھے۔ وہ اگست 2011ء میں ترہونہ کے قریب باغیوں اور نیٹو افواج کے ساتھ شدید لڑائی کے دوران مارے گئے تھے۔

سیف العرب قذافی :(Saif al-Arab Gaddafi) یہ قذافی کے بیٹے تھے جو سیاست سے دور رہتے تھے۔ اپریل 2011ء کے آخر میں طرابلس میں ان کی رہائش گاہ پر نیٹو کے ایک فضائی حملے میں وہ ہلاک ہو گئے تھے۔

اپریل 2011ء میں نیٹو کے اسی فضائی حملے میں، جس میں سیف العرب قذافی ہلاک ہوئے تھے، معمر قذافی کے تین معصوم پوتے پوتیاں (جن کی عمریں 12 سال سے کم تھیں) بھی ہلاک ہو گئے تھے۔ بعض رپورٹس اور دعووں کے مطابق، قذافی کی گود لی ہوئی بیٹی ہناء قذافی بھی فضائی حملوں کی زد میں آ کر ہلاک ہوئی تھیں

۔بعد میں ہونے والی ہلاکتوں میں سیف الاسلام قذافی (Saif al-Islam Gaddafi) معمر قذافی کے دوسرے اور سب سے بااثر بیٹے بھی شامل تھے جنہیں طویل عرصے تک ان کا جانشین سمجھا جاتا رہا، وہ 2011ء کی بغاوت میں زندہ بچ گئے تھے اور انہیں زنتان کے باغیوں نے قید کر لیا تھا۔ بعد ازاں وہ رہا ہوئے، تاہم فروری 2026ء میں زنتان شہر میں نامعلوم مسلح افراد نے ان کی رہائش گاہ پر حملہ کر کے انہیں بھی قتل کر دیا

۔۔قذافی کے بعد لیبیا میں جمہوریت کے بجائے انتشار نے جنم لیا۔ ملک عملاً دو حصوں میں تقسیم ہو گیا: مغرب میں طرابلس میں اقوامِ متحدہ کی حمایت یافتہ حکومت، اور مشرق میں جنرل خلیفہ حفتر کی قیادت میں متوازی انتظامیہ، جبکہ روس، ترکی، مصر اور متحدہ عرب امارات جیسے ممالک اپنے اپنے مفادات کے تحت مختلف دھڑوں کی پشت پناہی کرتے رہے۔ گزشتہ برسوں میں جنگ بندی اور سیاسی مصالحت کی متعدد کوششیں ہوئی ہیں اور دونوں طرف کی حکومتیں بظاہر برقرار ہیں، مگر متحدہ انتخابات اور مستقل سیاسی تصفیے کی راہ میں رکاوٹیں تاحال موجود ہیں۔





31 اگست۔ دلوں کی شہزادی: لیڈی ڈیانا کی حادثاتی موت۔، فلاحی ورثہ اور برطانوی شاہی خاندان پر اثرات اور پاکستانی شخصیات سے تعلقات

لیڈی ڈیانا فرانسس اسپینسر 1 جولائی 1961 کو برطانیہ کے ایک نامور اشرافیہ خاندان میں پیدا ہوئیں۔ وہ بچپن ہی سے انتہائی نرم دل اور فنونِ لطیفہ سے لگاؤ رکھنے والی خاتون تھیں

۔ان کی زندگی میں سب سے بڑا موڑ اس وقت آیا جب 29 جولائی 1981 کو ان کی شادی برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس (موجودہ شاہ چارلس) سے ہوئی۔ اس پر شکوہ شادی کو دنیا بھر میں کروڑوں لوگوں نے دیکھا اور ڈیانا راتوں رات دنیا کی مقبول ترین شخصیت اور "دلوں کی شہزادی" بن گئیں

۔ان کے ہاں دو بیٹوں، شہزادہ ولیم اور شہزادہ ہیری کی پیدائش ہوئی۔ ظاہری چمک دمک کے برعکس، یہ شادی جلد ہی شدید خانگی تنازعات کا شکار ہو گئی۔ شہزادہ چارلس کے اپنی پرانی دوست کامیلا پارکر کے ساتھ مسلسل تعلقات اور شاہی محل کے سخت ماحول نے ڈیانا کو شدید ذہنی تناؤ میں مبتلا کر دیا۔ اختلافات اس وقت کھل کر دنیا کے سامنے آئے جب ڈیانا نے 1995 میں بی بی سی کے پینوراما پروگرام میں ایک تہلکہ خیز انٹرویو دیا، جس میں انہوں نے تاریخی جملہ کہا کہ

"اس شادی میں ہم تین لوگ تھے،

اس لیے تھوڑی بھیڑ تھی"

۔اس انٹرویو نے شاہی خاندان کی ساکھ کو ہلا کر رکھ دیا اور بالآخر اگست 1996 میں ان کے درمیان باقاعدہ طلاق ہو گئی۔ طلاق کے بعد ڈیانا سے ان کا شاہی مرتبہ (Her Royal Highness) تو واپس لے لیا گیا، لیکن عوام کے دلوں میں ان کی محبت مزید بڑھ گئی

ایک برطانوی شہزادی کے روایتی کردار سے ہٹ کر، ڈیانا نے دکھی انسانیت کی خدمت کو اپنا مقصد بنایا۔ انہوں نے ایڈز (HIV) کے مریض سے بغیر دستانے کے ہاتھ ملا کر اس بیماری سے جڑے سماجی خوف اور نفرت کو ختم کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے جذام کے مریضوں کی دیکھ بھال کی اور اپنی موت سے چند ماہ قبل، جنوری 1997 میں، انگولا کے فعال بارودی سرنگوں والے میدانوں کا دورہ کر کے دنیا کو ان ہلاکت خیز ہتھیاروں پر پابندی لگانے پر مجبور کیا۔ ان کے یہ انقلابی اقدامات تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے

:طلاق کے ایک سال بعد، 30 اگست 1997 کو ڈیانا اپنے قریبی دوست ڈوڈی الفائد کے ساتھ پیرس میں موجود تھیں۔ 31 اگست 1997 کی رات کے ابتدائی گھنٹوں میں، جب وہ ایک مرسڈیز کار میں رٹز ہوٹل سے نکلیں، تو موٹر سائیکلوں پر سوار پاپرازی (میڈیا فوٹو گرافرز) نے ان کا پیچھا کیا۔ ان سے بچنے کے لیے گاڑی کی رفتار انتہائی تیز کر دی گئی، جس کے باعث کار پیرس کی 'پونٹ ڈی ایلما' سرنگ میں ایک کنکریٹ کے ستون سے ٹکرا گئی۔ اس حادثے میں ڈوڈی الفائد اور ڈرائیور موقع پر ہلاک ہو گئے، جبکہ لیڈی ڈیانا نے ہسپتال پہنچ کر دم توڑ دیا

۔ڈیانا کی اچانک موت پر دنیا بھر میں کئی سازشی نظریات سامنے آئے، جن میں شاہی خاندان پر بھی الزامات لگائے گئے۔ تاہم، فرانسیسی اور برطانوی پولیس کی طویل اور وسیع ترین تحقیقات (بشمول آپریشن پیجٹ) کے بعد یہ ثابت ہوا کہ یہ کوئی قتل کی سازش نہیں بلکہ ایک حادثہ تھا

۔ تفتیش کے مطابق کار کا ڈرائیور ہنری پال شدید نشے کی حالت میں تھا اور گاڑی مقررہ حد سے دگنی رفتار پر چلا رہا تھا۔ بالآخر 2008 میں برطانوی عدالت کی جیوری نے حتمی فیصلہ دیا کہ یہ موت ڈرائیور کی غفلت اور پیچھا کرنے والے فوٹو گرافرز کی لاپرواہی کے باعث ہونے والی ایک "غیر قانونی ہلاکت (Unlawful Killing) " تھی۔

لیڈی ڈیانا اپنی زندگی میں تین بار (1991، 1996 اور 1997) پاکستان تشریف لائیں۔ پاکستان میں ان کے سب سے قریبی، دوستانہ اور گھریلو تعلقات سابق وزیر اعظم اور کرکٹ اسٹار عمران خان اور ان کی سابقہ اہلیہ جمائما خان کے ساتھ تھے۔ ڈیانا جمائما خان کی قریبی دوست تھیں اور اسی دوستی کی وجہ سے وہ عمران خان کے شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال کے لیے فنڈز اکٹھے کرنے پاکستان آئیں۔ وہ لاہور میں عمران خان کے گھر بھی گئیں جہاں انہوں نے ان کے خاندان اور بالخصوص ان کی والدہ اور دیگر اہل خانہ سے انتہائی سادگی اور محبت سے ملاقات کی، جس کی وجہ سے خان فیملی کے ساتھ ان کا رشتہ محض رسمی نہیں بلکہ مکمل طور پر گھریلو تھا۔

اس کے علاوہ اس کے ایک برطانوی نژاد پاکستانی ہارٹ سرجن ڈاکٹر حسنات خان سے بھی تعلقات تھے، جنہیں لیڈی ڈیانا کی زندگی کی سچی محبت کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حسنات خان کا تعلق جہلم سے تھا اور ڈیانا ان سے اس حد تک مخلص تھیں کہ وہ ان کے خاندان سے ملنے اور ان کی والدہ کو سلام کرنے خود پاکستان آئیں۔ انہوں نے ڈاکٹر حسنات کے مینوفیکچرنگ اور خاندانی ماحول کو سمجھنے کے لیے ان کے رشتہ داروں سے ملاقاتیں کیں اور ان کے ساتھ وقت گزارا۔ ان دو بڑے خاندانوں کے علاوہ، ڈیانا کے اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان اور دیگر سرکاری شخصیات کے ساتھ بھی اچھے مراسم تھے، لیکن ان کے دل کے سب سے قریب عمران خان اور ڈاکٹر حسنات خان کے خاندان ہی رہے

۔

۔لیڈی ڈیانا کی موت نے برطانوی شاہی خاندان کو تاریخ کے سب سے بڑے بحران سے دوچار کر دیا۔ ڈیانا کی موت پر عوامی غم و غصے اور احتجاج کو دیکھتے ہوئے ملکہ الزبتھ دوم اور شاہی خاندان کو اپنے صدیوں پرانے سخت روایتی رویوں میں لچک لانی پڑی اور عوام کے قریب ہونا پڑا۔

اس واقعے کے بعد میڈیا اور شاہی خاندان کے تعلقات کے قوانین سخت کیے گئے تا کہ نئی نسل کو پاپرازی سے بچایا جاسکے۔ نیز، شہزادہ چارلس کو کامیلا سے شادی کرنے اور انہیں ملکہ کا درجہ دلوانے کے لیے کئی سال تک عوامی قبولیت کا انتظار کرنا پڑا

31 اگست کو ڈیانا کی برسی کے موقع پر دنیا بھر میں ان کی یادگاریں ان کے لازوال اثر کی گواہی دیتی ہیں۔ لندن کے ہائیڈ پارک میں واقع "ڈیانا، پرنسس آف ویلز میموریل فاؤنٹین" اور کینسنگٹن پیلس کے باغات میں ان کا نصب کردہ کانسی کا مجسمہ آج بھی لاکھوں مداحوں کی توجہ کا مرکز بنتا ہے

۔ دنیا انہیں نہ صرف ایک فیشن آئیکن کے طور پر یاد کرتی ہے، بلکہ ایک ایسی ماں اور ہمدرد انسان کے طور پر خراجِ عقیدت پیش کرتی ہے جس نے شاہی محلات کے پروٹوکولز کو توڑ کر عام لوگوں کے دکھ درد بانٹے۔ ان کے دونوں بیٹوں نے ان کے مشن (ذہنی صحت اور فلاحی کاموں) کو آگے بڑھا کر ان کی یاد کو آج بھی زندہ رکھا ہوا ہے





جنرل راتکو ملاچچ" (Ratko Mladić) بوسنیا کے قصائی "کی جیل میں موت۔۔۔ تاریخ کے بدترین کردار کا ذلت آمیز انجام۔

سابق بوسنیائی سربیائی جنرل اور جنگی مجرم راتکو ملادیچ(Ratko Mladić) ، جسے دنیا بھر میں "بوسنیا کا قصاب" کے نام سے جانا جاتا ہے، 27 اگست 2026ء کو نیدرلینڈز (دی ہیگ) میں اقوام متحدہ کے جیل اسپتال میں 84 برس کی عمر میں انتقال کر گیا سربیائی سرکاری میڈیا رپورٹس کے مطابق، ملادیچ جیل میں متعدد بار فالج (Strokes) کے حملوں کا شکار ہو چکا تھا اور طویل عرصے سے شدید علالت کے باعث اسپتال کے وارڈ میں زیرِ علاج تھا۔ وہ بوسنیا کی جنگ (1992–1995) کے دوران بوسنیائی سربیائی فوج کا سربراہ اور کمانڈر تھا، جسے نسل کشی اور جنگی جرائم کے جرم میں عمر قید کی سزا سنائی گئی

-

اس نے بوسنیا کی جنگ میں بوسنیائی سرب جمہوریہ (Republika Srpska) کی فوج کی کمان کی۔ وہ بوسنیا میں غیر سرب آبادی (خاص طور پر بوسنیائی مسلمانوں اور کروسیوں) کے خلاف سخت گیر قوم پرست نظریات رکھتا تھا

۔۔راتکو ملاچیچ بوسنیا میں ہونے والے بدترین انسانی مظالم کا براہ راست ذمہ دار تھا۔ اس کی فوج نے بوسنیا کے دارالحکومت سرائیوو کا تقریباً چار سال تک محاصرہ کیے رکھا، جہاں عام شہریوں اور بچوں کو سنائپرز اور گولہ باری کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے علاوہ جولائی 1995 میں اس کی فوج نے اسربیری نیکا (Srebrenica) کے محفوظ علاقے پر قبضہ کیا اور تقریباً 8,000 مسلم مردوں اور لڑکوں کو بے دردی سے قتل کر کے اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا۔ جدید تاریخ میں یہ یورپ کا بدترین نسل کشی کا واقعہ مانا جاتا ہے

جنگ کے بعد وہ کئی سال تک روپوش رہا، لیکن اسے مئی 2011 میں سربیا سے گرفتار کر کے نیدرلینڈز کے شہر دی ہیگ میں قائم بین الاقوامی فوجداری ٹربیونل (ICTY) کے حوالے کیا گیا۔ نومبر 2017 میں عدالت نے اسے نسل کشی، جنگی جرائم اور انسانیت کے خلاف جرائم کا مجرم قرار دیا اور اسے عمر قید کی سزا سنائی، جسے بعد میں 2021 کی اپیل میں بھی برقرار رکھا گیا

بوسنیا کی جنگ (1992–1995) اور اس کے دوران ہونے والا اسربیری نیکا (Srebrenica) کا قتل عام دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپی تاریخ کا سیاہ ترین باب مانے جاتے ہیں۔ بوسنیا کی جنگ (Bosnian War) صرف ایک فوجی تنازع نہیں تھا بلکہ اس کا بڑا مقصد نسلی صفایا (Ethnic Cleansing) تھا۔

1991 میں اشتراکی ملک 'یوگوسلاویہ' کے ٹوٹنے کے بعد، بوسنیا اور ہرزیگووینا نے 1992 میں اپنی آزادی کا اعلان کیا۔ بوسنیا میں تین بڑے گروہ آباد تھے: بوسنیائی مسلمان (بوسنیاک)، سربیائی عیسائی (سرب) اور کروشیائی عیسائی (کروٹ)۔ بوسنیا کے سربوں نے (جنہیں پڑوسی ملک سربیا کے صدر سلوبودان میلوسووچ کی بھرپور فوجی مدد حاصل تھی) اس آزادی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کا مقصد بوسنیا کے مسلم علاقوں پر قبضہ کر کے انہیں "عظیم تر سربیا" کا حصہ بنانا تھا۔ راتکو ملاچیچ کی کمان میں سربیائی فوج نے مسلم آبادیوں کو نشانہ بنایا۔ معصوم شہریوں کو حراستی کیمپوں میں ڈالا گیا، ہزاروں خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی، اور شہروں کی ناکہ بندی کر کے انہیں بھوکا مارا گیا۔ اس پوری جنگ میں تقریباً 100,000 لوگ مارے گئے اور 20 لاکھ سے زائد بے گھر ہوئے۔ یہ بوسنیا کی جنگ کا سب سے ہولناک اور وحشیانہ واقعہ تھا، جسے عالمی عدالتوں نے باقاعدہ نسل کشی (Genocide) قرار دیا۔

اس کے علاوہ ایک دوسرا واقعہ بھی رونما ہوا

جنگ کے دوران اقوام متحدہ نے اسربیری نیکا نامی قصبے کو مسلمانوں کے لیے "محفوظ علاقہ (Safe Area) " قرار دے رکھا تھا، جہاں ڈچ (Dutch) امن دستے تعینات تھے۔ اسی وجہ سے ہزاروں پناہ گزینوں نے وہاں پناہ لے رکھی تھی۔ جولائی 1995 میں جنرل راتکو ملاچچ کی سربیائی فوج نے اس قصبے کا گھیراؤ کر لیا۔ اقوام متحدہ کے ڈچ فوجی تعداد اور ہتھیاروں میں کم ہونے کی وجہ سے پیچھے ہٹ گئے اور شہریوں کو سربیائی جلادوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا

۔11 سے 13 جولائی کے درمیان سربیائی فوجیوں نے مسلم خواتین، بچوں اور بوڑھوں کو بسوں میں ڈال کر دوسری جگہ بھیج دیا، لیکن 12 سے 77 سال تک کے تمام مردوں اور لڑکوں کو علیحدہ کر لیا گیا۔ ملاچچ کے حکم پر، اگلے چند دنوں کے اندر تقریباً 8,000 سے زائد نہتے مسلم مردوں اور لڑکوں کو آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر، ہاتھ پاؤں جکڑ کر مختلف مقامات (فٹ بال گراؤنڈز، اسکولوں اور کھیتوں) میں لے جا کر گولیوں سے بھون دیا گیا۔ سربیائی فوج نے اس وحشیانہ جرم کو چھپانے کے لیے لاشوں کو بلڈوزروں کے ذریعے اجتماعی قبروں میں دفن کیا اور بعد میں ثبوت مٹانے کے لیے لاشوں کو اکھاڑ کر دوسری دور دراز جگہوں پر منتقل کر دیا۔

آج تک ڈی این اے (DNA) ٹیسٹ کے ذریعے ان ہڈیوں کی شناخت کر کے انہیں دفنایا جا رہا ہے

اسربیری نیکا کے قتل عام کے بعد عالمی برادری جاگی اور نیٹو نے سربیائی فوج کے ٹھکانوں پر شدید بمباری کی، جس نے سربیائی قیادت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا

دسمبر 1995 میں امریکہ کی ثالثی میں 'ڈیٹن امن معاہدہ' ہوا، جس کے بعد یہ جنگ ختم ہوئی اور بوسنیا کو دو حصوں (مسلم-کروٹ فیڈریشن اور سرب جمہوریہ) میں تقسیم کر دیا گیا۔

جنگی جرائم کے ٹریبونل نے نہ صرف راتکو ملاچچ بلکہ سربیائی جلادوں کے سیاسی سرغنہ رادوان کاراد زیچ (Radovan Karadžić) کو بھی نسل کشی کا ذمہ دار پا کر عمر قید کی سزا سنائی

بوسنیا کی جنگ کے دوران عالمی برادری—بشمول اقوام متحدہ (UN) اور یورپی ممالک—کا کردار شدید تنقید کا نشانہ بنا کیونکہ ان کی خاموشی اور سستی کی وجہ سے لاکھوں معصوم انسانوں کی جانیں گئیں۔

اقوام متحدہ نے جنگ کے شروع میں پورے یوگوسلاویہ پر ہتھیار خریدنے کی پابندی لگادی۔ اس کا سب سے بڑا نقصان بوسنیائی مسلمانوں کو ہوا، کیونکہ سربیائی فوج کے پاس سابق یوگوسلاو آرمی کے بھاری ہتھیار پہلے سے موجود تھے، جبکہ مسلمانوں کے پاس اپنے دفاع کے لیے بنیادی ہتھیار بھی نہیں تھے۔ اقوام متحدہ کے امن دستے (UN Peacekeepers) بوسنیا میں موجود تھے، لیکن انہیں صرف امن برقرار رکھنے کا مینڈیٹ حاصل تھا، لڑنے کا نہیں۔ سربیائی فوج اکثر ان امن دستوں کو یرغمال بنالیتی تھی یا ان کے سامنے شہریوں پر ظلم کرتی تھی اور وہ کچھ نہیں کر پاتے تھے

ترکی، سعودی عرب، ایران اور پاکستان جیسے ممالک نے سفارتی سطح پر بوسنیا کے مسلمانوں کی حمایت کی۔ پاکستان نے اقوام متحدہ کے امن مشن کے تحت اپنے فوجی بھی بوسنیا بھیجے جنہوں نے مقامی آبادی کے تحفظ میں اہم کردار ادا کیا۔ جب جولائی 1995 میں اسربیری نیکا کا قتل عام ہوا، تو عالمی برادری پر دباؤ بڑھ گیا۔ بالآخر اگست 1995 میں نیٹو نے سربیائی فوج پر فضائی حملے (Operation Deliberate Force) شروع کیے، جس نے سربیائی فوج کی کمر توڑ دی اور انہیں امن معاہدے پر مجبور کیا۔

آج کا بوسنیا اور ہرزیگووینا (Bosnia and Herzegovina) جنگ سے تو باہر نکل چکا ہے، لیکن اس کے اثرات اور سیاسی ڈھانچہ اب بھی انتہائی پیچیدہ ہیں۔ 1995 کے ڈیٹن معاہدے کے تحت بوسنیا کو ایک ملک تو رکھا گیا، لیکن اسے اندرونی طور پر دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا: ایک مسلم اور کروشیائی وفاق اور دوسرا سرب جمہوریہ (Republika Srpska) ۔ ملک میں ایک وقت میں تین صدر ہوتے ہیں (ایک مسلم، ایک سرب اور ایک کروٹ) جو باری باری حکومت چلاتے ہیں۔ اس نظام کی وجہ سے فیصلے بہت سست ہوتے ہیں۔ اگرچہ اب وہاں جنگ نہیں ہے، لیکن نسلی دوریاں اب بھی موجود ہیں

۔ سرب جمہوریہ کے موجودہ قوم پرست رہنما اکثر یہ دھمکی دیتے رہتے ہیں کہ وہ بوسنیا سے الگ ہو کر سربیا کے ساتھ مل جائیں گے، جس کی وجہ سے خطے میں دوبارہ کشیدگی کا خطرہ برقرار رہتا ہے

۔ سیاسی عدم استحکام کی وجہ سے بوسنیا کی معاشی ترقی سست رہی ہے۔ بے روزگاری کی وجہ سے بڑی تعداد میں نوجوان نسل ملک چھوڑ کر جرمنی اور دیگر یورپی ممالک کا رخ کر رہی ہے۔ بوسنیا نے باقاعدہ طور پر یورپی یونین کی رکنیت کے لیے درخواست دے رکھی ہے اور اسے 'امیدوار ملک (Candidate Status)' کا درجہ مل چکا ہے، لیکن وہاں کے سیاسی نظام کی خرابیوں کی وجہ سے اسے مکمل رکن بننے میں ابھی وقت لگے گا۔

اسربیری نیکا میں ایک بہت بڑی یادگار (Potočari Memorial Center) بنائی گئی ہے، جہاں ہر سال 11 جولائی کو دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں اور ڈی این اے کے ذریعے نئی شناخت ہونے والی ہڈیوں کو سپردِ خاک کیا جاتا ہے۔



30اگست'لاپتہ افراد(جبرًالاپتہ کیے گئے متاثرین)کاعالمی دن۔اقوام متحدہ کالاپتہ افراد کے تحفظ کے معاہدے پر دستخط کے لئے پاکستان پر دباؤاور صورت حال کا جائزہ

لاپتہ افراد(جبرًالاپتہ کیے گئے متاثرین)کا

عالمی دن ہر سال30اگست کو منایا جاتا ہے، جس کا مقصد دنیا بھر میں بغیر کسی قانونی کارروائی کے غائب کیے جانے والے افراد کے مسئلے کو اجاگر کرنااور ان کے خاندانوں کے ساتھ یکجہتی کااظہار کرنا ہے۔

اس دن کی بنیاد لاطینی امریکہ (Latin America) سے پڑی.1981ءمیں کوسٹاریکامیں قائم ایک تنظیم فیڈی فام)

FEDEFAM)

(Federation of Associations for Relatives of Detained-Disappeared in Latin America)

نے سب سے پہلے اس دن کو منانے کی ابتدا کی

جس کی بڑی وجہ یہ بنی کہ1970ءاور1980ءکی دہائیوں میں لاطینی امریکہ کے مختلف ممالک(جیسے ارجنٹائن، چلی اور گوئٹے مالا)میں فوجی آمریتوں کے دوران ہزاروں سیاسی مخالفین، انسانی حقوق کے کارکنوں اور عام شہریوں کو خفیہ طور پر اغوا کر کے لاپتہ کر دیا گیا تھا۔ان کے خاندانوں نے آواز اٹھانے کے لیے یہ تحریک شروع کی

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بڑھتی ہوئی جبری اور غیر رضاکارانہ گمشدگیوں پر تشویش کے اظہار کے بعد 30 اگست کو یہ عالمی دن قرار دیا، جس کا باقاعدہ آغاز 2011ء سے ہوا۔

سال 2026 کا اس دن کا مرکزی پیغام

"Victims First. Actions Now"

یعنی "متاثرین سب سے پہلے، عمل ابھی" ہے

۔اس پیغام کا بنیادی مقصد متاثرین کے حقِ سچ، انصاف اور ازالے کو مرکزیت دینا اور ریاستوں و متعلقہ اداروں کو جبری گمشدگیوں کی روک تھام کے لئے امادہ کرنا ہے

جبرًا لاپتہ کیے جانے کے خلاف اقوامِ متحدہ کا ایک باقاعدہ معاہدہ ہے جسے

International Convention for the Protection of All Persons from Enforced Disappearance

کہا جاتا ہے۔ اس قانون کے مطابق، اگر ریاست کے ادارے یا ان کی پشت پناہی حاصل کرنے والے عناصر کسی شخص کو حراست میں لیں اور پھر اس کی گرفتاری کا اعتراف نہ کریں یا اس کا پتہ چھپائیں، تو یہ "جبرًا لاپتہ کرنا" کہلاتا ہے اور اس قانون کے تحت کسی بھی حالت میں (خواہ جنگ ہو، اندرونی سیاسی عدم استحکام ہو یا ہنگامی صورتحال) کسی بھی انسان کو غائب کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ اس معاہدے پر دستخط کرنے والے ممالک پابند ہیں کہ وہ اپنے ملکی قانون میں اسے ایک سنگین "فوجداری جرم" قرار دیں اور ملوث افراد کو سزائیں دیں

پاکستان نے اب تک اقوامِ متحدہ کے لاپتہ افراد سے متعلق کنونشن (ICPPED) پر دستخط یا توثیق نہیں کی ہے۔ اقوامِ متحدہ اور عالمی برادری مسلسل پاکستان پر زور دیتی آرہی ہے کہ وہ اس معاہدے کی توثیق کرے اور جبرًا لاپتہ کرنے کے عمل کو ملکی قانون کے تحت ایک جرم تسلیم کرے

پاکستان میں جبری گمشدگی (Enforced Disappearances) یا لاپتہ افراد کا معاملہ طویل عرصے سے ایک انتہائی حساس، پیچیدہ اور اہم انسانی حقوق کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس کا تعلق ملک کی قومی سلامتی، قانون کی حکمرانی اور انسانی حقوق کے حقوق سے جڑا ہوا ہے۔

پاکستان میں جبری گمشدگیوں کا سلسلہ بنیادی طور پر 2001ء کے بعد "دہشت گردی کے خلاف جنگ (War on Terror)" کے دوران شدت اختیار کر گیا۔ اس کے بعد بلوچستان، خیبر پختونخوا اور بعض دیگر علاقوں میں قومی سلامتی کے چیلنجز اور انتہا پسندی کے خلاف اقدامات کے دوران مختلف افراد کو قانونی کارروائی اور باضابطہ گرفتاری کی اطلاع کے بغیر اٹھائے جانے کے الزامات سامنے آئے:

حکومت پاکستان نے 2011ء میں کمیشن برائے تحقیقاتِ جبری گمشدگی (CoIoED) قائم کیا۔ اس کمیشن میں 10,000 سے زائد کیسز درج ہوئے، جن میں سے 8000 سے زائد کیسز کو کمیشن نے حل کرنے یا ٹریس کرنے کا دعویٰ کیا، لیکن سینکڑوں کیسز ابھی بھی زیرِ التواء ہیں۔

ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان (HRCP) اور بین الاقوامی ادارے جیسے ایمنسٹی انٹرنیشنل اس عمل کو آئین پاکستان کے آرٹیکل 9 (آزادی و تحفظ) اور آرٹیکل 10 (منصفانہ ٹرائل) کی خلاف ورزی قرار دیتے ہیں۔ سوشل میڈیا (خاص طور پر X/ٹوئٹر اور فیس بک) پر لاپتہ افراد کے مسئلے کو لے کر شدید بحث اور تحرک دیکھنے کو ملتا ہے۔ متاثرہ خاندان، انسانی حقوق کے کارکنان اور بلوچ یا پشتون حقوق کی تحریکیں (مثلاً بلوچ یکجہتی کمیٹی اور دیگر) سوشل میڈیا کو بطورِ احتجاج استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے عزیزوں کی تصاویر اور تفصیلات پوسٹ کر کے ان کی بازیابی اور عدالتوں میں پیشی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

سوشل میڈیا پر غالب بیانیہ یہ ہے کہ اگر کسی شخص پر کسی جرم، بغاوت یا دہشت گردی کا الزام ہے، تو اسے آئین کے مطابق عدالت میں پیش کیا جائے اور قانونی طریقہ کار (Due Process) کی پیروی کی جائے۔ اس کے علاوہ ریاستی اداروں کے طریق کار پر سوالات اٹھائے جاتے ہیں اور اسے آئینی بنیادی حقوق کے منافی قرار دیا جاتا ہے۔

تاہم حکومت اور سیکیورٹی اداروں کا موقف اس معاملے پر بالکل مختلف زاویے سے سامنے آتا ہے

ریاستی اداروں کا کہنا ہے کہ ملک کو غیر معمولی اور پیچیدہ سیکیورٹی چیلنجز اور بیرونی فنڈڈ دہشت گردی (خصوصاً بلوچستان اور خیبر پختونخوا میں) کا سامنا ہے، جہاں روایتی ادوار کے ثبوت جمع کرنا مشکل ہوتا ہے۔

سرکاری موقف یہ بھی رہا ہے کہ لاپتہ قرار دیے گئے تمام افراد ریاست کے پاس نہیں ہیں۔ ان میں سے کئی افراد افغانستان فرار ہو چکے ہیں، کالعدم تنظیموں (مثلاً BLA یا TTP کے لیے لڑتے ہوئے مارے گئے ہیں، یا غیر قانونی راستوں سے بیرونِ ملک جا چکے ہیں۔

حکومت کا کہنا ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوشاں ہے۔ اعلیٰ عدالتیں (سپریم کورٹ اور ہائی کورٹس) باقاعدگی سے ان کیسز کی سماعت کرتی ہیں اور کئی افراد کی بازیابی بھی ممکن بنائی گئی ہے۔

عدالت عظمیٰ پاکستان اور پارلیمانی کمیٹیوں نے بارہا اس بات پر زور دیا ہے کہ لاپتہ افراد کا مسئلہ محض ایک قانونی مسئلہ نہیں بلکہ ایک گہرا انسانی اور جذباتی مسئلہ ہے۔ بنیادی حل یہی تجویز کیا جاتا ہے کہ تمام تر کارروائیاں آئین اور قانون کے دائرے کے اندر لائی جائیں تاکہ ریاستی تحفظ اور انسانی حقوق کے درمیان توازن برقرار رکھا جا سکے۔



29اگست: نیوکلیئر تجربات کے خلاف عالمی دن

اور پاکستان وبھارت کی دفاعی صورتحال

ہر سال29اگست کو دنیا بھر میں "نیوکلیئر تجربات کے خلاف عالمی دن International Day against Nuclear) Tests) منایا جاتا ہے۔اس دن کو رسمی طور پر منانے کی منظوری اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے دسمبر2009ء میں قازقستان کی جانب سے پیش کردہ ایک قرارداد کے ذریعے دی تھی۔اس کا بنیادی مقصد جوہری دھماکوں کے ہولناک اور دیرپا اثرات سے آگاہی فراہم کرنا، ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ کو روکنا اور دنیا کو ایٹمی تجربات سے پاک کرنے کے عزم کو تازہ کرنا ہے۔اس دن دنیا بھر میں سیمینارز اور کانفرنسز کا انعقاد کیا جاتا ہے

۔اس خاص تاریخ کو منتخب کرنے کی ایک اہم تاریخی پس منظر ہے۔ قازقستان میں واقع 'سیمی پالاتنسک '
(Semipalatinsk)سوویت یونین کی سب سے بڑی نیوکلیئر ٹیسٹ سائیٹ تھی، جہاں 1949ء سے 1989ء کے درمیان ریکارڈ 456 ایٹمی تجربات کیے گئے۔ ان تجربات کے نتیجے میں نہ صرف وسیع پیمانے پر ماحولیاتی تباہی ہوئی بلکہ لاکھوں افراد شدید متاثر ہوئے۔ 29 اگست 1991ء کو عوامی تحریک کے بعد قازقستان نے اس ٹیسٹ سائیٹ کو ہمیشہ کے لیے بند کرنے کا تاریخی فیصلہ کیا، جس کی یاد میں اقوام متحدہ نے اس دن کو عالمگیر سطح پر مختص کیا۔

۔ایٹمی دھماکوں کے اثرات صرف فوری تباہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ یہ نسل در نسل منتقل ہوتے ہیں۔ تابکاری (Radiation)کی وجہ سے تجربہ گاہوں کے قریب رہنے والی آبادیوں میں کینسر، تھائرائیڈ اور جینیاتی بیماریاں عام ہوئیں۔ مزید برآں، ایٹمی فضلے نے زمین کو ناقابلِ کاشت بنادیا اور زیرِ زمین پانی زہریلا ہونے سے پورا ایکو سسٹم تباہ ہو گیا۔ 1945ء سے 1996ء کے درمیان دنیا بھر میں 2,000 سے زائد ایٹمی تجربات کیے گئے، جن کے نتیجے میں اٹھنے والے ریڈیو ایکٹو ذرات دنیا کی تاریخ کا ایک تاریک باب ہیں

۔جنوبی ایشیا میں پاکستان اور بھارت کی ایٹمی تاریخ خطے کے دفاعی توازن سے جڑی ہوئی ہے۔ بھارت نے اپنا پہلا جوہری تجربہ 18 مئی 1974ء کو راجستھان کے صحرا پوکھران میں کیا، جسے "آپریشن اسمائلنگ بدھا " (Smiling Buddha)کا نام دیا گیا۔ اگرچہ بھارت نے اسے پرامن دھماکہ قرار دیا، لیکن اس سے خطے کا توازن متاثر ہوا۔ اس کے چوبیس سال بعد، 11 اور 13 مئی 1998ء کو بھارت نے "آپریشن شکتی (Operation Shakti) "کے تحت پوکھران ہی میں مزید 5 زیرِ زمین ایٹمی دھماکے کر کے خود کو باقاعدہ ایٹمی طاقت ظاہر کر دیا

۔بھارتی اقدامات کے جواب میں اور ملکی دفاع کو ناقابلِ تسخیر بنانے کے لیے پاکستان نے 28 مئی 1998ء کو بلوچستان کے ضلع چاغی (راس کوہ) میں 5 کامیاب زیرِ زمین ایٹمی دھماکے کیے۔ اس دن کو پاکستان میں "یومِ تکبیر" کا نام دیا گیا۔ بعد ازاں 30 مئی 1998ء کو خاران میں چھٹا ایٹمی دھماکہ کیا گیا، جس کے ساتھ ہی پاکستان دنیا کی 7 ویں اور عالمِ اسلام کی پہلی تسلیم شدہ ایٹمی طاقت بن گیا۔ ان تجربات نے جنوبی ایشیا میں "روایتی عدم توازن" کو ختم کر کے ایک مضبوط دفاعی توازن (Minimum Credible Deterrence) قائم کیا۔ 1998ء کے تجربات کے بعد پاکستان اور بھارت دونوں نے مزید ایٹمی دھماکے نہ کرنے کے یکطرفہ عزم (Unilateral Moratorium) کا اعلان کیا تھا، جس پر وہ اب تک قائم ہیں۔ تاہم، اقوامِ متحدہ اور عالمی ادارے دونوں ممالک پر "جامع نیوکلیئر ٹیسٹ بین معاہدے (CTBT) "پر دستخط کے لیے زور دیتے رہتے ہیں۔ دونوں ممالک کا موقف ہے کہ وہ خطے کی مجموعی سیکیورٹی اور نیوکلیئر سپلائرز گروپ (NSG) جیسے عالمی فورمز پر مساوی رویے کے بغیر یکطرفہ طور پر سی ٹی بی ٹی پر دستخط نہیں کر سکتے

۔آج کے دور میں 29 اگست کا دن اس بات کی یاد دہانی کرواتا ہے کہ اگرچہ پاکستان اور بھارت جیسی ریاستوں نے دفاعی اور قومی سلامتی کی ضرورت کے تحت ایٹمی صلاحیت حاصل کی، لیکن عالمی سطح پر غیر فعال ایٹمی تجربات کو روکنا انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کے لیے ضروری ہے کہ دونوں ہمسایہ ممالک نیوکلیئر کمانڈ اینڈ کنٹرول سسٹم کی مضبوطی اور بحران کے حل کے لیے اعتماد سازی کے اقدامات (CBMS) کو مزید فروغ دیں۔



29اگست — نیشنل لیمن جوس ڈے: ایک قطرۂ لیموں سے صحت، ذائقے اور معیشت تک کا سفر

ہر سال 29 اگست کو دنیا بھر میں نیشنل لیمنجوس ڈے منایا جاتا ہے، جو بنیادی طور پر امریکہ سے شروع ہونے والا ایک غیر سرکاری غذائی و ثقافتی دن ہے۔ اس دن کا مقصد لیموں کے رس کی غذائی، ذائقہ دار اور گھریلو اہمیت کو اجاگر کرنا ہے۔ اس کے آغاز کا درست سال یا بانی فرد و ادارہ مستند طور پر ریکارڈ میں موجود نہیں، اور معروف نیشنل ڈے کیلنڈر بھی اس کی اصل تاریخ پر تحقیق جاری ہونے کا ذکر کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے کسی عالمی ادارے، اقوامِ متحدہ یا ادارۂ صحت کا باقاعدہ عالمی دن قرار دینا درست نہیں، بلکہ یہ زیادہ تر عوامی دلچسپی اور سوشل میڈیا کی سرگرمی کا نتیجہ ہے

امریکہ کے علاوہ برطانیہ اور دیگر انگریزی بولنے والے ممالک میں بھی فوڈ کیلنڈرز اور #NationalLemonJuiceDay ہیش ٹیگ کے ذریعے لوگ لیمونیڈ، مختلف مشروبات اور روایتی پکوان شیئر کرتے ہیں، تاہم یہ کسی ملک میں سرکاری تعطیل نہیں

۔اس دن کے پیچھے لیموں کی ایک طویل انسانی و طبی تاریخ کار فرما ہے۔ سائٹرس پھلوں کی اصل کو عمومی طور پر ہمالیائی اور جنوبی ایشیائی خطے سے جوڑا جاتا ہے، جہاں سے یہ صدیوں میں دنیا بھر میں پھیلے۔ اٹھارویں صدی میں سمندری سفر کرنے والے ملاحوں میں اسکوروی، یعنی وٹامن سی کی شدید کمی، سے بچاؤ کے لیے ترش پھلوں کے رس کا استعمال ایک اہم طبی دریافت ثابت ہوا، جس نے لیموں کو محض ذائقے کے بجائے صحت اور بقا کی علامت بھی بنا دیا

۔ آج بھی لیموں پانی وٹامن سی، تازگی اور آسان دستیابی کی وجہ سے صحت مند طرزِ زندگی کا ایک مقبول حصہ ہے۔ یہ جسم میں پانی کی کمی پوری کرنے میں مددگار ہو سکتا ہے، خاص طور پر گرمی یا جسمانی سرگرمی کے دوران، کیونکہ اس کا ذائقہ لوگوں کو زیادہ پانی پینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اسے سلاد، سبزیوں اور کھانوں میں شامل کر کے نمک اور مصنوعی ذائقوں پر انحصار بھی کم کیا جا سکتا ہے۔
البتہ سائنسی طور پر یہ ثابت نہیں کہ لیموں پانی جسم سے زہریلے مادے خارج کرتا ہے یا فوری وزن کم کرتا ہے، اور نہ ہی یہ کسی بیماری کا علاج یا دوا کا متبادل ہے۔ چونکہ لیموں تیزابی ہوتا ہے، اس لیے اس کا کثرت سے استعمال دانتوں کی بیرونی تہہ کو متاثر کر سکتا ہے؛ بہتر ہے کہ اسے پانی میں ملا کر اور استعمال کے بعد سادہ پانی سے کلی کر کے پیا جائے، جبکہ معدے کی تیزابیت کے مریض احتیاط برتیں۔

پاکستان کے لیے یہ دن خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ ملک سائٹرس پیداوار کی نمایاں صلاحیت رکھتا ہے۔ سرکاری زرعی اعداد و شمار کے مطابق پاکستان میں لیموں، کینو، مالٹے اور گریپ فروٹ سمیت مختلف سائٹرس اقسام کاشت ہوتی ہیں، اور پنجاب اس شعبے کا مرکزی خطہ ہے جہاں سرگودھا، ٹوبہ ٹیک سنگھ اور آس پاس کے اضلاع کینو کی پیداوار کے لیے خاص طور پر معروف ہیں۔
2023-24ء میں پاکستان کی مجموعی سائٹرس پیداوار تقریباً 23 لاکھ 34 ہزار ٹن رہی، جس میں پنجاب کا حصہ سب سے نمایاں تھا۔ اس پیداوار سے جوس، پلپ، کنسنٹریٹ، اچار، جام اور مارملیڈ جیسی ویلیو ایڈڈ مصنوعات بھی تیار کی جاتی ہیں

۔معاشی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو کینو پاکستان کی چند بڑی پھل برآمدات میں شامل ہے اور خلیجی ممالک، روس، وسطی ایشیائی ریاستوں اور بعض یورپی منڈیوں کو برآمد کیا جاتا ہے، جس سے ملک کو قیمتی زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ سائٹرس کی کاشت اور اس سے جڑی صنعتیں، جیسے چھانٹی، پیکنگ، کولڈ اسٹوریج اور پروسیسنگ یونٹس، دیہی علاقوں میں روزگار کا ایک اہم ذریعہ ہیں اور لاکھوں کسان خاندانوں کی آمدنی کا انحصار براہِ راست یا بالواسطہ اسی شعبے پر ہے۔ اس کے باوجود پاکستان اپنی اصل برآمدی صلاحیت سے کہیں کم استفادہ کر پا رہا ہے، جس کی بڑی وجوہات میں بعد از فصل نقصانات، ناقص کولڈ چین، معیاری پیکنگ کی کمی، بیماریوں جیسے سٹرس گرینِنگ کا پھیلاؤ، اور بین الاقوامی صحت و معیار کے معیارات (فائٹو سینیٹری اسٹینڈرڈز) پر مکمل عملدرآمد نہ ہونا شامل ہیں

۔اگر پاکستان جدید پروسیسنگ ٹیکنالوجی، بہتر کولڈ چین انفراسٹرکچر اور بین الاقوامی معیار کی پیکیجنگ میں سرمایہ کاری کرے تو خام پھل کے بجائے ویلیو ایڈڈ مصنوعات کی برآمد بڑھا کر زیادہ زرِمبادلہ اور بہتر منافع حاصل کیا جاسکتا ہے، جو دیہی معیشت کو مضبوط بنانے اور کسانوں کی آمدنی میں اضافے کا مؤثر ذریعہ بن سکتا ہے

۔29 اگست کا یہ دن دراصل ایک سادہ یاد دہانی ہے کہ قدرت کی عطا کردہ نعمتوں کو محض استعمال کرنے کے بجائے علم، تحقیق اور جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے قومی ترقی کا ذریعہ بنایا جانا چاہیے۔ ایک قطرہ لیموں کا رس جہاں روزمرہ خوراک کا ذائقہ اور معیار بہتر بنا سکتا ہے، وہیں درست منصوبہ بندی، تحقیق اور محنت کسی قوم کی زرعی اور معاشی تقدیر بھی بدل سکتی ہے۔ پاکستان کے لیے اصل چیلنج پیداوار بڑھانے سے زیادہ اسے ویلیو ایڈیشن، معیاری برآمدات اور دیہی معیشت کی مضبوطی میں تبدیل کرنا ہے، تاکہ یہ چھوٹا سا پھل قومی سطح پر صحت اور خوشحالی دونوں میں اپنا کردار ادا کر سکے۔



28-اگست 1955۔ گوری میم کو دیکھ کر سیٹی بجانے پر 14 سالہ سیاہ فام کا وحشیانہ قتل اور اس کے مابعد اثرات۔

28 اگست 1955 کو 14 سالہ سیاہ فام ایمیٹ ٹل (Emmett Till) کا قتل امریکی تاریخ کا ایک ایسا المناک اور سیاہ باب ہے جس نے شہری حقوق کی تحریک (Civil Rights Movement) کو ایک نئی اور طاقتور سمت دی

ایمیٹ ٹل شکاگو کا رہنے والا ایک 14 سالہ افریقی امریکی (سیاہ فام) لڑکا تھا۔ اگست 1955ء میں وہ مانی (Money)، مسیسپی میں اپنے رشتہ داروں سے ملنے آیا ہوا تھا۔ 24 اگست 1955ء کو ایمیٹ اپنے کزن اور دوستوں کے ساتھ ایک مقامی دکان (Bryant's Grocery) پر گیا۔ وہاں اس پر الزام لگایا گیا کہ اس نے دکان کی 21 سالہ سفید فام مالکن، کیرولین برائنٹ (Carolyn Bryant) کے ساتھ بدتمیزی کی اور اسے دیکھ کر سیٹی بجائی۔ اس دور میں امریکہ کی جنوبی ریاستوں میں نسلی امتیاز کے سخت قوانین (Jim Crow laws) نافذ تھے، جہاں کسی سیاہ فام کا سفید فام خاتون سے اس طرح مخاطب ہونا شدید جرم سمجھا جاتا تھا۔ اور یہاں بھی یہی ہوا

اور 28اگست 1955ء کی رات، کیرولین برائنٹ کا شوہر روئے برائنٹ (Roy Bryant) اور اس کا سوتیلا بھائی جے ڈبلیو میلم (J.W. Milam) ہتھیاروں کے ساتھ ایمیٹ ٹل کے رشتہ دار کے گھر میں داخل ہوئے اور ایمیٹ کو زبردستی اغوا کر کے لے گئے۔ انہوں نے ایمیٹ پر شدید ترین وحشیانہ تشدد کیا، اس کی ایک آنکھ نکال دی، اسے گولی ماری اور پھر اس کی لاش کو ایک بھاری پنکھے کے ساتھ خاردار تار سے باندھ کر تالاہیچی ندی (Tallahatchie River) میں پھینک دیا۔ تین دن بعد، 31اگست کو ندی سے ایمیٹ ٹل کی مسخ شدہ لاش برآمد ہوئی۔ اس کا چہرہ اس حد تک بگڑ چکا تھا کہ اس کی شناخت صرف اس کے ہاتھ میں موجود اس کے والد کی انگوٹھی سے ہو سکی۔

۔ایمیٹ ٹل کی والدہ، میمی ٹل موبلی (Mamie Till-Mobley) نے اپنے بیٹے کی لاش کو واپس شکاگو منگوایا۔ انہوں نے ایک انتہائی جرات مندانہ اور تاریخی فیصلہ کرتے ہوئے جنازے پر تابوت کو کھلا رکھنے (Open-casket funeral) کا حکم دیا۔ انہوں نے کہا:

"میں چاہتی ہوں کہ پوری دنیا دیکھے کہ انہوں نے میرے بچے کے ساتھ کیا کیا ہے۔"

اس کھلے تابوت اور مسخ شدہ چہرے کی تصاویر جب میڈیا اور رسالوں (جیسے Jet magazine) میں شائع ہوئیں، تو اس نے پورے امریکہ اور دنیا بھر کو ہلا کر رکھ دیا اور سفید فاموں کے ظلم و ستم کا اصل چہرہ بے نقاب ہو گیا۔

ستمبر 1955ء میں دونوں ملزمان (روئے برائنٹ اور جے ڈبلیو میلم) کے خلاف مقدمہ چلایا گیا۔ مسیسیپی کی اس عدالت میں جیوری کے تمام اراکین سفید فام مرد تھے۔ محض 67منٹ کی سماعت کے بعد، جیوری نے دونوں ملزمان کو بے قصور قرار دے کر رہا کر دیا۔ جیوری کے ایک رکن نے بعد میں کہا کہ

"اگر ہم کوکا کولا پینے کے لیے وقفہ نہ لیتے تو فیصلہ اس سے بھی جلدی آ جاتا"

عدالت سے بچنے کے بعد، جنوری 1956ء میں Look میگزین کو دیے گئے ایک انٹرویو میں دونوں قاتلوں نے (چونکہ دوبارہ مقدمہ نہ چلنے کے قانون (Double Jeopardy) کا تحفظ حاصل تھا، (ایمیٹ ٹل کو قتل کرنے کا اعتراف کیا اور انہیں اس اعتراف پر 4,000ڈالر بھی دیے گئے

ایمیٹ ٹل کے قتل اور قاتلوں کی بریت نے افریقی امریکی برادری میں شدید غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ اس واقعے نے سول رائٹس موومنٹ کے لیے ایک فیول کا کام کیا۔

اس واقعے کے چند ماہ بعد، دسمبر 1955ء میں روزہ پارکس (Rosa Parks) نے بس میں ایک سفید فام کے لیے سیٹ چھوڑنے سے انکار کیا، جس سے مونٹگمری بس بائیکاٹ شروع ہوا۔ روزہ پارکس نے بعد میں کہا تھا کہ

"میں نے ایمیٹ ٹل کے بارے میں سوچا اور میں پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی" نوجوانوں کی ایک پوری نسل (جیسے جان لیوس اور محمد علی کلے) اس واقعے سے متاثر ہو کر ناانصافی کے خلاف کھڑی ہوئی۔ اور جدوجہد جاری رہی اور بہت سی مشکلات بھی سامنے آئیں۔ مگر یہ جدوجہد بالآخر رنگ لائی اور

سال 2022ء میں، امریکی صدر جو بائیڈن نے "ایمیٹ ٹل اینٹی لنچنگ ایکٹ (Emmett Till Anti-Lynching Act)" پر دستخط کیے، اور یہ ایکٹ امریکہ میں نسلی اور نفرت پر مبنی تشدد کے خلاف ایک تاریخی قانون ہے، جسے 29 مارچ 2022ء کو نافذ کیا گیا

۔اس قانون نے لنچنگ—یعنی کسی فرد یا گروہ کی جانب سے قانون کو ہاتھ میں لے کر، بالخصوص نفرت یا تعصب کی بنیاد پر، اجتماعی تشدد—سے متعلق سنگین جرائم کو وفاقی ہیٹ کرائمز کے قانونی دائرے میں مزید واضح اور مضبوط کیا۔ قانون کے تحت نفرت انگیز جرم کی سازش کے نتیجے میں موت یا سنگین جسمانی نقصان کی صورت میں مجرموں کو 30 سال تک قید اور جرمانے کی سزا دی جا سکتی ہے

۔اس قانون کو 1955ء میں نسلی تعصب کا شکار ہونے والے 14 سالہ افریقی نژاد امریکی نوجوان ایمیٹ ٹل کے نام سے منسوب کیا گیا۔ اور اسے طویل عرصے کی قانونی جدوجہد کی تکمیل کی علامت سمجھا جاتا ہے۔

عالمی سطح پر اس قانون کا سب سے اہم اثر اخلاقی اور علامتی ہے: اس نے دنیا کو یہ پیغام دیا کہ ہجومی تشدد، نسلی نفرت اور ماورائے عدالت قتل کسی معاشرے کا داخلی معاملہ نہیں بلکہ انسانی وقار اور قانون کی حکمرانی کے خلاف سنگین جرم ہیں۔

اگرچہ یہ امریکی قانون براہِ راست دوسرے ممالک میں نافذ نہیں ہوتا، تاہم اس نے انسانی حقوق کے کارکنوں اور قانون سازوں کے لیے ایک اہم مثال فراہم کی ہے کہ ریاستوں کو نفرت انگیز اور اجتماعی تشدد کے خلاف واضح قوانین، مؤثر تحقیقات اور بلا امتیاز احتساب کو یقینی بنانا چاہیے۔

اس کا بنیادی سبق یہی ہے کہ انصاف میں تاخیر تاریخ کے زخم تو گہرے کر سکتی ہے، مگر قانون کی بالادستی اور اجتماعی احتساب ہی ایک مہذب معاشرے کی اصل پہچان ہیں۔



27اگست-مدر ٹریسا کا یوم پیدائش، زندگی کے سفر، عالمی خدمات اور پاکستان پر ان کے اثرات

مدر ٹریسا (جن کا پیدائشی نام آغ نیس گونگجہ بوجاکسیو (Anjezë Gonxhe Bojaxhiu) تھا۔27اگست1910 کو موجودہ شمالی مقدونیہ کے شہر سکوپجے میں ایک البانیائی کیتھولک خاندان میں پیدا ہوئیں۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی شہر سے حاصل کی، جہاں ان کے خاندانی پس منظر نے ان میں مذہبی رجحان اور ہمدردی کے جذبات پیدا کیے۔ محض 18 سال کی عمر میں انہوں نے مشنری بننے کی راہ چنی اور آئرلینڈ کی "لوریٹو سسٹرز" سے وابستہ ہو گئیں

مدر ٹریسا کو 24 مئی 1937 کو اپنے حتمی مذہبی عہد (Final Vows) اٹھانے کے موقع پر کیتھولک کلیسیا اور ان کے مذہبی ادارے (لوریٹو سسٹرز) کے روایتی ضابطے کے تحت "مدر" کا خطاب ملا، جس کے بعد وہ مدر ٹریسا کہلائیں۔ اس سے قبل سنہ 1931ء میں جب انہوں نے ابتدائی مذہبی عہد لیے تو انہوں نے فرانسیسی سینٹ "تھریس (Thérèse de Lisieux) " کی نسبت سے اپنا نام سسٹر ٹریسا رکھا تھا۔

1929 میں وہ پہلی بار کلکتہ (بھارت) آئیں، جہاں انہوں نے سینٹ مریز اسکول میں ایک طویل عرصے تک بحیثیت استاد جغرافیہ اور تاریخ پڑھایا۔ تاہم، ارد گرد پھیلی غربت اور انسانی تکالیف نے ان کی زندگی کے رخ کو یکسر تبدیل کر دیا۔

1946 میں سفر کے دوران انہیں ایک اندرونی پکار (Call within a call) کا احساس ہوا، جس نے انہیں اسکول کی آسائش چھوڑ کر کچی بستیوں کے غریب ترین لوگوں کی خدمت کا عزم بخشا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے 1950 میں مشنریز آف چیریٹی (Missionaries of Charity) نامی مذہبی فلاحی جماعت کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے کلکتہ کی سڑکوں پر بے یار و مددگار مرتے ہوئے لوگوں، کوڑھ (leprosy) کے مریضوں اور یتیم بچوں کے لیے پناہ گاہیں، موبائل کلینکس اور ہسپتال قائم کیے۔ ان کا یہ کام جلد ہی ایک عالمی تحریک بن گیا اور دنیا بھر سے رضاکار اس کارِ خیر میں شامل ہونے لگے

انسانیت کے لیے ان کی بے لوث اور طویل خدمات کے اعتراف میں انہیں 1979 میں نوبل امن انعام سے نوازا گیا۔ اس موقع پر انہوں نے اپنے غیر معمولی پیشہ ورانہ اور فلاحی طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے اعزاز میں دی جانے والی شاہی ضیافت کو منسوخ کروا دیا اور اس کے 7,000 ڈالر کے اخراجات کلکتہ کے غریبوں کو عطیہ کر دیے تاکہ وہ بھوک سے بچ سکیں۔ 10 دسمبر 1979 کو اپنی نوبل تقریر میں انہوں نے دنیا کو امن کا عالمگیر پیغام دیتے ہوئے واضح کیا کہ

"روٹی کی بھوک سے زیادہ بڑی غربت یہ ہے کہ انسان خود کو تنہا، غیر مطلوب اور نظر انداز کیا ہوا محسوس کرے"،

اور انہوں نے معاشرے میں امن کی بنیاد اپنے گھروں اور خاندانوں سے محبت کے آغاز کو قرار دیا

ایک طویل علالت کے بعد، 5 ستمبر 1997 کو مدر ٹریسا کا کلکتہ میں انتقال ہو گیا ۔ ان کی وفات پر حکومتِ ہند نے ان کی فلاحی خدمات کے احترام میں انہیں مکمل فوجی اعزازات کے ساتھ سرکاری جنازے (State Funeral) کا تحفہ پیش کیا، جو کہ عام طور پر صرف اعلیٰ ترین سیاسی رہنماؤں تک محدود ہوتا ہے۔ ان کی وفات کے بعد بھی ان کا کام بند نہیں ہوا بلکہ ان کی تنظیم آج بھی دنیا کے 130 سے زائد ممالک میں سینکڑوں مراکز کے ذریعے فعال ہے۔

بعد ازاں، ان کی زندگی کے دوران اور بعد میں پیش آنے والے واقعات کی کڑی جانچ پڑتال کے بعد، 4 ستمبر 2016 کو ویٹیکن سٹی میں پوپ فرانسس نے انہیں باقاعدہ طور پر "سینٹ" (ولی) کا درجہ دے دیا۔ چرچ کی طرف سے "سینٹ" (ولی) کا درجہ ملنا کیتھولک چرچ میں کسی کو "سینٹ" یعنی ولی یا مقدس شخصیت کا درجہ دینا ایک طویل اور سخت عمل ہوتا ہے۔ مدر ٹریسا کو یہ درجہ دینے کے لیے دو بڑے واقعات (miracles) کو تسلیم کیا گیا

پہلا واقعہ (2000 بھارت کی ایک خاتون، مونکا بیسرا کے پیٹ کا کینسر (ٹیومر) مدر ٹریسا کی تصویر کے پاس دعا کرنے اور ان کا لاکیٹ چھونے سے ٹھیک ہو گیا۔ پوپ جان پال دوم نے 2003 میں انہیں) "Blessed" مبارک) کا درجہ دیا

۔ دوسرا واقعہ :(2015) برازیل کے ایک شخص، مارسیلیو ہدا اندریانی کے دماغ کا شدید انفیکشن اور ٹیومر اس وقت معجزاتی طور پر ٹھیک ہو گیا جب ان کی اہلیہ نے مدر ٹریسا سے دعا مانگی۔ ڈاکٹروں کے پاس اس کا کوئی طبی جواب نہیں تھا۔

4 ستمبر 2016 کو ویٹیکن سٹی میں ایک عظیم الشان تقریب کے دوران پوپ فرانسس نے مدر ٹریسا کو باقاعدہ طور پر "سینٹ ٹریسا آف کلکتہ (Saint Teresa of Calcutta) "کا درجہ دیا

۔ مدر ٹریسا کے فلاحی کاموں کا دائرہ کار صرف بھارت تک محدود نہیں رہا بلکہ انہوں نے پاکستان کا بھی دورہ کیا اور یہاں کے مظلوم اور بے سہارا طبقے کے لیے گہرے نقوش چھوڑے۔ انہوں نے 1991 میں لاہور کا دورہ کیا اور وہاں مشنریز آف چیریٹی کے تحت "ہوم آف لو (Home of Love) "نامی مرکز کا افتتاح کیا۔ ان کی تنظیم نے پاکستان کے مختلف شہروں جیسے کراچی، لاہور اور فیصل آباد میں کچی بستیوں کے غریبوں، یتیموں، اور معذور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مراکز (Convents) قائم کیے۔ پاکستان میں ان کے کام کا سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ مسلم اور مسیحی دونوں کمیونٹیز نے ان کے کام کو دل سے سراہا اور ان کے مراکز کی مالی معاونت کی۔ پاکستانی معاشرے میں ان کی ذات کو بلا تفریق مذہب و ملت بلالوث خدمت اور سماجی ہمدردی کی ایک بہترین مثال تسلیم کیا جاتا ہے

پاکستان میں سماجی خدمت کے میدان میں مدر ٹریسا کے نظریاتی اثرات انتہائی وسیع ہیں۔ پاکستان میں کوڑھ (leprosy) کے خاتمے کے لیے اپنی زندگی وقف کرنے والی جرمن طبیبہ ڈاکٹر روتھ فاؤ Marie Adelaide Leprosy Centre) کی بانی) کی بے پناہ خدمات کی وجہ سے انہیں اکثر "پاکستان کی مدر ٹریسا" کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ مدر ٹریسا کے کام نے پاکستان میں انصار برنی اور دیگر سماجی کارکنوں کو قیدیوں اور لاوارثوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے کی تحریک دی۔ ان کی قائم کردہ روایات نے پاکستانی فلاحی اداروں کو یہ سکھایا کہ کسی بھی انسان کی خدمت رنگ، نسل یا مذہب سے بالاتر ہو کر محض انسانیت کی بنیاد پر کی جاتی ہے۔



.

کامیابی کا اصل پیمانہ: اپنی ذات سے آگے سوچنا۔ (جسمانی موت سے پہلے نہ مریں)

انسانی زندگی کا ایک تلخ مگر اہم حقیقت یہ ہے کہ بہت سے لوگ صرف اپنی ذات، اپنے مفادات اور اپنی خوشیوں کے گرد زندگی گزار دیتے ہیں۔ مگر زندگی کی اصل عظمت اور انسان کی حقیقی قدر اس بات سے متعین ہوتی ہے کہ وہ اپنے بعد دوسروں کے لیے کیا چھوڑ جاتا ہے۔ بینجمن فرینکلن سے منسوب یہ خیال کہ

"بہت سے لوگ پچیس برس کی عمر میں مر جاتے ہیں، مگر انہیں دفن پچھتر برس میں کیا جاتا ہے"

دراصل جسمانی موت نہیں بلکہ مقصد، جستجو اور زندگی کے شعور کے ختم ہو جانے کی تمثیل ہے۔

بینجمن فرینکلن (1706–1790) امریکہ کے بانیوں میں سے ایک، ممتاز سیاستدان، سفارت کار اور عبقری شخصیت تھے جنہوں نے سائنسی اور علمی میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بجلی کی نوعیت پر طبعی تحقیق کرتے ہوئے یہ ثابت کیا کہ آسمانی بجلی اور برقی چارج ایک ہی چیز ہیں، اور اسی بنیاد پر انہوں نے عمارتوں کو بجلی سے بچانے کے لیے لائٹننگ راڈ (بجلی کی چھڑی) ایجاد کی۔ اس کے علاوہ انہوں نے بائی فوکل عینک (دور اور نزدیک دونوں کے لیے کارآمد عینک) اور فرینکلن چولہا ایجاد کیا، جبکہ علمی و سماجی میدان میں انہوں نے فلاڈیلفیا کی پہلی پبلک لائبریری، امریکن فلاسوفیکل سوسائٹی اور پنسلوانیا یونیورسٹی کی بنیاد رکھی اور اپنے مشہور رسالے "پور رچرڈز المانک" کے ذریعے معاشرے میں عملی و اخلاقی اقدار کو فروغ دیا۔

ینجمن فرینکلن کے اس خیال کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ

جب انسان خواب دیکھنا، سیکھنا، آگے بڑھنا اور دوسروں کے لیے کچھ کرنا چھوڑ دیتا ہے تو وہ زندہ ہوتے ہوئے بھی زندگی کی اصل روح سے محروم ہو جاتا ہے۔

زندگی کو ایک ایسے درخت سے تشبیہ دی جاسکتی ہے جس کی اصل پہچان صرف اس کی قامت نہیں بلکہ اس کا سایہ اور پھل ہوتے ہیں۔ جو شخص صرف اپنے لیے جیتا ہے، اس کی زندگی شاید اس کی ذات تک محدود رہ جائے؛ لیکن جو دوسروں کے لیے آسانیاں پیدا کرتا، علم بانٹتا، کسی کا ہاتھ تھامتا اور معاشرے کی بہتری میں اپنا حصہ ڈالتا ہے، اس کی زندگی اپنے وجود سے کہیں زیادہ وسیع ہو جاتی ہے۔ اصل کامیابی صرف لمبی عمر پانے میں نہیں، بلکہ اپنی عمر کو بامقصد اور دوسروں کے لیے مفید بنانے میں ہے

۔ آیئے! ہم زندگی کو محض گزارنے کے بجائے اسے ایک مقصد دیں۔ ہر دن اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ آج ہم نے کیا سیکھا، کیا بہتر کیا اور کس کے لیے آسانی پیدا کی؟

یاد رکھیے، انسان کی زندگی کے برس گنے ضرور جاتے ہیں، مگر اس کی عظمت اس کے کردار، خدمت اور چھوڑے ہوئے مثبت اثرات سے پہچانی جاتی ہے۔ زندہ وہی نہیں جو سانس لے رہا ہو، بلکہ حقیقی معنوں میں زندہ وہ ہے جو اپنے وجود سے دوسروں کی زندگیوں میں امید، روشنی اور بہتری پیدا کر رہا ہو۔

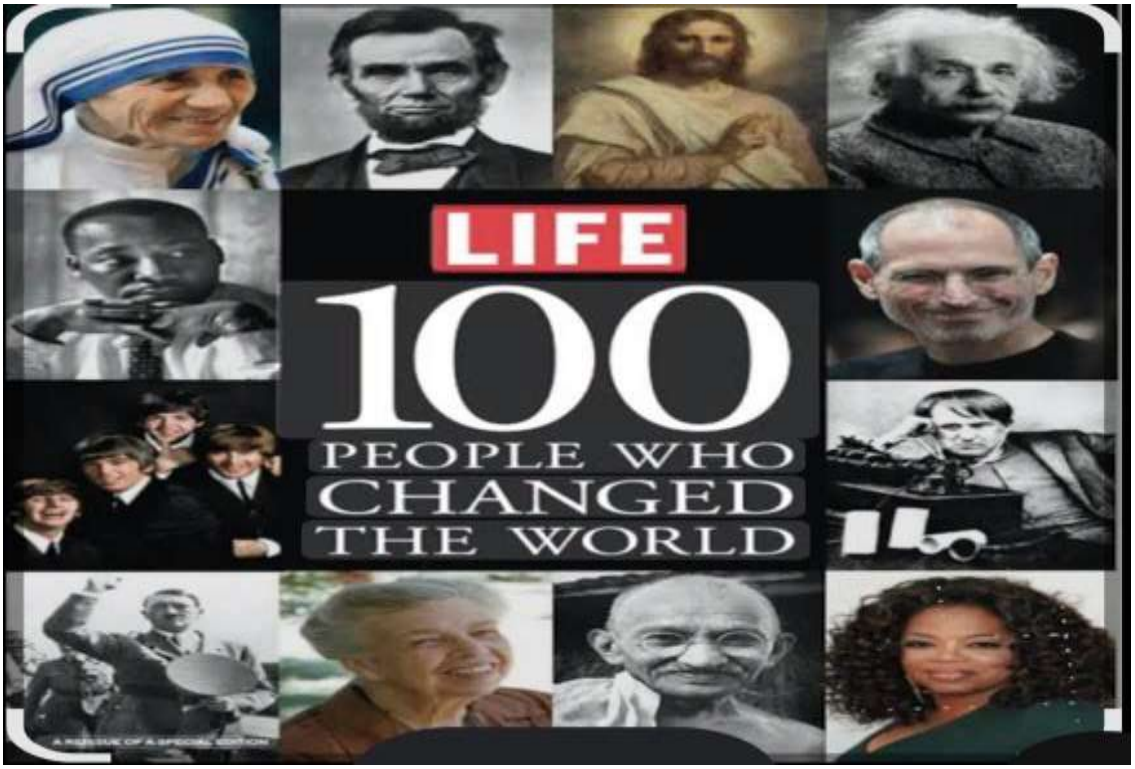

محسنِ اعظم انسانیت حضرت محمد ﷺ: مائیکل ہارٹ کے اعترافِ عظمت کا ایک تحقیقی و ایمانی جائزہ۔

ڈاکٹر مائیکل ایچ ہارٹ ایک امریکی مورخ، ماہر فلکیات اور مصنف ہیں۔ انہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب "دی ہنڈرڈ (The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History) 1970 کی دہائی کے وسط میں لکھی اور یہ کتاب پہلی بار 1978ء میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں اس کی نظر ثانی شدہ دوسری اشاعت 1992ء میں منظرِ عام پر آئی۔ مائیکل ایچ ہارٹ نے پرنسٹن یونیورسٹی سے فلکیات میں پی ایچ ڈی اور نیویارک لا اسکول سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔

انہوں نے اس کتاب میں ان سو(100) شخصیات کی درجہ بندی کی جو انسانی تاریخ پر سب سے زیادہ اثر انداز ہوئیں۔ مائیکل ہارٹ نے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو تاریخ کی تمام شخصیات میں پہلے نمبر پر رکھا۔ اس کی بنیادی اور واضح وجہ اس نے یہ لکھی کہ

": آپ ﷺ دنیا کی واحد ہستی ہیں جو مذہبی اور دنیاوی (سیاسی) دونوں محاذوں پر یکساں طور پر انتہائی کامیاب (Supremely Successful) رہے۔ "

اس نے وضاحت کی کہ: آپ ﷺ نے نہ صرف ایک عظیم الٰہی مذہب (اسلام) کی بنیاد رکھی اور اس کی تبلیغ کی، بلکہ آپ ﷺ ایک انتہائی مؤثر سیاسی اور فوجی رہنما بھی ثابت ہوئے۔ عیسائیت کے بانی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے برعکس، جن کی تعلیمات کی تشکیل اور اشاعت میں (St. Paul) کا بڑا ہاتھ تھا، حضرت محمد ﷺ نے خود اپنے دین، قانون اور معاشرے کی تشکیل اور نفاذ میں براہِ راست بنیادی کردار ادا کیا

آپ ﷺ کی لائی ہوئی تبدیلی اور اثرات آپ کی وفات کے تیرہ چودہ صدیاں بعد بھی اتنے ہی طاقتور اور وسیع پیمانے پر جاری و ساری ہے

مائیکل ہارٹ نے تاریخ کی ان سو شخصیات کو چننے کے لیے چند سخت اصول اور پیمانے مقرر کیے تھے۔ جب ہم ان پیمانوں کو دیکھتے ہیں، تو ۱۲ ربیع الاول کے اس بابرکت مہینے میں حضور ﷺ کی عظمت اور واضح ہو کر سامنے آتی ہے

1۔ مائیکل ہارٹ کا کہنا تھا کہ شخصیت صرف اپنے دور میں نہیں، بلکہ صدیوں بعد بھی انسانیت پر اثر انداز ہو۔ بارہ ربیع الاول کا دن اس بات کی گواہی ہے کہ چودہ سو سال گزرنے کے بعد بھی دنیا بھر کے اربوں انسان آپ ﷺ کی ولادت کا جشن مناتے ہیں اور آپ ﷺ کی تعلیمات پر عمل پیرا ہیں

2۔ دوسرا معیار یہ تھا کہ اثر کسی ایک خطے تک محدود نہ ہو۔ آپ ﷺ عرب کی سرزمین پر تشریف لائے، لیکن آپ ﷺ کی لائی ہوئی روشنی چند ہی دہائیوں میں مشرق سے مغرب تک پھیل گئی

3۔ ہارٹ نے عیسیٰ علیہ السلام کو تیسرے نمبر پر رکھا کیونکہ ان کے نزدیک عیسائیت کو پھیلانے میں سینٹ پال کا کردار زیادہ تھا۔ لیکن حضور ﷺ کی ذاتِ مبارکہ وہ واحد ہستی ہے جنہوں نے قرآنِ پاک کا پیغام خود پہنچایا، خود اس کی عملی تفسیر بنے، اور اپنی حیاتِ مبارکہ میں ہی ایک مثالی معاشرہ قائم کر کے دکھایا

۔ مائیکل ہارٹ نے اپنی کتاب میں دنیا کے بڑے بڑے رہنماؤں، سائنسدانوں اور مصلحین کو جگہ دی، لیکن کسی کو بھی حضور ﷺ کے برابر مقام نہ دے سکا۔ اس نے دیگر ناموں کو جن نمبروں پر رکھا اس میں پہلی پانچ شخصیات کا موازنہ کچھ یون ہے

1، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ آخری رسول اور بانیِ اسلام مذہبی اور دنیاوی، دونوں میدانوں میں تاریخ کی سب سے زیادہ کامیاب ترین ہستی

۔2۔ آئزک نیوٹن۔ عظیم سائنسدان سائنس کی دنیا پر گہرے اثرات چھوڑے، مگر ان کا اثر صرف علم تک محدود تھا، انسانی زندگی کے طور طریقوں پر نہیں

۔3۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بانیِ عیسائیت عیسائیت کے پھیلاؤ میں ان کے بعد آنے والے لوگوں (جیسے سینٹ پال) کا کردار زیادہ مانا گیا۔

4۔ مہاتما گوتم بدھ بانیِ بدھ مت ایک بڑے مذہب کے بانی ہیں، لیکن ان کے اثرات دنیاوی یا سیاسی نظام پر اس طرح نہیں پڑے جیسے اسلام کے پڑے

۔5۔ کنفیوشس چینی فلسفی اخلاقیات کا نظام دیا، مگر ان کا اثر زیادہ تر چین اور مشرقی ایشیا تک ہی محدود رہا

۔ عشرہ ربیع الاول کی مناسبت سے مائیکل ہارٹ کے اعتراف کا نچوڑ ایک غیر مسلم مورخ ہونے کے باوجود مائیکل ہارٹ کا اعترافِ عظمتِ مصطفیٰ ﷺ دراصل اس بات کی تائید ہے کہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی "رحمت اللعالمین" (تمام جہانوں کے لیے رحمت) ہے

ماہ۔ ربیع الاول ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جس ہستی کی آمد کا جشن ہم مناتے ہیں، ان کی عظمت کا لوہا اپنوں کے ساتھ ساتھ بیگانوں نے بھی مانا ہے

۔مائیکل ہارٹ کے الفاظ میں، انسانی تاریخ میں نہ کوئی محمد ﷺ جیسا پہلے آیا ہے، اور نہ ہی کوئی دوسرا آسکتا ہے جو دین اور دنیا دونوں کو اتنے خوبصورت اور کامل طریقے سے سنوار دے





.

24اگست سن 79ء(1947 سال قبل)—جب آسمان سے آگ برسی اور اٹلی کے دو شہر (پومپئی اور ہرکولینیم (وقت کی راکھ میں دفن ہو گئے۔

یہ دن تاریخ کے ان دنوں کی یاد دلاتا ہے جب قدرت کی بے پناہ طاقت نے انسانی تہذیب کے ایک آباد اور خوش حال خطے کو لمحوں میں خاموش کر دیا۔

79عیسوی میں اٹلی کے ماؤنٹ ویسوویئس (Mount Vesuvius) کے ہولناک آتش فشانی دھماکے نے رومی سلطنت کے مشہور شہروں پومپئی (Pompeii) اور ہرکولینیم (Herculaneum) کو راکھ، آتش فشانی پتھروں اور انتہائی گرم گیسوں کے نیچے دفن کر دیا

۔اگرچہ جدید تحقیقات میں اس واقعے کی درست تاریخ کے بارے میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے اور بعض شواہد اسے اکتوبر 79ء سے جوڑتے ہیں، تاہم روایتی تاریخی حوالوں میں 24 اگست کو اس عظیم سانحے سے منسوب کیا جاتا ہے۔اور اسی لئے 24 اگست کو اس واقعہ کی یاد تازہ کی جاتی ہے جب ویسوویئس کے دہانے سے اچانک بلند ہونے والا دھوئیں، راکھ اور گیس کا عظیم ستون دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر چھا گیا۔ پھر آتش فشانی پتھروں اور راکھ کی بارش شروع ہوئی، دن رات کی تاریکی میں بدل گیا اور خوف زدہ لوگ جان بچانے کے لیے گھروں اور گلیوں سے نکل پڑے۔ کچھ ہی عرصے میں پومپئی کی گلیاں، مکانات، بازار اور زندگی کی رونقیں راکھ کی موٹی تہوں کے نیچے چھپ گئیں۔ ہرکولینیم کو تو انتہائی گرم آتش فشانی گیسوں اور ملبے کے تیز رفتار بادلوں نے اپنی لپیٹ میں لے کر مزید المناک انجام سے دوچار کر دیا

اس سانحے کی سب سے حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جس راکھ نے ان شہروں کو تباہ کیا، اسی نے انہیں صدیوں تک محفوظ بھی رکھا۔ جب تقریباً سترہ سو برس بعد پومپئی کی باقاعدہ کھدائی ہوئی تو دنیا کے سامنے رومی معاشرے کی ایک ایسی تصویر آئی جو گویا وقت میں منجمد ہو چکی تھی۔ گھروں کی دیواریں، گلیاں، دکانیں، برتن، آرائش و زیبائش کی اشیا اور روزمرہ زندگی کے بے شمار آثار نے تاریخ کے ایک گمشدہ باب کو دوبارہ زندہ کر دیا۔

پومپئی آج محض ایک کھنڈر نہیں بلکہ انسانی تاریخ کا ایک زندہ سبق ہے۔ یہ واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ترقی، دولت اور طاقت انسان کو قدرت کے قوانین سے بے نیاز نہیں کر سکتیں۔ ایک آباد شہر، مصروف بازار اور خوش حال زندگی چند لمحوں میں آزمائش کا شکار ہو سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید دنیا میں قدرتی آفات کے بارے میں تحقیق، بروقت وارننگ سسٹم، محفوظ تعمیرات اور ہنگامی منصوبہ بندی کو انسانی زندگی کے تحفظ کے لیے بنیادی اہمیت حاصل ہے

تاریخ کا مقصد صرف ماضی کو یاد کرنا نہیں بلکہ ماضی کے تجربات سے مستقبل کو محفوظ بنانا بھی ہے

۔پاکستان جیسے ملک کے لیے بھی پومپئی کا سبق نہایت اہم ہے، جہاں زلزلے، سیلاب، لینڈ سلائیڈنگ، شدید گرمی اور دیگر قدرتی خطرات انسانی زندگی اور معیشت کو متاثر کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں قدرتی آفات کو محض تقدیر کہہ کر نظر انداز کرنے کے بجائے تیاری، احتیاط، سائنسی منصوبہ بندی اور اجتماعی ذمہ داری کو اپنی قومی ترجیحات کا حصہ بنانا ہو گا۔ بروقت معلومات، محفوظ انفراسٹرکچر اور عوامی آگاہی ہزاروں جانیں بچا سکتے ہیں

۔اسلامی نقطۂ نظر سے بھی قدرت کے ایسے واقعات انسان کو اپنی کمزوری اور کائنات کے نظام پر غور کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ قرآنِ کریم بار بار انسان کو زمین و آسمان کی نشانیوں میں غور و فکر کی تلقین کرتا ہے۔ آزمائش اور مصیبت کے وقت انسان کا فرض ہے کہ وہ صبر، تدبر اور ذمہ داری کا مظاہرہ کرے، جبکہ علم اور عقل سے کام لے کر نقصان کو کم سے کم کرنے کی کوشش بھی کرے۔ توکل کا مطلب تدبیر سے دست بردار ہونا نہیں، بلکہ تدبیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسا کرنا ہے۔

24 اگست اور ماؤنٹ ویسوویئس کا یہ تاریخی واقعہ ہمیں ایک گہرا پیغام دیتا ہے کہ

"زندگی غیر یقینی ضرور ہے، لیکن انسان کا بہترین جواب خوف نہیں بلکہ شعور، تیاری اور عمل ہے"

پومپئی کا راکھ میں دفن خاموش شہر آج بھی آنے والی نسلوں سے مخاطب ہے کہ وقت کے اشاروں کو سمجھیں، علم سے رہنمائی حاصل کریں اور آزمائش آنے سے پہلے اپنی حفاظت کی تدبیر کریں۔ تاریخ کی سب سے بڑی دانش شاید یہی ہے کہ ہم ماضی کے المیوں کو صرف داستان نہ بنائیں بلکہ انہیں مستقبل کی بہتری کا ذریعہ بنا دیں۔



23 اگست۔۔ انسانیت کی عظیم فتح: غلامی کے خاتمے کا عالمی دن

اور برصغیر پر اس کے گہرے اثرات

ہر سال 23 اگست کو دنیا بھر میں غلاموں کی تجارت کے خاتمے کی یاد کا بین الاقوامی دن منایا جاتا ہے۔ یونیسکو نے 1997ء میں اس دن کو منانے کی باقاعدہ منظوری دی، جس کا مقصد 22 اور 23 اگست 1791ء کی درمیانی شب سان دومنگو (موجودہ ہیٹی اور ڈومینیکن جمہوریہ) میں شروع ہونے والی تاریخی بغاوت کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔ اس رات افریقی غلاموں نے ظلم کے خلاف ایک ایسی چنگاری سلگائی جس نے دنیا میں ٹرانس اٹلانٹک غلاموں کی تجارت کے خاتمے کی بنیاد رکھی اور تاریخ کا دھارا ہمیشہ کے لیے بدل دیا

۔اس بے مثال بغاوت کی قیادت طوسان لوورتیور(Toussaint Louverture) ،ڈوبوک میں (Dutty Boukman) اور جین جیکس ڈیسالینز (Jean-Jacques Dessalines) جیسے عظیم رہنماؤں نے کی۔انہوں نے غلاموں کی ایک منظم فوج تیار کر کے فرانسیسی، برطانوی اور ہسپانوی نو آبادیاتی طاقتوں کو عبرتناک شکست دی، جس کے نتیجے میں 1804ء میں دنیا کی پہلی آزاد سیاہ فام جمہوریہ "ہیٹی" وجود میں آئی۔یہ انسانی تاریخ کی واحد کامیاب غلام بغاوت تھی جس نے سامراجی طاقتوں کو خوفزدہ کر کے غلامی پر پابندی لگانے پر مجبور کیا اور دنیا کو یہ آفاقی پیغام دیا کہ آزادی کسی مخصوص رنگ یا نسل کی جاگیر نہیں بلکہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے

۔ہیٹی کے انقلاب نے عالمی معیشت کا رخ موڑ دیا، جس کے بالواسطہ مگر انتہائی گہرے اثرات برصغیر پاک وہند پر پڑے۔ہیٹی اس وقت دنیا میں چینی (Sugar) اور کافی کی پیداوار کا سب سے بڑا مرکز تھا۔انقلاب کے بعد جب وہاں کا معاشی نظام مفلوج ہوا، تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے عالمی منڈی کا خلا پُر کرنے کے لیے برصغیر کا رخ کیا اور بنگال سمیت دیگر علاقوں میں گنے اور نیل (Indigo) کی کاشت کو تیزی سے فروغ دے کر اس خطے کو ایک نئی معاشی تجربہ گاہ میں بدل دیا۔جب برطانوی سلطنت نے دباؤ کے تحت 1833ء میں غلامی کا مکمل خاتمہ کیا، تو انہیں ماریشس، فجی، گیانا اور کیریبین جزائر کے باغات کے لیے سستے متبادل کی ضرورت پڑی۔اس کے نتیجے میں "گرمٹیا مزدوروں (Indentured Labour) "کا ظالمانہ نظام شروع ہوا۔لاکھوں غریب ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کے اجداد کو معاہدوں (گرمٹ) کے تحت دھوکے اور مجبوری میں ان جزائر پر منتقل کیا گیا، جہاں ان کی حالتِ زار غلاموں سے قطعی مختلف نہیں تھی۔یہی وجہ ہے کہ آج ان کیریبین اور افریقی جزائر میں برصغیر نژاد باشندوں کی ایک بڑی ثقافتی اور سیاسی قوت آباد ہے۔عالمی انسدادِ غلامی کی انھی تحریکوں اور دباؤ کے نتیجے میں برطانوی حکومت نے "انڈین سلیوری ایکٹ 1843 "نافذ کیا، جس نے برصغیر میں صدیوں سے جاری انسانوں کی خرید و فروخت اور گھریلو غلامی کو قانونی طور پر ممنوع قرار دیا

۔تاہم، غلامی کی یہ تاریک سوچ آج بھی مکمل طور پر دم نہیں توڑ سکی۔پاکستان اور خطے کے دیگر ممالک میں وڈیرہ شاہی، مزارعوں کا استحصال، بھٹہ مزدوروں کی نسل در نسل قرض کی زنجیریں، اور گھریلو مشقت کے لیے نوعمر بچوں کی خرید و فروخت دراصل اسی قدیم غلامی کی جدید اور تلخ شکلیں ہیں، جن کا مکمل خاتمہ آج کے آزاد معاشروں کا سب سے بڑا امتحان ہے۔



22اگست — "فرشتہ بننے" کا دن (BE AN ANGEL DAY)۔اسلام اور پاکستان کے تناظر میں

ہر سال22اگست کو "Be An Angel Day" منایا جاتا ہے۔ دستیاب حوالوں کے مطابق اس دن کا آغاز 1993ء میں جین ہاورڈ فیلڈ مین (Jayne Howard Feldman) نے کیا تھا، جو ایک امریکی مصنفہ، مقرر اور روحانی استاد ہیں۔ وہ طویل عرصے سے فرشتوں کے تصور، امن، اور انسانیت کے درمیان محبت کو فروغ دینے پر کام کر رہی ہیں۔ انہوں نے اس موضوع پر کتابیں بھی لکھ رکھی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ زمین پر ہر انسان دوسرے کے لیے خدا کا فرشتہ بن سکتا ہے، بس اس کے لیے دل میں ہمدردی اور عمل میں نیکی کا ہونا ضروری ہے۔

اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد لوگوں کو دوسروں کے لیے مہربان، مددگار اور ہمدرد بننے کی ترغیب دینا ہے۔ یہ اقوام متحدہ کا سرکاری عالمی دن، کسی بین الاقوامی معاہدے کا حصہ یا کسی ملک کی سرکاری تعطیل نہیں، بلکہ ایک غیر سرکاری سماجی و اخلاقی مہم ہے۔ اس کا مرکزی پیغام یہ ہے کہ انسان اپنے معمول کے رویے اور چھوٹے چھوٹے نیک اعمال کے ذریعے کسی دوسرے انسان کے لیے "فرشتہ" ثابت ہو سکتا ہے

اس تصور کو اگر اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو نیکی، ہمدردی، ایثار اور انسانوں کی مدد کوئی ایک دن منانے کی سرگرمی نہیں بلکہ مسلمان کی مستقل اخلاقی ذمہ داری ہے

۔ قرآنِ مجید نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کی تعلیم دیتا ہے، جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کے لیے آسانی پیدا کرنے، محتاج کی مدد کرنے، غم زدہ کی دلجوئی اور دوسروں کے کام آنے کی بے شمار ترغیبات دی ہیں۔

اسلام میں فرشتے اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں؛ انسان فرشتہ نہیں بن سکتا، لیکن فرشتوں جیسی پاکیزہ صفات — نیکی، اطاعت، خیر خواہی اور بے غرض خدمت — اپنے کردار میں ضرور پیدا کر سکتا ہے۔ یہی اس دن کے تصور کو ایک بامعنی اخلاقی پیغام میں تبدیل کرتا ہے۔

پاکستان جیسے معاشرے میں اس پیغام کی اہمیت مزید بڑھ جاتی ہے، جہاں غربت، بے روزگاری، مہنگائی، قدرتی آفات، تنہائی اور سماجی عدم مساوات کے باعث بہت سے افراد دوسروں کی معمولی سی توجہ اور مدد کے بھی محتاج ہیں۔ کسی بزرگ کو سڑک پار کروا دینا، بیمار یا تنہا شخص کی عیادت کرنا، کسی طالب علم کی تعلیمی مدد کرنا، ضرورت مند خاندان کو راشن پہنچانا، کسی پریشان شخص کی بات تحمل سے سن لینا، خون کا عطیہ دینا، یا کسی مستحق کی عزتِ نفس مجروح کیے بغیر مدد کرنا — یہ سب ایسے اعمال ہیں جو معاشرے میں انسانیت اور باہمی اعتماد کو مضبوط کر سکتے ہیں۔

پاکستان میں یہ دن سرکاری طور پر نہیں منایا جاتا، تاہم فلاحی ادارے، تعلیمی ادارے اور سوشل میڈیا صارفین اس کے پیغام کو مثبت سرگرمیوں کے ذریعے اجاگر کر سکتے ہیں۔ اسلامی تعلیمات میں صدقہ، زکوٰۃ، صلہ رحمی، حسنِ سلوک، پڑوسی کے حقوق، یتیم و مسکین کی کفالت اور ضرورت مند کی مدد اجتماعی زندگی کو بہتر بنانے کے بنیادی اصول ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ نیکی صرف ظاہری رسم کا نام نہیں بلکہ مال و وسائل کو ضرورت مندوں، یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کرنا، وعدہ پورا کرنا اور مشکل حالات میں صبر و ثابت قدمی اختیار کرنا بھی نیکی ہے۔

اس لیے "Be An Angel Day" کو اسلامی معاشرے میں کسی نئے مذہبی تہوار کے طور پر نہیں بلکہ نیکی اور خدمتِ انسانیت کی ایک غیر سرکاری یاد دہانی کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے — اور اس پیغام کو ایک دن تک محدود رکھنے کے بجائے سال کے 365 دن عملی زندگی کا حصہ بنانا زیادہ اہم ہے۔ اصل "فرشتہ" وہ نہیں جو صرف خوبصورت الفاظ بولے، بلکہ وہ انسان ہے جو کسی کے دکھ کو محسوس کرے اور اسے کم کرنے کی کوشش کرے؛ جو طاقت رکھتے ہوئے کمزور کو سہارا دے، علم رکھتے ہوئے دوسروں کو سکھائے، اختیار رکھتے ہوئے انصاف کرے اور استطاعت رکھتے ہوئے ضرورت مند کا ہاتھ تھامے۔ کبھی کبھی ایک مسکراہٹ، ایک حوصلہ افزا جملہ، ایک گلاس پانی، ایک فون کال یا خاموشی سے کی گئی مدد کسی انسان کے لیے زندگی کا مشکل ترین لمحہ آسان بنا دیتی ہے

آج 22 اگست کا پیغام یہی ہے: فرشتہ بننے کے لیے پر نہیں، ایک حساس دل اور نیک عمل درکار ہے۔ اور شاید یہی وہ مقام ہے جہاں انسان اپنی انسانیت کی بلندی کو چھوتا ہے۔

S



22 اگست-"مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر تشدد کا شکار ہونے والوں کی یاد کا عالمی دن"،

ہر سال 22 اگست کو اقوام متحدہ کے تحت "مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر تشدد کا شکار ہونے والوں کی یاد کا عالمی دن "
(International Day Commemorating the Victims of Acts of Violence Based on Religion or Belief) منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد ان تمام افراد کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے جو صرف اپنے مذہبی عقائد، فکر یا نظریات کی وجہ سے نفرت، تعصب، جسمانی تشدد، اور دہشت گردی کا نشانہ بنے۔
۔یہ دن دنیا کو یہ یاد دلاتا ہے کہ فکر و عقیدے کی آزادی انسانی حقوق کا بنیادی حصہ ہے اور اس بنیاد پر کسی کے ساتھ امتیازی سلوک یا تشدد انسانیت کی تذلیل ہے۔

اس دن کو منانے کی تجویز پہلی بار پولینڈ (Poland) نے پیش کی تھی۔ سن 2018 اور 2019 کے دوران دنیا میں مذہبی بنیادوں پر تشدد کی تشویشناک لہر دیکھی گئی، خصوصاً نیوزی لینڈ کی کرائسٹ چرچ مساجد پر حملہ، سری لنکا میں ایسٹر کے موقع پر گرجا گھروں پر بم دھماکے، اور میانمار میں روہنگیا مسلمانوں کی نسل کشی۔ اس بڑھتی ہوئی مذہبی انتہاپسندی کے پیشِ نظر، پولینڈ نے امریکہ، کینیڈا، برازیل، نائجیریا، پاکستان، اور دیگر متعدد ممالک کے تعاون سے اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں ایک قرارداد پیش کی۔ 28 مئی 2019 کو اقوام متحدہ نے قرارداد 73/296 کی منظوری دی، جس کے تحت 22 اگست کو سرکاری طور پر اس عالمی دن کے طور پر مقرر کیا گیا

22 اگست کی تاریخ کا انتخاب اس لیے اہم ہے کیونکہ یہ 22 اگست (دہشت گردی کے متاثرین کی یاد کے دن) سے ٹھیک ایک دن پہلے آتا ہے، جس سے انسانی حقوق اور تحفظ کی مربوط زنجیر بنتی ہے۔

یہ دن اقوام متحدہ کے تمام 193 رکن ممالک میں باضابطہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ عالمی برادری، بشمول یورپی یونین، اسلامی تعاون تنظیم (OIC)، اور مختلف بین الاقوامی حقوقِ انسانی کی تنظیمیں اس دن سیمینارز، شمعیں روشن کرنے کی تقریبات، اور قانون سازی سے متعلق اجلاس منعقد کرتی ہیں۔ اس کا بنیادی مقصد محض سوگ منانا نہیں بلکہ عالمی سطح پر تمام رکن ممالک کو یہ یاد دہانی کرانا ہے کہ وہ اپنے تمام شہریوں کو بلا تفریقِ مذہب مکمل تحفظ فراہم کرنے کے پابند ہیں۔

اگر یہ دیکھا جائے کہ اس دن کے منائے جانے سے کیا مذہبی نفرتوں اور تشدد میں کمی آئی ہے۔ اس کا مختصر جواب یہی ہے کہ عملی طور پر دیکھا جائے تو اس دن کو منائے جانے کے باوجود عالمی سطح پر مذہبی بنیادوں پر تشدد میں نمایاں کمی نہیں آئی، بلکہ کئی خطوں میں اس میں اضافہ ہوا ہے

۔پیو ریسرچ سینٹر (Pew Research Center) اور دیگر عالمی حقوق کی رپورٹوں کے مطابق، دنیا کے 180 سے زائد ممالک میں کسی نہ کسی سطح پر مذہبی بنیادوں پر ہراساں کرنے یا سرکاری / سماجی پابندیوں کے واقعات رپورٹ ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر کروڑوں افراد اس تشدد کی مختلف صورتوں — جیسے نفرت انگیز تقاریر، عبادت گاہوں کی بے حرمتی، جبری تبادلہ خیال، بے دخلیاں، اور ہلاکتوں — کا شکار ہیں۔

مذہب یا عقیدے کی بنیاد پر سب سے زیادہ خلاف ورزیاں اور تشدد درج ذیل خطوں اور ممالک میں دیکھنے کو ملتے ہیں :

بھارت: اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف انتہاپسندانہ تشدد، ہجوم کے ذریعہ قتل (Mob Lynching)، اور بلڈوزر جسٹس۔

میانمار: روہنگیا مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے خلاف ریاستی و فوجی تشدد۔

چین: سنکیانگ کے علاقے میں ایغور مسلمانوں کی جبری نظریاتی ترویج اور انسانی حقوق کی شدید پامالی۔

مشرقِ وسطیٰ (عراق و شام): داعش (ISIS) کی طرف سے ایزدی (Yazidi) اور عیسائی برادریوں پر مظالم۔

نائجیریا و دیگر افریقی ممالک میں بوکو حرام اور انتہا پسند گروہوں کے ہاتھوں عیسائی اور مسلم آبادیوں کو نشانہ بنانا۔

2025 کے دوران عالمی سطح پر دہشت گردی کے نتیجے میں کل 5,582 اموات ریکارڈ ہوئیں، تاہم بین الاقوامی اداروں کے پاس خالصتاً "مذہب یا فرقے کی بنیاد پر" مارے جانے والے افراد، زخمیوں اور عبادت گاہوں کو پہنچنے والے نقصان کے الگ سے کوئی حتمی عالمی اعداد و شمار موجود نہیں ہیں کیونکہ زیادہ تر رپورٹس سیاسی اور عسکریت پسندانہ تشدد کو مشترکہ طور پر درج کرتی ہیں۔

پاکستان کے حوالے سے ورلڈ ٹیررزم انڈیکس 2026 کی رپورٹ کے مطابق 2025ء میں پاکستان دہشت گردی سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک رہا اور اس سال 1,139 ہلاکتیں ہوئیں (جن میں سکیورٹی اہلکار، عام شہری اور عسکریت پسند شامل ہیں)۔ اور تقریباً 1,595 افراد زخمی ہوئے۔ پاکستان انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز (PIPS) اور دیگر سکیورٹی رپورٹس کے مطابق 2025ء میں مساجد، مدارس اور بعض دیگر مذہبی مقامات پر خودکش دھماکوں اور بم دھماکوں کے الگ سے واقعات (مثلاً خیبر پختونخوا اور دارالحکومت کے چند حملے کوئٹہ اور بلوچستان میں ہزارہ قبیلے کے افراد کی ٹارگٹ کلنگ) بھی پیش آئے، تاہم ملک بھر کی عبادت گاہوں کے نقصان کا کوئی مجموعی سرکاری یا حتمی شماریاتی اعشاریہ جاری نہیں کیا گیا۔

تاہم پاکستان میں آئینِ پاکستان اور مختلف قانونی و انتظامی اقدامات کے ذریعے اقلیتوں کو مذہبی آزادی، جان و مال کا تحفظ اور مساوی حقوق فراہم کیے گئے ہیں۔ پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں میں ان کے لیے نشستیں مخصوص ہیں، جبکہ قومی اور صوبائی سطح پر فلاحی اسکیمیں اور ادارے بھی متحرک ہیں۔ آئین کا آرٹیکل 20 تمام شہریوں کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے اور اس کی تبلیغ کا حق دیتا ہے۔ اور آرٹیکل 36 ریاست کو پابند کرتا ہے کہ وہ اقلیتوں کے جائز حقوق اور مفادات کا تحفظ کرے۔ نیز آرٹیکل 25 کے تحت قانون کی نظر میں تمام شہری برابر ہیں اور امتیازی سلوک کی ممانعت ہے۔ اقلیتوں کے حقوق کے نفاذ اور بہتری کے لیے قومی و صوبائی کمیشنز اور پولیس میں خصوصی یونٹس (جیسے پروٹیکشن آف مائنارٹیز یونٹ) قائم ہیں اور صوبائی سطح پر اقلیتی کارڈ اور مستحقین کے لیے مالی معاونت اور ترقیاتی اسکیمیں اس کے علاوہ ہیں۔

اس کے باوجود اس قسم کے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں اور پاکستان میں اقلیتوں (عیسائی، ہندو، سکھ، احمدی) کے علاوہ شیعہ برادری کو مذہبی انتہا پسندی، توہینِ مذہب کے قوانین کے غلط استعمال، اور جبری مذہبی تبدیلی کے خدشات اور تشدد کی شکایات بھی ہیں۔ جڑانوالہ، گوجرہ، اور سیالکوٹ جیسے واقعات اس تلخ حقیقت کا ثبوت ہیں۔

تاہم اس تاریک پہلو کے ساتھ ساتھ پاکستان میں کچھ مثبت قانونی اور سیاسی پیشرفت بھی ہوئی ہے۔ اور ریاست نے فوری ایکشن لے کر مجرمون کو سخت سزائیں بھی دی ہیں اور بھارت کے برعکس یہاں سرکاری سرپرستی میں اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہیں ایا۔ حکومتِ پاکستان نے "بین المذاہب ہم آہنگی" کی وزارتی سطح پر کوششیں تیز کی ہیں اور نیشنل ایکشن پلان کے تحت نفرت انگیز تقاریر پر قابو پانے کے اقدامات کیے ہیں۔ اور حکومت پاکستان اور صوبائی حکومتیں

"NO TOLERANCE "۔

پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔۔



21اگست: نیشنل سینئر سٹیزنز ڈے-بزرگ شہریوں کا احترام—تجربے، خدمت اور وقار کو سلام۔پاکستان اور پنجاب میں کئے گئے اقدامات پر ایک نظر۔۔

21اگست بزرگ شہریوں کی زندگی بھر کی خدمات، تجربے، قربانیوں اور معاشرے میں ان کے کردار کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا دن ہے۔ یہاں ایک اہم فرق واضح کرنا بھی ضروری ہے کہ 21اگست اقوام متحدہ کا عالمی دن نہیں۔اقوام متحدہ نے 1 اکتوبر کو International Day of Older Persons کے طور پر مقرر کیا ہے۔۔بزرگ شہری کی عمر کی کوئی ایک عالمگیر قانونی حد نہیں

اس دن کی بنیاد امریکہ میں 1988ء میں پڑی، جب صدر رونالڈ ریگن نے 19اگست 1988ء کو صدارتی اعلامیہ Proclamation 5847 جاری کرتے ہوئے 21اگست 1988ء کو National Senior Citizens Day قرار دیا۔ اعلامیے میں اس امر پر زور دیا گیا کہ بزرگ افراد خاندان، معاشرے اور ملک کی تعمیر میں اپنی پوری زندگی صرف کرتے ہیں اور بڑھتی عمر کے باوجود معاشرتی خدمت، رضاکارانہ سرگرمیوں اور تجربے کے ذریعے اپنا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

۔مختلف ممالک اور قوانین میں 60 یا 65 سال اور اس سے زائد عمر کے افراد کے لیے مختلف تعریفیں استعمال ہوتی ہیں

۔اقوام متحدہ کے عالمی ageing framework میں بھی 60 سال یا اس سے زائد عمر کی آبادی پر خاص توجہ دی جاتی ہے، جبکہ بعض اعداد و شمار میں 65 سال کو older persons کی حد کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں کہ دنیا بھر میں لازماً 65 سال ہی senior citizen کی واحد قانونی حد ہے. ۔بزرگ شہری کی عمر کی کوئی ایک عالمگیر قانونی حد نہیں

بزرگ شہریوں کے احترام کا بنیادی مقصد صرف انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا نہیں بلکہ یہ احساس پیدا کرنا ہے کہ بڑھتی عمر انسان کی افادیت ختم ہونے کی علامت نہیں۔ بزرگ اپنے تجربے، دانش، پیشہ ورانہ مہارت، خاندانی رہنمائی اور سماجی شعور کے ذریعے نئی نسلوں کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہوتے ہیں۔ اسی سوچ کے تحت دنیا کے مختلف ممالک میں پنشن، صحت کی سہولیات، سماجی تحفظ، رعایتی سفری سہولیات اور age-friendly services جیسے اقدامات متعارف کرائے گئے ہیں

اکثر یہ سوال بھی سامنے آتا ہے کہ کیا اس دن کے حوالے سے سوچے گئے مقاصد مکمل طور پر حاصل ہو گئے ہیں، اس کا جواب جزوی طور پر ہاں اور بڑی حد تک نہیں میں دیا جا سکتا ہے۔ پالیسی اور قانون سازی کے میدان میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے، لیکن عملی زندگی میں عمر رسیدہ افراد کو اب بھی تنہائی، معاشی عدم تحفظ، صحت کے مسائل، age discrimination، نظر انداز کیے جانے اور بعض اوقات بدسلوکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے

۔اقوام متحدہ بھی ageism یعنی عمر کی بنیاد پر امتیاز کو بزرگ افراد کی سماجی شمولیت، صحت اور حقوق کے لیے ایک اہم رکاوٹ قرار دیتا ہے۔ خاص طور پر ترقی پذیر معاشروں میں یہ مسئلہ زیادہ پیچیدہ ہے۔ مشترکہ خاندانی نظام کے کمزور ہونے، روزگار کے لیے نوجوان نسل کی دوسرے شہروں یا ممالک کو منتقلی اور بڑھتے ہوئے معاشی دباؤ کے باعث بہت سے بزرگ افراد جذباتی اور سماجی تنہائی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ بعض خاندانوں میں بزرگوں کو صرف مالی بوجھ سمجھنا اس مسئلے کو مزید سنگین بنا دیتا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آج کی نسل جن سہولیات، تعلیم، اقدار اور معاشرتی بنیادوں سے فائدہ اٹھا رہی ہے، ان کی تعمیر میں موجودہ بزرگ نسل کا بنیادی کردار رہا ہے

پاکستان میں بزرگ افراد کی فلاح کے لیے مختلف ادوار میں وفاقی اور صوبائی سطح پر اقدامات کیے گئے ہیں۔ مثال کے طور پر Islamabad Capital Territory Senior Citizens Act, 2021 وفاقی سطح پر نافذ قانون ہے۔

صوبوں میں بھی بزرگ شہریوں کے حقوق اور فلاح کے لیے مختلف قانونی و انتظامی اقدامات سامنے آئے ہیں۔ پنجاب کے حوالے سے ایک اہم اور حالیہ پیش رفت Punjab Senior Citizens Welfare Act 2026 کا نفاذ ہے۔ اس قانون کا دائرہ بنیادی طور پر 70 سال یا اس سے زائد عمر کے بزرگ شہریوں تک ہے اور اس کا مقصد بزرگ افراد کی عزت، تحفظ، بہبود اور سماجی شمولیت کے لیے ایک باقاعدہ قانونی و ادارہ جاتی framework قائم کرنا ہے

۔ قانون کے تحت Senior Citizens Welfare Council اور Senior Citizens Welfare Fund جیسے ادارہ جاتی انتظامات کی بنیاد رکھی گئی ہے، جبکہ کمزور، بے سہارا اور نظر انداز ہونے کے خطرے سے دوچار بزرگوں پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

یہ بات بھی درست کرنا ضروری ہے کہ پاکستان میں ہر 60 سال سے زائد عمر کے فرد کو محض عمر کی بنیاد پر پنجاب کے اس نئے قانون کے تحت تمام مذکورہ مراعات کا خود کار حق دار قرار دینا درست نہیں۔ مختلف سرکاری سہولیات، پنشن، سفری رعایت یا صوبائی قوانین میں عمر کی حد اور اہلیت الگ الگ ہو سکتی ہے۔ اس لیے میٹرو، اورنج لائن، پاکستان ریلوے، PIA، سرکاری اسپتالوں، NADRA وغیرہ کی ہر سہولت کو ایک ہی عمومی "60 سال کی عمر" کے اصول سے جوڑنا درست نہیں ہو گا۔ اصل امتحان قانون نہیں، عمل ہے بزرگ شہریوں کے لیے قانون سازی یقیناً ایک مثبت قدم ہے، لیکن کسی بھی قانون کی اصل کامیابی اس وقت سامنے آتی ہے جب اس کے ثمرات عام بزرگ شہری کی زندگی میں محسوس ہوں۔ مناسب صحت کی سہولیات، ادویات تک آسان رسائی، سماجی تحفظ، مناسب رہائش، قانونی مدد، ترجیحی خدمات اور معاشی تحفظ ضروری ہیں؛ لیکن ان سب کے ساتھ عزت، محبت اور انسانی توجہ بھی اتنی ہی اہم ہے

۔ اولڈ ایج ہوم کسی بے سہارا بزرگ کے لیے ضروری پناہ گاہ بن سکتا ہے، لیکن اسے خاندانی محبت کا متبادل نہیں سمجھا جا سکتا۔ ایک بزرگ والد یا والدہ کو مہنگی دوا سے پہلے شاید اپنے بچوں کا چند منٹ ساتھ، گفتگو اور توجہ زیادہ درکار ہو۔ اسی طرح کسی سرکاری دفتر میں الگ کاؤنٹر قائم کرنا اچھی حکمرانی ہے، مگر گھر میں بزرگ کو نظر انداز کرنا ایک ایسی سماجی ناانصافی ہے جس کا کوئی سرکاری کاؤنٹر ازالہ نہیں کر سکتا

۔ آج جب دنیا تیزی سے ageing society کی طرف بڑھ رہی ہے، بزرگ شہریوں کو "ماضی کا حصہ" نہیں بلکہ موجودہ معاشرے کا فعال اور قیمتی حصہ سمجھنے کی ضرورت ہے۔

اقوام متحدہ کے مطابق دنیا میں 60 سال یا اس سے زائد عمر کے افراد کی تعداد 2025ء میں تقریباً 1.2 ارب تک پہنچ چکی ہے اور 2050ء تک یہ تعداد تقریباً 2.1 ارب ہونے کی توقع ہے۔ یہ اعداد واضح کرتے ہیں کہ بزرگوں کا مسئلہ مستقبل کا نہیں بلکہ آج کا عالمی سماجی، معاشی اور انسانی مسئلہ ہے

۔ 21 اگست کا اصل پیغام یہی ہے کہ عمر انسان کی قدر کم نہیں کرتی؛ بلکہ زندگی بھر کا تجربہ اسے مزید قیمتی بنا دیتا ہے۔ بزرگ شہری ہمارے معاشرے کی یادداشت، تجربہ اور دانش ہیں۔ ان کے حقوق کا تحفظ صرف حکومت کی ذمہ داری نہیں بلکہ خاندان، معاشرے اور ہر فرد کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ کسی بزرگ کو عزت دینا دراصل اپنی آنے والی عمر اور اپنی آنے والی نسلوں کے ساتھ انصاف کرنا ہے





20 اگست۔ مچھروں کا عالمی دن (World Mosquito Day) اور پاکستان اور صوبہ پنجاب میں کئے گئے اقدامات پر ایک نظر

مچھروں کا عالمی دن ہر سال 20 اگست کو منایا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا 1897ء میں ہوئی جب برطانوی ڈاکٹر سر رونالڈ راس (Ronald Ross) نے یہ دریافت کیا کہ مادہ اینوفلیز مچھر (female Anopheles mosquito) ملیریا کی بیماری کو انسانوں میں منتقل کرتی ہے۔ اس اہم دریافت کے اعتراف میں لندن سکول آف ہائجین اینڈ ٹراپیکل میڈیسن نے اس دن کو "ورلڈ موسکیٹو ڈے" کے طور پر منانا شروع کیا

۔رونالڈ راس کو اس دریافت پر 1902ء میں طب کے شعبے میں نوبل انعام بھی ملا۔

اس دن کے منانے کا مقصد مچھروں سے پھیلنے والی بیماریوں (ملیریا، ڈینگی، چکن گونیا، زیکاوائرس وغیرہ) کے بارے میں آگاہی پھیلانا عوام کو احتیاطی تدابیر پر عمل کرنے کی ترغیب دینا تحقیق اور بچاؤ کے پروگراموں کے لیے فنڈنگ اور توجہ حاصل کرنا صحت عامہ کے اداروں کو مچھر مار مہمات تیز کرنے کی یاد دہانی کرانا ہے۔

عالمی ادارہ صحت (WHO) کے اعداد و شمار کے مطابق، دنیا بھر میں ہر سال ملیریا کے تقریباً 282 ملین (2 کروڑ 82 لاکھ) کیسز اور 610,000 اموات ہوتی ہیں، جبکہ ڈینگی کے سالانہ 100 سے 400 ملین تک انفیکشنز ہوتے ہیں جن میں سے تقریباً 10 سے 14 ملین ظاہری کیسز رپورٹ ہوتے ہیں اور 10,000 سے زائد اموات ریکارڈ کی جاتی ہیں۔ زیادہ متاثرہ ممالک میں افریقی خطہ سر فہرست ہے جو کل ملیریا کا 94 فیصد بوجھ اٹھاتا ہے۔ اس کی نصف سے زیادہ اموات صرف تین ممالک نائجیریا (Nigeria) جمہوریہ کانگو (Democratic Republic of the Congo) اور نائجر (Niger) میں ہوتی ہیں۔

اسی طرح ڈینگی (Dengue) کے انفیکشن کیسز بھی بہت زیادہ ہیں۔ 2024 میں دنیا بھر میں تقریباً 14.1 ملین (1 کروڑ 41 لاکھ) رپورٹ شدہ کیسز سامنے آئے۔ اور تقریباً 9,500 سے 11,000 اموات سالانہ ریکارڈ ہوتی ہیں۔ اس کی کیس فیٹیلٹی ریٹ (CFR) عام طور پر ایک فیصد سے بھی کم (تقریباً 0.07٪) ہوتی ہے۔ ڈینگی کا سب سے زیادہ بوجھ براعظم امریکہ اور جنوب مشرقی ایشیا پر ہے۔ سر فہرست ممالک میں برازیل (Brazil)

بھارت (India)، انڈونیشیا (Indonesia) اور

پاکستان شامل ہیں۔

پاکستان میں ہر سال ملیریا کے تقریباً 15 سے 18 لاکھ سے زائد کنفرم اور مشکوک کیسز رپورٹ ہوتے ہیں جن سے سینکڑوں اموات واقع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس ڈینگی کے سالانہ کیسز موسمی تبدیلیوں اور بارشوں کی وجہ سے کم و بیش 20 ہزار سے 50 ہزار تک ہوتے ہیں

ملیریا کا سب سے زیادہ تناسب بلوچستان اور سندھ کے صوبوں میں جبکہ ڈینگی کا تناسب سندھ اور پنجاب کے بڑے شہروں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ بلوچستان اور سندھ کے پسماندہ اور سیلاب سے متاثرہ اضلاع ملیریا سے سب سے زیادہ متاثر ہیں۔ سندھ کے اندرونی اضلاع (خصوصاً خیرپور، لاڑکانہ، سانگھڑ، دادو اور قمبر شہداد کوٹ (اور بلوچستان میں کیچ (تربت)، گوادر، لسبیلہ، جعفر آباد، صحبت پور، نصیر آباد اور قلات سمیت 21 اضلاع شامل ہیں۔ حالیہ ڈیٹا کے مطابق ان صوبوں میں ملیریا سے اموات کی شرح تقریباً 9 سے 10 فی 100,000 افراد سالانہ ریکارڈ کی گئی ہے۔

ڈینگی کے عام طور پر سالانہ 20,000 سے 50,000 تک کیسز رپورٹ ہوتے ہیں (مثلاً 2021 میں تقریباً 49,000 اور سنہ 2022 کے سیلاب میں بھی اسی تناسب سے کیسز ریکارڈ ہوئے تھے)۔ اور سالانہ 60 سے 200 کے درمیان اموات ہوتی ہیں۔ اور ان میں سرفہرست سندھ اور پنجاب۔ ہیں اور متاثرہ شہروں میں کراچی، لاہور اور راولپنڈی۔ شامل ہیں

عالمی ادارہ صحت (WHO) نے ملیریا کے خاتمے کے لیے کئی پروگرام شروع کیے، جن میں مچھر دانیوں کی تقسیم، سپرے مہمات، اور نئی ویکسینز (مثلاً RTS,S اور R21 ملیریا ویکسین) شامل ہیں۔ کئی ممالک (جیسے سری لنکا، چین) کو ملیریا سے پاک قرار دیا جا چکا ہے۔ تحقیق کے ذریعے مچھروں کی جینیاتی تبدیلی (gene drive) جیسی جدید تکنیکیں بھی زیر غور ہیں۔

پاکستان میں ہر سال ڈینگی اور ملیریا کے پھیلاؤ کے پیش نظر یہ دن اہمیت رکھتا ہے، خصوصاً مون سون کے موسم میں۔ محکمہ صحت اور بلدیاتی ادارے اس موقع پر آگاہی مہمات، فوگنگ (سپرے) کی سرگرمیاں اور سکولوں میں سیمینار منعقد کرتے ہیں۔ شہری علاقوں جیسے لاہور، اسلام آباد اور کراچی میں ڈینگی سے بچاؤ کے لیے خصوصی وارڈز اور ہیلپ لائنز قائم کی گئی ہیں۔ تاہم چیلنجز اب بھی موجود ہیں۔ شہری آبادی میں تیزی سے اضافہ، ناقص نکاسی آب کا نظام، اور آگاہی کی کمی کے باعث ہر سال ڈینگی کے بہت سے کیسز رپورٹ ہوتے ہیں

حکومت پنجاب نے ڈینگی کے خاتمے اور روک تھام کے لیے ہنگامی اور متحرک حکمت عملی اپنائی ہے، جس کے تحت صوبہ بھر میں سرویلنس، لاروا تلف کرنے کی مہم اور علاج معالجے کے لیے خصوصی کاؤنٹرز قائم کیے گئے ہیں۔ اور گھروں، قبرستانوں، کباڑ خانوں اور نرسریوں میں گھر گھر جا کر ڈینگی لاروا کی تلاش اور تلفی کا عمل جاری ہے۔ نیز حساس اضلاع اور ہاٹ اسپاٹس پر ٹارگٹڈ اسپرے اور فوگنگ کی جاتی ہے۔ تمام سرکاری ہسپتالوں میں ڈینگی وارڈز، مخصوص بیڈز اور ہائی ڈیپینڈنس یونٹس (HDUs) بنائے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ علاج اور تشخیص کے لیے معیاری طبی اصول (SOPs) مرتب کیے گئے ہیں۔ تعلیمی اداروں اور عوامی مقامات پر عوام کی آگاہی اور رہنمائی کے لئے سیمینارز اور واکس کا انعقاد بھی کیا جاتا ہے۔



19 اگست عالمی یومِ انسانیت: خدمت، قربانی اور یکجہتی کا دن

ہر سال 19 اگست کو دنیا بھر میں "عالمی یومِ انسانیت (World Humanitarian Day) "منایا جاتا ہے۔ یہ دن کسی مخصوص یا محدود تعداد کے حامل ممالک میں نہیں، بلکہ اقوام متحدہ (United Nations) کے تمام 193 رکن ممالک سمیت پوری دنیا میں بین الاقوامی سطح پر منایا جاتا ہے جس میں پاکستان بھی شامل ہے۔

اس دن کا مقصد ان امدادی کارکنوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے جو دنیا کے مختلف خطوں میں انسانی بحرانوں، جنگوں اور قدرتی آفات کے دوران متاثرہ لوگوں کی مدد کے لیے اپنی جانیں خطرے میں ڈالتے ہیں۔

یہ دن انسانی ہمدردی، قربانی اور بے لوث خدمت کی علامت کے طور پر منایا جاتا ہے

۔اس دن کا انتخاب 19 اگست 2003 کو عراق کے دارالحکومت بغداد میں اقوامِ متحدہ کے دفتر پر ہونے والے بم دھماکے کی یاد میں کیا گیا، جس میں اقوامِ متحدہ کے خصوصی نمائندے سرجیو ویئرا ڈی میلو سمیت 22 امدادی کارکن جاں بحق ہوئے تھے۔ اس افسوسناک واقعے نے عالمی برادری کو یہ یاد دلایا کہ انسانی امداد فراہم کرنے والے کارکن بھی سنگین خطرات کا سامنا کرتے ہیں، اور ان کی قربانیوں کو تسلیم کرنا ضروری ہے

اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 2008 میں باقاعدہ طور پر 19 اگست کو "عالمی یومِ انسانیت" کے طور پر تسلیم کیا، تاکہ ہر سال اس دن دنیا بھر کے انسانی امدادی کارکنوں کی خدمات کو سراہا جاسکے اور ان لوگوں کو یاد کیا جاسکے جنہوں نے اپنی جانیں اس مقصد کے لیے قربان کیں۔

2026ء کے عالمی یومِ انسانیت کا باضابطہ اور مکمل تھیم

"Honouring fallen humanitarians and calling for greater protection of health care"

)جان نثار کرنے والے امدادی کارکنوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا اور صحت کی دیکھ بھال کے نظام کے لیے وسیع تر تحفظ کا مطالبہ کرنا)ہے

اس مہم کے تحت اقوام متحدہ کے دفتر برائے ہم آہنگیِ انسانی امور (UN OCHA) نے اس سال عالمی سطح پر #ActForHumanity) انسانیت کے لیے عملی قدم اٹھائیں) کی تحریک کو مزید تیز کیا ہے.

اقوام متحدہ کے دفتر برائے ہم آہنگیِ انسانی امور (UN OCHA) اور امدادی تنظیموں کی حالیہ رپورٹس (بشمول Aid Worker Security Database) میں پیش کیے گئے حقائق اور اعداد و شمار انتہائی تشویشناک ہیں، جنہیں اس مہم کا حصہ بنایا گیا ہے 📈:

امدادی کارکنوں کے لیے حالیہ سال تاریخ کے بدترین سال ثابت ہوئے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق صرف ایک سال میں دنیا بھر میں 1,187 امدادی کارکن شدید ترین حملوں کا شکار ہوئے

ان حملوں کے نتیجے میں 350 سے زائد امدادی کارکنوں نے جامِ شہادت نوش کیا، جو کہ تاریخ میں دوسری سب سے بڑی سالانہ تعداد ہے۔ رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ نشانہ مقامی ورکرز کو بنایا جاتا ہے۔ گذشتہ 5 سالوں میں ہونے والے 96٪ سے 98٪ حملے مقامی عملے (National Staff) پر ہوئے، جو اپنے ہی ہم وطنوں کی خدمت کر رہے تھے: غیر ریاستی عناصر اور مجرمانہ گروہوں کی جانب سے امدادی ورکرز کو اغوا کرنے کے واقعات بڑھ کر 235 تک پہنچ گئے۔

: دسمبر 2017ء سے اب تک دنیا کے 29 خطرناک ترین خطوں میں طبی عملے اور ہسپتالوں پر 10,400 سے زائد حملے ریکارڈ کیے گئے۔ ان حملوں میں اب تک 5,700 سے زائد ڈاکٹرز اور طبی عملہ شہید جبکہ 8,500 سے زائد زخمی ہو چکے ہیں۔

اس سال اب تک 914 نئے حملے رپورٹ ہوئے ہیں جن کا بڑا حصہ یوکرین، لبنان، مقبوضہ فلسطینی علاقوں (غزہ) اور میانمار میں پیش آیا

اقوام متحدہ کی گلوبل رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں 239 ملین (23.9 کروڑ) افراد شدید بحرانوں کا شکار ہیں جنہیں فوری امداد کی ضرورت ہے اور اقوام متحدہ نے اس سال 33 ارب ڈالرز کا فنڈ مانگا ہے تاکہ دنیا بھر میں 135 ملین انتہائی مجبور انسانوں تک خوراک اور طبی امداد پہنچائی جاسکے۔

یہ رپورٹس واضح کرتی ہیں کہ دنیا بھر میں جہاں ایک طرف معصوم انسانوں کے لیے امداد کی ضرورت بڑھ رہی ہے، وہیں دوسری طرف امداد پہنچانے والے محافظ خود غیر محفوظ ہوتے جارہے ہیں

۔یہی وجہ ہے کہ اقوام متحدہ اس سال #ActForHumanity کے تحت حکومتوں پر سخت ترین سزاؤں کے لیے دباؤ ڈال رہی ہے۔

اقوام متحدہ کا کہنا ہے کہ امدادی کارکنوں پر حملوں کے خلاف محض "تشویش کا اظہار" یا "مذمت" کرنا اب بس ہو چکا ہے، بلکہ اب مجرموں کو کٹہرے میں لا کر سخت سزا (Consequence) دینے کا وقت آ گیا ہے

اس سال حکومتوں اور جنگی دھڑوں سے واضح مطالبات کیے گئے ہیں کہ وہ

بین الاقوامی انسانی قانون (International Humanitarian Law) کا احترام کریں، امدادی کارکنوں کی بلا رکاوٹ رسائی یقینی بنائیں، اور ان پر حملہ کرنے والوں کا فوری احتساب کریں کیونکہ طبی اور فرنٹ لائن ورکرز کو اس وقت تاریخ کے بدترین حالات کا سامنا ہے۔

بین الاقوامی قوانین جنگوں اور تنازعات کے دوران امدادی اور طبی عملے کو خصوصی قانونی تحفظ فراہم کرتے ہیں: جنیوا کنونشنز کے تحت جنگی علاقوں میں غیر جانبدار امدادی کارکنوں، ہسپتالوں اور ایمبولینسوں پر حملہ کرنا ایک سنگین جنگی جرم (War Crime) ہے۔

ریڈ کراس (Red Cross)، ریڈ کریسنٹ (Red Crescent) اور اقوام متحدہ کے نشانات والی گاڑیوں اور عمارتوں کو کسی بھی صورت میں نشانہ بنانا قانوناً ممنوع ہے

بین الاقوامی قانون کے مطابق، تمام رکن ممالک اور جنگی دھڑے پابند ہیں کہ وہ شہریوں تک امداد پہنچانے والے کارکنوں کو محفوظ راستہ فراہم کریں

۔عالمی مہم #ActForHumanity کا حصہ بننے اور اس آواز کو عام کرنے کے لیے عوام درج ذیل اقدامات کر سکتے ہیں کہ وہ

سوشل میڈیا پر آواز اٹھائیں اور اپنے اکاؤنٹس سے ہیش ٹیگ #ActForHumanity اور #WorldHumanitarianDay کا استعمال کرتے ہوئے امدادی کارکنوں کے تحفظ کے حق میں پوسٹس شیئر کریں اور اقوام متحدہ کی آفیشل ویب سائٹ پر جا کر اس پٹیشن پر دستخط کریں جس میں عالمی رہنماؤں سے امدادی کارکنوں پر حملہ کرنے والوں کو سخت سزائیں دینے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اپنے اردگرد موجود ان مقامی تنظیموں اور رضاکاروں کی مالی یا اخلاقی مدد کریں جو قدرتی آفات اور ہنگامی حالات میں فرنٹ لائن پر کام کرتے ہیں۔





18 اگست۔1920)جب امریکی خواتین کو۔ووٹ ڈالنے کا حق دیا گیا)اور اس کے عالمی اثرات

امریکی آئین کی 19ویں ترمیم کی توثیق 18 اگست 1920 کو ہوئی اور اسے 26 اگست 1920 کو باضابطہ طور پر نافذ کیا گیا.
۔اس تاریخی قدم نے نصف امریکی آبادی کو سیاسی عمل کا حصہ بنایا، تاہم یہ کامیابی کسی ناگہانی فیصلوں کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سات دہائیوں پر محیط ایک سخت اور منظم سیاسی و سماجی جدوجہد کا حاصل تھی

۔امریکن وومن سفریج موومنٹ (Women's Suffrage Movement) کی باقاعدہ شروعات 1848 میں نیویارک میں منعقدہ 'سینیکا فالز کنونشن (Seneca Falls Convention) 'سے ہوئی۔ الیز بتھ کیڈی اسٹینٹن اور سوسن بی انتھونی جیسے رہنماؤں کی قیادت میں شروع ہونے والی اس تحریک میں خواتین نے جلسے جلوس، سیاسی ریلیاں اور وائٹ ہاؤس کے باہر طویل احتجاجی مظاہرے کیے

(اس کا تفصیلی ذکر میں اپنی 19 جولائی 26 کی پوسٹ میں کر چکا ہوں۔ قارئین ریفرنس کے لئے دیکھ سکتے ہیں)

۔اس جدوجہد کے دوران سینکڑوں خواتین کو گرفتار کیا گیا، جیلوں میں سختیاں جھیلنی پڑیں اور کئی متحرک رہنماؤں نے بھوک ہڑتالیں بھی کیں۔ تحریک کے اس طویل سفر میں پہلی جنگِ عظیم (1914-1918) ایک اہم موڑ ثابت ہوئی۔ جب مرد محاذِ جنگ پر چلے گئے، تو خواتین نے کارخانوں، ہسپتالوں، ٹرانسپورٹ اور دیگر انتظامی شعبوں کا کنٹرول سنبھالا۔ خواتین کی اس عملی شمولیت نے معاشرتی اور سیاسی سوچ کو یکسر بدل دیا، جس کے نتیجے میں حکومت اور عوامی حلقوں پر یہ واضح ہو گیا کہ جو خواتین ریاست کی معیشت اور دفاع چلا سکتی ہیں، انہیں فیصلے کرنے کا مساوی حق نہ دینا جمہوریت کے چہرے پر داغ ہے

۔بین الاقوامی سطح پر امریکہ سے کہیں پہلے خواتین کو یہ حق مل چکا تھا۔ نیوزی لینڈ نے 19 ستمبر 1893 کو دنیا میں سب سے پہلے تمام بالغان اور تمام نژاد کی خواتین کو قومی انتخابات میں ووٹ کا حق فراہم کیا۔ جرمنی نے پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے کے فوری بعد 1918ء میں یہ حق دیا جبکہ برطانیہ میں 1918ء میں پہلے 30 سال سے زائد عمر کی مخصوص جائیداد کی مالکہ خواتین کو محدود حق ملا اور 1928ء میں تمام بالغان کو یکساں حقِ رائے دہی ملا۔ بعد ازاں فرانس نے 1944ء میں اور چین نے 1947ء کے آئین اور 1953ء کے انتخابی قانون کے تحت خواتین کو یہ حق دیا

،۔برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں بھی خواتین کے حقوق کی تدریجی پیش رفت ملتی ہے۔ مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات (1919ء) کے تحت برطانوی حکومت نے صوبائی کونسلوں کو خواتین کے ووٹ کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیا، جس کے بعد 1921ء میں مدراس اور بمبئی نے سب سے پہلے محدود پیمانے پر خواتین کو حقِ رائے دہی دیا۔ یہ ابتدائی حق تعلیم، جائیداد اور ٹیکس دہندگی کی سخت شرائط سے مشروط تھا۔

بعد ازاں 'گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء' کے تحت نہ صرف ووٹ کا دائرہ وسیع کیا گیا بلکہ قانون ساز اسمبلیوں میں خواتین کے لیے مخصوص نشستیں بھی رکھی گئیں۔ تقسیمِ ہند کے بعد نئی آزاد مملکتوں نے جمہوری روح کو اپناتے ہوئے کسی بھی قسم کے مشروط حق کی بندش ختم کر دی۔

بھارت نے 1950ء کے آئین کی منظوری کے ساتھ اور پاکستان نے 1956ء کے پہلے آئین کے تحت بلا امتیازِ جنس تمام بالغ مردوں اور خواتین کو مساوی اور مکمل حقِ رائے دہی دیا، جس نے خواتین کو قومی تعمیر کے عمل میں براہ راست شراکت دار بنایا۔

مجموعی طور پر، عالمی تاریخ میں خواتین کے حقِ رائے دہی کی جدوجہد محض ایک ووٹ کے حصول کی کوشش نہیں تھی، بلکہ یہ انسانی مساوات، شہری شناسا اور جمہوری عمل کی مکمل تجدید کا ایک عالمی سفر تھا جس نے جدید ریاستوں کی بناؤ کو بدل کر رکھ دیا۔



Zia dies in plane crash

US envoy, Gen. Akhtar among dead

Ishaq takes over as President

10-day mourning declared

Inquiry ordered



17 اگست 1988 :سانحہ بہاول پور۔۔۔جنرل ضیاء الحق کے فضائی حادثے کا پس منظر اور مابعد اثرات۔

17 اگست 1988 کو پاکستان کے فوجی صدر جنرل محمد ضیاء الحق بہاولپور کے قریب ٹامیوالی فائرنگ رینج میں امریکی ساختہ M1 ابرام ٹینکوں کی مشقی نمائش دیکھنے کے بعد پاک فضائیہ کے C-130B ہرکولیس طیارے میں سوار ہوئے۔ یہ طیارہ اسلام آباد واپس جارہا تھا مگر پرواز بھرنے کے چند منٹ بعد ہی بے قابو ہو کر زمین پر گر کر تباہ ہو گیا

۔حادثے میں طیارے میں سوار تمام افراد ہلاک ہو گئے۔اس حادثے میں جنرل ضیاء الحق کے علاوہ پاکستان کی چیئرمین جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کمیٹی جنرل اختر عبدالرحمان، کئی سینئر فوجی جنرلز، اور امریکہ کے سفیر آرنلڈ رافیل اور امریکی فوجی اتاشی بریگیڈیئر جنرل ہربرٹ ویسم بھی شامل تھے۔ مجموعی طور پر تیس کے قریب افراد اس حادثے میں جان سے گئے، جن میں پاکستان کی اعلیٰ فوجی قیادت کا بڑا حصہ شامل تھا

حادثے کے بعد پاکستانی فضائیہ اور امریکی حکام نے مشترکہ طور پر تحقیقات کا آغاز کیا۔ امریکی ماہرین نے بھی معاونت فراہم کی کیونکہ سفیر رافیل بھی حادثے میں ہلاک ہوئے تھے۔ مختلف رپورٹوں کے مطابق طیارے میں بلیک باکس (کاک پٹ وائس ریکارڈر یا فلائٹ ڈیٹا ریکارڈر) نصب نہیں تھا، اس لیے پائلٹس کی آخری گفتگو اور پرواز کے فنی کوائف محفوظ نہ ہو سکے۔ پرواز کے چند منٹ بعد کنٹرول ٹاور سے طیارے کا رابطہ منقطع ہو گیا، اور فنی خرابی کی کوئی واضح وجہ سامنے نہ آ سکی

پاکستانی بورڈ آف انکوائری نے اپنی رپورٹ میں یہ نتیجہ پیش کیا کہ یہ حادثہ "تخریب کاری کا مجرمانہ عمل" تھا، لیکن ذمہ دار عناصر یا تخریب کاری کے حتمی طریقہ کار کی نشاندہی نہ ہو سکی۔ دوسرے الفاظ میں، تحقیقات حادثے کی حتمی وجہ متعین کرنے میں ناکام رہیں۔ فنی خرابی، بمباری، یا زہریلی گیس کے استعمال جیسے مختلف نظریات پیش کیے گئے، مگر کوئی ٹھوس شہادت نہ ملی۔

اس حادثے کے بارے میں کئی سازشی نظریات مشہور ہوئے۔ ان میں یہ خیال شامل تھا کہ طیارے میں آموں کی پیٹی میں دھماکہ خیز مواد رکھا گیا تھا، یا کاک پٹ میں زہریلی گیس چھوڑی گئی جس سے پائلٹس بے ہوش ہو گئے۔ افغان جنگ کے تناظر میں، شک کی انگلیاں سوویت خفیہ ایجنسی، بھارتی ایجنسی، اسرائیلی موساد، اور حتیٰ کہ پاکستان کے اندرونی مخالفین کی جانب بھی اٹھائی گئیں، لیکن کسی بھی نظریے کی تصدیق نہیں ہو سکی

جنرل ضیاء الحق کی موت نے پاکستان میں گیارہ سالہ فوجی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ آئین کے مطابق سینیٹ کے چیئرمین غلام اسحاق خان عبوری صدر بنے، اور اسی سال نومبر میں عام انتخابات کرائے گئے جن کے نتیجے میں بے نظیر بھٹو پاکستان کی وزیر اعظم منتخب ہوئیں۔ یوں پاکستان میں جمہوریت کی بحالی کا عمل شروع ہوا، اگرچہ سیاسی عدم استحکام بعد کے برسوں میں بھی جاری رہا

عالمی سطح پر بھی اس حادثے کے اثرات نمایاں تھے۔ یہ افغانستان میں سوویت افواج کے انخلا کے دوران پیش آیا، جس میں جنرل ضیاء اور امریکہ افغان مجاہدین کی حمایت میں کلیدی کردار ادا کر رہے تھے۔ سفیر آرنلڈ رافیل کی ہلاکت نے امریکہ-پاکستان تعلقات کو بھی متاثر کیا۔ یہ واقعہ سرد جنگ کے آخری دور کے پیچیدہ علاقائی مسائل کی ایک کڑی سمجھا جاتا ہے، اور آج تک اس کی حتمی وجہ ایک معمہ ہی سمجھی جاتی ہے۔

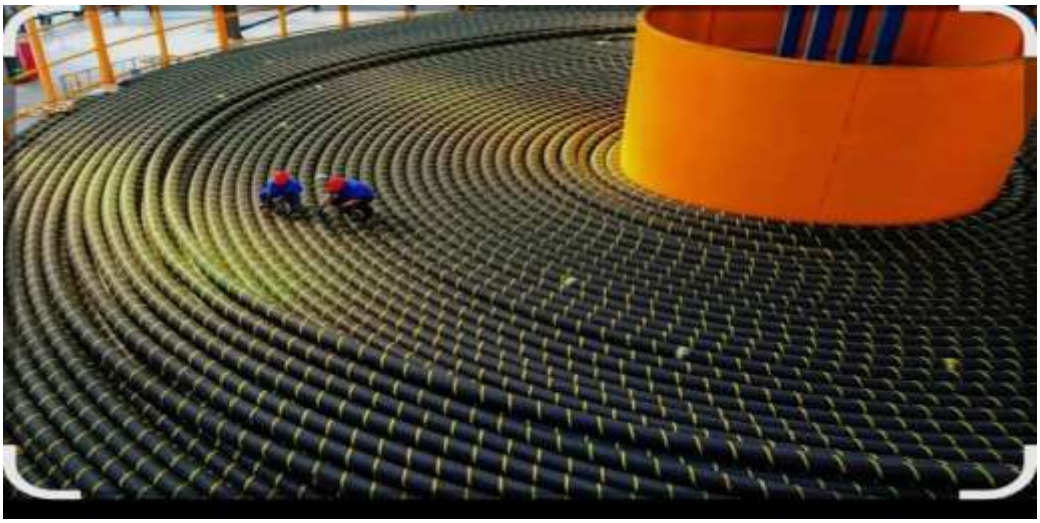



16 اگست 1858: پہلا بین البر اعظمی ٹیلی گرافی پیغام — جب دو بر اعظم پہلی بار ایک تار سے جڑے اور موجودہ انٹرنیٹ انقلاب۔

16 اگست 1858 کو انسانی تاریخ میں مواصلات کے میدان میں ایک ایسا سنگِ میل عبور ہوا جس نے دنیا کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ نے امریکی صدر جیمز بکانن کو پہلا بین البر اعظمی (Transatlantic) ٹیلی گراف پیغام ارسال کیا، جو آئرلینڈ اور نیوفاؤنڈلینڈ کے درمیان سمندر کی تہہ میں بچھائی گئی 2,130 میل طویل کیبل کے ذریعے سفر کر کے منزل تک پہنچا

۔98الفاظ پر مشتمل یہ پیغام اگرچہ سمجھے جانے تک تقریباً16 گھنٹے کا وقت لے گیا، مگر اس نے وہ خلیج پاٹ دی جسے پار کرنے میں بحری جہاز پہلے 10 دن لگاتے تھے. اس عظیم کامیابی کا پس منظر کئی دہائیوں پر محیط جدوجہد پر مشتمل ہے

۔1840ء کی دہائی میں سیموئل مورس نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ سمندر پار کیبل بچھا کر براعظموں کو باہم منسلک کیا جا سکتا ہے۔1850ء میں برطانیہ اور فرانس کے درمیان انگلش چینل میں زیرِ سمندر کیبل کا پہلا کامیاب تجربہ ہوا، جس نے یہ ثابت کیا کہ سمندر کی تہہ میں کیبل بچھانا تکنیکی طور پر ممکن ہے۔ اسی حوصلے سے متاثر ہو کر امریکی تاجر سائرس ویسٹ فیلڈ نے اٹلانٹک کے آر پار کیبل بچھانے کے عظیم منصوبے کے لیے "اٹلانٹک ٹیلی گراف کمپنی" قائم کی۔ یہ سفر ہرگز آسان نہیں تھا۔ 1857 سے 1858 کے دوران کیبل بار بار ٹوٹنے اور سمندری طوفانوں کے باعث ابتدائی چار کوششیں بری طرح ناکام ہوئیں، جس سے سرمایہ کاروں اور انجینئرز کا حوصلہ متزلزل ہونے لگا۔ تاہم ناکامیوں سے سبق سیکھتے ہوئے انجینئرز نے ایک نئی حکمتِ عملی اپنائی :

"دونوں جہاز سمندر کے وسط میں ملیں گے، کیبل کے سرے آپس میں جوڑیں گے (Spliced) اور پھر مخالف سمتوں میں سفر کرتے ہوئے اپنے اپنے کناروں تک پہنچیں گے"

اس مقصد کے لیے برطانوی جہاز HMS Agamemnon اور امریکی جہاز USS Niagara نے مل کر جولائی 1858 میں کام کا آغاز کیا۔ انتھک محنت رنگ لائی اور 5 اگست 1858 کو کیبل کے دونوں سرے کامیابی سے کناروں پر لگا دیے گئے— ایک سرا آئرلینڈ کے جزیرہ ویلنٹیا پر اور دوسرا شمالی امریکہ کے نیوفاؤنڈلینڈ پر۔ کچھ ابتدائی تجرباتی پیغامات کے تبادلے کے بعد 16 اگست کو وہ تاریخی لمحہ آیا جب ملکہ وکٹوریہ اور صدر جیمز بکانن نے باضابطہ مبارکبادی پیغامات کا تبادلہ کیا۔ اس خبر کے پھیلتے ہی نیویارک اور لندن میں جشن کا سماں پیدا ہو گیا، توپوں کی سلامی دی گئی اور لوگوں نے اس کامیابی کو انسانی ذہانت کی فتح قرار دیا۔ تاہم یہ خوشی زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ سگنل کی کمزوری پر قابو پانے کے لیے تکنیکی عملے نے کیبل پر زیادہ وولٹیج کا استعمال شروع کر دیا، جس کے نتیجے میں کیبل کی موصلیت (insulation) کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ نتیجتاً یہ تاریخی کیبل محض تین ہفتوں کے اندر، ستمبر 1858 کے اوائل میں، مکمل طور پر ناکارہ ہو گئی

۔ مگر اس تجربے نے ایک نئی امید پیدا کی اور 1866ء میں زیادہ کامیاب Transatlantic cable قائم ہو گئی۔ بعد ازاں 1956ء میں TAT-1 کے ذریعے یورپ اور شمالی امریکہ کے درمیان پہلی باقاعدہ Transatlantic telephone service شروع ہو گی

۔ آج کا جدید انٹرنیٹ بظاہر وائی فائی اور وائرلیس ٹیکنالوجی پر قائم نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک انٹرنیٹ، ویڈیو، کلاؤڈ سروسز، مالیاتی لین دین اور دیگر ڈیجیٹل معلومات کی ترسیل کا تقریباً 95 فیصد، جبکہ مجموعی بین البراعظمی مواصلات کا تقریباً 99 فیصد زیرِ سمندر فائبر آپٹک کیبلز کے ذریعے ہوتا ہے

دنیا نے اس کا متبادل سیٹلائٹ انٹرنیٹ، خصوصاً Low Earth Orbit (LEO) سیٹلائٹس کی صورت میں ضرور تیار کر لیا ہے، جو دور دراز علاقوں کے لیے انتہائی مفید ہیں، لیکن موجودہ حالات میں سیٹلائٹس سمندری کیبلز کی رفتار، بے پناہ گنجائش، کم تاخیر (Latency) اور کم لاگت کا مکمل متبادل نہیں بن سکتے۔ اسی لیے وائرلیس انٹرنیٹ کے باوجود عالمی انٹرنیٹ کا اصل Backbone زیرِ سمندر فائبر نیٹ ورک ہی ہے۔

زیرِ سمندر کیبلز کے کٹنے کا خطرہ ضرور موجود ہے، لیکن دنیا نے اس کے لیے Network Redundancy کا نظام بنایا ہوا ہے، یعنی عالمی انٹرنیٹ کسی ایک کیبل پر منحصر نہیں بلکہ مختلف routes اور متعدد کیبلز استعمال کرتا ہے۔ کیبلز کو نقصان پہنچنے کی بڑی وجوہات عموماً جہازوں کے لنگر، fishing اور trawling، زیرِ سمندر زلزلے اور landslides ہیں؛ تقریباً 75 فیصد cable breaks انسانی سرگرمیوں، خصوصاً fishing اور anchoring، سے منسلک بتائے جاتے ہیں۔

2025 میں دنیا بھر میں 170 سے زائد submarine cable repairs رپورٹ ہوئیں۔ ساحل کے قریب کیبلز کو عموماً سمندری تہہ میں دفن کیا جاتا ہے، جبکہ گہرے سمندر میں انہیں seabed پر بچھایا جاتا ہے۔ ایک کیبل خراب ہونے کی صورت میں ڈیٹا کو دوسری کیبلز کے راستے منتقل کیا جاتا ہے۔

آج دنیا میں سینکڑوں submarine cable systems اور ایک ہزار سے زیادہ landing stations موجود ہیں، جو عالمی ڈیجیٹل معیشت کو جوڑے ہوئے ہیں۔ یوں 1850ء میں ٹیلی گراف سے شروع ہونے والی یہ ٹیکنالوجی 176 سال بعد بھی جدید انٹرنیٹ کی ریڑھ کی ہڈی ہے؛ سیٹلائٹ اور دیگر وائرلیس ذرائع اس کا متبادل اور backup ضرور ہیں، مگر فی الحال عالمی سطح پر اس کی جگہ لینے کی صلاحیت نہیں رکھتے

۔ آج جب ہم چند سیکنڈوں میں دنیا کے دوسرے کونے میں پیغام بھیج دیتے ہیں، تو اس کی جڑیں 1858 کی اسی جرات مندانہ کوشش سے جا ملتی ہیں جس نے سمندروں کے فاصلے کو گھنٹوں میں سمیٹ دیا تھا۔





15اگست 1945 ۔(وی جے ڈے)

(VICTORY OVER JAPAN) DAY)

15اگست 1945کادن عالمی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتاہے،جب جاپان کے شہنشاہ ہیروہیٹونے ریڈیو کے ذریعے قوم سے خطاب کرتے ہوئے غیر مشروط ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا۔یہ اعلان دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کا باقاعدہ اعلامیہ تھا،جسے جاپان میں "وی-جے ڈے (Victory over Japan Day) "کے نام سے یاد کیاجاتاہے۔
باقاعدہ دستاویزات پر دستخط2 ستمبر1945 کو امریکی بحری جہاز یو ایس ایس مسوری پر ہوئے۔دستخط کرنے والے (جاپانی نمائندے):مامورو شیگیمیتسو(وزیر خارجہ،شہنشاہ اور جاپانی حکومت کی طرف سے)جنرل یوشیجیرو اومیزو(آرمی جنرل اسٹاف کے چیف،فوجی کمان کی طرف سے قبول کرنے والے(اتحادی نمائندہ):جنرل ڈگلس میک آرتھر(سپریم کمانڈر فار دی الائیڈ پاور)

مگر 15 اگست کا دن ہی وہ لمحہ تھا جب جاپانی عوام نے پہلی بار اپنے شہنشاہ کی آواز براہ راست سنی۔ اس ہتھیار ڈالنے کا پس منظر انتہائی سنگین اور المناک تھا۔ اگست 1945 کے آغاز میں امریکہ نے دو ایٹمی حملے کیے: 6 اگست کو ہیروشیما اور 9 اگست کو ناگاساکی پر۔ ان حملوں میں فوری طور پر ہزاروں افراد ہلاک ہوئے اور بعد میں تابکاری کے اثرات سے مزید لاکھوں افراد متاثر ہوئے۔ اس کے علاوہ 8 اگست 1945 کو سوویت یونین نے بھی جاپان کے خلاف جنگ کا اعلان کر کے منچوریا پر حملہ کر دیا، جس سے جاپان کی عسکری اور سفارتی پوزیشن مزید کمزور ہو گئی۔

جاپانی حکومت اور فوجی قیادت میں شدید اختلافات کے باوجود، شہنشاہ ہیرو ہیٹو نے بالآخر ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ سنایا تاکہ مزید تباہی سے بچا جا سکے۔ ہتھیار ڈالنے کے فوری بعد دنیا بھر میں ملا جلا ردعمل دیکھنے میں آیا۔ اتحادی ممالک، خاص طور پر امریکہ اور برطانیہ میں، خوشی اور جشن کا سماں تھا کیونکہ ایک طویل اور خونریز جنگ بالآخر ختم ہو چکی تھی۔ دنیا بھر میں کروڑوں افراد کی جانیں بچ گئیں جو متوقع زمینی حملے کی صورت میں ضائع ہو سکتی تھیں

۔ تاہم ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال نے عالمی سیاست میں ایک نیا اور خوفناک باب کھول دیا، جس نے بعد میں سرد جنگ کے دوران جوہری ہتھیاروں کی دوڑ کی بنیاد رکھی

۔ جاپان کے اندرونی حالات پر اس شکست کے اثرات انتہائی گہرے اور دیرپا تھے۔ ملک تباہ حال معیشت، منہدم شہروں اور کروڑوں بے گھر افراد کے ساتھ کھڑا تھا۔ 1945 سے 1952 تک جاپان پر امریکی زیرِ قیادت اتحادی افواج کا قبضہ رہا، جس کی سربراہی جنرل ڈگلس میک آرتھر کر رہے تھے۔ اس دور میں جاپان میں بنیادی سیاسی، معاشی اور سماجی اصلاحات کی گئیں، جن میں ایک نیا جمہوری آئین نافذ کیا گیا جس کے تحت شہنشاہ کو محض علامتی حیثیت دی گئی اور جاپان کو جنگ سے دستبرداری کا پابند بنایا گیا۔ ان اصلاحات کے نتیجے میں جاپان نے آہستہ آہستہ اپنے آپ کو ایک نئے، پرامن اور جمہوری ملک کے طور پر دوبارہ تعمیر کیا۔ زمینی اصلاحات، تعلیمی نظام کی تبدیلی، اور صنعتی ترقی کے ذریعے جاپان نے 1950 اور 1960 کی دہائیوں میں غیر معمولی اقتصادی ترقی حاصل کی، جسے "جاپانی معاشی معجزہ" کہا جاتا ہے۔ آج جاپان دنیا کی چند بڑی معیشتوں میں شمار ہوتا ہے اور امن پسندی کی پالیسی پر عمل پیرا ہے، جو اس تاریخی شکست کے بعد اپنائی گئی حکمتِ عملی کا براہ راست نتیجہ ہے

المختصر 15 اگست 1945 نہ صرف دوسری عالمی جنگ کے خاتمے کا دن تھا بلکہ یہ جدید عالمی نظام کی تشکیل کا نقطہ آغاز بھی ثابت ہوا۔ اس واقعے نے جوہری ہتھیاروں کے خطرات کو دنیا کے سامنے آشکار کیا، اقوامِ متحدہ جیسے عالمی اداروں کی اہمیت کو اجاگر کیا، اور جاپان کو تباہی سے ترقی کی راہ پر گامزن کیا۔ یہ دن آج بھی انسانیت کے لیے ایک سبق کے طور پر یاد رکھا جاتا ہے کہ جنگ کی تباہ کاریاں کتنی گہری اور دیرپا ہو سکتی ہیں







14 اگست: آزادی کی قیمت – ہجرت، خون اور قربانی کی لازوال داستان

14 اگست پاکستان کے قیام کی خوشی کا دن ضرور ہے، مگر یہ صرف جشنِ آزادی کا دن نہیں؛ یہ ان لاکھوں انسانوں کو یاد کرنے کا دن بھی ہے جنہوں نے آزادی کی قیمت اپنے گھر، اپنی زمین، اپنے عزیزوں بلکہ اپنی جانوں سے ادا کی

1947ء کی تقسیمِ ہند انسانی تاریخ کی عظیم ترین ہجرتوں میں سے ایک تھی۔ تقریباً ڈیڑھ کروڑ سے زائد انسان مذہبی شناخت کی بنیاد پر سرحد کے آر پار منتقل ہوئے، اور پنجاب اس انسانی المیے کا سب سے بڑا میدان بن گیا

۔ تحقیق کے مطابق صرف پنجاب میں تقسیم سے متعلق آبادیاتی نقصان، جس میں اموات اور غیر ریکارڈ شدہ ہجرت دونوں شامل ہیں، تقریباً 23 سے 32 لاکھ کے درمیان تھا۔ اس لیے ان اعداد کو براہِ راست مقتولین کی تعداد سمجھنا درست نہیں، لیکن یہ اس المیے کی غیر معمولی شدت ضرور ظاہر کرتے ہیں

۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کے خلاف ہونے والے تشدد کی شدت کا اندازہ خود برطانوی سرکاری ریکارڈ سے لگایا جا سکتا ہے۔ 25 اگست 1947ء کی ایک برطانوی دستاویزی رپورٹ میں مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کو بڑے پیمانے پر مغرب کی طرف دھکیلنے، مسلم دیہات جلانے اور مسلح جتھوں کے ہاتھوں قتلِ عام کا ذکر ہے۔ رپورٹ میں پانچ دیہات میں ایک ہی دن کم از کم 500 افراد کے قتل اور بیک وقت تقریباً 50 دیہات کے جلنے کی اطلاع درج ہے۔ جالندھر، امرتسر، لدھیانہ، ہوشیار پور، گورداسپور، فیروزپور، کپورتھلہ اور امبالہ سمیت مشرقی پنجاب کے متعدد علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی شدید متاثر ہوئی۔ برطانوی ریکارڈ کے مطابق ستمبر کے وسط تک جالندھر، ہوشیار پور اور کپورتھلہ میں بدامنی جاری تھی اور امرتسر کے قریب مسلم مہاجرین کے قافلوں پر حملوں کی اطلاعات بھی موجود تھیں۔ یہ محض بے قابو ہجوم کا ایک سلسلہ نہیں تھا؛ بعض علاقوں میں تشدد منظم اور علاقائی سطح پر coordinated کارروائیوں کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ برطانوی ریکارڈ میں مشرقی پنجاب کو مسلمانوں سے "صاف" کرنے، انہیں مغرب کی طرف دھکیلنے اور دیہات کو ایک ایک سیکٹر میں نشانہ بنانے کی اطلاعات موجود ہیں۔ تاہم تاریخ کے ساتھ انصاف کا تقاضا ہے کہ اس حقیقت کو پورے 1947ء کے تناظر میں دیکھا جائے: مغربی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں ہندو اور سکھ آبادی بھی قتل، لوٹ مار، اغوا اور جبری بے دخلی کا شکار ہوئی

۔ تقسیم کا المیہ کسی ایک مذہب کے تمام لوگوں کا جرم نہیں تھا؛ اصل مجرم وہ مسلح جتھے، انتہا پسند عناصر اور وہ انتظامی و سیاسی ناکامیاں تھیں جنہوں نے انسان کو اس کی مذہبی شناخت کے نام پر دشمن بنا دیا۔ اس سانحے کا سب سے دردناک باب خواتین کی داستان ہے۔ ہزاروں مسلم خواتین کو اغوا کیا گیا، جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، قید رکھا گیا، جبری مذہبی تبدیلی اور جبری شادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پنجاب پر ہونے والی تحقیقی مطالعات میں مسلم خواتین کے خلاف عصمت دری، اغوا، یرغمال بنائے جانے، قتل اور جبری شادیوں کے متعدد واقعات دستاویزی شواہد اور متاثرہ خواتین کی روایات کی بنیاد پر بیان کیے گئے ہیں۔ اغوا شدہ خواتین کی قطعی تعداد آج بھی معلوم نہیں، کیونکہ بے شمار واقعات کبھی رپورٹ ہی نہیں ہوئے۔

مستند رپورٹس کے مطابق پاکستان میں تقریباً50,000 مسلم خواتین اور بچوں کے اغوا یا گمشدگی کی سرکاری رپورٹس سامنے آئیں، جبکہ ہندوستان میں تقریباً33,000 ہندو اور سکھ خواتین و بچوں کے لاپتہ یا اغوا ہونے کی اطلاعات تھیں۔ مورخ اُروشی بٹالیا نے دونوں طرف اغوا ہونے والی خواتین کی مجموعی تعداد تقریباً75,000 کے قریب بتائی ہے۔ اس لیے "ایک لاکھ سے زائد مسلم خواتین" جیسے قطعی دعووں کے بجائے "دسیوں ہزار مسلم خواتین" کہنا زیادہ تاریخی طور پر محتاط اور مستند ہے۔
یہ وہ نسل تھی جس نے پاکستان کو صرف نقشے پر نہیں دیکھا تھا؛ اس نے پاکستان کی قیمت اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ کسی نے اپنے والدین کو راستے میں کھویا، کسی نے بھائی کو قتل ہوتے دیکھا، کسی کی بہن یا بیٹی اغوا ہو گئی، کسی کا پورا گاؤں اجڑ گیا اور کسی نے مہاجر ٹرین میں سفر کرتے ہوئے منزل کے بجائے موت کو دیکھا۔ لاکھوں لوگ پیدل، بیل گاڑیوں، ٹرکوں اور ٹرینوں کے ذریعے ایک ایسے وطن کی طرف روانہ ہوئے جسے انہوں نے ابھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر جس پر ان کا یقین تھا.

۔14 اگست ہمیں صرف یہ نہیں بتاتا کہ پاکستان کب وجود میں آیا؛ یہ ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ پاکستان کیوں وجود میں آیا اور اس کے قیام کی قیمت کیا تھی۔ اس تاریخ کو ہمیں اپنے بزرگوں کی قربانیوں کو سیاسی نعروں سے آگے بڑھ کر انسانی اور تاریخی شعور کے ساتھ یاد کرنا چاہیے۔ ان شہیدوں، مہاجروں اور مظلوم خواتین کی داستان ہماری قومی یادداشت کا حصہ ہونی چاہیے — مگر اس انداز میں کہ تاریخ سچائی کے ساتھ بیان ہو، مبالغے سے نہیں؛ اپنے دکھ کو یاد رکھا جائے، مگر دوسروں کے دکھ سے انکار نہ کیا جائے۔ آزادی صرف ایک سرحد کا نام نہیں؛ آزادی ان قربانیوں کی امانت بھی ہے۔

14 اگست کا حقیقی پیغام یہی ہے کہ جن لوگوں نے اپنی جانیں دے کر پاکستان کو حاصل کیا، ہم اس پاکستان کو انصاف، قانون، انسانی وقار، رواداری اور اتحاد کے اصولوں پر مضبوط کریں۔ کیونکہ شہیدوں اور مہاجروں کی سب سے بڑی یادگار صرف پرچم لہرانا نہیں، بلکہ ایک ایسا پاکستان بنانا ہے جس میں کسی انسان کو اس کی شناخت کی وجہ سے وہ ظلم نہ سہنا پڑے جس کا سامنا 1947ء کی نسل نے کیا تھا۔ پاکستان زندہ باد — اور ان تمام گمنام شہیدوں، مہاجروں اور مظلوموں کو سلام جن کی قربانیوں سے یہ وطن وجود میں آیا۔



13 اگست-لیفٹ ہینڈرز (خبچوں) کا عالمی دن

(International Left Handers Day)

13 اگست کو دنیا بھر میں "انٹر نیشنل لیفٹ ہینڈرز ڈے" کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد ان افراد کو خصوصی طور پر یاد کرنا اور ان کی پہچان کروانا ہے جو اپنے روزمرہ کے کام بائیں ہاتھ سے انجام دیتے ہیں

چونکہ دنیا کی اکثریتی آبادی دائیں ہاتھ کی ہے، اس لیے زیادہ تر اشیاء، آلات اور ماحول بھی دائیں ہاتھ والوں کے لیے ڈیزائن کیے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے بائیں ہاتھ والوں کو روزمرہ زندگی میں کئی چھوٹی بڑی مشکلات کا سامنا رہتا ہے۔ یہ دن دراصل ایسے مسائل کی طرف توجہ دلانے اور ان افراد کی صلاحیتوں کو سراہنے کے لیے مقرر کیا گیا۔

اس دن کے آغاز کا سہرا "لیفٹ ہینڈرز کلب" کو جاتا ہے، جو برطانیہ میں قائم کیا گیا تھا۔

پہلی بار یہ دن 13 اگست 1992 کو منایا گیا۔ اس کے پیچھے بنیادی محرک ڈین آر کیمبل (Dean R. Campbell) نامی امریکی شخص کا کام تھا، جس نے اس سے قبل امریکہ میں بائیں ہاتھ والوں کی تنظیم "لیفٹ ہینڈرز انٹر نیشنل" قائم کی تھی تاکہ لیفٹی افراد کو ایک پلیٹ فارم مل سکے، وہ آپس میں رابطہ کر سکیں اور اپنے تجربات شیئر کر سکیں

۔رفتہ رفتہ یہ دن دنیا کے مختلف ممالک میں مقبول ہوتا گیا، جہاں تعلیمی ادارے، تنظیمیں اور سوشل میڈیا پیج آگاہی مہمات، مذاق آمیز مقابلے (جیسے بائیں ہاتھ سے کھانا کھانا یا لکھنا) اور سیمینار منعقد کرتے ہیں

جہاں تک دنیا میں بائیں ہاتھ والوں کی شرح کا تعلق ہے، مختلف تحقیقی جائزوں کے مطابق دنیا کی تقریباً 10 فیصد آبادی بائیں ہاتھ سے کام کرتی ہے، یعنی ہر دس میں سے ایک شخص لیفٹی ہوتا ہے۔ مردوں میں یہ شرح خواتین کی نسبت معمولی زیادہ بتائی جاتی ہے۔ یہ تناسب تقریباً تمام معاشروں اور نسلوں میں کم و بیش ایک جیسا ہی پایا گیا ہے، جس سے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ اس کا تعلق جینیاتی اور دماغی ساخت سے ہے، خاص طور پر دماغ کے دائیں حصے کی زیادہ فعالیت سے، جو تخلیقی صلاحیتوں اور فنی رجحانات سے جوڑا جاتا ہے (اگرچہ اس بارے میں سائنسی تحقیق ابھی حتمی نہیں)۔ بائیں ہاتھ والوں کے بارے میں عمومی طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ تخلیقی، فنکارانہ ذہن رکھنے والے اور مختلف زاویوں سے سوچنے کی صلاحیت کے حامل ہوتے ہیں۔ کھیلوں میں بھی، خاص طور پر باکسنگ، ٹینس اور کرکٹ جیسے کھیلوں میں، بائیں ہاتھ والے کھلاڑیوں کو اکثر ایک منفرد فائدہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ حریف عام طور پر دائیں ہاتھ والوں کے مقابلے کے عادی ہوتے ہیں۔

تاریخ میں بھی کئی نامور شخصیات جیسے لیونارڈو ڈاونچی، البرٹ آئن سٹائن اور باراک اوباما لیفٹی مشہور رہے ہیں۔ تاہم روزمرہ زندگی میں انہیں قینچی، دروازوں کے ہینڈل، ڈیسک اور کچھ برتنوں جیسی عام اشیاء کے استعمال میں دشواری بھی پیش آتی ہے کیونکہ یہ عموماً دائیں ہاتھ والوں کے لیے بنائی جاتی ہیں

۔پاکستان کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں کے سماجی و ثقافتی ماحول میں بائیں ہاتھ سے کام کرنے کو اکثر منفی انداز میں دیکھا جاتا ہے، خصوصاً کھانا کھانے یا کسی کو کوئی چیز دینے میں دائیں ہاتھ کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے، جس کی جڑیں مذہبی و ثقافتی روایات میں پائی جاتی ہیں۔ اکثر والدین اور اساتذہ بچپن ہی سے بچوں کو زبردستی دائیں ہاتھ کا استعمال سکھانے کی کوشش کرتے ہیں، جو بعض ماہرین کے نزدیک بچے کی فطری نشوونما پر منفی اثر ڈال سکتا ہے۔ اس لیے پاکستان جیسے معاشروں میں یہ دن خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے آگاہی پیدا ہوتی ہے کہ بائیں ہاتھ سے کام کرنا کوئی کمی یا عیب نہیں بلکہ ایک قدرتی صلاحیت ہے۔ آخر میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان میں بھی کئی نامور شخصیات، خاص طور پر کرکٹ کی دنیا میں وسیم اکرم، سہیل تنویر اور کچھ دیگر کھلاڑی بائیں ہاتھ سے کھیل کر شہرت پا چکے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ بائیں ہاتھ ہونا کسی بھی طرح کی رکاوٹ نہیں بلکہ بعض اوقات ایک خاص خوبی بھی بن سکتا ہے۔

اس دن کو منانے کا اصل مقصد یہی ہے کہ معاشرے میں بائیں ہاتھ والوں کو قبولیت دی جائے، ان کے لیے سازگار ماحول اور آلات بنائے جائیں، اور انہیں اپنی فطری صلاحیتوں کے ساتھ اعتماد سے آگے بڑھنے کا موقع دیا جائے۔



13 اگست-عالمی یوم عطیہ اعضا (World Organ Donation Day) پاکستان کے پس منظر میں۔

ہر سال 13 اگست کو عالمی یوم عطیہ اعضا (World Organ Donation Day) منایا جاتا ہے

اس دن کو منانے کا بنیادی مقصد لوگوں میں اعضا کے عطیہ کی اہمیت اجاگر کرنا، اس بارے میں پائے جانے والے غلط تصورات کو دور کرنا اور مرنے کے بعد یا زندگی میں اعضا عطیہ کرنے کا عزم کرنے کی ترغیب دینا ہے تاکہ دنیا بھر میں اعضا کی کمی کی وجہ سے زندگی کی بازی ہار جانے والے مریضوں کی جانیں بچائی جا سکیں۔

تاریخ کا پہلا کامیاب ترین اعضا کا عطیہ (گردے کی پیوند کاری) 1954ء میں امریکہ میں کیا گیا تھا۔ یہ کارنامہ ڈاکٹر جوزف ماریے (Dr. Joseph E. Murray) کی سرجن ٹیم نے سرانجام دیا تھا، جنہوں نے ایک جڑواں بھائی کا گردہ دوسرے صحت مند جڑواں بھائی کو لگایا تھا۔

اسی تاریخی طبی انقلاب اور خدمات کی یاد میں اس دن کو عالمی سطح پر منتخب کیا گیا۔ ڈاکٹر جوزف ماریے کو اس شاندار طبی کامیابی اور تحقیق پر 1990ء میں فزیالوجی یا میڈیسن کا نوبل انعام بھی دیا گیا

یہ دن منانے کے مقاصد میں لوگوں کو یہ سمجھانا کہ ایک اکیلا انسان مرنے کے بعد اپنے دل، گردے، جگر، پھیپھڑوں اور آنکھوں کی فراہمی سے کئی افراد کو نئی زندگی دے سکتا ہے۔ اعضا کے عطیہ سے متعلق معاشرتی خوف اور غلط فہمیوں کا خاتمہ کرنا۔ عطیہ کرنے والے رضاکاروں اور ان کے خاندانوں کے عظیم اور پر خلوص جذبے کو خراج تحسین پیش کرنا شامل ہے

پاکستان میں غیر قانونی انسانی اعضا کی تجارت کو روکنے اور قانونی عطیات کو فروغ دینے کے لیے باقاعدہ نظام موجود ہے سال 2010ء میں حکومتِ پاکستان نے "ٹرانسپلانٹیشن آف ہیومن آرگنز اینڈ ٹشوز ایکٹ (HOTA) "منظور کیا۔ اس قانون کے تحت اعضا کی خرید و فروخت پر سخت پابندی ہے اور ایسا کرنا سنگین جرم ہے۔

قانون کے مطابق صرف قریبی رشتہ دار (خونی رشتے جیسے والدین، بہن بھائی، بچے، اور شریکِ حیات) ہی زندگی میں ایک دوسرے کو اعضا عطیہ کر سکتے ہیں۔

تاہم کوئی بھی شہری اپنی زندگی میں وصیت کر سکتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کے اعضا عطیہ کر دیے جائیں۔ برین ڈیڈ (دماغی موت) کی صورت میں لواحقین کی اجازت سے اعضا حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

کراچی کا ادارہ 'سندھ انسٹیٹیوٹ آف یورولوجی اینڈ ٹرانسپلانٹیشن (SIUT) 'اور اس کے سربراہ ڈاکٹر ادیب الرضوی اس قانون کو نافذ کروانے اور مفت و قانونی ٹرانسپلانٹ فراہم کرنے میں سب سے آگے رہے ہیں۔

اعضا کا عطیہ دو حالتوں میں ممکن ہوتا ہے: زندگی میں (Living Donation) اور موت کے بعد (Deceased Donation)۔

ایک صحت مند انسان اپنی زندگی میں درج ذیل اعضا کا کچھ حصہ عطیہ کر سکتا ہے، جس سے اس کی اپنی صحت پر مستقل اثر نہیں پڑتا:

1۔ ایک گردہ :(Kidney) انسان ایک گردے کے ساتھ بھی بالکل نارمل زندگی گزار سکتا ہے۔ 2۔ جگر کا ایک حصہ :(Liver Lobe) جگر انسانی جسم کا وہ واحد عضو ہے جو دوبارہ اپنی اصل شکل اور سائز میں بڑھ جاتا ہے

3۔۔ پھیپھڑے کا ایک حصہ :(Lung Lobe) یہ بہت کم اور مخصوص حالات میں ہوتا ہے

برین ڈیڈ یا وفات کے بعد عطیہ (Deceased Donation) اس وقت موثر ہوتا ہے جب کسی مریض کا دماغ مکمل اور مستقل طور پر کام کرنا چھوڑ دے (Brain Dead) لیکن وینٹی لیٹر کی وجہ سے دل دھڑک رہا ہو، تو ایک ہی انسان 8 افراد کی جان بچا سکتا ہے اور کئی دوسروں کی زندگی بہتر کر سکتا ہے ان اہم اعضا میں دل (Heart)، دونوں گردے (Kidneys)، جگر (Liver)، دونوں پھیپھڑے (Lungs)، اور لبلبہ (Pancreas)۔ ٹشوز اور دیگر حصے: آنکھوں کے قرنیے – (Corneas جو اندھے پن کا شکار افراد کو بینائی دیتے ہیں)، جلد – (Skin جل جانے والے مریضوں کے لیے)، اور ہڈیاں (Bones)

دنیا بھر میں ہر سال تقریباً 173,700 سے زائد اعضا کی پیوند کاری (Transplants) کی جاتی ہے، جن میں 47,000 سے زائد مردہ (Deceased) اور باقی زندہ ڈونرز کے اعضا شامل ہوتے ہیں۔ عالمی ڈونیشن اور ٹرانسپلانٹ کا تقریباً 65 فیصد حصہ گردوں پر مشتمل ہے۔ کل پیوند کاری کا تقریباً 24 فیصد حصہ جگر کا ہوتا ہے۔ تیسرے نمبر پر دل کی پیوند کاری آتی ہے

پاکستان میں ہر سال تقریباً 50,000 افراد آخری درجے کے عضو کی خرابی (End Stage Organ Failure) کی وجہ سے موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں۔ اس تعداد میں تقریباً 15,000 گردے کی خرابی، 10,000 جگر کی خرابی اور 6,500 دل کی ناکامی کے مریض شامل ہوتے ہیں۔

پاکستان میں مردہ یا برین ڈیتھ کے بعد اعضا عطیہ کرنے کا نظام انتہائی کمزور ہے اور شرح برائے نام (Negligible) ہے۔ ملک میں ہونے والے چند ایک گردے یا جگر کے ٹرانسپلانٹ زیادہ تر قریبی زندہ رشتہ داروں کے عطیات کے ذریعے ہی سر انجام پاتے ہیں۔

پاکستان میں زندگی میں ہی یہ عہد کرنا کہ

"وفات کے بعد میرے اعضا دوسروں کے کام آسکیں"،

ایک انتہائی آسان عمل ہے۔ کراچی میں واقع SIUT کے مرکز یا ان کی آفیشل ویب سائٹ پر جا کر "ڈونر کارڈ (Donor Card)" کے لیے فارم ڈاؤن لوڈ یا آن لائن پُر کر سکتے ہیں۔ فارم میں اپنی بنیادی معلومات اور یہ لکھنا ہوتا ہے کہ آپ وفات کے بعد کون سے اعضا (آنکھیں، گردے، جگر وغیرہ) عطیہ کرنا چاہتے ہیں

پاکستان کے قانون کے مطابق، کارڈ بنوانے کے باوجود وفات کے وقت آپ کے لواحقین (خاندان) کی حتمی اجازت لازمی ہوتی ہے۔ اس لیے کارڈ بنواتے وقت اپنے گھر والوں کو اپنے اس فیصلے سے آگاہ کرنا اور انہیں اعتماد میں لینا سب سے ضروری ہے۔

SIUT کے علاوہ لائنز کلب اور پاکستان آئی بینک سوسائٹی جیسی تنظیمیں خصوصی طور پر آنکھوں کے قرنیے (Cornea) کے عطیے کے لیے کارڈز جاری کرتی ہیں۔

اسلام میں انسانی جان کی حرمت اور احترام کو اولین ترجیح دی گئی ہے، اور اسی بنیاد پر دنیا بھر کے جید علمائے کرام نے اعضا کے عطیے کے حق میں فتاویٰ دیے ہیں۔ قرآن مجید کی سورہ المائدہ (آیت 32) میں ارشاد ہے: "اور جس نے کسی ایک انسان کی جان بچائی، گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی۔" علمائے کرام اس آیت کو اعضا کے عطیے کی بنیاد بناتے ہیں۔ تمام مکاتبِ فکر کے علماء متفق ہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی زندگی میں اپنے قریبی رشتہ دار کو ایک گردہ یا جگر کا حصہ اس شرط پر دے کہ اس سے عطیہ دینے والے کی اپنی جان کو خطرہ نہ ہو، اور اس میں کوئی مالی خرید و فروخت شامل نہ ہو، تو یہ بالکل جائز اور کارِ ثواب ہے۔

۔وفات کے بعد عطیہ (برین ڈیتھ) پر پاکستان کے علما میں اختلافات ہیں۔ مولانا سید ابولاعلی مودودی اس کے مخالف اور اسے حرام سمجھتے ہیں مگر مصر کی جامعہ الازہر، سعودی عرب کی فقہ اکیڈمی، اور پاکستان کے مفتیانِ کرام (بشمول مفتی تقی عثمانی صاحب اور دیگر مستند دارالافتاء) کے فتاویٰ کے مطابق، اگر کوئی شخص برین ڈیڈ (دماغی طور پر مردہ) ہو جائے تو انسانیت کی بھلائی کے لیے اس کے اعضا دوسروں کو منتقل کرنا جائز ہے، بشرطیکہ مرنے والے نے زندگی میں وصیت کی ہو یا اس کے وارثین اس کی اجازت دیں۔ اسلام میں انسانی جسم کا کوئی بھی حصہ بیچنا یا اس کی تجارت کرنا سخت حرام ہے۔ اعضا کا تبادلہ صرف اور صرف فی سبیل اللہ (محض انسانی ہمدردی اور جذبے کے تحت) ہونا چاہیے۔

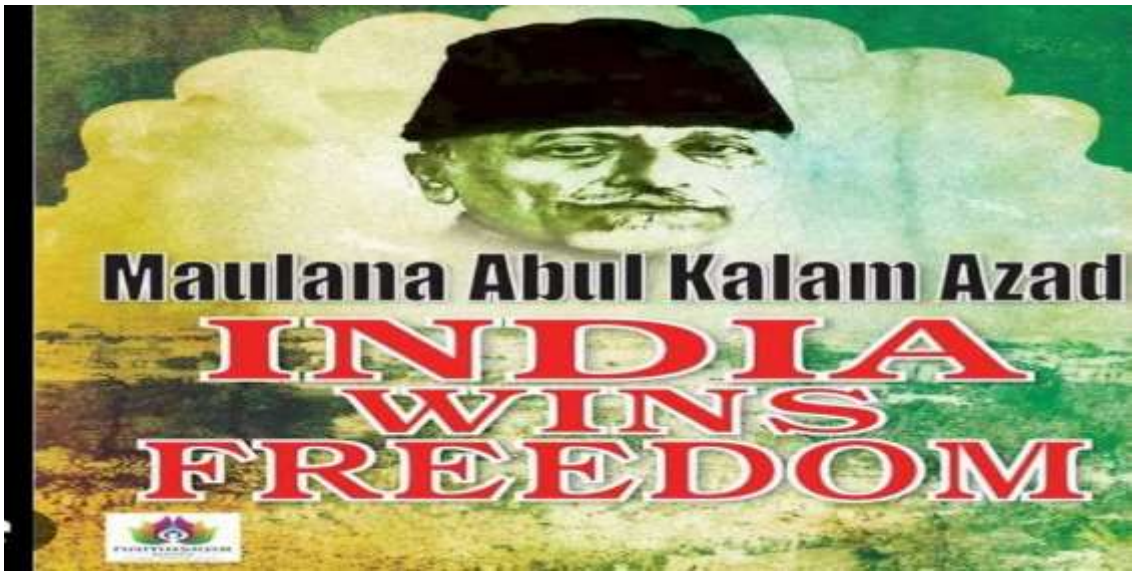

انڈیاوِنز فریڈم: آزادی کی داستان یا متحدہ ہندوستان کے خواب کا ماتم؟—

قائداعظم اور قیامِ پاکستان کے تناظر میں ایک تنقیدی مطالعہ۔

قارئین کرام مولانا ابوالکلام ازاد کی اس کتاب کا اردو ترجمہ بھی اس وقت ازادئ ہند کے نام سے کتابی صورت میں نیٹ پر موجود ہے۔ مکمل تفصیلات کے لئے وہ اپ ڈائون لوڈ کر کے پڑھ سکتے ہیں) تقسیم ہند کے پس منظر میں یہ کتاب مسلم لیگ اور قائداعظم کے نقطہ نظر سے ایک متنازعہ موقف پیش کرتی ہے۔ مگر اسے بھی پڑھنا ضروری ہے تاکہ نئی نسل جو بات بھی تسلیم کرے وہ دلیل کے ساتھ اور صحت معلومات کے ساتھ ہو۔ امید ہے کہ اپ کو یہ کوشش پسند ائے گی

(امان اللہ خان)

مولانا ابوالکلام آزاد کی India Wins Freedom محض آزادی کی داستان نہیں بلکہ برصغیر کی آخری سیاسی کشمکش، کانگریس کی اندرونی سیاست، مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان، کیبنٹ مشن اور تقسیمِ ہند کے فیصلوں کا ایک اہم عینی شاہدانہ بیان ہے۔
مولانا آزاد خود کانگریس کے ممتاز رہنما اور متحدہ ہندوستان کے پُرجوش حامی تھے، اس لیے ان کی تحریر کی سب سے بڑی قوت بھی یہی ہے اور سب سے بڑی حد بھی۔ وہ تقسیم کو ایک تاریخی المیہ سمجھتے ہیں اور بار بار اس امکان کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر کانگریس کی قیادت زیادہ لچک کا مظاہرہ کرتی تو متحدہ ہندوستان کا کوئی آئینی بندوبست ممکن تھا

۔ تاہم، ایک تنقیدی قاری کے لیے یہ بات نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ آزاد کا بنیادی مقدمہ پہلے ہی متحدہ ہندوستان کے نظریے سے وابستہ تھا؛ چنانچہ ان کی تعبیر کو آخری اور غیر جانب دار فیصلہ سمجھنے کے بجائے ایک بڑے سیاسی رہنما کی عینی شہادت اور مخصوص نظریاتی زاویۂ نظر کے طور پر پڑھنا زیادہ مناسب ہے۔ خود کتاب کا ڈھانچہ —کیبنٹ مشن، تقسیم سے قبل کے حالات، عبوری حکومت، ماؤنٹ بیٹن مشن اور تقسیم— اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ مصنف نے فیصلہ کن سیاسی مرحلے کو اندر سے بیان کیا ہے

مولانا آزاد کا بنیادی اختلاف قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ کے مطالبۂ پاکستان سے تھا۔ ان کا یقین تھا کہ ہندوستان کے مسلمان اور ہندو ایک مشترکہ تاریخی و تہذیبی معاشرے کا حصہ بن چکے ہیں اور مذہب کو سیاسی قومیت کی بنیاد بنانا مسئلے کا مستقل حل نہیں۔ لیکن یہاں قائداعظم کے مؤقف کو محض مذہبی تقسیم یا اقتدار کی خواہش قرار دینا تاریخی صورتِ حال کو حد سے زیادہ سادہ بنا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کا مطالبہ ایک ایسے سیاسی ماحول میں ابھرا جس میں سوال صرف مذہب کا نہیں بلکہ سیاسی نمائندگی، آئینی تحفظ، صوبائی خود مختاری، اکثریتی غلبے کے خدشے اور مسلمانوں کی اجتماعی سیاسی شناخت کا تھا۔ 1937ء کے انتخابات اور اس کے بعد کانگریسی طرزِ حکمرانی نے مسلم لیگ کے اس مؤقف کو مزید تقویت دی کہ محض آئینی یقین دہانیاں مستقبل میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی کافی ضمانت نہیں بن سکتیں۔ لہٰذا قائداعظم کے مطالبۂ پاکستان کو صرف "اقتدار حاصل کرنے کی سیاسی چال" قرار دینا اس پیچیدہ آئینی اور سیاسی پس منظر کو نظر انداز کرنے کے مترادف ہے

۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ مولانا آزاد کی اپنی تنقید بالواسطہ طور پر اس حقیقت کو مضبوط کرتی ہے کہ مسئلہ صرف جناح یا مسلم لیگ کی ضد نہیں تھا۔ وہ کانگریس کی قیادت، بالخصوص جواہر لعل نہرو اور سردار پٹیل کے بعض فیصلوں سے اختلاف کرتے ہیں اور آخری مرحلے میں اختیار کی گئی حکمتِ عملی کو تقسیم کی راہ ہموار کرنے والا عامل سمجھتے ہیں۔ خاص طور پر 1946ء کے کیبنٹ مشن پلان کا معاملہ انتہائی اہم ہے۔ یہ منصوبہ ایک کمزور مرکز اور صوبائی گروپوں پر مشتمل ایسے وفاق کی بنیاد فراہم کرتا تھا جس میں برصغیر کو متحد رکھنے کی گنجائش موجود تھی۔ مسلم لیگ نے اسے قبول کیا، مگر بعد کے سیاسی بیانات اور باہمی عدم اعتماد نے اس سمجھوتے کو کمزور کر دیا۔

خود آزاد کی کتاب میں کیبنٹ مشن، تقسیم سے پہلے کے مذاکرات اور کانگریس کی اعلیٰ قیادت کے فیصلے مرکزی موضوعات ہیں۔ اس تناظر میں اگر آزاد کانگریس کی قیادت کو تقسیم کی ذمہ داری سے مکمل طور پر بری نہیں کرتے تو یہ نکتہ پاکستانی مؤقف کے لیے اہم تقویت فراہم کرتا ہے کہ قیامِ پاکستان کو صرف مسلم لیگ کی خواہش کا نتیجہ سمجھنا تاریخی طور پر نامکمل تصویر ہے

۔ قائداعظم کے مؤقف کا اصل دفاع یہاں سامنے آتا ہے: پاکستان کا مطالبہ اچانک 1947ء میں پیدا نہیں ہوا بلکہ یہ کئی برسوں پر محیط آئینی جدوجہد اور مسلم سیاسی تحفظات کے ارتقا کا نتیجہ تھا۔ قائداعظم ابتدا میں ہندو مسلم آئینی مفاہمت کے داعی رہے، لیکن جب انہیں یہ محسوس ہوا کہ کانگریس کی قومی سیاست میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت اور مؤثر آئینی تحفظ کی ضمانت نہیں بن رہی تو ان کی سیاسی حکمتِ عملی تبدیل ہوئی۔

اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہے کہ قائداعظم نے تقسیم کو پہلی ترجیح کے طور پر نہیں بلکہ ایک ایسے سیاسی حل کے طور پر اختیار کیا جس میں مسلمانوں کو اپنی اجتماعی سیاسی تقدیر کے تعین کا حق حاصل ہو۔ اگر آزاد کے مطابق بھی کانگریس کی بعض پالیسیوں، نہرو اور پٹیل کے فیصلوں اور باہمی عدم اعتماد نے متحدہ ہندوستان کے امکانات کو کمزور کیا تو پھر یہ سوال بجا طور پر پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان کا قیام صرف جناح کی سیاسی خواہش تھا، یا وہ ایک ایسے بحران کا نتیجہ تھا جس میں کانگریس اور مسلم لیگ دونوں کے فیصلے شامل تھے؟

یہاں مولانا آزاد کی کتاب کا سب سے اہم اور شاید غیر ارادی سبق سامنے آتا ہے: قیامِ پاکستان کی مخالفت کرنے والے ایک ممتاز مسلم رہنما کی شہادت بھی یہ ثابت کرتی ہے کہ تقسیم کے آخری مرحلے میں کانگریس کے اندر شدید اختلافات موجود تھے اور متحدہ ہندوستان کا خواب خود اپنی سیاسی عملی بنیاد کھو رہا تھا۔ آزاد کی تحریر کو قائداعظم کے خلاف فردِ جرم بنانے کے بجائے اسے تقسیم کے اسباب سمجھنے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے

۔ مزید یہ کہ کتاب کی یادداشت نگاری 1956ء سے 1958ء کے عرصے میں ہوئی اور اس میں مصنف نے اپنے زمانے کے سیاسی تجربات اور بعد کے نتائج کی روشنی میں ماضی کی تعبیر کی؛ اس لیے اس کے بعض فیصلوں کو دیگر تاریخی دستاویزات، مذاکرات اور سیاسی واقعات کے ساتھ ملا کر دیکھنا ضروری ہے۔

مکمل متن کے بعض حصے بھی تین دہائیوں تک شائع نہیں ہوئے اور 1988ء میں سامنے آئے، جس سے اس کتاب کی تدوینی اور تاریخی حیثیت مزید پیچیدہ ہو جاتی ہے۔ بالآخر India Wins Freedom کو پاکستان یا قائداعظم کے خلاف حتمی تاریخی فیصلہ سمجھنا درست نہیں؛

یہ دراصل اس دور کے ایک بڑے مسلم کانگریسی رہنما کی وہ گواہی ہے جس میں تقسیم کا دکھ، کانگریس کی سیاسی غلطیوں پر مایوسی اور متحدہ ہندوستان کے خواب کے ٹوٹنے کا کرب نمایاں ہے

۔پاکستان کے نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے یہ سوال زیادہ شدت سے سامنے آتا ہے کہ اگر متحدہ ہندوستان واقعی ایک قابلِ عمل اور منصفانہ سیاسی بندوبست تھا تو پھر کانگریس، مسلم لیگ اور برطانوی حکومت اس کے لیے قابلِ قبول آئینی فارمولا کیوں نہ تلاش کر سکیں؟ قائداعظم کا تاریخی مقدمہ اسی بنیادی سوال کے گرد گھومتا تھا: محض مشترکہ جغرافیہ کافی ہے یا ہر بڑی قوم اور سیاسی اکائی کو اپنی شناخت، نمائندگی اور مستقبل کے تعین کا مؤثر حق بھی حاصل ہونا چاہیے؟

1947ء کا فیصلہ اسی طویل سیاسی کشمکش کا نتیجہ تھا۔اس لیے India Wins Freedom کو اگر تعصب کے بجائے تنقیدی نظر سے پڑھا جائے تو یہ کتاب پاکستان کے قیام کی مخالفت سے زیادہ، اس تاریخی بحران کی پیچیدگی کو سمجھنے کا ذریعہ بن جاتی ہے جس نے بالآخر برصغیر کو دو آزاد ریاستوں میں تقسیم کر دیا۔



12 اگست-نوجوانوں کا عالمی دن (International Youth Day)

اور پاکستان میں نوجوانوں کے لئے کئے گئے اقدامات

نوجوانوں کا عالمی دن (International Youth Day) ہر سال 12 اگست کو منایا جاتا ہے۔ اس دن کو منانے کا آغاز باضابطہ طور پر اقوام متحدہ (United Nations) نے سنہ 1999 میں منظور کی گئی جنرل اسمبلی کی قرارداد (54/120) کے تحت کیا تھا، جس کی پہلی بار باقاعدہ تعمیل 12 اگست 2000 کو کی گئی

اس دن کو منانے کا خیال سب سے پہلے 1991 میں ویانا (آسٹریا) میں ہونے والے اقوام متحدہ کے 'ورلڈ یوتھ فورم' کے نوجوان مندوبین نے پیش کیا تھا۔ بعد ازاں 1998 میں پرتگال کے شہر لزبن میں نوجوانوں کے امور کے وزراء کی عالمی کانفرنس ہوئی، جس نے 12 اگست کو یوتھ ڈے قرار دینے کی سفارش کی اور اس سفارش کو مد نظر رکھتے ہوئے 17 دسمبر 1999 کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اسے منظور کیا

اس دن کو منانے کے پس پردہ مقاصد میں

معاشرے اور عالمی سطح پر نوجوانوں کو درپیش مسائل (جیسے بے روزگاری، تعلیم کی کمی، اور صحت کے مسائل) اجاگر کرنا۔ دنیا کی ترقی اور فیصلوں میں نوجوانوں کی شرکت اور اہمیت کو تسلیم کرنا اور نوجوانوں کی تخلیقی صلاحیتوں، قیادت اور کاوشوں کو سراہنا ہے

اس دن کے منانے اور اس کو اہمیت دینے کی وجہ سے دنیا بھر کے پلیٹ فارمز سے نوجوانوں کو ڈیجیٹل اور ڈیولپمنٹ کے عمل میں شامل کرنے کے لیے مہمات چلائی جاتی ہیں۔ جن میں اجاگر کیے جانے والے اہم مسائل میں باعزت روزگار، معاشی مواقع کی کمی۔ معیاری تعلیم کا فقدان اور سکولوں سے باہر بچوں / لڑکیوں کی بڑی تعداد، نوجوانوں میں ڈپریشن، اضطراب اور دباؤ کے مسائل (جن پر کم توجہ دی جاتی ہے)۔ خواتین کو پسماندہ رکھنا اور ڈیجیٹل وسائل تک یکساں رسائی کا نہ ہونا شامل ہیں۔

پاکستان کی کل آبادی کا تقریباً 67 فیصد حصہ 30 سال سے کم عمر نوجوانوں پر مشتمل ہے اور وہ بہت سے مسائل کا شکار ہی۔

گیلپ پاکستان اور حالیہ سروے کے مطابق 15 سے 24 سال کے نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 12.5 فیصد سے زائد ہو چکی ہے جبکہ

نوجوان خواتین میں یہ شرح 13 فیصد سے تجاوز کر چکی ہے۔

اس وقت ملک میں اندازاً 3 کروڑ 20 لاکھ نوجوان ایسے ہیں جو نہ تو کسی تعلیمی ادارے کا حصہ ہیں اور نہ ہی کسی قسم کا روزگار یا ہنر سیکھ رہے ہیں۔ تقریباً 40 فیصد گریجویٹس کا ماننا ہے کہ ان کی ڈگری موجودہ دور کی مارکیٹ کی ضروریات (جیسے آئی ٹی اور ڈیجیٹل اسکلز) سے مطابقت نہیں رکھتی۔

حکومتِ پاکستان نے نوجوانوں کی معاشی اور تکنیکی مدد کے لیے اربوں روپے کے منصوبے شروع کر رکھے ہیں، جن کا انتظام Prime Minister's Youth Programme دیکھ رہا ہے

ان میں اہم منصوبہ "پرعزم پاکستان" پروگرام (2026ء کا حالیہ منصوبہ) ہے جو وفاقی حکومت کا ایک نیا جامع اقدام ہے جو نوجوانوں کو تعلیم سے روزگار تک کے مواقع فراہم کرنے کے لیے شروع کیا گیا ہے اس کے تحت فنی تعلیم کے لیے 19 ارب روپے کی خطیر رقم مختص کی گئی ہے۔ اس کا بنیادی مقصد غریب طبقات اور خاص طور پر لڑکیوں کو آرٹس، سائنس، ٹیکنالوجی اور کھیلوں میں آگے لانا ہے

اس کے علاوہ ڈیجیٹل یوتھ ہب (Digital Youth Hub) کے تحت یونیسف (UNICEF) کے اشتراک سے پاکستان کا سب سے بڑا ڈیجیٹل پورٹل بنایا گیا ہے ۔ یہ پلیٹ فارم نوجوانوں کو نوکریوں، وظائف، انٹرن شپ اور کاروبار کے مواقع سے براہِ راست جوڑتا ہے۔

وزیرِ اعظم بزنس اینڈ ایگریکلچر لون سکیم کے تحت نوجوانوں کو اپنا کاروبار شروع کرنے یا زراعت میں جدت لانے کے لیے بینکوں کے ذریعے آسان شرائط پر قرضے (Loans) فراہم کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ خود روزگار پیدا کر سکیں اور

وزیرِ اعظم یوتھ اسکل ڈیولپمنٹ پروگرام NAVTTC کے تحت نوجوانوں کو ہائی ٹیک (High-tech) شعبوں جیسے آرٹیفیشل انٹیلیجنس (AI)، سائبر سیکیورٹی، ڈیٹا اینالیٹکس اور گرافک ڈیزائننگ کے مفت کورسز کروائے جا رہے ہیں۔

ہونہار طلبہ کو جدید دنیا کی معلومات اور فری لانسنگ کے ذرائع تک رسائی دینے کے لیے میرٹ پر مفت لیپ ٹاپس تقسیم کیے جا رہے ہیں

وزیر اعلیٰ پنجاب محترمہ مریم نواز شریف صاحبہ نے بھی پنجاب میں کسٹمر سپورٹ، کال سینٹر اور ڈیجیٹل مارکیٹنگ کی مانگ پوری کرنے کے لیے 25 ہزار نوجوانوں کو مفت تربیت دینے کا منصوبہ منظور کیا ہے تاکہ وہ آئی ٹی سیکٹر میں روزگار حاصل کر سکیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ سکولز آئوٹ سورس کر کے نوجوانوں کو دیے جا رہے ہیں تاکہ وہ معیاری تعلیم کی فراہمی کے ساتھ ساتھ خود روزگار سکیم کا حصہ بنیں۔ اسی طرح نوجوان ڈاکٹروں کو بنیادی مراکز صحت بھی آئوٹ سورس کر دیئے گئے ہیں۔ PEF کے تحت معیاری سکولوں میں طلبا کو بہترین کوالٹی ایجوکیشن دینے کے پروگرام پر پرائیویٹ شعبے کے ذریعے عمل ہو رہا ہے۔



11 اگست – پاکستان میں اقلیتوں کا قومی دن

تاریخ، آئینی تحفظات اور حالیہ پیش رفت

پاکستان میں ہر سال 11 اگست کو "اقلیتوں کا قومی دن" نہایت عقیدت کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اسے باضابطہ طور پر منانے کا فیصلہ 2009ء میں اُس وقت کے وزیرِ اعظم سید یوسف رضا گیلانی کی حکومت نے کیا۔ اس اقدام کا سہرا بڑی حد تک اقلیتی امور کے پہلے وفاقی وزیر شہباز بھٹی کی انتھک کاوشوں کو جاتا ہے، جنہوں نے اس دن کے قیام کے لیے مؤثر آواز اٹھائی اور بعد ازاں 2011ء میں اپنی اسی جدوجہد کی پاداش میں جان کا نذرانہ بھی پیش کیا

اس دن کے منانے کا بنیادی مقصد پاکستان کی تعمیر و ترقی میں غیر مسلم پاکستانی شہریوں کی خدمات، وفاداری اور قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنا، نیز معاشرے میں رواداری، بھائی چارے اور مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔

اس تاریخ کا انتخاب محض علامتی نہیں بلکہ گہری تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ 11 اگست 1947ء کو بانیٔ پاکستان قائدِ اعظم محمد علی جناح نے کراچی میں پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی سے اپنے تاریخی خطاب میں قوم کو ایک واضح اور جامع وژن دیا۔ انہوں نے فرمایا کہ ریاست میں بسنے والا ہر شہری، اپنے مذہب، ذات یا عقیدے سے قطع نظر، برابر کے حقوق کا حامل ہو گا اور اسے اپنی عبادت گاہوں — مساجد، مندروں یا گرجا گھروں — میں جانے کی مکمل آزادی حاصل ہو گی۔ یہی خطاب ایک روادار اور جمہوری ریاست کے قیام کا بنیادی منشور قرار پایا، اور اسی مناسبت سے 11 اگست کا دن اقلیتوں سے منسوب کیا گیا۔

قائدِ اعظم کے اسی وژن کی روشنی میں دستورِ پاکستان 1973ء میں اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے واضح ضمانتیں دی گئی ہیں۔

آرٹیکل 20 ہر شہری کو اپنے مذہب پر عمل کرنے، اس کی تبلیغ کرنے اور مذہبی ادارے قائم کرنے کی آزادی دیتا ہے، آرٹیکل 22 تعلیمی اداروں میں کسی بھی شہری کو اس کی رضامندی کے بغیر مذہبی تعلیم دینے سے روکتا ہے، آرٹیکل 25 تمام شہریوں کی قانون کی نظر میں مساوات کو یقینی بناتا ہے، جبکہ آرٹیکل 36 ریاست کو پابند کرتا ہے کہ وہ وفاقی و صوبائی ملازمتوں میں اقلیتوں کی مناسب نمائندگی سمیت ان کے جائز حقوق و مفادات کا تحفظ کرے۔ انہی آئینی ضمانتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کئی انتظامی اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں اقلیتوں کے لیے 5 فیصد کوٹہ مختص ہے، جبکہ سیاسی نمائندگی کو یقینی بنانے کے لیے قومی اسمبلی میں 10، سینیٹ میں 4، اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں مجموعی طور پر 24 نشستیں — سندھ میں 9، پنجاب میں 8، خیبر پختونخوا میں 4 اور بلوچستان میں 3 — اقلیتوں کے لیے مخصوص ہیں۔ یہی اصول بلدیاتی اداروں میں بھی اپنایا گیا ہے جہاں تمام سطحوں پر 5 فیصد نشستیں اقلیتوں کے لیے مختص ہیں۔

وفاقی سطح پر وزارتِ مذہبی امور و بین المذاہب ہم آہنگی، جبکہ صوبائی سطح پر اقلیتی امور کی الگ وزارتیں اور محکمے قائم کر کے اقلیتی برادری کے مسائل کے حل کو ادارہ جاتی شکل دی گئی ہے۔

اقلیتوں کے حقوق کی نگرانی کے حوالے سے حال ہی میں ایک اہم پیش رفت سامنے آئی ہے۔

سپریم کورٹ آف پاکستان نے 2014ء میں پشاور چرچ دھماکے سے متعلق مقدمے کے فیصلے میں حکومت کو ایک باضابطہ قومی کمیشن برائے اقلیتیں کے قیام کی ہدایت دی تھی، جس پر عمل کرتے ہوئے 2020ء میں محض کابینہ کی منظوری سے ایک عبوری کمیشن تشکیل دیا گیا تھا، تاہم اسے قانونی حیثیت حاصل نہ تھی

۔ایک دہائی کی مسلسل کوششوں کے بعد بالآخر دسمبر 2025ء میں پارلیمنٹ کے مشترکہ اجلاس نے "نیشنل کمیشن فار مائنارٹیز رائٹس بل 2025" منظور کیا، اور صدرِ پاکستان کی توثیق کے بعد یہ باضابطہ قانون کی شکل اختیار کر گیا۔

اس ایکٹ کے تحت قائم ہونے والا کمیشن اقلیتوں کے آئینی و قانونی حقوق کی خلاف ورزیوں کی آزادانہ چھان بین اور ان کے تدارک کے لیے پالیسی سفارشات مرتب کرنے کا مجاز ہے۔

خاندانی وازدواجی قوانین کے میدان میں بھی نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ہندو برادری کے لیے وفاقی سطح پر "ہندو میرج ایکٹ 2017" اور اس سے قبل سندھ میں "سندھ ہندو میرج رجسٹریشن ایکٹ 2016" کے ذریعے شادی کے اندراج، طلاق اور جائیداد جیسے معاملات کو قانونی تحفظ فراہم کیا گیا۔ اسی طرح سکھ برادری کی مذہبی رسم "آنند کارج" کے تحت ہونے والی شادیوں کو قانونی حیثیت دینے کے لیے پنجاب اسمبلی نے 2018ء میں "پنجاب سکھ آنند کارج میرج ایکٹ" منظور کیا، جسے 2024ء میں مکمل نفاذ کے قواعد وضوابط کے ساتھ عملی طور پر فعال کیا گیا

۔ اقلیتوں کی تاریخی عبادت گاہوں کی دیکھ بھال کی ذمہ داری بنیادی طور پر "متروکہ وقف املاک بورڈ" (ای ٹی پی بی) کے سپرد ہے، جو "اقلیتی بہبود فنڈ" کے تحت مندروں اور گردواروں کی مرمت وبحالی، اقلیتی طلبہ کے وظائف اور نادار افراد کی مالی معاونت کا انتظام کرتا ہے۔

اس ضمن میں نومبر 2019ء میں کھلنے والا کرتارپور راہداری منصوبہ ایک نمایاں سنگِ میل ہے، جس نے دنیا بھر سے سکھ یاتریوں کو بغیر ویزہ گوردوارہ دربار صاحب کرتارپور تک رسائی فراہم کی۔ آج اقلیتی برادری سے تعلق رکھنے والے متعدد پاکستانی شہری عدلیہ، مسلح افواج، پارلیمان اور انتظامیہ میں اہم ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں۔ جسٹس رانا بھگوان داس پہلے ہندو رکن تھے جنہوں نے 2005ء، 2006ء اور 2007ء میں قائم مقام چیف جسٹس آف پاکستان کے طور پر خدمات انجام دیں، جبکہ سردار رمیش سنگھ اروڑہ مارچ 2024ء میں وزیرِ اعلیٰ پنجاب مریم نواز کی کابینہ میں انسانی حقوق واقلیتی امور کے وزیر کا حلف اٹھا کر پاکستان کی تاریخ کے پہلے سکھ صوبائی وزیر بنے۔ ایسی مثالیں اس امر کی غماز ہیں کہ پاکستان کی تعمیر وترقی میں اقلیتوں کا کردار ہر دور میں نمایاں اور قابلِ فخر رہا ہے۔



10 اگست- سستی کا قومی دن (National Lazy Day) ۔۔ضرور منائیں مگر اپنے رسک پر

نیشنل لیزی ڈے ہر سال 10 اگست کو منایا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نہ کوئی سرکاری تعطیل ہے اور نہ کسی حکومت یا بین الاقوامی ادارے کا تسلیم شدہ دن ــــ یہ خالصتاً ایک غیر رسمی مگر عوامی سطح پر مقبول دن ہے۔ اس کا بنیادی مقصد تیز رفتار اور مصروف زندگی سے کچھ دیر کے لیے وقفہ لینا اور ذہن و جسم کو دوبارہ توانا کرنا ہے۔ مسلسل محنت اور تھکن کے بعد یہ دن انسان کو یاد دلاتا ہے کہ کبھی کبھار کچھ نہ کرنا بھی ضروری ہوتا ہے

اس دن کا اغاز کب ہوا اور کس نے کیا ہے۔ اس میں مختلف ارا پائی جاتی ہیں۔ کچھ کم معتبر ویب سائٹس پر یہ دعویٰ ملتا ہے کہ اسے 1976 میں امریکی ریاست اوہائیو کے شہر ایکرون کے رہائشی بل وِلز نامی شخص نے شروع کیا تھا،

اور لوگون کی ایک اچھی خاصی تعداد اس دن کو کولمبیا کے (WORLD DAY OF LAZINESS) سے منسوب کرتی ہے جہاں سستی کو باقاعدہ عزت اور پہچان ملی کولمبیا کے صنعتی شہر اٹاگوئی میں 1980 کی دہائی کے وسط میں ایک تہوار کا آغاز ہوا جسے "ورلڈ ڈے آف لیزنس "یعنی "کاہلی کا عالمی دن" کہا جاتا ہے۔ یہ شہر کے سالانہ آٹھ روزہ ثقافتی میلے، "صنعت، تجارت اور ثقافت کا تہوار" کے اختتامی دن کے طور پر منایا جاتا ہے

۔اس کے پیچھے ایک دلچسپ کہانی ہے: مقامی ثقافتی کارکن کارلوس ماریو مونتویا نے اپنے دوستوں کے ساتھ سوچا کہ جب یکم مئی کو "یومِ مزدور" اتنی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے، تو انصاف کا تقاضا ہے کہ فرصت اور آرام کو بھی ایک دن ملنا چاہیے — بھلا محنت کو عزت اور سکون کو بے توجہی، یہ کہاں کا انصاف؟ چنانچہ انہوں نے شہر کے "مزدور پارک" میں ہی، مزدوروں کے میدان میں، سستی کا جھنڈا گاڑ دیا۔ آج یہ تہوار اتنا وسیع ہو چکا ہے کہ لوگ تکیے، گدے، خیمے اور رضائیاں لے کر سڑکوں پر نکل آتے ہیں اور کھلے عام قیلولہ فرماتے ہیں۔ میلے کی جان اس کی مشہور "پلنگ پریڈ" ہے، جس میں لوگ سجے سجائے بستروں پر لیٹے لیٹے جلوس نکالتے ہیں، اور ساتھ ہی بیئر فیسٹیول، پرانی گاڑیوں کی نمائش اور موسیقی کے پروگرام بھی ہوتے ہیں۔

سب سے مزے کی بات اس تہوار کا نعرہ ہے: "سستی کے حق کے لیے، سب لوگ کام پر آجائیں — "!

یعنی سستی منانے کے لیے بھی خاصی محنت درکار ہوتی ہے، بالکل ویسے جیسے ہمارے ہاں "سادگی سے شادی" کے انتظامات میں بھی مہینوں کی بھاگ دوڑ ہوتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ کہ اٹاگوئی کے اسی تہوار سے متاثر ہو کر دیگر ممالک میں بھی لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں یہ دن منانا شروع کیا

۔ آج کل امریکہ سمیت کئی مغربی ممالک میں یہ دن بنیادی طور پر سوشل میڈیا اور انفرادی سطح پر منایا جاتا ہے۔ سنہ 2013 میں ہیش ٹیگ #NationalLazyDay سوشل میڈیا پر خوب ٹرینڈ ہوا، اور اب کئی برانڈز بھی اس دن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سٹریمنگ سروسز، آرام دہ کپڑوں اور کھانا گھر پہنچانے والی ایپس پر خصوصی رعایتیں پیش کرتے ہیں—

قارئین کو یہ جان کر حیرانی ہو گی کہ لفظ Lazy پہلی بار سولہویں صدی کے وسط میں استعمال ہوا، اور اس کی جڑیں پرانی جرمن زبان سے ملتی ہیں جہاں ملتا جلتا لفظ "کمزور" یا "بے دم (Tail less) " کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ ویسے جانوروں کی دنیا میں کاہلی کا تاج "سلوتھ" نامی جانور کے سر ہے، جو اتنی آہستہ حرکت کرتا ہے کہ اس کے جسم کے بالوں میں کائی تک جم جاتی ہے۔ مگر پاکستان میں یہ شرف ہم کچھوے کو پہلے ہی دے چکے ہیں

تاہم ماہرینِ صحت کا اتفاق ہے کہ مسلسل کام اور تناؤ کے بعد وقفہ لینا ذہنی اور جسمانی صحت کے لیے نہایت اہم ہے۔ لگاتار مصروفیت تھکن اور ذہنی دباؤ کو جنم دے سکتی ہے، جبکہ وقتاً فوقتاً خود کو مکمل آرام دینا توانائی بحال کرنے کے ساتھ ساتھ کام کی صلاحیت اور موڈ کو بھی بہتر بناتا ہے

یہ دن منانے کے کچھ اصول بھی وضع ہو چکے ہیں جو کہ ظاہر ہے اپنے اپنے رسک پر ہیں

کہ

اس دن یعنی 10 اگست کو:

صبح الارم بند کر کے جتنی دیر جی چاہے سوئیں

سارا دن پاجامے یا آرام دہ لباس میں گزاریں،

گھر کی صفائی اور باقی کام کاج اگلے دن پر چھوڑ دیں—ویسے بھی وہ "اگلا دن" کبھی نہیں آتا، تو فکر کاہے کی

۔ کھانا پکانے کی بجائے فوڈ پانڈا یا قریبی ہوٹل سے کچھ منگوالیں

۔چارپائی یا صوفے پر دراز ہو کر پسندیدہ ڈرامہ، فلم یا کرکٹ میچ دیکھتے ہوئے دن گزار دیں۔

مہمانوں کو بلکل توجہ نہ دین نہ اٹینڈ کریں

انہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ وہ اپ کی سستی کے راستے کی رکاوت بنین۔

موبائل سائلنٹ کر کے فیملی واٹس ایپ گروپ کچھ دیر کے لیے نظر انداز کر دیں یقین کریں، دنیا نہیں رکے گی

۔ٹھنڈا مشروب یا چائے کا کپ ہاتھ میں لیے پنکھے یا اے سی تلے آرام سے بیٹھ جائیں۔

نوٹ: اگر اسی دن اچانک لوڈشیڈنگ ہو جائے تو سمجھ لیجیے قدرت خود آپ کو مزید سکون کا موقع دے رہی ہے—نہ موبائل کی مصروفیت، نہ ٹی وی کا شور، صرف خالص سکوت اور آپ کی چارپائی یا صوفہ

۔10 اگست کو پورے ضمیر کے ساتھ سستی کرنے کی مکمل اجازت ہے، اور اس کے لیے کسی این او سی یا سرکاری منظوری کی حاجت نہیں۔ تاہم

ایک ضروری بات۔ سرکاری اداروں میں تو ہر روز قومی کاہلی کا دن منایا جاتا ہے۔ وہاں ملازمین کے لئے کوئی مسلہ نہیں۔ مگر

پرائیویٹ ادارے کے ملازمین اس روز یا تو چھٹی لے لین یا دفتر میں ہی سستی کھیلنے کی کوشش کریں

۔ مگر اپنی اپنی سروس کے رسک پر۔۔۔۔؟

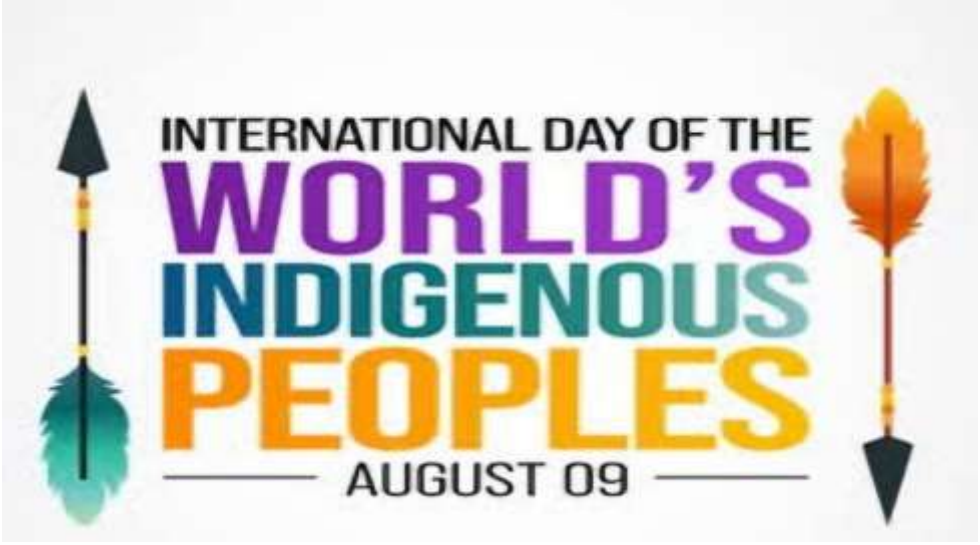



9- اگست قدیم مقامی باشندگان کا عالمی دن پاکستان کے تناظر میں

۔عالمی سطح پر مڈوائف (دایوں) کی انسانیت کے لئے خدمات کا اعتراف۔

ہر سال 9 اگست کو منایا جانے والا International Day of the World's Indigenous Peoples دنیا بھر کی ان قدیم مقامی اقوام کے حقوق، ثقافت اور بقا کے لیے وقف ہے جو اپنی منفرد شناخت رکھتی ہیں۔

اس دن کو منانے کا فیصلہ اقوام متحدہ (UN) کی جنرل اسمبلی نے دسمبر 1994 میں کیا
. یہ دن 1982 میں جنیوا میں ہونے والے اقوام متحدہ کے ورکنگ گروپ برائے مقامی آبادی کے پہلے اجلاس کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

اس دن کے ذریعے دنیا بھر کے تقریباً 90 ممالک میں آباد 47.6 کروڑ سے زائد دیسی باشندوں کے مسائل اجاگر کیے جاتے ہیں۔ ان اہم دیسی (Indigenous) اقوام میں امریکہ میں ریڈ انڈین (امریکی آدی واسی)، فرسٹ نیشنز، اور انوئٹ (Inuit) نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے ماوری (Māori) اور آسٹریلوی اب اوریجنل (Aboriginal Australians) لاطینی امریکا اور ایمیزون کے یانومامی (Yanomami)، مایا (Maya)، اور آئیمارا (Aymara) اور یورپ اور روس کے شمال کے سامی (Sámi) جو ناروے، سویڈن اور فن لینڈ میں رہتے ہیں۔ افریقہ کے ماسائی (Maasai) اور سان بشمین San Bushmen) وغیرہ شامل ہیں۔

ایشیا دنیا کی کل دیسی آبادی کا دو تہائی حصہ رکھتا ہے، جس میں بھارت کے مختلف قبائل (آدی واسی)، فلپائن کے بونٹوک، اور جاپان کے آئنو (Ainu) لوگ شامل ہیں۔

پاکستان میں متعدد قدیم اور روایتی قبائل آباد ہیں جن کی اپنی منفرد زبان، ثقافت اور رہن سہن ہے۔ ان میں سب سے نمایاں برادریاں درج ذیل ہیں

:کلاش برادری (چترال): یہ پاکستان کی سب سے چھوٹی اور مشہور ترین قدیم ترین نسلی و مذہبی برادری ہے جو خیبر پختونخوا کے ضلع لوئر چترال کی وادیوں (بمبورت، رمبور اور بریر) میں آباد ہے۔ ان کا اپنا مخصوص عقیدہ، لباس اور تہوار ہیں۔ جولائی 2026 میں خیبر پختونخوا اسمبلی نے ایک تاریخی اقدام کرتے ہوئے "کے پی کلاش میرج ایکٹ 2026" پاس کیا ہے۔ یہ پاکستان کی تاریخ میں کسی بھی مقامی قبیلے کے خاندانی قوانین (شادی، طلاق اور وراثت) کو باقاعدہ قانونی تحفظ دینے کا پہلا واقعہ ہے۔

صوبہ سندھ (کے صحرائے تھر میں کوہلی اور بھیل جیسی قدیم برادریاں آباد ہیں۔ ان کا صدیوں پر انا طرزِ زندگی اور صحرائی ماحول سے مطابقت رکھنے والا روایتی علم منفرد ہے۔ اس کے علاوہ دریائے سندھ کے درمیانی حصوں میں آباد قدیم مچھیرے (جیسے موہانا یا کیہل قبیلہ) جو پانی اور کشتیوں پر زندگی گزارنے کی صدیوں پرانی تاریخ رکھتے ہیں

پاکستان کا آئین تمام شہریوں کو برابر کے حقوق اور اپنی زبان و ثقافت کے تحفظ کی اجازت دیتا ہے، اس لئے سرکاری طور پر) "Indigenous" مقامی قدیم باشندے) کی اصطلاح یا زمرہ الگ سے استعمال نہیں کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حوالے سے پاکستان میں سرکاری سطح پر اس دن کے منانے بارے کوئی دستاویز دستیاب نہیں۔

۔چترال اور تھر کے علاقوں میں شدید موسم اور گلیشیئر پگھلنے یا قحط سالی کی وجہ سے ان برادریوں کا روایتی روزگار شدید متاثر ہو رہا ہے۔چترال جیسے علاقوں میں غیر منظم سیاحت (Over-tourism) کی وجہ سے مقامی لوگوں کی نجی زندگی اور روایتی اقدار کو خطرات کا سامنا ہے۔

پاکستان اس دن کے موقع پر کلاش اور تھرپارکر کی برادریوں کے ثقافتی ورثے اور زبانوں کو بچانے کے عزم کا اعادہ کرتا ہے۔ان برادریوں کی تاریخ اور روایات کو اب جامعات کے نصاب کا حصہ بنانے پر بھی کام کیا جارہا ہے تاکہ یہ نایاب ثقافتیں ہمیشہ زندہ رہ سکیں

اقوام متحدہ کی جانب سے اس سال کا تھیم

"مقامی دائیوں کا احترام: زندگی اور فلاح و بہبود کا تحفظ "

(Honouring Indigenous Midwives: Safeguarding Life and Well-being) مقرر کیا گیا ہے

یہ مڈوائف یا دایاں نسل در نسل منتقل ہونے والے آبائی علم اور روایتی طریقوں کے ذریعے ماؤں اور نوزاد بچوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ان کا کردار صرف بچے کی پیدائش تک محدود نہیں ہوتا بلکہ یہ خاندانوں کو مضبوط بنانے اور صحت کے فروغ میں بھی مدد دیتی ہیں۔یہ دن صحت کے نظام میں مقامی دائیوں کے مثبت کردار، ان کے تجربات اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے ان کی قربانیوں کا اعتراف کرتا ہے۔





بیولا کی نئی جنگ: کیا پرانی ویکسین Bundibugyo کے نئے خطرے کا مقابلہ کر سکے گی؟ (ڈاکٹر ثانیہ نشتر کی اہم عالمی صحت پیش رفت، پس منظر، سائنسی حقیقت اور پاکستان کے لیے سبق)

عالمی صحت کے میدان میں ایک اہم پیش رفت اس وقت سامنے آئی ہے جب Gavi — the Vaccine Alliance کی CEO ڈاکٹر ثانیہ نشتر نے موجودہ Ervebo Ebola vaccine کو Bundibugyo virus disease کے خلاف clinical trials میں شامل کرنے کی سفارش کا خیر مقدم کیا ہے

۔میں اپنے قارئین کے لیے سب سے پہلے یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس کا مطلب یہ ہر گز نہیں کہ Ervebo کو Bundibugyo کو وائرس کے خلاف مؤثر ثابت کر دیا گیا ہے یا اسے اس بیماری کے لیے منظور کر لیا گیا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ماہرین اب اس امکان کو سائنسی طور پر جانچنا چاہتے ہیں کہ کیا پہلے سے دستیاب Ervebo ، جو ایک دوسری قسم کے Ebola virus کے خلاف مؤثر ہے، Bundibugyo کے خلاف بھی کچھ حفاظتی اثر پیدا کر سکتی ہے۔؟؟

بنڈی بگیو وائرس (Bundibugyo virus) ایبولا وائرس کے خاندان کی ایک الگ قسم ہے اور اس سے ہونے والی بیماری کو Bundibugyo Virus Disease (BVD) کہا جاتا ہے۔ اس وائرس کی شناخت پہلی مرتبہ 2007 میں Uganda کے Bundibugyo علاقے میں ہونے والی وبا کے دوران نمایاں ہوئی تھی۔ اس سے قبل ہونے والی بڑی وباؤں میں شرحِ اموات تقریباً 30 سے 50 فیصد تک رہی ہے۔ موجودہ بحران اس لیے زیادہ تشویشناک ہے کہ اس مخصوص وائرس کے خلاف ابھی تک کوئی licensed vaccine یا مخصوص منظور شدہ علاج موجود نہیں۔

موجودہ وبا مئی 2026 میں Democratic Republic of Congo (DRC) کے صوبے Ituri میں سامنے آئی، جہاں ابتدائی طور پر ایک پراسرار اور انتہائی مہلک بیماری کی اطلاعات ملیں۔ 15 مئی کو Bundibugyo virus کی تصدیق ہوئی اور Uganda میں بھی DRC سے آنے والے افراد میں کیسز سامنے آئے۔

صورتحال کی سنگینی کے پیشِ نظر 17 مئی 2026 کو WHO نے اسے Public Health Emergency of International Concern (PHEIC) قرار دیا۔ یہ اس بات کا اعتراف تھا کہ بیماری نہ صرف متاثرہ علاقوں کے لیے بلکہ سرحدوں سے باہر بھی صحتِ عامہ کے لیے خطرہ بن سکتی ہے۔

صورتحال بعد میں تیزی سے بگڑی۔ 1 اگست 2026 تک DRC میں 3,748 confirmed cases اور 1,657 confirmed deaths رپورٹ ہو چکی تھیں۔ یہ وبا اب دنیا کی دوسری بڑی Ebola epidemic بن چکی ہے، جبکہ اس کے پھیلاؤ کی رفتار بھی غیر معمولی طور پر زیادہ رہی ہے۔

تاخیر سے تشخیص، کمزور surveillance ، conflict سے متاثرہ علاقوں تک محدود رسائی، contact tracing کی مشکلات، غلط ابتدائی تشخیص اور Bundibugyo کے خلاف مخصوص vaccine اور علاج کی عدم دستیابی نے صورتحال کو مزید پیچیدہ کیا ہے۔

یہاں Ervebo کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔ Ervebo دنیا کی پہلی اور فی الحال WHO-prequalified licensed Ebola vaccine ہے، لیکن یہ Zaire Ebola virus (EBOV) کے خلاف ہے، Bundibugyo virus کے خلاف نہیں۔ اسے Ebola outbreaks میں انتہائی اہم کامیابی حاصل ہوئی ہے، مگر Bundibugyo کے معاملے میں اس کی efficacy ابھی ثابت نہیں ہوئی۔ WHO کے مطابق اس کے Bundibugyo کے خلاف ممکنہ cross-protection کے شواہد محدود اور غیر حتمی ہیں؛ اسی لیے WHO نے واضح کیا ہے کہ Ervebo کو Bundibugyo outbreak میں عام vaccination کے طور پر استعمال نہ کیا جائے بلکہ اسے carefully designed clinical research کے تحت آزمایا جائے۔ سائنسی اعتبار سے یہ تحقیق انتہائی اہم ہے۔

ایبولا کی مختلف اقسام ایک ہی بڑے viral family سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کے بعض antigenic حصوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

اسی لیے سوال یہ ہے کہ کیا Zaire Ebola کے خلاف Ervebo سے پیدا ہونے والا immune response Bundibugyo virus کو بھی پہچان کر کسی حد تک تحفظ فراہم کر سکتا ہے؟

اس کا جواب صرف laboratory یا animal studies سے نہیں بلکہ انسانوں میں باقاعدہ clinical trials سے ملے گا۔ اگر Ervebo کچھ meaningful protection ثابت کرتی ہے تو ایک پہلے سے دستیاب vaccine platform مستقبل کے Bundibugyo outbreaks کے خلاف فوری اہمیت اختیار کر سکتا ہے۔ تاہم عالمی سائنسی کوشش صرف Ervebo تک محدود نہیں۔ اس وقت Bundibugyo-specific vaccines بھی تیزی سے تیار کی جا رہی ہیں۔ Oxford University اور Serum Institute of India کی تیار کردہ ChAdOx1 BDBV vaccine نے Phase-I human trial شروع کر دیا ہے، جس میں ابتدائی طور پر صحت مند بالغ افراد میں vaccine کی safety اور immune response کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یہ وہی بنیادی viral-vector platform ہے جس نے Oxford/AstraZeneca COVID-19 vaccine میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔ دوسری طرف Moderna نے بھی Bundibugyo کے لیے اپنا mRNA-1469 vaccine candidate انسانی clinical trial میں داخل کر دیا ہے۔ اگست 2026 میں شروع ہونے والے اس ابتدائی trial میں تقریباً 80 صحت مند بالغ افراد شامل کیے جا رہے ہیں، جس کا بنیادی مقصد safety اور immune response کا جائزہ لینا ہے۔ mRNA technology کی خوبی یہ ہے کہ ضرورت پڑنے پر نئے pathogens کے لیے vaccine development اور manufacturing کو نسبتاً تیزی سے آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ علاج کے میدان میں بھی تحقیق جاری ہے

WHO ۔ کے ماہرین نے MBP134 ، Maftivimab اور remdesivir جیسے امید وار treatments کو clinical trials کے لیے ترجیح دی ہے، جبکہ obeldesivir کو high-risk contacts میں post-exposure prophylaxis کے طور پر بھی تحقیق میں شامل کیا جارہا ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ جاننا نہیں کہ وائرس کو روکا جاسکتا ہے یا نہیں بلکہ یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ متاثرہ مریضوں میں mortality کو حقیقتاً کم کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔

اس پوری پیش رفت میں Gavi اور ڈاکٹر ثانیہ نشتر کا کردار بھی اہم ہے۔ Gavi نے Bundibugyo outbreak کے مقابلے اور vaccine development/access کو تیز کرنے کے لیے 50 ملین امریکی ڈالر تک مختص کیے ہیں، جن میں 40 ملین ڈالر vaccine access ، manufacturing readiness اور investigational doses کے لیے جبکہ 10 ملین ڈالر outbreak response اور routine immunisation services کے تحفظ کے لیے رکھے گئے ہیں ۔ Gavi کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ vaccine کامیاب ہونے کے بعد اس کی بڑے پیمانے پر تیاری شروع کرنے کا انتظار نہ کیا جائے بلکہ manufacturing capacity پہلے سے تیار رکھی جائے۔

یہاں ایک بہت اہم عالمی صحت کا سبق بھی پوشیدہ ہے۔ Bundibugyo جیسی بیماریوں کے outbreaks نسبتاً نایاب ہوتے ہیں، اس لیے pharmaceutical companies کے لیے ان کے خلاف vaccine تیار کرنا تجارتی اعتبار سے ہمیشہ پرکشش نہیں ہوتا۔ نتیجتاً دنیا کے پاس ٹیکنالوجی ہونے کے باوجود vaccine development میں سرمایہ کاری کم رہتی ہے۔ Gavi اور CEPI کی موجودہ کوششیں اسی "market failure" کو دور کرنے کی کوشش ہیں—یعنی ایسی vaccines میں بھی سرمایہ کاری کی جائے جن کی فوری commercial market شاید موجود نہ ہو، مگر کسی وبا کے دوران ان کی ضرورت انتہائی شدید ہو سکتی ہے۔

پاکستان میں اس وقت Bundibugyo کے حوالے سے کسی بڑے پیمانے کی vaccination campaign کی ضرورت کا مطلب اخذ کرنا درست نہیں ہو گا۔ تاہم یہ واقعہ پاکستان کے لیے health security کا ایک اہم warning signal ضرور ہے۔ عالمی نقل و حرکت، فضائی سفر، تجارتی روابط اور انسانی آمد و رفت کے موجودہ دور میں کوئی بھی infectious disease صرف اپنے جغرافیائی مرکز تک محدود رہنے کی ضمانت نہیں رکھتی۔

پاکستان کو emerging infections کے لیے بہتر disease surveillance، rapid diagnostic capacity، biosafety laboratories، infection prevention and control، trained healthcare workers، contact tracing اور airports/points of entry پر risk-based preparedness کو مسلسل مضبوط رکھنا چاہیے

۔طبی ماہرین کے لیے اس واقعے کا ایک اہم سبق یہ بھی ہے کہ Ebola کی ابتدائی علامات بخار، کمزوری، جسم اور سر میں درد، vomiting اور diarrhea جیسی عام بیماریوں سے مل سکتی ہیں۔اس لیے travel history، exposure history، epidemiological linkage، فوری isolation، مناسب infection-control protocols اور بروقت laboratory diagnosis انتہائی اہم ہیں۔موجودہ outbreak میں ابتدائی تشخیص میں تاخیر نے بھی وائرس کو پھیلنے کا موقع دیا۔

اس بحران کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ دنیا نے پچھلی Ebola وباؤں سے سبق سیکھا ہے۔اس بار vaccine candidates، treatments، diagnostic tests اور clinical trial protocols پہلے سے زیادہ تیزی سے متحرک کیے جا رہے ہیں۔

جولائی 2026 میں WHO نے Bundibugyo کے لیے ایک diagnostic test کو Emergency Use Listing میں بھی شامل کیا، جبکہ vaccine development کے لیے target product profile بھی جاری کیا گیا

۔اس لیے ڈاکٹر ثانیہ نشتر کی پوسٹ کو صرف ایک vaccine کی خبر سمجھنا درست نہیں ہو گا۔یہ دراصل عالمی صحت کے نظام میں ایک بڑے paradigm shift کی علامت ہے: وبا آنے کے بعد صرف ردعمل دینے کے بجائے مستقبل کی وباؤں کے لیے پہلے سے vaccines، manufacturing capacity، treatments، diagnostics اور clinical research تیار رکھنا

۔مختصراً، Ervebo ابھی Bundibugyo کی ویکسین نہیں ہے؛ اس کی ممکنہ cross-protection کو clinical trial کے ذریعے جانچا جا رہا ہے۔ساتھ ہی Oxford/Serum Institute اور Moderna سمیت مختلف ادارے Bundibugyo-specific vaccines تیار کر رہے ہیں۔موجودہ وبا شدید ہے، لیکن اس بار عالمی سائنسی برادری نسبتاً زیادہ تیزی سے متحرک ہوئی ہے۔یہی اس بحران سے نکلنے والی سب سے بڑی امید ہے۔اور پاکستان کے لیے پیغام واضح ہے: عالمی صحت کا تحفظ صرف ہسپتالوں اور ادویات سے نہیں بلکہ مضبوط surveillance، تحقیق، تشخیص، trained health workforce اور وباؤں سے پہلے تیاری سے ممکن ہے



8اگست—آسیان (ASEAN)کایومِ تاسیس

جنگ وتنازع سے علاقائی تعاون تک کا سفر اور پاکستان کے لیے نئے امکانات

ہر سال8اگست کو جنوب مشرقی ایشیائی ممالک کی تنظیم،یعنی آسیان (ASEAN—Association of Southeast Asian Nations)کے قیام کی سالگرہ منائی جاتی ہے۔یہ دن صرف ایک بین الاقوامی تنظیم کے قیام کی یادگار نہیں بلکہ اس تصور کی علامت بھی ہے کہ باہمی اختلافات،تاریخی دشمنیوں اور سیاسی تنازعات کے باوجود ممالک اگر مشترکہ مفادات،مکالمے اور اقتصادی تعاون کو ترجیح دیں تو پورا خطہ ترقی،امن اور خوشحالی کی جانب بڑھ سکتا ہے۔

آسیان کی بنیاد8اگست1967ء کو بنکاک،تھائی لینڈ میں پانچ ممالک—انڈونیشیا،ملائیشیا،فلپائن،سنگاپور اور تھائی لینڈ—کے وزرائے خارجہ کی جانب سے بینکاک اعلامیے (Bangkok Declaration) پر دستخط کے ذریعے رکھی گئی۔اس کے بانی رہنماؤں میں انڈونیشیا کے آدم ملک(Adam Malik)،ملائیشیا کے تون عبدالرزاق(Tun Abdul Razak)،فلپائن کے نارسیسو راموس(Narciso Ramos)،سنگاپور کے ایس۔راجارتنم (S. Rajaratnam) اور تھائی لینڈ کے تھانات کھومان (Thanat Khoman) شامل تھے

۔ آسیان کا قیام ایسے وقت میں ہوا جب جنوب مشرقی ایشیا سرد جنگ، نظریاتی کشمکش، علاقائی تنازعات، سیاسی عدم استحکام اور معاشی پسماندگی جیسے مسائل سے دوچار تھا۔ اس کے بانیوں نے محسوس کیا کہ مسلسل کشیدگی اور باہمی مقابلے کے بجائے مکالمہ، باہمی احترام، عدم مداخلت اور اقتصادی تعاون خطے کے مستقبل کے لیے زیادہ مفید راستہ ہے۔ چنانچہ آسیان کے بنیادی مقاصد میں اقتصادی ترقی کو تیز کرنا، سماجی و ثقافتی ترقی کو فروغ دینا، علاقائی امن و استحکام قائم کرنا، رکن ممالک کے درمیان باہمی تعاون بڑھانا اور مشترکہ مسائل کے حل کے لیے مشاورت کا نظام قائم کرنا شامل کیا گیا

۔یوں آسیان نے محض ایک سیاسی اتحاد کے بجائے بتدریج ایک ایسے علاقائی پلیٹ فارم کی شکل اختیار کی جہاں اختلافات کے باوجود بات چیت کا دروازہ بند نہیں کیا جاتا

۔ابتدائی پانچ ممالک کے بعد آسیان کا دائرہ مسلسل وسیع ہوتا گیا۔ برونائی دارالسلام 1984ء، ویتنام 1995ء، لاؤ پی ڈی آر اور میانمار 1997ء، اور کمبوڈیا 1999ء میں تنظیم کا حصہ بنے۔ ایک اہم حالیہ پیش رفت کے طور پر تیمور لیستے (Timor-Leste) کو 26 اکتوبر 2025ء کو آسیان کا 11 واں مکمل رکن تسلیم کر لیا گیا۔ اس طرح آج آسیان کے رکن ممالک کی تعداد گیارہ ہے۔

آسیان کا مرکزی انتظامی ادارہ سیکرٹریٹ جکارتہ، انڈونیشیا میں قائم ہے، جبکہ آسیان سربراہی اجلاس (ASEAN Summit) تنظیم کا اعلیٰ ترین سیاسی و پالیسی ساز فورم ہے۔ آسیان کی ایک نمایاں خصوصیت اس کا "ASEAN Way" ہے، جس میں باہمی مشاورت، اتفاقِ رائے، خود مختاری کا احترام اور اندرونی معاملات میں عدم مداخلت کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی محتاط مگر مسلسل سفارت کاری نے مختلف سیاسی نظام رکھنے والے ممالک کو ایک ہی علاقائی پلیٹ فارم پر اکٹھا رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ موجودہ سیکرٹری جنرل ڈاکٹر کاؤ کم ہورن (Dr. Kao Kim Hourn) کمبوڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور انہوں نے یکم جنوری 2023ء کو پانچ سالہ مدت کے لیے منصب سنبھالا۔ آسیان کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ اس نے جنوب مشرقی ایشیا میں اقتصادی تعاون اور علاقائی انضمام کو ایک مضبوط بنیاد فراہم کی۔ آسیان اکنامک کمیونٹی (AEC) کے ذریعے تجارت، سرمایہ کاری، کاروباری روابط اور علاقائی معاشی انضمام کو فروغ دیا گیا

۔ آج آسیان دنیا کی اہم اقتصادی قوتوں میں شمار ہوتا ہے اور چین، جاپان، جنوبی کوریا، بھارت، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ سمیت متعدد بڑی معیشتوں کے ساتھ اس کے گہرے تجارتی و اقتصادی روابط ہیں۔ تاہم یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ آسیان مکمل طور پر اختلافات سے پاک تنظیم نہیں۔ جنوبی بحیرۂ چین کے تنازعات، میانمار کا سیاسی بحران، بڑی طاقتوں کے درمیان مسابقت اور رکن ممالک کے مختلف سیاسی و معاشی مفادات اس کے لیے مسلسل چیلنج ہیں۔ اس کے باوجود آسیان کی اصل طاقت یہی ہے کہ اختلاف کے باوجود مکالمہ جاری رہتا

پاکستان جغرافیائی طور پر جنوب مشرقی ایشیا کا ملک نہیں، اس لیے وہ آسیان کا رکن نہیں ہے۔ تاہم پاکستان کے آسیان کے ساتھ کئی دہائیوں پر محیط رسمی اور کثیر الجہتی تعلقات موجود ہیں۔ پاکستان کو 1993ء میں آسیان کا سیکٹرل ڈائیلاگ پارٹنر بنایا گیا، اور وقت کے ساتھ تجارت، صنعت، سرمایہ کاری، ماحولیات، سائنس و ٹیکنالوجی، سیاحت، انسانی وسائل، انسدادِ دہشت گردی، زراعت اور دیگر شعبوں میں تعاون کے امکانات پیدا ہوئے۔

پاکستان نے 2 جولائی 2004ء کو Treaty of Amity and Cooperation (TAC) میں شمولیت اختیار کی اور اسی روز ASEAN Regional Forum (ARF) کا 24واں رکن بن گیا۔ پاکستان آج بھی ARF میں فعال کردار ادا کر رہا ہے اور 2026ء میں بھی اس فورم کی 33ویں وزارتی میٹنگ میں شرکت کر چکا ہے۔ پاکستان اور آسیان کے تعلقات کی ایک منفرد بات یہ ہے کہ پاکستان واحد Sectoral Dialogue Partner ہے جو ASEAN Regional Forum کا بھی رکن ہے۔ ARF ایشیا پیسیفک خطے میں سیاسی و سلامتی کے مسائل پر مکالمے، اعتماد سازی اور سفارتی تعاون کا اہم پلیٹ فارم ہے۔

پاکستان نے مختلف مواقع پر آسیان کے ساتھ اپنے تعلقات کو Full Dialogue Partner کی سطح تک بڑھانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ پاکستانی سفارت کاری کے لیے یہ اس لیے اہم ہے کہ جنوب مشرقی ایشیا عالمی معیشت، سمندری تجارت، ٹیکنالوجی اور علاقائی سلامتی میں مسلسل اہمیت حاصل کر رہا ہے. پاکستان اور آسیان کے درمیان اقتصادی تعلقات میں بہت زیادہ امکانات موجود ہیں، لیکن موجودہ تجارت میں ایک نمایاں عدم توازن بھی پایا جاتا ہے

۔پاکستان کی وزارتِ خارجہ کے مطابق 2022ء میں پاکستان اور آسیان کے درمیان دوطرفہ تجارت تقریباً 11 ارب ڈالر تک پہنچی تھی؛ پاکستان کی آسیان کو برآمدات تقریباً 3 ارب ڈالر جبکہ درآمدات تقریباً 8.8 ارب ڈالر تھیں۔ اس تجارت کا تقریباً 90 فیصد حصہ پانچ اہم ممالک—ملائیشیا، تھائی لینڈ، ویتنام، فلپائن اور انڈونیشیا—کے ساتھ ہے۔ پاکستان آسیان کی منڈیوں میں ٹیکسٹائل اور گارمنٹس، چاول، کھیلوں کا سامان، چمڑے کی مصنوعات، سمندری غذا، پھل اور دیگر زرعی و صنعتی مصنوعات کے ذریعے اپنی موجودگی مزید مضبوط کر سکتا ہے۔ دوسری طرف پاکستان آسیان سے بالخصوص پام آئل، مشینری، الیکٹرانک مصنوعات، کیمیکلز اور مختلف صنعتی اشیا درآمد کرتا ہے۔ اس تجارتی ساخت سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان کے لیے اصل چیلنج صرف تجارت کا حجم بڑھانا نہیں بلکہ برآمدات کا دائرہ وسیع کرنا اور تجارتی خسارہ کم کرنا ہے۔ ملائیشیا کے ساتھ پاکستان کا آزاد تجارتی معاہدہ (FTA) اور انڈونیشیا کے ساتھ ترجیحی تجارتی معاہدہ (PTA) پہلے ہی موجود ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ پاکستان روایتی ٹیکسٹائل اور چاول سے آگے بڑھ کر آئی ٹی اور ڈیجیٹل خدمات، سافٹ ویئر، انجینئرنگ مصنوعات، فارماسیوٹیکل مصنوعات، حلال فوڈ، حلال کاسمیٹکس، کھیلوں کا سامان، سرجیکل آلات، پھل و سبزیاں اور ویلیو ایڈڈ زرعی مصنوعات کے لیے آسیان کی وسیع منڈیوں کو ہدف بنائے۔ پاکستان کے لیے آسیان کی اہمیت صرف تجارت تک محدود نہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کی تیزی سے بڑھتی ہوئی ڈیجیٹل معیشت، مینوفیکچرنگ، سیاحت، بندرگاہی تجارت، سپلائی چینز اور ٹیکنالوجی کے شعبے پاکستان کے لیے سرمایہ کاری اور شراکت داری کے نئے مواقع پیدا کر سکتے ہیں۔
پاکستان کے CPEC ، گوادر پورٹ اور جغرافیائی محلِ وقوع کو جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ بہتر سمندری، فضائی، ڈیجیٹل اور تجارتی رابطوں سے جوڑا جائے تو پاکستان وسطی، جنوبی اور مغربی ایشیا کو جنوب مشرقی ایشیا سے ملانے والے ایک اہم معاشی پل کے طور پر اپنی حیثیت مضبوط کر سکتا ہے

آسیان کی کہانی پاکستان کے لیے ایک اہم سبق بھی رکھتی ہے۔ یہ ممالک بھی ماضی میں تنازعات، جنگوں، سیاسی اختلافات اور معاشی مشکلات سے گزرے، لیکن انہوں نے اختلافات کو ختم کرنے کا انتظار نہیں کیا؛ انہوں نے اختلاف کے ساتھ تعاون کا راستہ تلاش کیا۔ یہی وہ سوچ ہے جس کی پاکستان کو بھی ضرورت ہے۔ معیشت، تجارت، تعلیم، ٹیکنالوجی، علاقائی رابطوں اور انسانی وسائل کو خارجہ پالیسی کے مرکزی ستونوں میں شامل کر کے پاکستان اپنی جغرافیائی اہمیت کو حقیقی معاشی طاقت میں تبدیل کر سکتا ہے۔ پاکستان کی Vision East Asia پالیسی اسی سمت ایک اہم قدم ہے۔ وزارتِ خارجہ بھی آسیان کے ساتھ سیاسی، اقتصادی، سکیورٹی، تعلیم، سیاحت، ثقافت اور عوامی روابط کو مزید مضبوط بنانے پر زور دیتی رہی ہے۔ پاکستان نے ASEAN-Pakistan Cooperation Fund قائم کیا ہے اور آسیان ممالک کے طلبہ اور سرکاری اہلکاروں کے لیے تربیتی و تعلیمی پروگرام بھی منعقد کیے ہیں۔

8 اگست کا آسیان ڈے ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ قومیں صرف طاقت سے نہیں بلکہ تعاون سے بھی مضبوط ہوتی ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کی یہ تنظیم اس بات کی عملی مثال ہے کہ مختلف زبانوں، مذاہب، سیاسی نظاموں اور قومی مفادات رکھنے والے ممالک مشترکہ اقتصادی اور علاقائی مفادات کے لیے ایک میز پر بیٹھ سکتے ہیں۔ پاکستان کے لیے بھی مستقبل کا راستہ محض جغرافیائی اہمیت پر فخر کرنے کے بجائے اسے معاشی رابطے، برآمدات، سرمایہ کاری، علم، ٹیکنالوجی اور علاقائی تعاون میں تبدیل کرنے کا ہے۔ آج جب دنیا تیزی سے علاقائی اقتصادی بلاکس، سپلائی چینز اور جغرافیائی معاشیات کی طرف بڑھ رہی ہے
، پاکستان کے لیے آسیان محض ایک سفارتی پلیٹ فارم نہیں بلکہ 11 ممالک پر مشتمل ایک وسیع مارکیٹ، سرمایہ کاری کا ممکنہ مرکز اور مشرقی ایشیا تک رسائی کا اہم دروازہ ہے۔ اگر پاکستان اپنی صنعتی پیداوار، برآمدی معیار، ٹیکنالوجی، انسانی وسائل اور علاقائی رابطوں کو بہتر بنائے تو آسیان کے ساتھ تعلقات پاکستان کی معیشت کے لیے ایک نئے باب کا آغاز بن سکتے ہیں۔ آسیان کی کامیابی کا اصل راز یہی ہے: اختلافات کے باوجود رابطہ، مقابلے کے باوجود تعاون، اور ماضی کے تنازعات کے باوجود مستقبل پر توجہ۔ پاکستان کے لیے بھی یہی سوچ ایک مضبوط، پُرامن اور معاشی طاقت کی بنیاد بن سکتی ہے

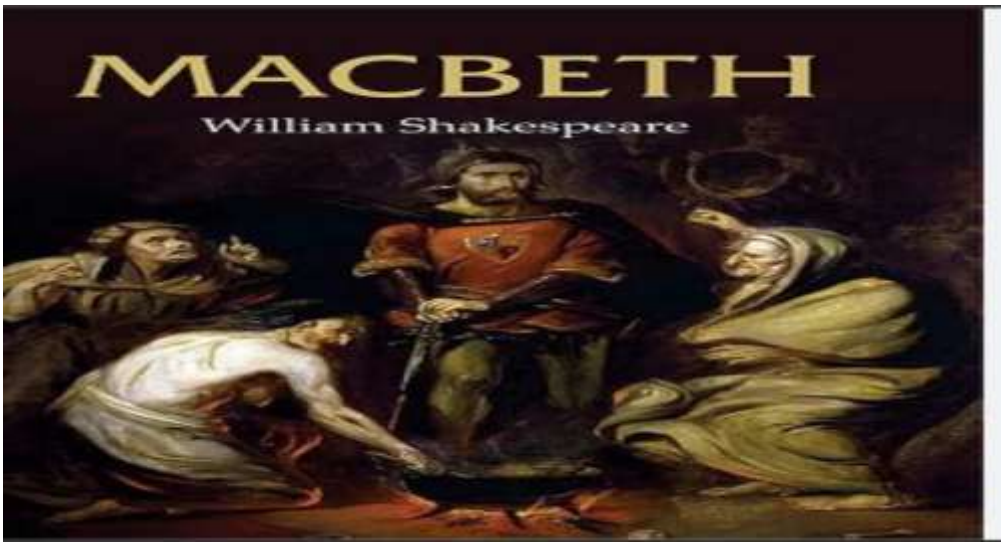



میکبتھ کا المیہ ــــ ہوسِ اقتدار اور جدید انسانی معاشرہ۔

اج کافی عرصہ بعد حسن رضا(برطانیہ سے چھتیون پرائے ہوئے نواسے (کے ہاتھ میں میکبتھ دیکھی جو اس کے سکول کے نصاب میں شامل ہے۔ تو دوبارہ اس کی ورق گردانی شروع کر دی اور ذہن 1606 سے 2026ء کے درمیان الجھ سا گیا۔

ولیم شیکسپیئر کا 1606ء کے قریب لکھا گیا ڈراما "میکبتھ " محض اسکاٹ لینڈ کے ایک بادشاہ کے قتل یا ڈرامائی واقعے کی کہانی نہیں، بلکہ یہ انسانی نفسیات، بے لگام ہوس اور ضمیر کی بربادی کی ایک دائمی داستان ہے

۔ کہانی کا مرکزی کردار میکبتھ ایک بہادر اور قابلِ احترام جرنیل ہوتا ہے، مگر پراسرار چڑیلوں کی بادشاہت سے متعلق پیشگوئی اس کے اندر اقتدار حاصل کرنے کی چھپی ہوئی خواہش کو بیدار کر دیتی ہے

۔اپنی بے رحم اور چالاک بیوی لیڈی میکبتھ کے اکسانے پر وہ مہمان بن کر آئے رحم دل بادشاہ ڈنکن کو قتل کر کے اقتدار پر قابض ہو جاتا ہے اور یوں اس کا سفر ایک وفادار انسان سے ظالم حکمران کی طرف مڑ جاتا ہے۔ اقتدار حاصل کر لینے کے بعد میکبتھ کو سکون نصیب نہیں ہوتا، بلکہ جرم کا احساس اور اپنے وجود کو لاحق خطرات اسے شدید خوف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ چڑیلوں کی اس پیشگوئی سے خوفزدہ ہو کر کہ اس کے دوست بانکو کی نسل بادشاہ بنے گی، وہ بانکو کو قتل کروا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لیے ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیتا ہے، حتیٰ کہ اپنے مخالف میکڈف کے معصوم خاندان کو بھی قتل کروا دیتا ہے۔

جرم سے جنم لینے والا یہ خوف اور بے گناہوں کا خون اسے اور لیڈی میکبتھ کو شدید ذہنی اذیت اور ضمیر کی خلش میں مبتلا کر دیتا ہے، جس کا انجام لیڈی میکبتھ کی پاگل پن میں موت کی صورت نکلتا ہے۔ میکبتھ کا گمان ہوتا ہے کہ چڑیلوں کی پر اسرار پیشگوئیوں کی وجہ سے اسے کوئی شکست نہیں دے سکتا، مگر تاریخ کا جبر اور مکافاتِ عمل کا قانون بالآخر پورا ہو کر رہتا ہے۔ میلکم اور میکڈف کی قیادت میں بغاوت ہوتی ہے اور وہ تمام پیشگوئیاں، جنہیں میکبتھ اپنی فتح کی ضمانت سمجھ رہا تھا، اس کی تباہی کا سبب بن جاتی ہیں۔ میکڈف کے ہاتھوں میکبتھ کا قتل ہوتا ہے اور ڈنکن کا بیٹا میلکم نیا بادشاہ بنتا ہے

اس کہانی کا بنیادی سبق یہی ہے کہ جب انسان اقتدار کی ہوس میں اخلاقی حدود کو پامال کرتا ہے، تو ایک جرم دوسرے جرم کو جنم دیتا ہے اور بالآخر انسان کو اپنے ہی بوجھ تلے تباہ کر دیتا ہے اگر غور کیا جائے تو چار سو سال گزرنے کے بعد بھی میکبتھ کے کردار اور اس کے اثرات ختم نہیں ہوئے، بلکہ وہ آج بھی ہمارے ارد گرد اور معاشرے میں زندہ ہیں

آج کا میکبتھ بادشاہی تاج نہیں پہنتا، بلکہ وہ سیاسی، سماجی یا معاشی اقتدار، عہدے اور بے جا اثر و رسوخ کی شکل میں نظر آتا ہے۔

آج کی لیڈی میکبتھ وہ ترغیب اور ذہنیت ہے جو طاقتور کو اپنے مفاد کے لیے اصول توڑنے پر اکساتی ہے، جبکہ چڑیلیں ان افواہوں، خوشامد اور گمراہ کن مشوروں کی مانند ہیں جو انسان کے اندر کی ہوس کو ہوا دیتے ہیں

۔پاکستانی معاشرہ ہو یا دنیا کا کوئی بھی پلیٹ فارم، یہ المیہ ہر اس جگہ نمودار ہوتا ہے جہاں اقتدار عوام یا عوام الناس کی خدمت کے بجائے ذات اور مفاد کا ذریعہ بن جائے۔ جب طاقت کا احتساب ختم ہو جائے اور مفادات اصولوں پر غالب آ جائیں تو میکبتھ جیسے کردار جنم لیتے ہیں۔ شیکسپیئر نے دراصل تاریخ کے ایک واقعے کے ذریعے انسان کے اندر موجود اقتدار کی اس بھوک اور بگاڑ کا آفتاب روشن کیا ہے جو ہر دور کے انسانی معاشرے کے لیے ایک آئینہ ہے

۔خلاصہ یہ کہ میکبتھ محض ایک کتابی یاڈرامائی کردار نہیں بلکہ ایک متحرک رویہ ہے۔اصل سوال یہ ہے کہ کیاہم
۔اپنے آس پاس موجود بے لگام اقتدار کے میکبتھ کو پہچاننے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟اور اس سے بھی زیادہ اہم
اور لمحہ فکریہ یہ ہے کہ کیاہم اس بات کا ادراک رکھتے ہیں کہ کہیں یہ ہوس، خوف اور ناانصافی کا میکبتھ خود
ہمارے اپنے وجود اور سوچ کے اندر تو جنم نہیں لے رہا؟





6 اگست: ہیروشیما کا سانحہ — تاریخِ انسانیت کا سیاہ ترین دن اور امریکہ کا وحشیانہ قدم جس نے نسلوں کی تباہی کی بنیاد رکھی---

6 اگست 1945ء تاریخ کا وہ الم ناک دن ہے جب امریکہ نے جاپان کے شہر ہیروشیما پر دنیا کا پہلا ایٹمی حملہ کر کے ایک لاکھ سے زائد بے گناہ انسانوں کو چند لمحوں میں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ یہ واقعہ نہ صرف دوسری جنگ عظیم کے خاتمے کا نقطۂ عروج ثابت ہوا بلکہ اس نے انسانی تاریخ کو ہمیشہ کے لیے ایک نئے اور خوف ناک دور — ایٹمی دور — میں داخل کر دیا۔

(اس عظیم سانحے کو صحیح تناظر میں سمجھنے کے لیے قارئین کرام کے لیے دوسری جنگ عظیم کے پس منظر پر ایک طائرانہ نظر ڈالنا ضروری ہے)

دوسری جنگ عظیم یکم ستمبر 1939ء کو جرمنی کے پولینڈ پر حملے سے شروع ہوئی اور 2 ستمبر 1945ء کو اتحادی ممالک کی فیصلہ کن فتح پر اختتام پذیر ہوئی۔ یہ خونریز جنگ دنیا کی دو بڑی طاقتوں، یعنی اتحادی ممالک اور محوری طاقتوں کے درمیان لڑی گئی۔ اتحادی طاقتوں میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین شامل تھے، جبکہ محوری طاقتوں کی نمائندگی جرمنی، جاپان اور اٹلی کر رہے تھے۔ اس عالمی جنگ کے بھڑکنے کے پیچھے جرمن آمر ایڈولف ہٹلر کی جارحانہ توسیع پسندانہ پالیسی، پہلی جنگ عظیم کے بعد جرمنی پر مسلط کیے گئے ذلت آمیز معاہدۂ ورسائی کا انتقام، اور عالمی بالادستی کے حصول کی خواہش کارفرما تھی

1945ء تک یورپ میں نازی جرمنی شکست تسلیم کر چکا تھا، مگر بحرالکاہل کے محاذ پر جاپان بدستور اتحادی افواج کے سامنے ہتھیار ڈالنے سے انکاری تھا۔ جاپانی فوجیوں کے ذہنوں میں راسخ روایتی جنگی جنون اور آخری سانس تک لڑنے کا نظریہ اس مزاحمت کی اصل بنیاد تھا۔ امریکی حکام کا اندازہ تھا کہ اگر جاپان کی سرزمین پر روایتی زمینی حملہ کیا گیا تو لاکھوں امریکی اور جاپانی فوجی و شہری لقمۂ اجل بن جائیں گے۔ ان حالات میں امریکی صدر ہیری ٹرومین اور اتحادی قیادت کا حتمی مقصد جاپان کو فوری اور غیر مشروط ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر کے جنگ کا جلد از جلد خاتمہ کرنا تھا

اس مقصد کے حصول کے لیے امریکہ نے دسمبر 1941ء سے جولائی 1945ء تک ایک انتہائی خفیہ سائنسی منصوبے، میں ہٹن پراجیکٹ (Manhattan Project) کے تحت دنیا کا پہلا ایٹم بم تیار کیا۔ اس ہتھیار کا پہلا کامیاب تجرباتی دھماکہ 16 جولائی 1945ء کو نیو میکسیکو کے ویران صحرا میں کیا گیا، جس کے بعد امریکہ دنیا کی واحد ایٹمی طاقت بن گیا۔ مورخین کے مطابق اس حملے کا ایک اہم پس منظر سوویت یونین کو خاموشی سے اپنی فوجی و سائنسی برتری کا پیغام دینا بھی تھا، تاکہ عالمی سیاست میں امریکہ کی بالادستی مسلّم ہو جائے

6 اگست 1945ء کی صبح 8 بج کر 15 منٹ پر امریکی بمبار طیارے 'اینولا گے (Enola Gay)' نے 'لٹل بوائے' نامی ایٹمی بم ہیروشیما پر گرا کر جنگ کا پانسہ ہمیشہ کے لیے پلٹ دیا۔ انسانی تاریخ میں کسی آبادی کے خلاف استعمال ہونے والے اس پہلے جوہری ہتھیار نے دیکھتے ہی دیکھتے شہر کے وسیع حصے کو خاکستر کر دیا۔ ابتدائی دھماکے میں ہی ستر ہزار سے زائد افراد موقع پر ہلاک ہو گئے، جبکہ شدید زخموں، آتشزدگی اور تابکاری کے باعث دسمبر 1945ء کے اختتام تک ہلاکتوں کی مجموعی تعداد تقریباً ایک لاکھ 40 ہزار تک جا پہنچی۔ محض تین دن بعد، 9 اگست کو امریکہ نے دوسرا ایٹم بم ناگاساکی پر بھی گرایا (جس میں فوری طور پر 40 ہزار سے زائد لوگ ہلاک ہو گئے اور اتنی ہی تعداد بعد ازاں تابکاری اثرات سے ہلاک ہو گئی) جس کے نتیجے میں بالآخر جاپان نے 15 اگست 1945ء کو ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا اور یوں دوسری جنگ عظیم کا باقاعدہ خاتمہ ہوا۔

یہ جنگ تو ختم ہو گئی مگر ایٹمی حملے کے اثرات محض چند لمحوں یا دنوں تک محدود نہیں رہے بلکہ دہائیوں تک انسانی صحت کو نگلتے چلے گئے۔ بم کی تابکاری سے متاثر ہونے والے افراد میں سب سے پہلے شدید تابکاری بیماری (Acute Radiation Sickness) کی علامات ظاہر ہوئیں، جن میں بالوں کا اچانک جھڑنا سب سے خوف ناک اور موت کی پیش گوئی کرنے والی علامت سمجھا جاتا تھا۔ حملے کے تقریباً دو سال بعد بچ جانے والوں میں خون کے سرطان (لیوکیمیا) کے کیسز میں غیر معمولی اضافہ دیکھا گیا، جو چار سے چھ برس بعد اپنے عروج پر پہنچا۔ ایک دہائی گزرنے کے بعد تھائی رائیڈ، چھاتی، پھیپھڑوں اور دیگر اعضاء کے سرطان کی شرح میں بھی نمایاں اضافہ ریکارڈ کیا گیا، اور حیرت انگیز طور پر سرطان کا یہ خطرہ سات دہائیوں بعد بھی زندہ بچ جانے والوں میں معمول سے زیادہ بلند رہا۔ جسمانی امراض کے ساتھ ساتھ متاثرین شدید نفسیاتی صدمے، ڈپریشن اور پوسٹ ٹرامیٹک اسٹریس ڈس آرڈر جیسے مسائل کا بھی شکار ہوئے

۔جاپان میں ایٹمی حملے سے بچ جانے والوں کو 'ہیباکوشا (Hibakusha) 'کہا جاتا ہے۔ ان افراد کو صحت کے مسائل کے ساتھ ساتھ معاشرتی امتیاز اور تعصب کا بھی سامنا کرنا پڑا، کیونکہ عام لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ تابکاری کے اثرات متعدی یا وراثتی ہو سکتے ہیں، جس کے باعث بہت سے ہیباکوشا کو روزگار اور رشتہ ازدواج جیسے بنیادی معاملات میں بھی دشواریوں کا سامنا رہا۔ سائنسدانوں نے 1947ء سے ریڈی ایشن ایفیکٹس ریسرچ فاؤنڈیشن کے تحت ہیباکوشا اور ان کی نسلوں پر طویل مدتی تحقیق کا سلسلہ شروع کیا، جو آٹھ دہائیوں سے زائد عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی جاری ہے۔ جاپانی حکومت نے 1957ء سے ہیباکوشا کے لیے باقاعدہ طبی امداد کا آغاز کیا جو وقت کے ساتھ وسیع تر ہوتی چلی گئی، اور آج زندہ بچ جانے والے تمام متاثرین کے علاج معالجے کے اخراجات حکومتی سطح پر پورے کیے جاتے ہیں

ایٹمی دور کا ہولناک آغاز ہیروشیما پر حملہ محض ایک عسکری کارروائی نہیں تھا بلکہ اس نے پوری دنیا کی سیاست، سفارت کاری اور عالمی تحفظ کے تصورات کو ہمیشہ کے لیے بدل ڈالا۔ اس واقعے کے فوراً بعد امریکہ اور سوویت یونین کے درمیان ایٹمی ہتھیاروں کی دوڑ کا آغاز ہوا، جو سرد جنگ کا سب سے اہم اور خطرناک محور بنی۔ محض چار برس بعد، 1949ء میں سوویت یونین نے بھی اپنا پہلا ایٹمی تجربہ کر ڈالا، اور اس کے بعد برطانیہ (1952ء)، فرانس (1960ء) اور چین (1964ء) بھی ایٹمی طاقتوں کی صف میں شامل ہو گئے۔ اس ہولناک دوڑ نے 'باہمی یقینی تباہی (Mutual Assured Destruction) 'کے نظریے کو جنم دیا، جس کے تحت دنیا کی بڑی طاقتیں ایک دوسرے کو مکمل تباہی کی دھمکی دے کر جنگ سے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہیں۔ آج، آٹھ دہائیوں سے زائد عرصہ گزرنے کے باوجود دنیا بھر میں تقریباً 13 ہزار 400 ایٹمی ہتھیار موجود ہیں، جن میں سے 90 فیصد سے زائد صرف امریکہ اور روس کے پاس ہیں۔ اگرچہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بعد کسی جنگ میں ایٹمی ہتھیار دوبارہ استعمال نہیں

ہوا، مگر عالمی برادری نے اس تباہ کن ٹیکنالوجی کو قابو میں رکھنے کے لیے کئی اہم معاہدے کیے، جن میں معاہدہ عدم پھیلاؤ جوہری ہتھیار (NPT) اور 2017ء کا ایٹمی ہتھیاروں کی ممانعت کا عالمی معاہدہ نمایاں ہیں

۔ہیروشیما کا 'جینبا کو ڈوم (Genbaku Dome) '، جو دھماکے کے مرکز کے قریب واحد باقی بچ جانے والی عمارت تھی، آج امن کی علامت اور یونیسکو کے عالمی ثقافتی ورثے کا حصہ ہے۔ ہر سال 6 اگست کو ہیروشیما پیس میموریل پارک میں ایک باوقار تقریب منعقد کی جاتی ہے جس میں صبح 8 بج کر 15 منٹ پر، یعنی عین اس وقت جب بم گرایا گیا تھا، ایک منٹ کی خاموشی اختیار کی جاتی ہے۔ تقریب میں امن کی گھنٹی بجائی جاتی ہے، کبوتر آزاد کیے جاتے ہیں اور شام کو دریائے موٹویاسو میں سیکڑوں لالٹینیں بہا کر مرحومین کو خراجِ عقیدت پیش کیا جاتا ہے۔ یہ دن اب پوری دنیا میں امن، ایٹمی تخفیف اسلحہ اور جنگ کے خاتمے کی علامت کے طور پر منایا جاتا ہے

ہیروشیما کا سانحہ محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بلکہ پوری نسلِ انسانی کے لیے ایک لازوال سبق ہے۔ یہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ جدید ہتھیاروں کی تباہ کاری کس قدر ہولناک اور دیرپا ہو سکتی ہے، اور محض چند لمحوں کا فیصلہ کس طرح لاکھوں انسانوں کی زندگیوں اور آنے والی نسلوں کی صحت پر صدیوں تک اثر انداز ہو سکتا ہے۔ آج، جب دنیا ایک بار پھر ایٹمی کشیدگی کے سائے میں سانس لے رہی ہے، ہیروشیما کی یاد ہمیں امن، مکالمے اور ہتھیاروں سے پاک دنیا کی جانب بڑھنے کی دعوت دیتی ہے



یومِ استحصالِ کشمیر — 5 اگست 2019 سے سات برس بعد:

آئینی حیثیت کی تبدیلی، قانونی جنگ، سفارتی ردِ عمل اور کشمیر کا آج

5 اگست — یومِ استحصالِ کشمیر محض ایک یادگاری دن نہیں بلکہ جنوبی ایشیا کی تاریخ کے ایک ایسے موڑ کی یاد دہانی ہے جس نے جموں و کشمیر کی داخلی آئینی، سیاسی اور انتظامی صورتِ حال کو بنیادی طور پر تبدیل کر دیا۔

5 اگست 2019 کو بھارتی حکومت نے آئینِ ہند کے آرٹیکل 370 سے متعلق ایسے اقدامات کیے جن کے نتیجے میں جموں و کشمیر کی سابق خصوصی آئینی حیثیت ختم ہوئی، اس کے اپنے آئین اور خصوصی قانونی انتظامات کا خاتمہ ہوا اور بعد ازاں ریاست کو دو وفاقی اکائیوں، یعنی جموں و کشمیر اور لداخ کے Union Territories میں تقسیم کر دیا گیا۔

پاکستان نے اس اقدام کو یک طرفہ، غیر قانونی اور کشمیر کی متنازع حیثیت تبدیل کرنے کی کوشش قرار دیا، جبکہ بھارت کا مؤقف ہے کہ یہ اس کے آئینی اختیار کے مطابق تھا اور اس کا مقصد جموں و کشمیر کو بھارت کے ساتھ مکمل طور پر ضم کرنا، ترقی اور بہتر حکمرانی کو فروغ دینا تھا۔

(قارئین کرام۔اس اختلاف کو سمجھنے کے لیے 5 اگست 2019 سے بہت پہلے کی کشمیر کی قانونی اور تاریخی حیثیت کو سمجھنا ضروری ہے)

)

1947 میں برطانوی ہندوستان کی تقسیم کے وقت جموں وکشمیر ایک باقاعدہ Princely State تھا، جس کے حکمران مہاراجہ ہری سنگھ تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ریاستوں کو بھارت یا پاکستان سے الحاق کا اختیار حاصل تھا۔ اکتوبر 1947 میں مہاراجہ ہری سنگھ نے بھارت کے ساتھ Instrument of Accession پر دستخط کیے، جس کے بعد بھارتی افواج کشمیر میں داخل ہوئیں اور جنگ کا آغاز ہوا۔ تاہم یہ مسئلہ جلد ہی بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک بین الاقوامی تنازع بن گیا اور بھارت خود یہ معاملہ اقوام متحدہ میں لے گیا

اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل نے 21 اپریل 1948 کو قرارداد 47 منظور کی، جس کا تعلق جموں وکشمیر میں امن کی بحالی اور رائے شماری (plebiscite) سے تھا۔ اقوام متحدہ کے سرکاری ریکارڈ میں قرارداد 47 کا عنوان ہی "restoration of peace and order and the plebiscite in the State of Jammu and Kashmir" درج ہے

۔یہاں ایک بنیادی قانونی فرق سمجھنا ضروری ہے۔ بھارت کا مؤقف یہ ہے کہ مہاراجہ کا الحاق ایک قانونی اور حتمی الحاق تھا اور اس کے نتیجے میں جموں وکشمیر بھارت کا حصہ بن گیا۔

پاکستان کا مؤقف یہ ہے کہ کشمیر ایک حل طلب بین الاقوامی تنازع ہے اور کشمیری عوام کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں کے مطابق دیا جانا چاہیے

۔اسی وجہ سے پاکستان 5 اگست 2019 کے بھارتی اقدام کو محض بھارت کا داخلی آئینی معاملہ نہیں سمجھتا۔ اقوام متحدہ کی قرارداد 47 کا تاریخی وجود اس تنازع کے بین الاقوامی پس منظر کی ایک اہم دستاویزی حقیقت ہے، اگرچہ اس قرارداد کے نفاذ کے طریقۂ کار اور اس سے متعلق شرائط پر بھارت اور پاکستان کے مؤقف ایک جیسے نہیں ہیں۔ آ

بھارتی آئین کے نفاذ کے بعد جموں وکشمیر کو ایک مخصوص آئینی انتظام دیا گیا جس کی بنیاد آرٹیکل 370 تھا۔ اس انتظام کے تحت بھارتی آئین کی تمام دفعات خودکار طور پر جموں وکشمیر پر نافذ نہیں ہوتی تھیں بلکہ مخصوص آئینی طریقۂ کار کے ذریعے ان کا اطلاق ہوتا تھا۔ ریاست کو اپنا آئین بنانے کا اختیار حاصل رہا، اس کی اپنی قانون ساز اسمبلی موجود تھی اور بھارت کی مرکزی حکومت کے قانون سازی کے اختیارات بھی تاریخی طور پر مخصوص شعبوں تک محدود رہے، اگرچہ وقت کے ساتھ ساتھ متعدد بھارتی آئینی دفعات اور قوانین ریاست پر لاگو کیے جاتے رہے

۔یوں 5 اگست 2019 تک جموں و کشمیر بھارت کے زیر انتظام ایک ایسی ریاست تھی جس کی بھارتی وفاق کے اندر ایک خصوصی آئینی حیثیت موجود تھی۔ اسی نظام کا ایک اہم حصہ آرٹیکل 35 A تھا، جو 1954 کے صدارتی حکم کے ذریعے نافذ ہوا اور ریاستی قانون ساز ادارے کو مستقل باشندوں کی تعریف اور ان کے بعض خصوصی حقوق و مراعات کے تعین کا اختیار دیتا تھا۔ اس انتظام کے تحت زمین کی ملکیت، سرکاری ملازمتوں اور بعض دیگر معاملات میں خصوصی قانونی تحفظ موجود تھا۔ اس لیے 5 اگست 2019 کا اقدام صرف ایک آئینی شق کے خاتمے تک محدود نہیں تھا بلکہ اس نے کشمیر کے پورے آئینی، قانونی، انتظامی اور سیاسی ڈھانچے کو تبدیل کر دیا۔

5 اگست 2019 کو بھارتی حکومت نے صدارتی حکم (Constitution (Application to Jammu and Kashmir Order, 2019 — C.O. 272 کے ذریعے بھارتی آئین کی دفعات کو جموں و کشمیر پر وسیع پیمانے پر نافذ کیا۔ اس کے بعد C.O. 273 کے ذریعے آرٹیکل 370 کی سابقہ عملی حیثیت ختم کر دی گئی۔ بھارتی حکومت نے اس اقدام کو آئینی انضمام کی تکمیل قرار دیا، جبکہ پاکستان نے اسے متنازع علاقے کی یک طرفہ حیثیت تبدیل کرنے کی کوشش قرار دیا۔ بھارتی آئینی ریکارڈ میں 5 اگست 2019 کے C.O. 273 کا اندراج موجود ہے

۔اس تبدیلی کا دوسرا بڑا مرحلہ Jammu and Kashmir Reorganisation Act, 2019 تھا، جسے بھارتی پارلیمنٹ نے 9 اگست 2019 کو منظور کیا۔ اس قانون کے تحت سابق ریاستِ جموں و کشمیر کو دو الگ Union Territories میں تقسیم کیا گیا Union Territory of Jammu and Kashmir :، جس کے پاس قانون ساز اسمبلی ہے، اور Union Territory of Ladakh، جس کے پاس قانون ساز اسمبلی نہیں ہے۔ یہ نیا انتظام 31 اکتوبر 2019 سے نافذ ہوا۔ بھارتی وزارتِ داخلہ کے مطابق آج بھی جموں و کشمیر ایک Legislature والی Union Territory ہے جبکہ لداخ Legislature کے بغیر Union Territory ہے

۔یوں 5 اگست 2019 سے پہلے کی صورتِ حال اور بعد کی صورتِ حال میں بنیادی فرق یہ تھا کہ پہلے جموں و کشمیر بھارتی وفاق کی ایک ریاست اور خصوصی آئینی انتظام رکھنے والی اکائی تھی، جبکہ 31 اکتوبر 2019 کے بعد اسے ایک Union Territory بنا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ریاست کا اپنا آئین ختم ہوا، آرٹیکل 370 کی خصوصی آئینی حیثیت ختم ہوئی اور آرٹیکل 35 A کے تحت موجود خصوصی قانونی انتظام بھی ختم ہو گیا

نریندر مودی کی حکومت نے اس اقدام کو تاریخی اصلاح قرار دیتے ہوئے کہا کہ آرٹیکل 370 نے جموں و کشمیر کو بھارت کے دوسرے حصوں سے الگ رکھا ہوا تھا اور اس کی منسوخی سے ایک ملک میں ایک آئین اور ایک قانونی نظام کا اصول مضبوط ہوا۔ بھارتی حکومت کے مطابق اس سے سرمایہ کاری، ترقی، روزگار، خواتین اور پسماندہ طبقات کے حقوق اور بہتر انتظامی نظام کے امکانات پیدا ہوئے اور دہشت گردی کے خلاف کارروائی مؤثر ہوئی۔ بھارت یہ بھی مؤقف اختیار کرتا ہے کہ جموں و کشمیر کا مسئلہ اس کے نزدیک بنیادی طور پر داخلی آئینی معاملہ ہے اور 2019 کے اقدامات نے اس خطے کو مکمل طور پر بھارتی آئینی نظام میں ضم کیا۔

اس کے برعکس پاکستان کا مؤقف ہے کہ کسی متنازع علاقے کی حیثیت کو یک طرفہ طور پر تبدیل نہیں کیا جاسکتا اور 5 اگست 2019 کے اقدامات نے کشمیر کے عوام کے سیاسی، آئینی اور جمہوری حقوق کو متاثر کیا۔ پاکستان خاص طور پر یہ اعتراض اٹھاتا ہے کہ ریاست کی آبادیاتی اور سیاسی ساخت میں تبدیلیاں کشمیر کے مستقبل پر اثرانداز ہو سکتی ہیں۔ پاکستان نے 2019 کے بعد کے بعض بھارتی قوانین اور انتظامی اقدامات، جن میں domicile ، انتخابی حلقہ بندی، ووٹر فہرستوں اور زمین و جائیداد کے قوانین میں تبدیلیاں شامل ہیں، کو بھی اسی تناظر میں تنقید کا نشانہ بنایا ہے

5 اگست 2019 کو پاکستان نے بھارتی حکومت کے اعلان کو فوری طور پر مسترد کیا۔ وزارتِ خارجہ نے واضح کیا کہ جموں و کشمیر ایک بین الاقوامی طور پر متنازع علاقہ ہے اور بھارت کا کوئی یک طرفہ اقدام اس کی متنازع حیثیت کو تبدیل نہیں کر سکتا۔ اسی روز پاکستانی دفتر خارجہ نے بھارتی ہائی کمشنر کو طلب کر کے سخت احتجاجی مراسلہ یعنی strong demarche دیا۔ پاکستان نے بھارتی اقدام کو بین الاقوامی قانون اور اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادوں کے منافی قرار دیا۔ پاکستان نے اس کے بعد سفارتی تعلقات کو محدود کرنے کے اقدامات کیے۔ بھارتی ہائی کمشنر کو واپس جانے کے لیے کہا گیا، بھارت کے لیے نامزد پاکستانی ہائی کمشنر کو نئی دہلی نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا گیا اور دونوں ملکوں کے تجارتی و سفارتی تعلقات پر نظر ثانی کی گئی۔ وزیر اعظم پاکستان نے مختلف عالمی رہنماؤں سے رابطے کر کے کشمیر کی صورتحال اور اس کے علاقائی امن و سلامتی پر ممکنہ اثرات کو اجاگر کیا۔ پاکستان نے مسئلہ کشمیر کو دوبارہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں اٹھایا اور اس امر پر زور دیا کہ کشمیر کا مسئلہ کسی یک طرفہ آئینی فیصلے سے ختم نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا سفارتی مؤقف آج بھی یہی ہے کہ مسئلے کا حل اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں اور کشمیری عوام کی خواہشات کے مطابق ہونا چاہیے

5اگست 2019 کے اقدامات کو بھارت کے اندر بھی عدالت میں چیلنج کیا گیا۔ متعدد درخواستوں میں مؤقف اختیار کیا گیا کہ آرٹیکل 370 کو اس انداز سے ختم کرنے اور ریاست کو Union Territories میں تقسیم کرنے کا طریقہ آئینی حدود سے تجاوز تھا۔ یہ معاملہ بالآخر بھارتی سپریم کورٹ کے پانچ رکنی آئینی بینچ کے سامنے پہنچا۔ 11 دسمبر 2023 کو بھارتی سپریم کورٹ نے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے آرٹیکل 370 کی منسوخی سے متعلق بھارتی حکومت کے اقدام کو برقرار رکھا۔ عدالت نے بنیادی طور پر یہ مؤقف اختیار کیا کہ آرٹیکل 370 ایک عارضی نوعیت کی آئینی شق تھی اور صدرِ بھارت کے ذریعے اسے غیر مؤثر کرنے کے اقدام کو آئینی طور پر برقرار رکھا جاسکتا ہے۔ عدالت نے اس طرح بھارتی حکومت کی 2019 کی بنیادی آئینی کارروائی کو کالعدم قرار نہیں دیا۔ لیکن اسی فیصلے میں ایک اہم پہلو یہ بھی تھا کہ سپریم کورٹ نے جموں وکشمیر کی ریاستی حیثیت جلد از جلد بحال کرنے اور انتخابات کرانے کی سمت ہدایت دی۔ اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہو گا کہ عدالت نے ہر معاملے میں حکومت کے تمام اقدامات کو غیر مشروط سیاسی توثیق دے دی؛ اس نے آرٹیکل 370 کے معاملے میں حکومت کے اقدام کو برقرار رکھتے ہوئے ریاستی حیثیت کی بحالی کی اہمیت بھی واضح کی

۔ کیا بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے سے کشمیر کا بین الاقوامی تنازع ختم ہو گیا۔؟

یہ ایک انتہائی اہم قانونی نکتہ ہے۔ بھارتی سپریم کورٹ کا فیصلہ بھارتی آئینی قانون کے دائرے میں تھا۔ عدالت نے یہ طے کیا کہ بھارتی آئین کے تحت آرٹیکل 370 سے متعلق حکومت کا اقدام قانونی تھا یا نہیں۔ اس فیصلے کا دائرۂ اختیار بھارت کے آئینی نظام تک ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اقوام متحدہ کے ریکارڈ میں کشمیر سے متعلق تاریخی قراردادیں خود بخود ختم ہو گئیں یا پاکستان اور بھارت کے درمیان کشمیر کا بین الاقوامی تنازع باہمی اتفاق سے ختم ہو گیا۔ اسی لیے پاکستان آج بھی یہ مؤقف رکھتا ہے کہ 2019 کے بھارتی اقدامات نے کشمیر کی متنازع حیثیت کو تبدیل نہیں کیا۔ پاکستان نے مسلسل زور دیا ہے کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی متعلقہ قراردادیں اور کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کا اصول اس تنازع کے حل کی بنیاد ہونا چاہیے

5اگست 2019 کے بعد بھارتی حکومت نے جموں وکشمیر میں متعدد انتظامی اور قانونی تبدیلیاں کیں۔ پاکستان ان تبدیلیوں کو کشمیر کی آبادیاتی اور سیاسی ساخت تبدیل کرنے کی کوشش قرار دیتا ہے، جبکہ بھارت انہیں انتظامی اصلاحات اور مساوی قانونی حقوق کے نفاذ کے طور پر پیش کرتا ہے۔ ان میں domicile rules ، انتخابی حلقہ بندی، ووٹر فہرستوں میں نئے طبقات کی شمولیت اور زمین وجائیداد سے متعلق قوانین میں تبدیلیاں شامل ہیں۔ پاکستان نے ان اقدامات پر اقوام متحدہ اور عالمی برادری کی توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی ہے۔ دوسری طرف بھارت یہ مؤقف رکھتا ہے کہ ان تبدیلیوں کا مقصد طویل عرصے سے جاری سیاسی وانتظامی عدم مساوات کو ختم کرنا اور جموں وکشمیر کو دوسرے بھارتی علاقوں کے برابر لانا ہے۔

2019 کے بعد پہلی مرتبہ 2024 میں جموں و کشمیر میں قانون ساز اسمبلی کے انتخابات منعقد ہوئے۔ ان انتخابات میں 90 نشستوں پر مقابلہ ہوا اور نیشنل کانفرنس کے رہنما عمر عبداللہ کی قیادت میں حکومت قائم ہوئی۔ یوں 2019 کے بعد جموں و کشمیر میں ایک منتخب مقامی حکومت تو وجود میں آگئی، لیکن اس کی آئینی حیثیت اب بھی Union Territory ہی ہے ۔یہی موجودہ صورتِ حال کا ایک اہم تضاد ہے: جموں و کشمیر میں منتخب حکومت واپس آگئی ہے، لیکن ریاستی حیثیت واپس نہیں آئی۔ بھارتی سپریم کورٹ کے فیصلے اور مرکزی حکومت کی سابق یقین دہانیوں کے باوجود اگست 2026 تک ریاستی حیثیت بحال نہیں ہوئی۔

جولائی 2026 میں وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ اور نیشنل کانفرنس نے ریاستی حیثیت کی بحالی کے لیے نئی سیاسی مہم شروع کی اور نئی دہلی میں احتجاج بھی کیا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ 2019 کے بعد پیدا ہونے والا داخلی آئینی مسئلہ ابھی مکمل طور پر حل نہیں ہوا۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ کشمیر کی بعض مقامی سیاسی جماعتیں اب بھی ریاستی حیثیت سے آگے بڑھ کر آرٹیکل 370 کی سابقہ خصوصی حیثیت کی بحالی کا مطالبہ کرتی ہیں، جبکہ موجودہ حکمران نیشنل کانفرنس کی عملی سیاسی مہم کا ایک بڑا مرکز ریاستی حیثیت کی بحالی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ 2019 کے فیصلے کے بعد خود بھارتی زیرِ انتظام جموں و کشمیر کے اندر بھی سیاسی بحث مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی۔ پاکستان نے 2019 کے بعد اپنے بنیادی مؤقف میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں کی۔ وہ کشمیر کو حل طلب تنازع سمجھتا ہے، 5 اگست 2019 کے بھارتی اقدامات کو یک طرفہ اور غیر قانونی قرار دیتا ہے اور کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کرتا ہے۔

پاکستان ہر سال 5 اگست کو یومِ استحصال کے طور پر مناتا ہے اور اس موقع پر عالمی برادری، اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے اداروں سے کشمیر کی صورتحال پر توجہ دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔ 2025 میں بھی پاکستان نے اقوام متحدہ کے جنرل اسمبلی و سلامتی کونسل کے صدور، اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل، انسانی حقوق کے ہائی کمشنر اور او آئی سی کے سیکرٹری جنرل کو کشمیر کی صورتحال سے آگاہ کرنے کے لیے خطوط بھیجے تھے۔ پاکستان کا مؤقف یہ بھی ہے کہ جنوبی ایشیا میں مستقل امن صرف اسی صورت ممکن ہے جب جموں و کشمیر کا تنازع کشمیری عوام کی خواہشات اور متعلقہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق حل ہو۔ اس لیے اسلام آباد 5 اگست 2019 کی آئینی تبدیلی کو مسئلے کا حل نہیں بلکہ تنازع کے ایک نئے مرحلے کے طور پر دیکھتا ہے یومِ استحصال کو صرف بھارت مخالف دن کے طور پر دیکھنے کے بجائے اسے تاریخ، قانون، انسانی حقوق، حقِ خود ارادیت اور جنوبی ایشیا میں پائیدار امن کے تناظر میں سمجھنے کی ضرورت ہے

۔5 اگست 2019 نے جموں و کشمیر کے اندر ایک بڑی آئینی تبدیلی ضرور پیدا کی، مگر اس نے پاکستان اور بھارت کے درمیان بنیادی تنازع ختم نہیں کیا۔ بھارت نے اپنے داخلی آئینی نظام میں کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر دی؛ بھارتی سپریم کورٹ نے 2023 میں اس اقدام کو برقرار رکھا؛ 2024 میں وہاں منتخب حکومت واپس آئی؛ مگر ریاستی حیثیت اگست 2026 تک بحال نہیں ہوئی۔ دوسری جانب پاکستان اقوام متحدہ کی متعلقہ قراردادوں، کشمیری عوام کے حقِ خود ارادیت اور کشمیر کی متنازع حیثیت پر اپنا مؤقف برقرار رکھے ہوئے ہے

کشمیر کی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کسی خطے کی آئینی یا انتظامی ساخت تبدیل کرنا اور کسی دیرینہ بین الاقوامی تنازع کو حل کرنا دو مختلف امور ہیں۔ 5 اگست 2019 کو بھارت نے جموں و کشمیر کی داخلی آئینی حیثیت ضرور بدل دی، لیکن پاکستان کے ساتھ کشمیر کا بنیادی تنازع ختم نہیں ہوا۔ آج بھی سوال صرف یہ نہیں کہ آرٹیکل 370 ختم ہوا یا نہیں؛ اصل سوال یہ ہے کہ جموں و کشمیر کے عوام کے سیاسی مستقبل، شناخت، نمائندگی اور حقِ خود ارادیت کا مسئلہ کس طرح ایک ایسے پائیدار اور قابلِ قبول سیاسی حل تک پہنچے گا جو خطے میں امن، استحکام اور انسانی وقار کی ضمانت دے

۔یومِ استحصال اسی لیے ہمیں ماضی کے واقعات یاد کرنے کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی کرنے پر مجبور کرتا ہے کہ کیا آئینی تبدیلی کسی قوم کے سیاسی سوال کا متبادل ہو سکتی ہے؟ کیا طاقت کے ذریعے خاموشی کو سیاسی رضامندی سمجھا جا سکتا ہے؟ اور کیا جنوبی ایشیا میں مستقل امن کشمیر کے دیرینہ تنازع کے منصفانہ حل کے بغیر ممکن ہے؟ ان سوالات کا جواب صرف سیاسی نعروں میں نہیں بلکہ تاریخ، قانون، سفارت کاری اور سب سے بڑھ کر کشمیری عوام کے مستقبل کو سامنے رکھ کر تلاش کرنا ہو گا

۔5 اگست — یومِ استحصالِ کشمیر — ہمیں یاد دلاتا ہے کہ تاریخ کے کسی باب کو آئینی حکم سے بند کیا جا سکتا ہے، مگر ایک دیرینہ سیاسی تنازع اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک اس کے بنیادی فریقوں اور عوام کے جائز مطالبات کا قابلِ قبول حل تلاش نہ کر لیا جائے



4اگست: آسٹریلیا کا خاموش المیہ — "چوری شدہ نسلیں"، چھینی ہوئی شناخت اور تاریخی انصاف کی مسلسل جدوجہد۔

ہر سال 4 اگست کو آسٹریلیا میں "نیشنل ابوریجنل اینڈ ٹوریس اسٹریٹ آئی لینڈر چلڈرنز ڈے (National Aboriginal and Torres Strait Islander Children's Day) " منایا جاتا ہے۔

یہ دن محض ایک روایتی تہوار نہیں بلکہ آسٹریلیا کی فرسٹ نیشنز (First Nations) یعنی ابوریجنل اور ٹوریس اسٹریٹ آئی لینڈر اقوام کی ثقافت، صلاحیتوں اور ان کے بچوں کی صلاحتوں کا احترام کرنے کا موقع ہے۔

اس دن کا سب سے دردناک اور اہم پہلو ان بچوں کو ایک مشترکہ شناخت اور سالگرہ کی تاریخ فراہم کرنا ہے جو ماضی کی مظلومیت کے باعث اپنی حقیقی تاریخ پیدائش سے محروم ہو گئے تھے۔

اس قومی دن کا آغاز پہلی بار 1988ء میں "سیکریٹریٹ آف نیشنل ابوریجنل اینڈ آئی لینڈر چائلڈ کیئر (SNAICC) "کی جانب سے کیا گیا تھا تا کہ ان متاثرہ نسلوں میں ثقافتی فخر، برادری کے ساتھ شفا کا احساس اور عام عوام میں تاریخی آگاہی پیدا کی جا سکے۔

1869ء تا 1950ء) 1910ء سے 1970ء کے درمیانی عرصے میں نسلی برتری اور نو آبادیاتی پالیسیوں کے تحت تقریباً 30,000 سے 1,00,000 کے قریب (یعنی مجموعی آبادی کا 10 سے 33 فیصد) بچوں کو ان کے والدین سے زبردستی چھین لیا گیا۔

آسٹریلیا چونکہ 1901ء میں وفاق بننے سے قبل مختلف برطانوی نو آبادیوں پر مشتمل تھا، اس لیے بچوں کی جبری علیحدگی کی یہ پالیسیاں کسی ایک مرکزی حکومت کے بجائے مختلف ریاستوں کی قانون سازی کے ذریعے نافذ کی گئیں جن میں اہم ترین یہ تھیں :

وکٹوریہ (1869ء): وکٹوریہ پہلی نو آبادی تھی جس نے "بورڈ فار پروٹیکشن آف ابوریجنز" کو ابوریجنل لوگوں کی زندگیوں کو مکمل کنٹرول کرنے کے اختیارات دیے، جس کے بعد 1884ء کی ترمیم کے تحت مخلوط نسل کے افراد کو ریزروز سے خارج کیا گیا۔

مغربی آسٹریلیا اور کوئینز لینڈ (1886ء / 1897ء): ان ریاستوں میں سخت تحفظاتی قوانین بنے۔ کوئینز لینڈ میں چیف پروٹیکٹر جے ڈبلیو بلیکلی (1913–1942) نے مقامی اور غیر مقامی آبادی کی مکمل علیحدگی پر زور دیا

۔نیو ساؤتھ ویلز (1909ء): یہاں "ابوریجنز پروٹیکشن ایکٹ" منظور ہوا، جس میں 1915ء کی ترمیم کے بعد حکومتی بورڈ کو یہ لامحدود اختیار ملا کہ وہ کسی بھی وجہ سے بچے کو والدین سے الگ کر سکتا ہے۔

جنوبی آسٹریلیا اور ناردرن ٹیریٹری (1910–1911ء): یہاں بھی اسی نوعیت کے قانون نافذ کیے گئے۔

1937ء میں کینبرا کانفرنس کے دوران تمام ریاستوں اور وفاقی حکومت نے "اسیملیشن "

(Inundation/ Assimilation) یعنی مقامی آبادی بالخصوص مخلوط نسل کو سفید فام معاشرے میں مکمل طور پر جذب کرنے کا فیصلہ کیا، جو 1950ء کی دہائی تک باضابطہ قومی پالیسی بن گیا۔

ظاہری طور پر حکومتی بیانیے میں اس ظالمانہ اقدام کو "بچوں کی بہتری اور تحفظ "کا نام دیا گیا، تاہم اس پالیسی کے پس پردہ مقاصد انتہائی لرزہ خیز تھے۔

اس کے اصل مقاصد میں مقامی باشندوں کا ان کی روایتی زمینوں، زبان، اور مذہبی و روحانی رسومات سے تعلق ختم کرنا سر فہرست تھا اور یہ نسلی مفروضہ بھی قائم کیا گیا کہ "خالص نسل" کے ابوریجنل لوگ وقت کے ساتھ خود بخود ختم ہو جائیں گے، جبکہ "مخلوط نسل" کے بچوں کی رنگت ہلکی ہونے کی وجہ سے انہیں سفید فام معاشرے میں آسانی سے جذب کیا جا سکتا ہے۔ ان بچوں کو سرکاری یا خیراتی اداروں کے بچوں کے گھروں (مثلاً بوماڈیری کا مشن ہوم، کوٹا ماندرا گرلز ہوم، اور کنچیلا بوائز ٹریننگ ہوم) میں رکھا گیا یا پھر غیر مقامی خاندانوں کو گود دے دیا گیا جہاں ان پر کڑے مذہبی و انتظامی ضوابط مسلط کیے گئے۔

انضمام کا یہ نو آبادیاتی خواب مکمل طور پر ناکام رہا کیونکہ ابوریجنل شناخت کو ختم نہ کیا جا سکا۔ تاہم، اس کے نتیجے میں جو نقصان ہوا وہ ناقابلِ تلافی تھا۔ طبی اور نفسیاتی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ متاثرہ افراد اور ان کی آنے والی نسلوں میں صدماتی تناؤ (PTSD)، شدید ڈپریشن، اضطراب اور خودکشی کا رجحان عام آسٹریلوی آبادی کے مقابلے میں انتہائی زیادہ ہے

یہ المیہ صرف آسٹریلیا تک محدود نہیں تھا؛ اسی دور میں کینیڈا جیسے ممالک میں بھی مقامی آبادیوں کے بچوں کو زبردستی "ریزیڈینشل اسکولوں" میں بھیجا جاتا رہا، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ عمل اٹھارویں اور انیسویں صدی کی ایک وسیع گیر نو آبادیاتی سوچ کا نتیجہ تھا۔ تاہم عالمی ضمیر اس پر خاموش نہ رہا اور اس پر کافی لے دے ہوتی رہی۔

1995ء میں آسٹریلین ہیومن رائٹس کمیشن نے اس المیے پر قومی تحقیقات کا آغاز کیا اور 500 سے زائد متاثرہ گواہوں کے بیانات سنے۔ اس کے نتیجے میں 1997ء میں تاریخی "برنگنگ دیم ہوم (Bringing Them Home) "رپورٹ شائع کی گئی جس میں 54 سفارشات پیش کی گئیں، جن میں سب سے بنیادی سفارش ریاست کی طرف سے باضابطہ معذرت تھی

1997ء آسٹریلیا کی 6 ریاستوں اور 2 علاقوں کی اسمبلیوں نے باضابطہ معذرت کی قراردادیں منظور کیں (تاہم اس وقت کے وزیر اعظم جان ہاورڈ نے قومی سطح پر معذرت سے انکار کیا)۔ 13 فروری 2008ء وزیر اعظم کیون رڈ (Kevin Rudd) نے آسٹریلوی پارلیمنٹ میں فرسٹ نیشنز سے تاریخی قومی معذرت (National Apology) پیش کی اور ماضی کی غلطیوں کا باضابطہ اعتراف کیا

۔2020ء "ہیلنگ فاؤنڈیشن" کی رپورٹ میں نشان دہی کی گئی کہ متاثرین آج بھی شدید پسماندگی کا شکار ہیں، اور حکومت پر سفارشات پر مکمل عمل نہ کرنے پر تنقید کی گئی۔ بعض متاثرین کو حکومت کی جانب سے $75,000 فی کس مالی ازالے اور $7,000 علاج معالجے کے لیے دیے گئے، تاہم بین النسلی صدمے (Intergenerational Trauma) کا مداوا مالی معاونت سے ممکن نہ ہو سکا

4اگست کا دن محض ایک تقریب نہیں بلکہ آسٹریلیا کے اس تاریک تاریخ کی یاد دہانی ہے جس میں بچوں کو ان کے خاندان اور شناخت سے محروم کیا گیا۔

یہ دن شفا، قومی اعترافِ جرم، اور فرسٹ نیشنز کے بچوں کے روشن اور خوددار مستقبل کے عزم کا دن ہے تاکہ یہ یقینی بنایا جا سکے کہ ماضی کی بدترین غلطیوں کو دوبارہ کبھی نہ دہرایا جائے۔







جنریشن زی، ("GEN "Z) یا محسن نقوی کے " "کاکروچ " اسے سمجھنا ضروری ہے یا اس سے ٹکرائو۔؟ کیا بے بی بومرز (Baby Boomers) جین زی کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں ؟(فیصلہ اپ کے اپنے اختیار میں)

یکم جنوری 2025ء کو پاکستان کے ایک انگریزی اخبار The Express Tribune میں ایک رائے (Op-Ed) شائع ہوئی جس کا عنوان "It Is Over" یعنی "اب یہ سلسلہ ختم) یہ تحریر زورین نظامانی کی تھی، جو امریکہ کی یونیورسٹی آف آرکنساس ایٹ لٹل راک میں جرائم شناسی (Criminology) کے شعبے میں پی ایچ ڈی کے طالب علم ہیں اور معروف فنکارون قیصر نظامانی اور فضیلہ قاضی کے بیٹے ہیں

۔یہ بیانیہ روایتی اشرافیہ، پرانے سیاسی بیانیوں اور موجودہ ملکی حالات سے متعلق نئی نسل کی مایوسی کے بارے میں تھا

۔اس مضمون کو بعد میں ویب سائٹ سے ہٹادیا گیا جس پر سوشل میڈیا پر شدید رد عمل آیا اور اس کے اسکرین شاٹس خوب وائرل ہوئے۔اس میں سوشل میڈیا پر قارئین کی اکثریت ایک نئے لفظ جین زی سے روشناس ہوئی۔جس نے پاکستانی معاشرے میں "جین زی" کی اصطلاح کو ایک نئی اور وسیع پہچان دے دی، اور یہی وہ محرک بنا جس نے اس نسل کی سوچ، رویوں اور توقعات کو سمجھنے کی ضرورت کو قومی سطح پر اجاگر کیا۔

پچھلے دنوں وفاقی وزیر داخلہ محسن نقوی نے پہلی معاشی سربراہی کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ نوجوانوں کو "کاکروچ" کہیں یا جو مرضی کہیں، اگر یہ ایک ہوگئے تو موجودہ فرسودہ نظام کو الٹ دیں گے۔ان کا یہ بیان نوجوانوں کی طاقت اور یہ واضح کرنا تھا کہ بے روزگاری اور مسائل کے شکار نوجوان اگر اپنے حقوق کے لیے متحد ہوگئے تو کوئی نظام انہیں نہیں روک سکے گا۔انہوں نے تسلیم کیا کہ پچھلے 70، 80 سال سے یہ ملکی نظام ٹھیک طرح سے کام نہیں کر رہا۔اور انہوں نے حکومت کو وارننگ دی کہ وہ عوام اور نوجوانوں کے باغی ہونے سے پہلے خود نظام کو درست کرلے اور ان کے مسائل حل کرے۔اس طرح بالواسطہ انہوں نے بھی "جین جی " کے نقطہ نظر کو اگے بڑھایا۔

جنریشن زی کیا ہے؟اصطلاحی طور پر "جنریشن زی" یا "جین زی" سے مراد وہ نسل ہے جو 1997ء سے 2012ء کے درمیان پیدا ہوئی۔یہ پہلی نسل ہے جسے ہوش سنبھالتے ہی انٹرنیٹ، سمارٹ فون اور سوشل میڈیا میسر رہے، اسی لیے اسے "ڈیجیٹل نیٹِوز (Digital Natives) " بھی کہا جاتا ہے۔سماجی علوم میں یہ اصطلاح بنیادی طور پر مختلف نسلوں کے مابین فکری اور طرزِ عمل کے فرق، یعنی "جنریشنل ڈیوائیڈ"، کو سمجھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

سماجیات کے ماہرین عمومی طور پر پیدائشی سالوں کی بنیاد پر نسلوں کو مختلف زمروں میں تقسیم کرتے ہیں جیسے۔بے بی بومرز (Baby Boomers)، یعنی 1946ء سے 1964ء کے درمیان پیدا ہونے والے افراد، وہ نسل ہے جس نے استحکام، مستقل ملازمت اور مادی وسائل کے حصول کو سب سے زیادہ اہمیت دی۔

ان کے بعد جنریشن ایکس (Generation X) کا دور آتا ہے، یعنی 1965ء سے 1980ء کے درمیان پیدا ہونے والے افراد، جو ٹیکنالوجی کے عروج سے پہلے اور بعد کے درمیانی دور میں پروان چڑھے

۔اس کے بعد ملینیئلز (Millennials) کا زمانہ ہے، یعنی 1981ء سے 1996ء کے درمیان پیدا ہونے والے افراد، جنہوں نے انٹرنیٹ اور ڈیجیٹل دنیا کو اپنی آنکھوں کے سامنے تشکیل پاتے دیکھا اور جو ذاتی و پیشہ ورانہ زندگی میں توازن کو ترجیح دیتے ہیں۔

اب باری آتی ہے جنریشن زی کی، یعنی 1997ء سے 2012ء کے درمیان پیدا ہونے والے نوجوانوں کی، جنہوں نے ڈیجیٹل دنیا میں ہی جنم لیا اور اسی میں پروان چڑھے۔ ان نسلوں کے مابین فرق دراصل کسی ایک نسل کی برتری یا کمتری کا معاملہ نہیں، بلکہ مختلف ادوار کے معاشی، تکنیکی اور سماجی حالات کا فطری نتیجہ ہے، جس نے ہر نسل کی ترجیحات اور طرزِ فکر کو الگ انداز میں تشکیل دیا۔

جین زی نسل ہر معاملے میں ٹیکنالوجی اور سوشل میڈیا، جیسے فیس بک ٹک ٹاک، انسٹاگرام اور ایکس، کو بروئے کار لاتی ہے، اور معلومات کے حصول کے لیے روایتی ٹی وی چینلز یا اخبارات کے بجائے براہِ راست ڈیجیٹل اور بین الاقوامی ذرائع پر انحصار کرتی ہے۔ یہ نسل روایتی حوالوں، خاندانی و سیاسی فیصلوں اور مذہبی و سماجی بیانیوں کو بلا تحقیق قبول کرنے کے بجائے ان پر کھلے عام سوال اٹھاتی ہے۔ چونکہ یہ نسل انٹرنیٹ کے ذریعے دنیا بھر کے ہم عمر افراد سے جڑی ہوئی ہے، اس لیے اس کی سوچ مقامی و علاقائی تعصبات سے کہیں بڑھ کر عالمی انصاف، انسانی حقوق اور ماحولیاتی تبدیلی جیسے وسیع تر مسائل پر مرکوز رہتی ہے۔ ملازمت کے حوالے سے بھی جین زی کا رجحان روایتی سرکاری یا مستقل نوکریوں کے بجائے فری لانسنگ، ڈیجیٹل مہارتوں، ای کامرس اور اسٹارٹ اپس کے ذریعے خود مختاری کے حصول کی جانب زیادہ ہے۔ یہ نسل موروثی یا خاندانی سیاست، جذباتی نعروں اور روایتی تقریروں سے بیزار دکھائی دیتی ہے، اور اس کے بجائے شفافیت، کارکردگی اور ڈیجیٹل آزادی، جیسے بلا تعطل تیز رفتار انٹرنیٹ تک رسائی، کی بنیاد پر اپنے سیاسی شعور کا اظہار کرتی ہے۔ اسی طرح ذہنی صحت، ماحولیاتی تبدیلی اور شخصی آزادی جیسے موضوعات پر بھی جین زی خاصی حساس اور فعال دکھائی دیتی ہے، جسے بعض اوقات پرانی نسلیں محض "حد سے زیادہ حساسیت" یا بغاوت کا نام دے دیتی ہیں، حالانکہ حقیقت میں یہ دونوں نسلوں کے مابین ایک دوسرے کو سمجھنے کی صلاحیت کا فرق ہے، بہ نسبت حقیقی ٹکراؤ کے۔

ایک عالمگیر رجحانیہ اور یہ امر پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ جین زی کی سیاسی و سماجی بیداری محض پاکستان تک محدود نہیں، بلکہ ایک عالمی رجحان کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ سال 2024ء میں بنگلہ دیش میں طلبہ کی زیرِ قیادت تحریک، جس کے نتیجے میں طویل عرصے سے برسرِ اقتدار وزیرِ اعظم شیخ حسینہ کو اقتدار چھوڑنا پڑا، کو عمومی طور پر "پہلی کامیاب جین زی تحریک" قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد سال 2025ء کے دوران نیپال، انڈونیشیا، مراکش، مڈغاسکر، پیرو، فلپائن، تیمور لیستے، مالدیپ، کینیا اور تنزانیہ سمیت گیارہ سے زائد ممالک میں نوجوانوں کی زیرِ قیادت مظاہروں کی ایک لہر دیکھنے میں آئی۔ نیپال میں ستمبر 2025ء میں سوشل میڈیا پر پابندی کے خلاف شروع ہونے والے مظاہرے دیکھتے ہی دیکھتے وسیع تر بدعنوانی مخالف تحریک میں بدل گئے، جس کے نتیجے میں وزیرِ اعظم کے پی شرما اولی کو استعفیٰ دینا پڑا۔ انڈونیشیا اور مڈغاسکر سمیت متعدد دیگر ممالک میں بھی حکومتی اداروں کو نوجوانوں کے شدید ردعمل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مظاہروں کا مشترکہ محرک اقربا پروری، بدعنوانی، بڑھتی ہوئی معاشی ناہمواری اور روزگار کے محدود مواقع رہے، جبکہ جاپانی منگا "ون پیس" کے ایک کردار سے ماخوذ "جولی راجر" پرچم ان مظاہروں کی ایک مشترکہ علامت بن کر ابھرا۔

کارنیگی انڈومنٹ فار انٹرنیشنل پیس کی ایک رپورٹ کے مطابق مارچ 2026ء تک، گزشتہ بارہ ماہ کے دوران دنیا کے 73 سے زائد ممالک میں 120 سے زیادہ قابلِ ذکر حکومت مخالف مظاہرے ریکارڈ کیے جا چکے تھے، جو 2017ء کے بعد کی سب سے بڑی تعداد ہے۔ اسی تناظر میں بھارت میں بھی امتحانی پرچوں کے افشا اور بے روزگاری کے خلاف طلبہ کی تحریک نے وفاقی وزیرِ تعلیم کو استعفیٰ دینے پر مجبور کیا۔ اس عالمی پس منظر میں دیکھا جائے تو پاکستان میں جین زی سے متعلق حالیہ بحث دراصل ایک وسیع تر خطے اور دنیا میں جاری تبدیلی کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔

پاکستان کی آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ مختلف رپورٹس کے مطابق ملک کی تقریباً 75 فیصد آبادی 35 سال سے کم عمر ہے، جبکہ جین زی، یعنی 1997ء سے 2012ء کے درمیان پیدا ہونے والے افراد کی تعداد ملک میں تقریباً 70 ملین کے قریب بتائی جاتی ہے۔ اتنی بڑی نوجوان آبادی کسی بھی ملک کے مستقبل کی معاشی اور سیاسی سمت پر گہرے اثرات مرتب کر سکتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں جین زی کا موضوع محض ایک عارضی بحث نہیں بلکہ ایک اہم قومی مسئلہ بن چکا ہے

۔پاکستان میں بھی جین زی کی زیرِ قیادت احتجاجی سرگرمیاں دیکھنے میں آچکی ہیں۔اکتوبر 2025ء میں پاکستان کے زیرِ انتظام کشمیر کے شہر مظفر آباد میں نوجوانوں نے بنیادی سہولیات، بجلی اور آٹے کی قیمتوں سمیت مختلف مطالبات کو لے کر مظاہرے کیے، جن کی قیادت عوامی ایکشن کمیٹی نے کی۔ان مظاہروں کے دوران پیش آنے والی جھڑپوں میں کئی افراد جاں بحق ہوئے اور علاقے میں عارضی طور پر انٹرنیٹ سروسز بھی معطل کر دی گئیں۔اس کے کچھ ہی عرصے بعد، نومبر 2025ء میں تعلیمی اصلاحات کے خلاف طلبہ کے مظاہروں کی ایک نئی لہر نے اسی خطے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، جو بتدریج وسیع تر حکومتی پالیسیوں کے خلاف نوجوانوں کی ناراضی کے اظہار میں تبدیل ہو گئی۔اسی طرح مختلف بین الاقوامی رپورٹس میں پاکستان میں نوجوانوں کو درپیش بے روزگاری، محدود جمہوری آزادیوں اور ڈیجیٹل نگرانی سے متعلق خدشات کا بھی ذکر ملتا ہے، جنہیں مختلف انسانی حقوق کی تنظیموں نے وقتاً فوقتاً اجاگر کیا.

حقائق کی روشنی میں چند اہم نکات قابلِ غور ہیں۔سب سے پہلے، زورین نظامانی کے مضمون کے ہٹائے جانے کا واقعہ اس بات کی ایک دلچسپ مثال ہے کہ ڈیجیٹل دور میں معلومات کو دبانے کی کوشش اکثر اس کے برعکس نتیجہ دیتی ہے۔ مضمون کے ہٹائے جانے نے دراصل اسے کہیں زیادہ پھیلا دیا، بہ نسبت اس کے کہ وہ محض ایک عام سے اخباری مضمون کے طور پر شائع ہو کر گزر جاتا۔یہ رجحان دنیا بھر میں ڈیجیٹل سنسر شپ کی کوششوں کے ساتھ عموماً دیکھنے میں آتا ہے

۔دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ کسی ایک واقعے یا چند مظاہروں کی بنیاد پر پوری نسل کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے سے گریز کیا جانا چاہیے۔جہاں بہت سے لوگوں نے اس مضمون کو نسلی جذبات کی درست ترجمانی قرار دیا، وہیں ناقدین کا یہ مؤقف بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس پورے معاملے کو غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا۔کسی بھی نسل کے اندر خیالات، ترجیحات اور سیاسی رجحانات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے، اور "جین زی" کو ایک یکساں و متحد سیاسی طبقہ سمجھ لینا حقیقت کو حد سے زیادہ سادہ بنا کر پیش کرنے کے مترادف ہو گا۔

تیسرا نکتہ یہ ہے کہ پاکستان کا معاملہ عالمی رجحان سے الگ تھلگ نہیں۔بنگلہ دیش سے نیپال، اور انڈونیشیا سے مراکش تک، دنیا بھر میں نوجوان نسل ڈیجیٹل رابطہ کاری کے ذریعے اپنے مقامی مسائل کو عالمی تحریکوں سے جوڑ رہی ہے۔اس تناظر میں پاکستان جیسے ممالک کے لیے، جہاں نوجوان آبادی کا تناسب انتہائی بلند ہے، یہ رجحان محض ایک عارضی بحث نہیں بلکہ ایک طویل المدتی سماجی و سیاسی حقیقت معلوم ہوتا ہے، جس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے

۔ آخر میں، یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ نسلوں کے مابین پائے جانے والے فرق کو محض ٹکراؤ کے بجائے باہمی مکالمے کے ایک قیمتی موقع کے طور پر دیکھا جانا چاہیے۔ روایتی ادارے، چاہے وہ حکومتی ہوں، خاندانی ہوں یا میڈیا سے متعلق، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ جین زی کی ترجیحات، خدشات اور توقعات کو سمجھنے کی کوشش کریں، بجائے اس کے کہ محض پرانے طریقوں پر انحصار کرتے رہیں۔ اس وقت مایوس نوجوان نسل احتجاج کے بجائے خاموشی سے ملک چھوڑنے کا راستہ اختیار کر سکتی ہے، جو کہ کسی بھی ملک کے لیے ایک سنگین اور طویل المدتی نقصان کا باعث بن سکتا ہے۔ مگر جو لوگ باہر نہیں جا سکتے وہ احتجاج کا راستہ اختیار کرتے ہیں

اور بقول محسن نقوی اگر یہ کاکروچ یا جین زی اکٹھے ہو گئے تو پھر اصلاح کا وقت نہیں بچے گا۔ یہی بات خواجہ سعد رفیق بے بھی زور دے کر کہی ہے

جنریشن زی محض ایک عمر کا گروہ نہیں، بلکہ سوچ کے ایک نئے انداز کی نمائندہ نسل ہے، جو ڈیجیٹل دنیا میں پروان چڑھی اور جس نے شفافیت، مساوات اور آزادئ اظہار کو اپنی بنیادی اقدار کے طور پر اپنایا ہے۔ پاکستان میں زورین نظامانی کے مضمون سے شروع ہونے والی بحث، اس کے محرکات خواہ کچھ بھی رہے ہوں، اس حقیقت کو اجاگر کرتی ہے کہ نوجوان نسل کی آواز کو سنجیدگی سے سننا، سمجھنا اور اس کے ساتھ مکالمہ کرنا، فرسودہ بیانیوں کو دہرانے سے کہیں زیادہ ضروری ہو چکا ہے

۔ یہ فیصلہ بہر حال معاشرے کے ہر فرد کے اپنے ہاتھ میں ہے کہ آیا نسلوں کے مابین یہ فرق باہمی افہام و تفہیم اور ترقی کا ذریعہ بنے، یا پھر غیر ضروری تصادم کا۔



یکم اگست (1834ء — برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے غلامی کے خاتمے کا تاریخی دن)۔ زنجیریں ختم ہوئیں، مگر کیا غلامی بھی ختم ہو گئی؟ پاکستان میں جدید غلامی کا ایک جائزہ

انسانی تاریخ میں چند دن ایسے ہوتے ہیں جو ظلم کے خلاف انسانی ضمیر کی فتح کی علامت بن جاتے ہیں۔ یکم اگست 1834ء ایسا ہی ایک دن ہے، جب پوری دنیا میں ایک نئی صبح طلوع ہوئی — 8 لاکھ سے زائد انسانوں نے غلامی کی زنجیروں سے نجات پائی۔ یہ محض ایک قانونی دستاویز نہیں بلکہ دہائیوں کی عوامی جدوجہد، اخلاقی بیداری اور بے مثال قربانیوں کا ثمر تھا۔

اٹھارویں اور انیسویں صدی میں برطانوی نو آبادیاتی نظام میں غلامی ایک منافع بخش "کاروبار" کی حیثیت رکھتی تھی: مغربی افریقہ سے لاکھوں انسانوں کو زبردستی اغوا کر کے بحری جہازوں کے ذریعے کیریبین اور امریکی نو آبادیات میں پہنچایا جاتا تھا۔ انہیں شوگر، تمباکو اور کپاس کے باغات میں جبری مشقت پر لگایا جاتا تھا۔ غلاموں کی خرید و فروخت برطانوی معیشت کا اہم ستون سمجھی جاتی تھی، خصوصاً برسٹل اور لیورپول جیسی بندرگاہوں کے لیے تو یہ ایک اہم ضرورت تھی۔

تاہم انسانی ذہن کبھی بھی غلامی کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے خلاف مدافعت آہستہ آہستہ اگے بڑھتی گئی۔ غلامی کے خاتمے کی جدوجہد ایک دن یا ایک قانون کا نتیجہ نہیں بلکہ کئی دہائیوں پر محیط منظم تحریک کا حاصل تھی

اگرچہ 1807ء میں غلاموں کی تجارت کو غیر قانونی قرار دیا گیا تھا مگر برطانوی کیریبین میں غلامی کا ادارہ بذاتِ خود 1834ء تک قانونی حیثیت رکھتا رہا۔ صرف یہ فرق پڑا کہ جہازوں کے ذریعے تجارت رک گئی مگر پہلے سے موجود غلاموں کی حالت جوں کی توں رہی

ولیم ولبر فورس نے برطانوی پارلیمنٹ کے ایوان میں دہائیوں تک اس ناانصافی کے خلاف آواز بلند کی۔ تھامس کلارکسن نے ملک بھر میں سفر کر کے شواہد جمع کیے، عوامی رائے عامہ ہموار کی اور دستخطی مہمات (پٹیشنز) کا اہتمام کیا۔ عوامی و مذہبی حمایت کو یکرز (Quakers) اور دیگر چرچ اصلاح پسندوں نے اسے اخلاقی و مذہبی فریضہ قرار دے کر تحریک کو وسعت دی۔ عام برطانوی شہریوں نے غلاموں کی پیداوار (خصوصاً چینی) کا بائیکاٹ کر کے دباؤ بڑھایا۔ غلاموں کی اپنی مزاحمت 1831-32ء کی 'باپٹسٹ وار' (کرسمس بغاوت) برطانوی کیریبین کی سب سے بڑی غلام بغاوت تھی، جس میں جمیکا کے تقریباً 60 ہزار غلاموں نے حصہ لیا۔ اس کی قیادت سیموئل شارپ نامی ایک غلام مبلغ نے کی، جسے بعد ازاں پھانسی دے دی گئی مگر ان کی قربانی رائیگاں نہ گئی۔

اس بغاوت نے برطانوی پارلیمنٹ کو فیصلہ کن اقدام پر مجبور کر دیا۔ یہاں ایک اہم وضاحت ضروری ہے کہ برطانوی آئینی روایت میں پارلیمنٹ سے منظور شدہ بل تب ہی قانون بنتا ہے جب اسے 'شاہی منظوری (Royal Assent) 'حاصل ہو—یہ کوئی الگ واقعہ نہیں بلکہ ایک ہی عمل کا حصہ ہے۔ چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ سے منظور 'سلیوری ابولیشن ایکٹ' کو 28 اگست 1833ء کو شاہی منظوری ملی (Legal Clarity) اور بعد ازاں یہ قانون یکم اگست 1834ء کو باضابطہ طور پر نافذ العمل ہوا اور اس کے نتیجے میں کیریبین، جنوبی افریقہ اور کینیڈا کے کچھ حصوں میں 8 لاکھ سے زائد افریقی نژاد غلام آزاد قرار پائے۔ تاہم اس قانون میں متنازعہ شقیں بھی تھیں یعنی معاوضہ اور نام نہاد 'اپرینٹس شپ' کا متنازعہ نظام پھر بھی اس قانون کو بظاہر انصاف کی فتح سمجھا گیا مگر اس کے عملی پہلو انتہائی تلخ حقائق لیے ہوئے تھے۔

برطانوی حکومت نے سابقہ مالکان کو ان کی 'جائیداد' (یعنی غلاموں) کے نقصان کے عوض 2 کروڑ پاؤنڈ ادا کیے، جبکہ خود آزاد ہونے والوں کو ایک پائی بھی نہ ملی۔ اس رقم کا حجم اتنا بڑا تھا کہ برطانوی خزانے کے مطابق عام ٹیکس گزاروں نے یہ قرض 2015ء میں جا کر مکمل طور پر چکایا—یعنی غلامی کے خاتمے کی "قیمت" ایک صدی سے زائد عرصے تک برطانوی عوام ادا کرتے رہے، نہ کہ خود صاحبانِ اختیار

بالغ غلاموں کو فوری مکمل آزادی نہیں ملی بلکہ انہیں 'اپرینٹس' کا نام دے کر مزید جبری مشقت پر مجبور کیا گیا۔ افریقی بالغ غلام خودکار طور پر آزاد نہیں ہوئے بلکہ 4 سے 6 سال تک 'اپرینٹس' رہے؛ کھیتوں پر کام کرنے والوں (پریڈیل) کے لیے یہ مدت 6 سال جبکہ گھریلو و ہنرمند کارکنوں (نان پریڈیل) کے لیے 4 سال مقرر کی گئی تاہم عوامی دباؤ کے باعث یہ ظالمانہ نظام وقت سے پہلے ہی 1838ء میں ختم کر دیا گیا کیونکہ اسے "غلامی کا ہی دوسرا نام" قرار دیا جا رہا تھا۔

اس قانون کے نفاذ سے قبل غلاموں کی زندگی انسانی وقار سے یکسر محروم تھی۔ انہیں انسان نہیں بلکہ ذاتی 'اثاثہ' سمجھا جاتا تھا جسے خریدا اور بیچا جا سکتا تھا۔ طویل اوقات کار میں سخت جسمانی مشقت، معمولی غلطیوں پر بہیمانہ سزائیں، اور ناگفتہ بہ رہائشی حالات۔ شناخت کا مکمل خاتمہ، اپنی زبان، روایتی نام اور مذہب اپنانے کی اجازت نہ تھی۔ غلاموں کی تجارت کے باعث خاندان بکھر جاتے، مائیں بچوں سے اور شوہر بیویوں سے جدا کر دیے جاتے۔

برصغیر پاک و ہند قانون کے دائرہ کار سے باہر رکھے گئے کہ اس ایکٹ میں واضح طور پر 'ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ قبضہ علاقوں' کے علاوہ سیلون اور سینٹ ہیلینا کو مستثنیٰ قرار دیا گیا تھا کیونکہ برصغیر اس وقت براہِ راست برطانوی تاج کے بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیرِ انتظام تھا۔ برصغیر میں غلامی کے خلاف قانون سازی کے لیے مزید 9 برس انتظار کرنا پڑا اور 'انڈین سلیوری ایکٹ سات اپریل '1843 کو نافذ ہوا جس کے تحت غلام کی حیثیت سے کسی کی خرید و فروخت یا زبردستی خدمت پر عدالتی نفاذ کو ممنوع قرار دیا گیا۔ تاہم مؤرخین کا کہنا ہے کہ یہ قانون بھی جاگیر دارانہ وذات پات کے نظام میں موجود جبری مشقت کی مختلف اقسام کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکا۔ برطانوی قانون کوئی الگ تھلگ واقعہ نہیں تھا بلکہ اس نے عالمی سطح پر گہرے اور دیرپا اثرات مرتب کیے اور بین الاقوامی غلام تجارت کے خلاف کارروائیاں شروع ہو گئیں اور رائل نیوی کے 'ویسٹ افریقہ سکواڈرن' نے مغربی افریقہ کے ساحل پر گشت کرتے ہوئے تقریباً 1600 غلام بردار جہاز پکڑے اور 1 لاکھ 50 ہزار افریقیوں کو آزاد کرایا۔ تاہم برطانیہ خود بھی اس دوران بین الاقوامی غلام تجارت کو مکمل طور پر ختم نہ کر سکا۔ غلامی کے خاتمے کے بعد باغات کے مالکان کو مزدوروں کی شدید کمی کا سامنا ہوا کیونکہ آزاد شدہ افراد اپنے سابقہ مالکوں کے لیے کام کرنے سے انکاری تھے اس خلا کو پر کرنے کے لیے 'انڈینچرڈ لیبر' (معاہدہ جاتی مزدوری) کا نظام متعارف کرایا گیا، جس کے تحت آنے والی آٹھ دہائیوں میں برطانوی ہندوستان سے 16 لاکھ سے زائد افراد کو یورپی نو آبادیات میں بھیجا گیا۔ یہ مزدور موریشس، فجی، نیٹال، برما، سیلون، ملایا، برطانوی گیانا، جمیکا اور ٹرینیڈاڈ سمیت انیس ممالک میں بھیجے گئے—یوں غلامی کے خاتمے نے بالواسطہ طور پر جنوبی ایشیائی تارکینِ وطن کی ایک نئی عالمی برادری کو جنم دیا، جس کے اثرات آج بھی کیریبین اور بحرالکاہل کے ممالک میں نمایاں ہیں۔

برطانیہ کی اس قانون سازی نے عالمی سطح پر غلامی مخالف تحریکوں کو تقویت دی، اگرچہ ہر ملک نے اپنے سیاسی حالات کے مطابق الگ رفتار اپنائی: فرانس نے 1848ء میں اپنی نو آبادیات میں غلامی کا مستقل خاتمہ کیا۔ نیدرلینڈز نے 1863ء میں غلامی کالعدم قرار دیا مریکہ میں خانہ جنگی کے بعد 1865ء میں تیرہویں ترمیم کے ذریعے غلامی ختم ہوئی برازیل امریکہ کے براعظم میں غلامی ختم کرنے والا آخری ملک تھا، جہاں یہ 1888ء میں ممکن ہوا۔

یکم اگست کو کینیڈا، جمیکا اور دیگر کیریبین ممالک میں آج بھی 'Emancipation Day) غلامی سے ازادی کے دن' کے طور پر منایا جاتا ہے عدم مساوات، نسلی امتیاز اور معاشی محرومی کے اثرات آزاد شدہ نسلوں کی کئی نسلوں تک برقرار رہے، جو آج بھی کیریبین ممالک کی 'ری پیریشنز' (ہرجانہ) کی تحریک کا محرک ہیں ولبر فورس اور کلارکسن کی حکمتِ عملی—پٹیشنز، رائے عامہ کی بیداری، اور مسلسل سیاسی دباؤ—بعد کی تمام انسانی حقوق کی تحریکوں کے لیے ایک نمونہ بن گئی

پاکستان میں غلامی قانونی طور پر ممنوع ہے۔ آئین پاکستان کا آرٹیکل 11 غلامی، غلاموں کی خرید و فروخت اور جبری مشقت کی ممانعت کرتا ہے۔ پاکستان نے Bonded Labour System (Abolition) Act 1992 کے ذریعے بندھوا مزدوری کے نظام کو ختم کرنے کی قانونی بنیاد فراہم کی، جبکہ انسانی اسمگلنگ کے خلاف Prevention of Trafficking in Persons Act 2018 بھی موجود ہے۔ پاکستان نے جبری مشقت کے خاتمے سے متعلق ILO Convention No. 29 اور Convention No. 105 کی بھی توثیق کر رکھی ہے اور 14 مارچ 2025ء کو ILO کے Forced Labour Protocol, 2014 کی توثیق کر کے اس عزم کو مزید تقویت دی؛

یہ پروٹوکول پاکستان کے لیے مارچ 2026ء میں نافذ العمل ہوا۔ لیکن اصل چیلنج قانون کی موجودگی نہیں بلکہ اس کا مؤثر نفاذ ہے۔ پاکستان میں جدید غلامی کی نمایاں شکلوں میں اینٹوں کے بھٹوں اور بعض زرعی شعبوں میں بندھوا مزدوری، قرض کے بدلے جبری مشقت، بچوں سے مشقت، گھریلو ملازمین کا استحصال، انسانی اسمگلنگ اور انتہائی کمزور طبقات کا معاشی استحصال شامل ہیں

۔ ILO کے مطابق پاکستان میں چائلڈ لیبر کا بڑا حصہ دیہی علاقوں میں پایا جاتا ہے، جبکہ پنجاب اور سندھ مل کر ملک میں رپورٹ ہونے والی چائلڈ لیبر کا بڑا حصہ رکھتے ہیں۔ بچوں سے مشقت دراصل غلامی کی سب سے دردناک شکلوں میں سے ایک ہے۔ جس عمر میں بچے کے ہاتھ میں کتاب اور قلم ہونا چاہیے، اگر وہ بھٹے، ورکشاپ، کھیت، ہوٹل یا کسی گھر میں مزدوری کرنے پر مجبور ہو تو صرف اس کا بچپن نہیں چھنتا بلکہ ملک کا مستقبل بھی کمزور ہوتا ہے۔ اسی طرح بندھوا مزدوری میں قرض یا پیشگی رقم اگر کسی مزدور کی آزادیِ نقل و حرکت اور ملازمت چھوڑنے کے اختیار کو ختم کر دے تو یہ محض غربت نہیں بلکہ جبری مشقت کی صورت اختیار کر سکتی ہے

۔اس مسئلے کا حل صرف مزید قوانین بنانا نہیں بلکہ قانون پر بلاامتیاز عملدرآمد، مؤثر لیبر انسپیکشن، مزدوروں کی رجسٹریشن، مناسب اجرت، بچوں کی لازمی اور معیاری تعلیم، غریب خاندانوں کے لیے سماجی تحفظ، بندھوا مزدوروں کی بحالی، انسانی اسمگلنگ کے نیٹ ورکس کے خلاف کارروائی اور متاثرین کو قانونی و معاشی مدد فراہم کرنا ہے۔

پاکستان کا 2025ء میں Forced Labour Protocol کی توثیق کرنا ایک مثبت قدم ہے، لیکن اصل کامیابی اس وقت ہو گی جب بین الاقوامی وعدے عام مزدور، بچے اور کمزور شہری کی عملی زندگی میں محسوس ہوں

۔یکم اگست ہمیں صرف 1834ء کی ایک تاریخی کامیابی یاد نہیں دلاتا؛ یہ آج کے پاکستان سے بھی ایک سوال کرتا ہے: اگر انسان کو زنجیروں میں جکڑنا جرم ہے تو کیا غربت، قرض، جبری مشقت، انسانی اسمگلنگ اور بچوں کے استحصال کے ذریعے اس کی آزادی چھیننا بھی اسی انسانی المیے کی نئی شکل نہیں؟ غلامی کا حقیقی خاتمہ اس دن ہو گا جب کوئی بچہ غربت کی وجہ سے اپنا بچپن، کوئی مزدور قرض کی وجہ سے اپنی آزادی، اور کوئی انسان روزگار کی مجبوری کے باعث اپنا انسانی وقار قربان کرنے پر مجبور نہ ہو۔ زنجیریں توڑنا غلامی کے خاتمے کا پہلا قدم تھا؛ انسان کو بااختیار بنانا اس کا حتمی نتیجہ ہونا چاہیئے۔



31جولائی1492ء—فرمانِ الحمراء: جب مذہبی تعصب (یہودیوں کی ملک بدری (نے اسپین کو اپنے ہی ذہین ترین لوگوں سے محروم کر دیا"

قومیں صرف زمین یا دولت سے نہیں، بلکہ اپنے انسانوں کے علم، ہنر اور تنوع سے عظیم بنتی ہیں۔ جب تعصب عقل پر غالب آ جائے تو زوال کی بنیادیں خود بخود رکھ دی جاتی ہیں۔

31جولائی1492ء میں اسپین (اندلس) سے یہودیوں کا اخراج تاریخِ عالم کا ایک انتہائی دردناک اور اہم موڑ ہے۔ اس واقعے نے نہ صرف اسپین کے سماجی و اقتصادی ڈھانچے کو تباہ کیا، بلکہ نوزائیدہ عثمانی سلطنت، شمالی افریقہ اور یورپ کی تاریخ کو بھی ایک نیا رخ دیا

۔ سپین میں مسلمانوں کی تقریباً800 سالہ حکمرانی کا دور (جسے "زریں دور" یا Golden Age بھی کہا جاتا ہے) یہودیوں کے لیے ایک سنہری دور تھا۔۔ اس دور میں مسلمان، عیسائی اور یہودی ایک ساتھ رہتے تھے، جسے اسپینش میں Convivencia) باہمی بقائے باہمی) کہا جاتا ہے۔ یہودی سائنس، فلسفے، طب اور تجارت میں عروج پر تھے۔ تاہم، جیسے جیسے عیسائی سلطنتوں نے مسلمانوں سے علاقے واپس چھیننے کی تحاریک (Reconquista) تیز کیں، متعصبانہ مہمات کا آغاز ہوا۔

2 جنوری 1492ء کو غرناطہ (Granada) کے زوال کے ساتھ ہی اندلس میں اسلامی حکومت کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ اس کے بعد 31 مارچ کو ملکہ ازابیلا اور بادشاہ فرڈیننینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جسے فرمان الحمرا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کے تحت سپین میں بسنے والے تمام یہودیوں کو حکم دیا گیا کہ

وہ یا تو عیسائیت قبول کر لیں یا ملک چھوڑ دیں

اور اس کے لئے 31 جولائی کی ڈیڈ لائن مقرر ہوئی

اور پھر 31 جولائی کو عیسائیت اختیار نہ کرنے پر 40,000 سے 100,000 کے قریب یہودی اسپین سے نکالے گئے۔ یہ مہاجرین سلطنت عثمانیہ، شمالی افریقہ (مراکش)، اٹلی اور پرتگال میں آباد ہوئے۔ اس اخراج کے دوران براہِ راست اجتماعی قتل عام نہیں ہوا، مگر سفر کی سختیوں، بھوک اور بیماریوں سے ہزاروں افراد ہلاک ہوئے۔ جبکہ 2 لاکھ کے قریب نے جبر کے تحت عیسایت قبول کر لی تھی۔ اور وہ سپین میں ہی رہے مگر ان کے حالات بھی ابتر رہے۔

یہودیوں کے اس بڑے پیمانے پر اخراج کے پیچھے چند اہم مذہبی، سیاسی اور اقتصادی اسباب تھے کیونکہ فرڈیننینڈ اور اژابیلا اسپین کو ایک "خالص کیتھولک ریاست" بنانا چاہتے تھے۔ ان کا ماننا تھا کہ مذہبی تنوع ریاست کے لیے خطرہ ہے۔

جب دو لاکھ کے قریب یہودیوں نے زبردستی عیسائیت قبول کی (جنہیں Conversos یا Marranos کہا جاتا تھا)، تو عیسائی کلیسا کو شک تھا کہ وہ دل سے اب بھی یہودی ہیں اور چھپ کر اپنے مذہب پر عمل کرتے ہیں۔ کلیسا کا خیال تھا کہ جب تک ملک میں اصل یہودی موجود ہیں، یہ نو مسلم عیسائی سچے عیسائی نہیں بن سکتے

اس کے علاوہ اس میں ان کے معاشی مفادات بھی شامل تھے کیونکہ اسپین کے بہت سے یہودی تاجر، بینکنگ کے شعبے سے وابستہ اور خوشحال تھے۔ عیسائی حکمرانوں اور عام لوگوں پر یہودیوں کا قرض تھا، اور اخراج کی صورت میں یہ تمام جائیدادیں اور اثاثے تاجِ اسپین نے ضبط کر لیے نیز اندلس کو فتح کرنے کے بعد شاہی جوڑے کو اپنے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے ایک مشترکہ دشمن اور مشترکہ مذہبی جذبے کی ضرورت تھی، جو انہوں نے اقلیتوں کے خلاف استعمال کیا

اس اخراج کے اثرات صرف اسپین تک محدود نہ رہے بلکہ اس کے بعد رونما ہونے والے عالمی واقعات نے دنیا کے نقشے کو بدل دیا

عثمانی سلطنت کے سلطان بایزید ثانی نے اسپین کے اس فیصلے کا دانشمندی سے فائدہ اٹھایا۔ انہوں نے عثمانی بحریہ کو ہدایت کی کہ وہ یہودی مہاجرین کو محفوظ طریقے سے اسپین سے نکال کر عثمانی علاقوں میں لائیں

عثمانی سلطنت (خاص طور پر استنبول، سالونیکا اور ازمیر) میں یہودیوں کی آمد سے تجارت، طب اور ٹیکنالوجی کو بے پناہ فروغ ملا۔ اور عثمانی سلطنت میں پہلی پرنٹنگ پریس انہی ہسپانوی یہودی مہاجرین (Sephardic Jews) نے قائم کی۔

دوسری طرف اگرچہ اسپین نے امریکہ سے ملنے والی دولت کی بدولت کچھ عرصے کے لیے عالمی طاقت کا روپ دھارا، لیکن طویل المدت بنیادوں پر یہودیوں (اور بعد میں مسلمانوں) کا اخراج اس کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ اس تعصب میں اسپین نے اپنے بہترین ڈاکٹر، ریاضی دان، تاجر اور بینکرز کھو دیے، جس کی وجہ سے وہ مالیاتی انتظامیہ کے لیے غیر ملکی بینکوں پر منحصر ہو گیا۔ ماہر کاریگروں اور تاجروں کی عدم موجودگی نے اسپین کے مقامی اقتصادی ڈھانچے کو اپاہج کر دیا۔

مراکش، الجزائر اور تیونس میں ہزاروں یہودیوں نے پناہ لی، جہاں انہوں نے مقامی عربی اور بربر ثقافت کے ساتھ مل کر ایک نیا امتزاج پیدا کیا۔ جو یہودی ہالینڈ منتقل ہوئے، انہوں نے 17ویں صدی میں ڈچ معاشی انقلاب (Dutch Golden Age) اور عالمی تجارت کی بنیاد رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

المختصر 1492ء کا فرمانِ الحمراء ایک تاریخی سبق ہے کہ مذہبی اور ثقافتی تنوع کو ختم کرنے کی کوششیں ریاستوں کو بظاہر یکجہتی تو دیتی ہیں، لیکن اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہیں۔ اسپین نے تعصب کی خاطر اپنا فکری اور معاشی سرمایہ گنوا دیا، جبکہ عثمانی سلطنت اور دیگر یورپی ممالک نے انہی مہاجرین کی صلاحیتوں سے استفادہ کر کے ترقی کی نئی منازل طے کیں۔

تاریخ کا فیصلہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ تلواریں سلطنتیں قائم کر سکتی ہیں، مگر علم، رواداری اور انصاف ہی انہیں پائیدار بناتے ہیں۔



30جولائی—انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی دن-انسان نہیں،

انسانیت بچایئے—جدید غلامی سے آن لائن فراڈ تک پھیلتا ہوا ایک عالمی

جرم۔

ہر سال30جولائی کو دنیا بھر میں — World Day against Trafficking in Persons انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد انسانی اسمگلنگ کے بڑھتے ہوئے خطرے کے بارے میں عالمی سطح پر شعور اجاگر کرنا، متاثرین کے حقوق اور وقار کا تحفظ، اسمگلنگ کے منظم جرائم پیشہ نیٹ ورکس کا خاتمہ اور حکومتوں، قانون نافذ کرنے والے اداروں، سول سوسائٹی اور عوام کو مشترکہ کارروائی کے لیے متحرک کرنا ہے

۔انسانی اسمگلنگ دراصل انسان کو اس کی مرضی کے خلاف جبری مشقت، جنسی استحصال، بھیک منگوانے، جبری شادی، جبری مجرمانہ سرگرمیوں یا دیگر استحصالی مقاصد کے لیے دھوکے، جبر، دھمکی، اغوا، طاقت کے غلط استعمال یا کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے جال میں پھنسانے کا جرم ہے۔ اس لیے اسے محض غیر قانونی سفر یا نقل مکانی کا مسئلہ سمجھنا درست نہیں؛ یہ بنیادی انسانی حقوق، انسانی وقار اور آزادی پر حملہ ہے

انسانی اسمگلنگ کے خلاف 30جولائی کو عالمی دن قرار دینے کی کوششوں میں بیلاروس کا اہم کردار رہا۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے 18دسمبر 2013ء کو قرارداد A/RES/68/192 کے ذریعے 30جولائی کو یہ عالمی دن قرار دیا اور فیصلہ کیا کہ یہ دن 2014ء سے ہر سال منایا جائے گا۔ اس فیصلے کا مقصد انسانی اسمگلنگ کے متاثرین کی صورتحال کے بارے میں آگاہی اور ان کے حقوق کے تحفظ کو فروغ دینا تھا

۔اقوام متحدہ کے ریکارڈ کے مطابق یہ اقدام بیلاروس کی پیش قدمی سے متعلق تھا۔اس سے پہلے 2010ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے Global Plan of Action to Combat Trafficking in Persons منظور کیا تھا، جس نے انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی تعاون، متاثرین کے تحفظ اور بین الاقوامی قانونی وادارہ جاتی اقدامات کو مزید منظم کرنے کی بنیاد فراہم کی۔30 جولائی 2014ء کو یہ دن پہلی مرتبہ عالمی سطح پر منایا گیا۔

انسانی اسمگلنگ دنیا کے تقریباً ہر خطے کو متاثر کرتی ہے۔ کوئی ملک اس جرم سے مکمل طور پر محفوظ نہیں؛ ممالک کبھی ماخذ، راہداری یا منزل کے طور پر اس عالمی نیٹ ورک کا حصہ بن جاتے ہیں

۔اقوام متحدہ کے دفتر برائے منشیات وجرائم UNODC کی Global Report on Trafficking in Persons 2024 کے مطابق 2019ء سے 2022ء کے درمیان عالمی سطح پر شناخت کیے جانے والے انسانی اسمگلنگ کے متاثرین کی تعداد میں تقریباً 25 فیصد اضافہ ہوا۔اسی عرصے میں جبری مشقت کے لیے اسمگل کیے جانے والے شناخت شدہ متاثرین میں 47 فیصد اضافہ ہوا۔2022ء میں شناخت شدہ متاثرین میں جبری مشقت کا حصہ 42 فیصد تھا، جو جنسی استحصال کے 36 فیصد حصے سے بھی زیادہ تھا۔اس رپورٹ کی ایک انتہائی تشویش ناک حقیقت بچوں سے متعلق ہے۔2022ء میں دنیا بھر میں شناخت کیے گئے انسانی اسمگلنگ کے متاثرین میں 38 فیصد بچے تھے، جبکہ 2004ء میں یہ تناسب صرف 13 فیصد تھا۔لڑکیوں میں جنسی استحصال ایک بڑا مقصد ہے، جبکہ لڑکوں کو جبری مشقت، جبری جرائم اور دیگر استحصالی سرگرمیوں میں دھکیلے جانے کے شواہد بھی سامنے آئے ہیں

۔یہ اعداد صرف ان لوگوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو حکام کی نظر میں آسکے؛ حقیقت میں بہت سے متاثرین خوف، سماجی دباؤ، زبان کی رکاوٹ، غیر قانونی حیثیت، عدم آگاہی یا اسمگلروں کے کنٹرول کی وجہ سے رپورٹ ہی نہیں ہو پاتے

انسانی اسمگلنگ کا تعلق جدید غلامی سے بھی گہرا ہے۔ILO ، Walk Free اور IOM کے مشترکہ عالمی تخمینوں کے مطابق 2021ء میں تقریباً 5 کروڑ افراد جدید غلامی کی مختلف صورتوں میں زندگی گزار رہے تھے۔ان میں تقریباً 2 کروڑ 80 لاکھ افراد جبری مشقت اور 2 کروڑ 20 لاکھ افراد جبری شادی کا شکار تھے۔2016ء کے مقابلے میں جدید غلامی کا شکار افراد کی تعداد میں تقریباً ایک کروڑ اضافہ ہوا۔یہ حقیقت اس تصور کو غلط ثابت کرتی ہے کہ غلامی صرف تاریخ کا ایک تاریک باب ہے

۔ آج غلامی کی شکل بدل گئی ہے؛ کہیں یہ جبری مشقت ہے، کہیں جنسی استحصال، کہیں جبری شادی اور کہیں ایک خوب صورت "غیر ملکی ملازمت" کے وعدے کے پیچھے چھپا ہوا جال

۔"فراڈ کے پیچھے قید انسان"

"Trapped Behind the Scam"

2026ء کا عالمی موضوع قرار دیا گیا ہے۔ جس کا مقصد انسانی اسمگلنگ کی ایک نئی اور تیزی سے پھیلتی ہوئی شکل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ منظم جرائم پیشہ گروہ سوشل میڈیا اور آن لائن پلیٹ فارمز پر جعلی ملازمتوں کے اشتہارات دیتے ہیں۔ متاثرین کو پرکشش تنخواہ، بیرونِ ملک ملازمت یا ڈیجیٹل مارکیٹنگ، کسٹمر سروس اور دیگر کاموں کا لالچ دے کر دوسرے ممالک منتقل کیا جاتا ہے۔ وہاں پہنچنے کے بعد بعض افراد کو غیر قانونی scam compounds میں قید کر دیا جاتا ہے، ان کے سفری دستاویزات ضبط کیے جاتے ہیں اور انہیں دھمکی یا تشدد کے ذریعے آن لائن فراڈ کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کے مطابق یہ انسانی اسمگلنگ، سائبر کرائم، مالی فراڈ، منی لانڈرنگ اور بدعنوانی کے باہم جڑے ہوئے نئے خطرے کی علامت ہے۔ یہ خطرہ اب کسی ایک خطے تک محدود نہیں

۔ INTERPOL کے مطابق مارچ 2025ء تک 66 ممالک کے شہری آن لائن اسکیم سینٹرز میں جبری مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے اسمگل کیے جانے کے کیسز میں سامنے آئے، جبکہ متاثرین کو دنیا کے مختلف خطوں میں موجود مراکز تک منتقل کیے جانے کے شواہد ملے۔ لہٰذا آج ایک مشکوک "آن لائن جاب آفر" بھی انسانی اسمگلنگ کے ایک خطرناک نیٹ ورک کا دروازہ ثابت ہو سکتی ہے

پاکستان کے لیے انسانی اسمگلنگ اور انسانی سمگلنگ دونوں اہم چیلنج ہیں، خصوصاً ان افراد کے لیے جو بہتر روزگار اور بہتر مستقبل کی تلاش میں بیرونِ ملک جانے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ پاکستان میں (Federal Investigation Agency ایف آئی اے)

کو انسانی سمگلنگ اور غیر قانونی ہجرت سے متعلق جرائم کی تحقیقات اور کارروائی کا اہم مینڈیٹ حاصل ہے

۔ FIA کے Anti Human Trafficking and Smuggling Wing کے ذریعے اس جرم کے خلاف کارروائیاں کی جاتی ہیں۔ FIA کے مطابق Prevention of Trafficking in Persons Act, 2018 اور Prevention of Smuggling of Migrants Act, 2018 اس حوالے سے اہم قانونی بنیاد فراہم کرتے ہیں، جبکہ 2025ء میں انسانی اسمگلنگ اور migrant smuggling کے خلاف ایک National Action Plan بھی UNODC کے تعاون سے تیار کیا گیا۔ 2025ء میں FIA نے بیت اہم کارروائیاں کیں

پاکستان میں غیر قانونی ہجرت اور انسانی سمگلنگ کے خلاف سخت نگرانی کی اہمیت کا اندازہ 2025ء کے اعداد و شمار سے لگایا جا سکتا ہے۔ FIA حکام کے مطابق 2025ء میں 39,786 مسافروں کو ایئرپورٹس پر آف لوڈ کیا گیا۔ حکام کا کہنا ہے کہ یہ کارروائیاں intelligence-led اور risk-based screening کے تحت کی گئیں تاکہ مشکوک سفری دستاویزات، جعلی ملازمتوں، مشکوک روٹس، جعلی اسپانسرشپ اور انسانی سمگلنگ کے نیٹ ورکس کی نشاندہی کی جا سکے

۔ اسی عرصے میں FIA کے مطابق 2,421 مقدمات درج ہوئے اور 3,130 مشتبہ ایجنٹ گرفتار کیے گئے۔ حکام نے تقریباً Rs961.71 million کی جائیداد ضبط، Rs87.7 million کی رقم برآمد اور تقریباً Rs239.63 million کے بینک اکاؤنٹس منجمد کیے۔ یہ کارروائیاں اس لیے بھی اہم ہیں کہ غیر قانونی ہجرت کے راستوں پر پاکستانی شہریوں کی جانوں کے ضیاع کے واقعات میں اضافہ ہوا ہے۔ FIA حکام کے مطابق 2025ء میں 109 پاکستانی شہری غیر قانونی ہجرت کی کوششوں کے دوران جاں بحق ہوئے

۔ تاہم یہاں ایک اہم فرق سمجھنا ضروری ہے Human Trafficking: میں بنیادی مقصد انسان کا استحصال ہے، جبکہ Human Smuggling عموماً کسی شخص کو غیر قانونی طریقے سے سرحد پار پہنچانے کی سہولت فراہم کرنے سے متعلق ہے۔ دونوں جرائم بعض اوقات ایک ہی منظم نیٹ ورک میں باہم جڑ جاتے ہیں، اور غیر قانونی طور پر منتقل کیے جانے والے افراد بعد میں اسمگلروں یا دیگر جرائم پیشہ گروہوں کے ہاتھوں استحصال کا شکار بھی ہو سکتے ہیں

۔ عوام کے لیے سب سے اہم پیغام یہی ہے کہ وہ جعلی ملازمت سے ہوشیار رہیں

۔ پاکستان میں بیرونِ ملک روزگار کے خواہش مند افراد کے لیے چند احتیاطیں انتہائی ضروری ہیں:

سوشل میڈیا یا WhatsApp پر آنے والی غیر معمولی طور پر پرکشش بیرونِ ملک ملازمت کو فوراً قبول نہ کریں۔ ایجنٹ کی قانونی حیثیت اور رجسٹریشن کی تصدیق کیے بغیر رقم یا پاسپورٹ اس کے حوالے نہ کریں

۔ جعلی ویزا، جعلی اسپانسر شپ اور غیر قانونی سفری راستوں سے مکمل اجتناب کریں۔ ملازمت کا تحریری معاہدہ، کمپنی، ویزا اور دیگر دستاویزات اچھی طرح تصدیق کریں۔ کسی شخص کو اپنا پاسپورٹ مستقل طور پر اپنے قبضے میں رکھنے نہ دیں۔ اگر کوئی ایجنٹ کہے کہ

"قانونی راستے سے جانے میں وقت لگے گا، ہم شارٹ کٹ سے پہنچا دیں گے"

تو اسے خطرے کی علامت سمجھیں

۔ آن لائن ملازمت کے معاملے میں کمپنی کی ویب سائٹ، پتہ، رابطہ اور ملازمت کی حقیقت الگ ذرائع سے تصدیق کریں۔ خاندان کو اپنے سفر، ویزا، ملازمت اور رابطہ نمبرز کی مکمل معلومات فراہم کر کے جائیں۔ اگر کسی شخص کو بیرونِ ملک پہنچنے کے بعد قید، تشدد، دھمکی یا جبری کام کا سامنا ہو تو اسے مجرم نہیں بلکہ ممکنہ متاثرہ فرد سمجھ کر مدد اور تحفظ فراہم کیا جانا چاہیے

۔ متاثرین کو مجرم نہیں، انسان سمجھیں۔ انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی جدوجہد کا ایک بنیادی اصول یہ ہے کہ متاثرین کو ان جرائم کے لیے سزا نہ دی جائے جو انہیں جبر، دھمکی یا دھوکے کے ذریعے کرنے پر مجبور کیا گیا ہو۔ ایک شخص جو کسی scam compound میں قید کر کے آن لائن فراڈ کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، بظاہر جرم میں شریک نظر آ سکتا ہے، لیکن حقیقت میں وہ خود ایک trafficking victim ہو سکتا ہے۔ اسی لیے قانون نافذ کرنے والے اداروں، عدالتی نظام، میڈیا اور معاشرے کو متاثرین کی شناخت، تحفظ، بحالی اور دوبارہ معاشرے میں باعزت واپسی پر بھی توجہ دینا ہو گی

۔ انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی مہم کی معروف علامت Blue Heart ہے، جو انسانی اسمگلنگ کے متاثرین کے ساتھ یکجہتی اور اس جرم کے خلاف عالمی عزم کی نمائندگی کرتی ہے۔ اقوام متحدہ کے ریکارڈ کے مطابق UNODC نے اسے انسانی اسمگلنگ کے خلاف جدوجہد کی بین الاقوامی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ لیکن صرف نیلا دل لگانا کافی نہیں؛ اصل ضرورت آنکھیں کھلی رکھنے، جعلی وعدوں کو پہچاننے، متاثرین کی مدد کرنے اور اسمگلنگ کے نیٹ ورکس کو قانون کے کٹہرے تک پہنچانے کی ہے

انسانی اسمگلنگ دراصل صرف سرحدوں کے پار انسانوں کی منتقلی کا نام نہیں؛ یہ غربت، بے روزگاری، عدم مساوات، کمزور حکمرانی، جعلی روزگار، ڈیجیٹل فراڈ اور انسانی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانے والے منظم جرائم کا مجموعہ ہے۔ آج اسمگلر صرف سڑکوں، سرحدوں اور بندرگاہوں پر نہیں؛ وہ سوشل میڈیا، WhatsApp، جعلی ویب سائٹس اور آن لائن جاب پورٹلز کے ذریعے بھی اپنے شکار تلاش کر رہے ہیں

۔اس لیے30جولائی کا پیغام صرف حکومتوں کے لیے نہیں بلکہ ہر گھر، ہر نوجوان، ہر والدین اور ہر انٹرنیٹ صارف کے لیے ہے: کسی انسان کو خریدنے، بیچنے، دھوکا دینے یا غلام بنانے کا حق کسی کو نہیں۔ جعلی ملازمت ایک جال ہو سکتی ہے، غیر قانونی سفر زندگی کا آخری سفر بن سکتا ہے، اور خاموشی اسمگلروں کی طاقت بن سکتی ہے۔ آیئے اس عالمی دن پر عہد کریں کہ ہم خود بھی باخبر رہیں گے، دوسروں کو بھی باخبر کریں گے، مشکوک سرگرمیوں کی اطلاع دیں گے اور انسانی اسمگلنگ کے ہر روپ کے خلاف آواز بلند کریں گے۔ انسانی اسمگلنگ کے خلاف جنگ دراصل انسان کی آزادی، عزت اور مستقبل کی حفاظت کی جنگ ہے

30جولائی—انسانی اسمگلنگ کے خلاف عالمی دن

💙Blue Heart- انسانیت کے ساتھ، استحصال کے خلاف۔



29جولائی شیروں کا عالمی دن

(INTERNATIONAL TIGERS DAY)

اس دن کا آغاز نومبر 2010 میں روس کے شہر سینٹ پیٹرزبرگ میں ہوا، جہاں روسی صدر ولادیمیر پوتن کی میزبانی میں شیروں والے 13 ممالک (بھارت، روس، بنگلہ دیش، نیپال، بھوٹان، انڈونیشیا، ملائیشیا، چین، کمبوڈیا، لاؤس، میانمار، تھائی لینڈ اور ویت نام) کے نمائندے "سینٹ پیٹرزبرگ ٹائیگر فورم" میں اکٹھے ہوئے۔ اس کانفرنس کی بنیادی وجہ یہ خطرناک رپورٹ تھی کہ ایک صدی پہلے دنیا میں تقریباً ایک لاکھ جنگلی شیر موجود تھے،

مگر شکار، جنگلات کی تباہی اور غیر قانونی تجارت کے باعث 2010 تک یہ تعداد گھٹ کر 3,500 سے بھی کم رہ گئی تھی۔ اسی موقع پر "سینٹ پیٹرزبرگ اعلامیہ" جاری ہوا جس میں 2022 تک شیروں کی تعداد دگنی کرنے کا عالمی ہدف (Tx2) طے کیا گیا تھا، اور ہر سال 29 جولائی کو یہ دن منانے کا فیصلہ ہوا

یہ مہم خاصی کامیاب رہی۔ 2010 کے تقریباً 3,200 شیروں کے مقابلے میں اب عالمی تعداد بڑھ کر تقریباً 5,500 تک جا پہنچی ہے، جو 2010 سے تقریباً 74 فیصد اضافے کے برابر ہے۔ چین، روس، بھارت اور نیپال جیسے ممالک نے اپنی شیروں کی تعداد دگنی کر لی ہے اور ہر سال Xinhua اور WWF جیسی تنظیمیں دنیا بھر میں آگاہی مہمات، تحقیقی منصوبے اور تحفظ کے پروگرام چلاتی ہیں

پاکستان میں جنگلی شیر اب موجود نہیں۔ 1965 میں بہاولپور کے قریب تیرہ شیر مارے گئے تھے اور تب سے یہ نسل یہاں معدوم سمجھی جاتی ہے۔ اس لیے یہ دن یہاں براہِ راست شیروں کے تحفظ کے بجائے زیادہ تر آگاہی کے طور پر منایا جاتا ہے۔

ڈبلیو ڈبلیو ایف-پاکستان کے مطابق، ملک میں شیر نہ ہونے کے باوجود یہ دن دیگر بڑی بلیوں جیسے خیبر پختونخوا و گلگت بلتستان کے برفانی تیندوے اور ایوبیہ کے مقامی تیندووں کی حفاظت پر توجہ دلانے کا اہم موقع ہے۔ اسکولوں، چڑیا گھروں اور سرکاری میڈیا پر بھی ہر سال اس مناسبت سے آگاہی سیمینار اور مہمات منعقد ہوتی ہیں۔





29جولائی: قومی یومِ لپ اسٹک — سرخ مٹی سے ماڈرن لپ اسٹک تک، لبوں کی رنگینی اور خود اعتمادی کا دلکش سفر

لپ سٹک کا قومی دن (National Lipstick Day)ہر سال29جولائی کو امریکا سمیت دنیا کے کئی ممالک میں منایا جاتا ہے۔

اس دن کو باقاعدہ طور پر منانے کی ابتدا2016ء میں امریکا سے ہوئی، جسے بعد ازاں دنیا بھر کے دیگر ملکوں نے بھی اختیار کر لیا۔ اس کی جدید بانی اور محرک مشہور میک اپ آرٹسٹ اور کاروباری شخصیت ہُدا قطان ہیں، جنہوں نے اپنے ایک نئے لپ اسٹک پروڈکٹ کے اجراء اور ہونٹوں کی آرائش کے اعتراف میں اس دن کو مقبول بنایا۔

تاہم اسے قومی دن کا درجہ کسی سرکاری قانون کے تحت نہیں بلکہ "نیشنل ڈے کیلنڈر (National Day Calendar) " کے رجسٹرار کے باضابطہ اعلامیے کے ذریعے سالانہ کلینڈر کا حصہ بنایا گیا، جسے بعد میں بڑی کاسمیٹکس کمپنیوں اور سوشل میڈیا مہمات نے شہرت دی

یہ دن باضابطہ یا غیر سرکاری طور پر درجنوں ممالک (خصوصاً امریکا، برطانیہ، کینیڈا اور دیگر مغربی و ایشیائی خطوں) میں بیوٹی برانڈز کی ترویج کے ساتھ منایا جاتا ہے۔ اس دن خواتین اور میک اپ کے شوقین افراد اپنی پسندیدہ لپ اسٹک کا رنگ لگاتے ہیں۔ سوشل میڈیا پر #NationalLipstickDay کے ہیش ٹیگ کے ساتھ تصاویر اور پسندیدہ شیڈز شیئر کیے جاتے ہیں۔ کاسمیٹکس کمپنیاں اور بڑے برانڈز اس دن زبردست سیل، ڈسکاؤنٹس اور مفت گفٹس کی افر دیتے ہیں۔

سجنا اور سنورنا ازل سے عورت کی فطرت کا حصہ رہا ہے۔ ہونٹ چہرے کا وہ حصہ ہے جس کی خوبصورتی پورے چہرے کو متاثر کن بنا دیتی ہے۔ ہونٹوں کی خوبصورتی اور اس کی دل آویزی نے ہمیشہ شعرا کے دلوں کو متوجہ کیا ہے۔ لبِ لعلین کی تابانی اور تبسم کی جادو گری نے اردو غزل میں استعاروں اور تشبیہوں کے ایسے درِ نایاب تراشے ہیں جو دلوں کو موہ لیتے ہیں۔ شاعروں نے ہونٹوں کو کبھی پھول اور کبھی جامِ مے سے تشبیہ دی ہے، جہاں ہر لفظ محبت اور حسن کی معراج کا پتا دیتا ہے. جیسے کچھ شعرا کرام نے کچھ یوں کہا۔

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سے کروں گا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سے کہوں گا

ناز کی ان کے لب کی کیا کہیئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

وہ تیرے حسن کی قیمت سے نہیں ہیں واقف
پنکھڑی کو جو تیرے لب کا بدل کہتے ہیں

لبوں پہ رنگ سجا تو چہرہ بھی کھل سا گیا،
مسکراہٹ نے حسن کو اور نکھار دیا۔

ہونٹوں کی شگفتگی سے مہکتا ہے ہر پیام،
رنگوں سے بڑھ کر خوب ہے مسکاں کا احترام۔

اس لئے زمانہ قدیم سے ہی خواتین ہونٹوں کی کشش پر خصوصی توجہ دیتی رہی ہیں۔ ہونٹوں کے بغیر چہرے کا حسن وہ تابانی نہیں دکھاپاتا۔ اسی لیئے لپ اسٹک یا ہونٹوں کو رنگنے کا ریکارڈ شدہ پہلا استعمال آج سے تقریباً5,000 سال قبل (3500 قبل مسیح) قدیم میسوپوٹیمیا (موجودہ عراق) کے شہر اِر (Ur) کی ملکہ پو آبی (Queen Puabi) نے کیا تھا،

جبکہ پہلی ٹھوس (Solid) لپ اسٹک دسویں صدی عیسوی میں اندلس کے مسلمان سائنس دان ابوالقاسم الزہراوی نے بنائی تھی

۔اس سے قبل خواتین ہونٹوں کی لالی کے لیے کملے ہوئے قیمتی پتھر، سرخ مٹی (Red Ochre) ،اور کیڑے مکوڑوں یا سمندری پودوں سے حاصل کردہ رنگ استعمال کرتی تھیں: قدیم سومریان خواتین قیمتی اور نیم قیمتی پتھروں (جیسے ہیمیٹائٹ) کو باریک پیس کر سفوف بناتی تھیں اور اسے ہونٹوں پر لگاتی تھیں۔ اور قدیم مصری خواتین سمندری جڑی بوٹیوں، پھولوں کے عرق اور سرخ مٹی کو شہد کے موم (Beeswax) یا تیل میں ملا کر ہونٹوں کو رنگتی تھیں۔ ملکہ قلوپطرہ اور مصری خواتین سرخ رنگ کے حصول کے لیے خاص کیڑوں (Cochineal/Carmine beetles) کو پیس کر استعمال کرتی تھیں۔

ابوالقاسم الزہراوی (10ویں صدی (اندلس کے اس ماہر طب نے پہلی بار عطر اور مصالحوں کی طرح قالب میں ڈھلی ہوئی ٹھوس لپ اسٹک ایجاد کی۔

ملکہ الزبتھ اول (16ویں صدی) نے برطانیہ میں سفید چہرے کے ساتھ گہرے سرخ ہونٹوں کے فیشن کو دوبارہ مقبول کیا، جس کے لیے موم اور پودوں کے رنگ استعمال ہوتے تھے

برصغیر پاک وہند میں لپ اسٹک کی دریافت سے قبل خواتین ہونٹوں کو سرخ کرنے کے لیے پودے، جڑیں اور پھول استعمال کرتی تھیں۔

جیسے گڑہل (Hibiscus) اور گلاب کے پھولوں کو پیس کر ان کا رس ہونٹوں پر لگایا جاتا تھا۔ اور انار کے دانوں یا چقندر کا رس ہونٹوں پر ملا جاتا تھا تاکہ قدرتی سرخی آئے۔ اس کے علاوہ مہندی کے پتے یا خاص پودوں کی جڑوں کو پیس کر رنگ بنایا جاتا تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ لبوں کی لالی دکھانے کے لئے اور

ہونٹوں کو نرم رکھنے اور چمک دینے کے لیے ملائی، مکھن یا دیسی گھی کا استعمال کیا جاتا تھا۔

اور ایک عام طریقہ جو مشرقی نزاکت کے زیادہ قریب تھا کہ ہلکا سا دباؤ دے کر یا ہونٹوں کو دانتوں سے بھینچ کر خون کا بہاؤ تیز کیا جاتا تھا تاکہ وقتی سرخی آئے۔۔ دنداسے کا استعمال دو دھاری ہوتا تھا۔ دانت بھی موتیوں جیسے اور لب بھی رنگین۔

پھر یہ جھنجھٹ کم ہونا شروع ہوا اور

1884ء میں پیرس کے کاسمیٹک برانڈ نے ہرن کی چربی، موم اور ارنڈی کے تیل (Castor oil) سے پہلی بار تجارتی بنیادوں پر لپ اسٹک بنائی، جسے بعد میں 1923ء میں موجودہ گھما کر باہر نکالنے والی نلکی (Swivel-tube) کی شکل دی گئی۔

اس وقت دنیا بھر میں لپ اسٹک کی کل سالانہ مارکیٹ تقریباً 19 سے 20 ارب ڈالر کی ہے اور بہترین لپ سٹک برانڈز میں MAC Cosmetics (امریکہ / کینیڈا)، Charlotte Tilbury (برطانیہ)، اور Dior (فرانس) شامل ہیں

پاکستان میں بھی لپ سٹک بنائی جاتی ہے جہاں سب سے مشہور اور تاریخی لوکل برانڈ میڈورا (Medora of London) ہے، اس کے علاوہ رواج (Rivaj) اور مسرت مصباح (Masarrat Misbah) بھی بہت مقبول ہیں۔ پاکستان میں لپ اسٹک کی سالانہ خرچ کی کوئی باضابطہ یا حتمی قومی سطح کی مالیاتی رپورٹ موجود نہیں ہے، تاہم متوسط اور اعلیٰ طبقے میں برانڈڈ کاسمیٹکس کی خریداری کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ پاکستان کے تجارتی اداروں کے پاس صرف "لپ اسٹک" کی درآمد کا الگ سے کوئی مخصوص اعداد و شمار کا خانہ نہیں ہے۔
البتہ مجموعی طور پر پاکستان کا بیوٹی اور کاسمیٹکس پروڈکٹس کا سالانہ درآمدی بل تقریباً 2.85 کروڑ ڈالر (28.5 ملین ڈالر) تک ریکارڈ کیا گیا ہے، جس میں لپ اسٹک سمیت میک اپ کا دیگر تمام سامان شامل ہے۔
اس کے باوجود لپ اسٹک اس وقت ہر طبقے کی خواتین کی ضرورت بن چکی ہے۔ اس کے بغیر میک اپ لگتا ہی نہیں۔ پورے چہرے کا میک اپ ایک طرف اور ہونٹوں کی لالی ایک طرف۔

SO LET THE LADIES ENJOY THIS DAY .

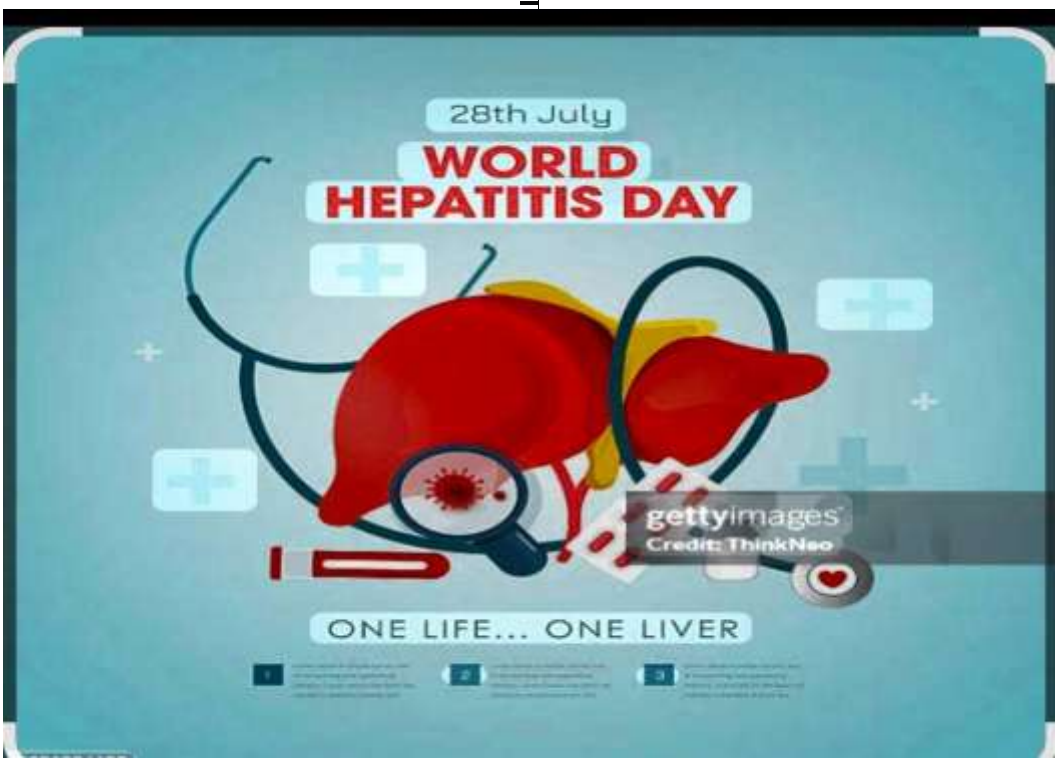

۔28جولائی: عالمی یومِ ہیپاٹائٹس (کالا یرقان)۔۔۔ہیپاٹائٹس کے خاتمے کی عالمی جدوجہد—پاکستان اور پنجاب کے لیے ایک اہم چیلنج کے ساتھ۔۔ امید کی نئی کرن۔

ہر سال 28 جولائی کو دنیا بھر میں عالمی یومِ ہیپاٹائٹس (World Hepatitis Day) منایا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد وائرل ہیپاٹائٹس کے بارے میں عوامی شعور اجاگر کرنا، بروقت تشخیص، مؤثر علاج، حفاظتی تدابیر اور اس موذی مرض کے خاتمے کے لیے عالمی کوششوں کو مزید مضبوط بنانا ہے۔

یہ دن ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ہیپاٹائٹس (کالا یرقان) ایک خاموش قاتل (Silent Killer) ہے، جو برسوں تک بغیر کسی نمایاں علامت کے انسانی جگر کو نقصان پہنچاتا رہتا ہے اور بالآخر جگر کے ناکارہ ہونے، سروسس (Cirrhosis) یعنی صلابت جگر اور جگر کے سرطان (Liver Cancer) جیسی جان لیوا پیچیدگیوں کا سبب بن سکتا ہے۔

عالمی یومِ ہیپاٹائٹس کا تصور سب سے پہلے ورلڈ ہیپاٹائٹس الائنس (World Hepatitis Alliance) اور مختلف مریض تنظیموں کی مشترکہ کاوشوں سے سامنے آیا، جنہوں نے 19 مئی کو پہلا عالمی یومِ ہیپاٹائٹس منایا۔ بعد ازاں 2010ء میں عالمی ادارۂ صحت (WHO) کی ورلڈ ہیلتھ اسمبلی (World Health Assembly) نے ایک قرارداد کے ذریعے اس دن کو باضابطہ طور پر 28 جولائی مقرر کیا، جبکہ پہلا سرکاری عالمی یومِ ہیپاٹائٹس 28 جولائی 2011ء کو منایا گیا۔ 28 جولائی کا انتخاب معروف امریکی سائنس دان ڈاکٹر باروچ سیموئل بلمبرگ (Dr. Baruch S. Blumberg) کی سالگرہ کے احترام میں کیا گیا، جنہوں نے 1967ء میں ہیپاٹائٹس بی وائرس دریافت کیا، اس کے بعد پہلی مؤثر ویکسین تیار کی، اور اپنی انقلابی خدمات پر 1976ء کا نوبل انعام برائے طب حاصل کیا۔

اس دفعہ عالمی یومِ ہیپاٹائٹس 2026 کا موضوع اس طرح سے تجویز کیا گیا ہے

"Hepatitis: Let's Break It Down"

یعنی: "آیئے ہیپاٹائٹس کے خاتمے کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں ختم کریں۔"

اس موضوع کا بنیادی مقصد مالی، سماجی، انتظامی اور نفسیاتی رکاوٹوں، خصوصاً مریضوں کے ساتھ وابستہ بدنامی (Stigma)، کو ختم کرتے ہوئے ہر فرد تک بروقت تشخیص، علاج اور حفاظتی سہولیات کی فراہمی کو یقینی بنانا ہے۔ عالمی ادارۂ صحت نے 2030ء تک جو اہداف مقرر کیے ہیں ان میں نئے ہیپاٹائٹس انفیکشنز میں 90 فیصد کمی اور بیماری سے ہونے والی اموات میں 65 فیصد کمی کے علاوہ ہر مریض کو بروقت تشخیص اور مؤثر علاج کی فراہمی اور ہیپاٹائٹس بی کی ویکسین تک عالمی رسائی شامل ہے۔

عالمی ادارۂ صحت کی 2026ء کی تازہ ترین عالمی رپورٹ (2024ء کے اعداد و شمار پر مبنی) کے مطابق دنیا بھر میں تقریباً 28 کروڑ 70 لاکھ (287 ملین) افراد دائمی ہیپاٹائٹس بی یا سی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ سالانہ تقریباً 13 لاکھ افراد ہیپاٹائٹس سے متعلقہ بیماریوں، خصوصاً جگر کے سرطان اور سروسس، کے باعث جان کی بازی ہار جاتے ہیں۔ یعنی اوسطاً روزانہ تقریباً 3,500 اموات جو بہت تشویشناک ہے

۔۔ہیپاٹائٹس بی کے صرف 5 فیصد سے بھی کم مریض علاج حاصل کر رہے ہیں۔ہیپاٹائٹس سی کے تقریباً20 فیصد مریض ہی مکمل علاج تک پہنچ پاتے ہیں۔ہیپاٹائٹس سی کے عالمی بوجھ کا تقریباً39 فیصد صرف پاکستان، بھارت اور چین میں موجود ہے، جبکہ پاکستان دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جہاں اس بیماری کی شدت سب سے زیادہ ہے

پاکستان اس وقت دنیا میں ہیپاٹائٹس سی سے سب سے زیادہ متاثرہ ممالک میں شمار ہوتا ہے۔دستیاب قومی اور عالمی تخمینوں کے مطابق ملک میں ایک کروڑ سے زائد افراد ہیپاٹائٹس بی یا سی کا شکار ہیں۔ہیپاٹائٹس سی کی شرح تقریباً7.5 فیصد ہے، جو دنیا کی بلند ترین شرحوں میں شامل ہے۔ہر سال تقریباً5 لاکھ 45 ہزار نئے ہیپاٹائٹس سی کے کیسز سامنے آتے ہیں۔سالانہ تقریباً31 ہزار افراد ہیپاٹائٹس بی اور سی کی پیچیدگیوں کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔2026ء میں عالمی ادارۂ صحت نے پاکستان کو دنیا میں ہیپاٹائٹس سی کے سب سے زیادہ مریضوں والا ملک قرار دیا

۔پاکستان میں بیماری کے پھیلاؤ کی اہم وجوہات میں غیر محفوظ انجیکشن اور سرنجوں کا دوبارہ استعمال، غیر معیاری طبی و دندان سازی کے آلات، غیر محفوظ خون کی منتقلی، غیر جراثیم کش حجامت اور بیوٹی پارلر کے آلات، ٹیٹو اور جسم چھیدنے کے غیر محفوظ طریقے اور بیماری سے متعلق آگاہی کی کمی سامنے ائی ہے

حکومتِ پنجاب نے ہیپاٹائٹس کے خاتمے کے لیے متعدد اقدامات کیے ہیں، جن میں: سرکاری ہسپتالوں میں ہیپاٹائٹس بی اور سی کی مفت تشخیص کی سہولیات۔ مستحق مریضوں کے لیے مفت یا رعایتی علاج اور حفاظتی ٹیکہ جات کے قومی پروگرام کے تحت نومولود بچوں کو ہیپاٹائٹس بی ویکسین کی فراہمی بلڈ، بینکوں کی نگرانی اور خون کی لازمی اسکریننگ، انفیکشن کنٹرول کے ضوابط پر عملدرآمد، عوامی آگاہی مہمات، طبی عملے کی تربیت اور محفوظ انجیکشن کے استعمال پر زور۔اور ان پر عمل درآمد کے لئے سنجیدہ اقدامات پر زور دیا جارہا ہے۔

بنیادی مراکز صحت لیول پر سب سے پہلے ہیپاٹائٹس B اور C کی مفت سکریننگ کا انتظام پنجاب رورل سپورٹ پروگرام (PRSP) نے اپنے زیر انتظام 14 اضلاع (CMIPHC) میں 2005 میں شروع کیا تھا اور 2017 تک کامیابی سے چلایا ۔بعد ازاں یہ مراکز صحت حکومتِ کی نئی تشکیل کردہ کمپنی (PHFMC) کو دے دئے گئے اور اس کے بعد یہ پرائیویٹ ڈاکٹروں کو ائوٹ سورس کر دیئے گئے۔ تاہم PRSP کے تجربات سے حکومت نے ایک سبق سیکھا اور اس کے بعد اس کی طرف توجہ دی۔اور اس کے لئے ایک علیحدہ پروگرام وضع کیا۔اور EPI کے تحت اس پر عمل درامد ہو رہا ہے۔۔

اگرچہ یہ اقدامات حوصلہ افزا ہیں، تاہم ماہرین کے مطابق بیماری پر مکمل قابو پانے کے لیے مؤثر نگرانی، دیہی علاقوں تک تشخیصی سہولیات کی توسیع، محفوظ طبی طریقوں کے سخت نفاذ اور عوامی شعور میں مزید اضافہ ناگزیر ہے

ہیپاٹائٹس سے بچاؤ ممکن ہے، اگر ہم چند بنیادی اصولوں پر عمل کریں

:ہمیشہ نئی اور جراثیم سے پاک سرنج استعمال کروائیں۔

صرف اسکریننگ شدہ خون ہی استعمال کریں۔ ہیپاٹائٹس بی کی ویکسین ضرور لگوائیں۔ دانتوں، حجامت اور بیوٹی پارلر کے آلات کی صفائی یقینی بنائیں۔ اگر خطرہ موجود ہو تو بروقت ہیپاٹائٹس بی اور سی کا ٹیسٹ کروائیں۔

مثبت تشخیص کی صورت میں علاج میں تاخیر نہ کریں

عالمی یومِ ہیپاٹائٹس صرف ایک یادگاری دن نہیں بلکہ ایک اجتماعی عہد ہے کہ ہم اپنی، اپنے خاندان اور اپنی آنے والی نسلوں کی صحت کے تحفظ کے لیے ذمہ داری کا مظاہرہ کریں۔ بروقت تشخیص، مؤثر علاج، محفوظ طبی رویّے اور عوامی آگاہی ہی وہ راستہ ہیں جو پاکستان کو 2030 تک ہیپاٹائٹس کے خاتمے کے عالمی ہدف کے قریب لے جاسکتے ہیں۔ ہر شہری کو یہ عہد کرنا چاہیئے کہ ہیپاٹائٹس کے خلاف جنگ میں آگاہی کو اپنا ہتھیار، احتیاط کو اپنی عادت اور بروقت تشخیص کو اپنی ترجیح بنائے، کیونکہ "ایک محفوظ جگر ہی صحت مند زندگی کی ضمانت ہے۔ "



27 جولائی۔عالمی یومِ سر و گردن کینسر: آگہی اور بروقت علاج ہی زندگی کی ضمانت ہے۔۔پاکستان خصوصا "پنجاب میں کئے گئے موثر اقدامات کا جائزہ (ایک ایسی بیماری جو اگر بروقت پہچان لی جائے تو مکمل شفایابی یقینی حد تک ممکن ہو جاتی ہے)

یہی وہ پیغام ہے جو ہر سال 27 جولائی کو دنیا بھر میں "عالمی یومِ سر و گردن کینسر" کے موقع پر دہرایا جاتا ہے۔
یہ دن اقوامِ متحدہ کا باضابطہ طور پر تسلیم شدہ دن نہیں، تاہم دنیا کی سب سے معتبر طبی تنظیمیں اسے پورے عزم اور جوش کے ساتھ مناتی ہیں، کیونکہ اس کا مقصد براہِ راست انسانی جانوں کی حفاظت سے جڑا ہوا ہے۔ WHO کی بھی تائید اس میں شامل ہے

۔اس دن کی بنیاد 27 جولائی 2014 کو نیویارک میں رکھی گئی، جب International Federation of Head and Neck Oncologic Societies (IFHNOS) کی پانچویں عالمی کانگریس کا افتتاح ہوا جو Memorial Sloan Kettering Cancer Cente میں منعقد ہوئی جس میں دنیا کی پہلی ہیڈ اینڈ نیک سرجری سروس کے قیام کی صد سالہ تقریبات شروع تھین۔ اس موقع پر بھارتی ماہر ڈاکٹر پنکج چترویدی کی تجویز پر، اور امریکن ہیڈ اینڈ نیک سوسائٹی (AHNS) کے اشتراک سے، 27 جولائی کو باضابطہ طور پر یہ دن قرار دیا گیا، جسے ہالی وڈ اداکار اور خود کینسر سے صحت یاب ہونے والے مائیکل ڈگلس نے بطور مہمانِ خصوصی اپنی تائید بخشی۔ بعد ازاں Union for International Cancer Control (UICC) سمیت دنیا بھر کی درجنوں طبی تنظیموں نے اس کی توثیق کی،

اور آج یہ دن 100 سے زائد ممالک میں منایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں سر اور گردن کے کینسر کے سالانہ تقریباً 9 لاکھ 47 ہزار نئے کیسز رپورٹ ہوتے ہیں، جن میں سے تقریباً 4 لاکھ 82 ہزار قیمتی جانیں ضائع ہو جاتی ہیں، اور ایشیا اس بوجھ کا سب سے بڑا حصہ برداشت کرتا ہے۔ بروقت تشخیص ہی وہ عنصر ہے جو علاج کی کامیابی کی شرح کو کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔

پاکستان کے تناظر میں اس دن کی اہمیت کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ حالیہ طبی تحقیق کے مطابق سر اور گردن کا کینسر پاکستان میں تمام کینسرز میں دوسرے نمبر پر سب سے عام مرض ہے، اور انسٹیٹیوٹ آف نیوکلیئر میڈیسن اینڈ آنکولوجی، لاہور کے ایک مطالعے کے مطابق یہ ملک میں رپورٹ ہونے والے تمام نئے کینسر کیسز کا تقریباً پانچواں حصہ (18.74 فیصد) بنتا ہے۔ ہر سال ملک بھر میں تقریباً 16 ہزار نئے کیسز سامنے آتے ہیں، جبکہ 10 ہزار سے زائد اموات ہوتی ہیں۔

کراچی بدقسمتی سے، دنیا بھر میں منہ کے کینسر کی شرح کے لحاظ سے سرِفہرست شہروں میں شمار ہوتا ہے۔ خواتین کے مقابلے میں مردوں میں یہ مرض دو سے تین گنا زیادہ پایا جاتا ہے، اور خطے (پاکستان، بھارت، سری لنکا) میں پانچ سالہ بقا کی شرح 40 فیصد سے کم ریکارڈ کی گئی ہے۔ یہ اعداد و شمار خوفزدہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ یہ یاد دلانے کے لیے ہیں کہ بروقت تشخیص اس شرح کو نمایاں طور پر بہتر بنا سکتی ہے—اور یہی تبدیلی ہمارے اپنے ہاتھ میں ہے

پاکستان میں اس کینسر کی سب سے بڑی وجہ تمباکو کا استعمال ہے—سگریٹ اور بیڑی کی صورت میں بھی، اور بغیر دھوئیں والے (Smokeless) تمباکو کی شکل میں بھی، جیسے گٹکا، چھالیہ، پان اور نسوار۔ دلچسپ مگر تشویشناک بات یہ ہے کہ ملک میں سگریٹ نوشوں سے کہیں زیادہ تعداد بغیر دھوئیں والے تمباکو کے عادی افراد کی ہے

۔متعدد ہسپتالوں کے مریضوں پر ہونے والی تحقیق سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ بغیر دھوئیں والا تمباکو استعمال کرنے والا شخص، غیر استعمال کنندہ کے مقابلے میں منہ کے کینسر میں مبتلا ہونے کے تقریباً چار گنا زیادہ امکانات رکھتا ہے۔ الکوحل کا استعمال اور HPV وائرس بھی اہم وجوہات میں شامل ہیں

۔علامات جن سے کبھی غفلت نہ برتی جائے اس میں منہ کا کوئی زخم یا چھالا جو دو ہفتوں سے زائد عرصے تک ٹھیک نہ ہو۔ گلے یا گردن میں غیر معمولی گلٹی یا سوجن، آواز کا مستقل بیٹھ جانا یا بھاری پن، نگلنے میں دشواری یا کان میں بلاوجہ درد، منہ میں سفید یا سرخ دھبے۔۔ اگر ان میں سے کوئی علامت دو ہفتوں سے زیادہ برقرار رہے تو فوری طور پر معالج سے رجوع کریں۔ وقت پر تشخیص ہی جان بچانے کا سب سے مؤثر ذریعہ ہے

دنیا بھر میں اس دن ہسپتالوں اور کینسر مراکز میں مفت معائنے کے کیمپ لگتے ہیں، معالجین اور آنکولوجسٹس کے لیے سائنسی کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں، اور آگہی واک، پوسٹر مقابلوں اور سوشل میڈیا مہمات کے ذریعے عوام کو تمباکو کے مضر اثرات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ پاکستان میں شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال، آغا خان یونیورسٹی ہسپتال، انڈس ہسپتال، جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر اور پنجاب انسٹیٹیوٹ آف آنکولوجی جیسے بڑے ادارے ہر سال خصوصی سیمینارز، مفت معائنہ کیمپس اور آگہی مہمات کا انعقاد کرتے ہیں، جہاں ڈینٹل سرجن اور ENT ماہرین منہ اور گلے کا معائنہ کر کے کینسر سے پہلے کی علامات (Pre-cancerous lesions) کو بروقت پہچاننے میں مدد فراہم کرتے ہیں۔ صحت یاب ہونے والے مریضوں (Survivors) کے تجربات پر مبنی سیشنز بھی منعقد کیے جاتے ہیں، جو زیرِ علاج مریضوں کے لیے حوصلے کا باعث بنتے ہیں

۔پاکستان میں علاج کی سہولیات کی شکل میں امید کی کرن نظر اتی ہے۔ پاکستان میں سر اور گردن کے کینسر کے علاج کے لیے متعدد معتبر ادارے مفت یا رعایتی سہولیات فراہم کر رہے ہیں

:شوکت خانم میموریل کینسر ہسپتال (لاہور و پشاور): تشخیص سے سرجری، کیموتھراپی اور ریڈی ایشن تک جدید سہولیات، مستحق مریضوں کے لیے مکمل مفت علاج

۔ کینسر کیئر ہسپتال اینڈ ریسرچ سینٹر (لاہور): تمام اقسام کے کینسر کا مکمل مفت علاج اور ریڈی ایشن کی سہولت

۔نواز شریف انسٹی ٹیوٹ آف کینسر ٹریٹمنٹ اینڈ ریسرچ (لاہور): حکومتِ پنجاب کا ادارہ، جدید علاج بالکل مفت فراہم کرتا ہے

۔جناح پوسٹ گریجویٹ میڈیکل سینٹر، کراچی: سائبر نائف مرکز کے ذریعے ابتدائی مرحلے کے کینسر کا مفت علاج
دیگر سرکاری ہسپتال: اسلام آباد کا PIMS، لاہور کے Mayo Hospital اور INMOL، اور پشاور کا Hayatabad Medical Complex بھی آنکولوجی کے شعبہ جات میں علاج و ریفرل کی سہولیات فراہم کرتے ہیں۔ مالی معاونت کے حوالے سے حکومتی سطح پر بھی مثبت پیش رفت جاری ہے۔ حکومتِ پنجاب کا "چیف منسٹر اسپیشل انیشیٹو فار کینسر پیشنٹس" پروگرام اہل مریضوں کو سالانہ 10 لاکھ روپے تک کا مکمل مفت علاج — تشخیص سے مکمل دیکھ بھال تک — فراہم کرتا ہے۔ رجسٹریشن اور رہنمائی کے لیے 24 گھنٹے ہیلپ لائن (0800-09009) اور واٹس ایپ سروس بھی دستیاب ہے، جس سے مستحق مریضوں تک رسائی مزید آسان ہو گئی ہے

آگہی، امید اور عملی قدم کے ساتھ سر اور گردن کے کینسر کی بڑی وجوہات کا تدارک یعنی تمباکو، گٹکا، پان اور نسوار سے مکمل پرہیز ہی وقت کی ضرورت ہے۔ اگر ہم آج ہی ان عادات کو خیرباد کہہ دیں، اپنے پیاروں کو ان کے مضر اثرات سے آگاہ کریں، اور کسی بھی مشکوک علامت پر فوری طبی معائنہ کروائیں، تو ہزاروں قیمتی جانیں بچائی جا سکتی ہیں

۔عالمی یومِ سر و گردن کینسر ہمیں یہی پیغام دیتا ہے

خاموشی نہیں، آگہی — خوف نہیں، عملی اقدام۔

آیئے اس دن خود بھی محتاط رہنے اور اپنے ارد گرد شعور اجاگر کرنے کا عزم کریں، کیونکہ بروقت تشخیص ہی زندگی کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔





26جولائی معرکہ کارگل کے اختتام کا دن۔۔۔بھارت اور پاکستان کے متضاد دعوے۔۔ایک طرف فتح کا جشن تو دوسری طرف مکمل خاموشی

26جولائی کا دن بھارت میں ہر سال "کارگل وجے دیوس" کے طور پر منایا جاتا ہے، کیونکہ اس دن 1999ء میں کارگل جنگ کا اختتام ہوا تھا اور بھارت نے ان علاقوں پر دوبارہ کنٹرول حاصل کیا تھا جہاں جھڑپیں ہوئیں تھیں. جبکہ پاکستان اس دن کو فتح یا خوشی کے طور پر نہیں مناتا۔ پاکستان میں اس جنگ کو "آپریشن کوہ پیما" کہا جاتا ہے اور یہاں اس تاریخ پر کوئی سرکاری تقریب نہیں منائی جاتی۔ دونوں ممالک کی قومی اور دفاعی تاریخ میں اس جنگ سے متعلق مختلف بیانیے پائے جاتے ہیں۔

اس کے پس منظر میں یہ امر ہمیشہ سامنے رکھا جانا چاہیئے کہ 1999ء کے اوائل میں پاکستان اور بھارت کے درمیان "معاہدہ لاہور" طے پایا تھا جس سے دونوں ممالک کے تعلقات میں بہتری کی امید پیدا ہو چلی تھی کہ اس دوران یہ معرکہ بپا ہو گیا۔ اور باہمی تعلقات تلخ سے تلخ ترین ہوتے چلے گئے۔

کارگل اور دراس کا علاقہ خطۂ کنٹرول (LoC) کے ساتھ انتہائی بلند اور دشوار گزار پہاڑیوں پر مشتمل ہے۔ روایتی طور پر، سردیوں کی شدید برف باری کے دوران دونوں ممالک کی افواج اپنی فارورڈ پوسٹس چھوڑ کر نچلی سطح پر منتقل ہو جاتی تھیں اور گرمیوں میں واپس آ جاتی تھیں

1999ء کی شروعات میں (سردیوں کے دوران) پاکستانی فوج اور مجاہدین نے کارگل اور دراس کے علاقوں میں خالی کی گئی بھارتی پوسٹوں پر پیش قدمی کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ اس پیش قدمی کا مقصد بھارت کی اہم شاہراہ (NH-1A جو سری نگر کو لیہہ سے جوڑتی ہے) کے مواصلاتی رابطے کو کاٹنا اور کشمیر کے مسئلے پر بین الاقوامی توجہ حاصل کرنا تھا۔

مئی 1999ء میں جب بھارتی فوج کو ان نفاذات کا علم ہوا تو اس نے اپنے علاقے کو واگزار کرانے کے لیے "آپریشن وجے" کا آغاز کیا۔ دو ماہ سے زائد عرصے تک بلند و بالا پہاڑوں پر شدید جنگ جاری رہی، جس میں دونوں طرف سے بھاری توپ خانے اور فضائیہ کا استعمال کیا گیا۔

جنگ کے دوران امریکہ سمیت عالمی برادری کی جانب سے شدید سفارتی دباؤ سامنے آیا، کیونکہ دونوں ممالک 1998ء میں ایٹمی طاقتیں بن چکے تھے اور ایٹمی تصادم کا خطرہ موجود تھا۔ جولائی 1999ء کے آغاز میں پاکستان کے اس وقت کے وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف نے واشنگٹن ڈی سی میں امریکی صدر بل کلنٹن سے ملاقات کی اور 4 جولائی 1999ء کو جاری ہونے والے مشترکہ اعلامیے کے بعد پاکستان نے اعلان کیا کہ وہ جنگجوؤں کو LoC کی اپنی حد میں واپس بلانے پر اثر و رسوخ استعمال کرے گا

26 جولائی 1999ء تک بھارتی فوج نے دعویٰ کیا کہ اس نے اپنی تمام سابقہ پوسٹوں کا کنٹرول دوبارہ حاصل کر لیا ہے، اور یوں یہ جنگ باضابطہ طور پر ختم ہو گئی۔

اس جنگ میں بھارت کے سرکاری اعداد و شمار کے مطابق 527 بھارتی فوجی ہلاک اور 1,363 زخمی ہوئے۔ جبکہ پاکستان کی جانب سے سرکاری طور پر 453 (اور سابق صدر پرویز مشرف کے مطابق 357) فوجی اہلکار شہید ہوئے اور 665 زخمی ہوئے۔ اس معرکہ میں پاک فوج کے افسروں اور جوانوں نے انتہائی ناگفتہ بہ اور سخت موسمی حالات میں شجاعت اور پامردی کی لازوال تاریخ رقم کی۔ اس جنگ کے روشن ترین ستاروں میں کیپٹن کرنل شیر خان اور حوالدار لالک جان خان کا نام سرفہرست ہے، جن کی بے مثال بہادری اور قربانی نے انہیں پاکستان کا اعلیٰ ترین فوجی اعزاز نشانِ حیدر دلایا۔ پاک فوج کے جوانوں نے 17,000 فٹ سے زائد بلند برف پوش اور سخت ترین پہاڑی چوٹیوں پر دفاعِ وطن کا فریضہ انجام دیا۔

مگر امریکہ اور عالمی برادری کے دباؤ کے باعث پاکستان کو لائن آف کنٹرول (LoC) پر جو پسپائی اختیار کرنی پڑی۔ اس کے فوراً بعد دونوں ممالک کو اپنے دفاعی اخراجات میں اربوں روپے کا اضافہ کرنا پڑا۔ پہلے سے گرتی ہوئی معیشت اور بیرونی ذخائر پر مزید منفی اثر پڑا۔ جنگ کے دوران کراچی اور ممبئی دونوں کی اسٹاک مارکیٹس کو شدید جھٹکا لگا اور فنڈز کا رخ دفاع کی طرف موڑنے سے عوامی فلاحی منصوبے متاثر ہوئے۔

کارگل جنگ میں جنرل مشرف اور اس کے ہم نوائوں نے فوجیوں کی شہادت اور پسپائی کی ذمہ داری نواز شریف کے جنگ بندی کے حکم پر ڈالنے کا سرعام تذکرہ بھی کیا مگر حقیقت یہ تھی کہ یہ آپریشن نواز شریف کی مرضی اور مشاورت کے بغیر شروع کیا گیا تھا۔ اور

وزیر اعظم کو زمینی حقائق کا ادراک انڈین وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی کے فون اور بین الاقوامی دباؤ کے ذریعے ہوا۔ فوج کے اندرونی حلقوں اور کتابوں (جیسے سابق ڈی جی ایم او جنرل شاہد عزیز کے بیانات) سے بھی ثابت ہوا کہ یہ فیصلہ چند جرنیلوں نے خفیہ طور پر کیا تھا۔ دیگر اعلی عسکری قیادت اس سے لاعلم تھی

۔جب حالات خراب ہو گئے اور محاذ پر رسد اور فضائی تحفظ کے فقدان کے باعث پاکستانی فوجی شدید خطرے میں تھے۔ تو اسحاق ڈار اور دیگر وزراء کے مطابق جنرل مشرف نے خود نواز شریف سے درخواست کی تھی کہ وہ صدر بل کلنٹن کے ذریعے جنگ بندی اور محفوظ راستہ حاصل کریں۔ اور نواز شریف کا دورہ واشنگٹن فوج کے محاصرے میں پھنسے ہوئے جوانوں کو مرنے سے بچانے کی ایک مجبوری اور کوشش تھی۔

مگر فوجی شکست کی کالک کو سویلین حکومت کے سر مڑھنے کے لیے یہ بیانیہ بنایا گیا

کہ

"جیتی ہوئی جنگ "سیاسی قیادت نے ہار دی"

۔اس کے بعد مشرف اور نواز شریف حکومت میں اعتماد کا رشتہ ختم ہو گیا۔ اور نواز شریف نے جنرل مشرف کو اس کے عہدے سے اس وقت برطرف کر کے نئے چیف اف ارمی سٹاف کا تقرر کر دیا جب وہ بیرون ملک دورے پر تھے اور واپس ارہے تھے ۔پھر اس کے طیارے کا رخ تبدیل کر کے اس کی وطن واپسی کی راہ میں رکاوت ڈالی گئی۔ مگر ان کا یہ مقصد پورا نہ ہو سکا اور گیم الٹ گئی اور اسی رات یعنی 12 اکتوبر 1999 کو نواز شریف کی حکومت کو ختم کر کے سیاسی قیادت کو جیل میں ڈال دیا گیا اور ملک میں مارشل لا لگ گیا۔ اس جنگ کا انڈیا میں الٹ اثر پڑا

۔اٹل بہاری واجپائی کی حکومت کو سیاسی طور پر مضبوطی ملی اور وہ دوبارہ الیکشن جیت گئے

عالمی سطح پر پاکستان کے اس اقدام کو سراہا نہیں گیا اور زیادہ تر ممالک نے پاکستان پر زور دیا کہ وہ LoC کا احترام کرے اور پیش قدمی واپس لے۔ اس سے پاکستان کو عارضی طور پر سفارتی سطح پر تنہائی کا سامنا کرنا پڑا۔ "معاہدہ لاہور" کے ذریعے جو امن کی فضا قائم ہوئی تھی، وہ مکمل طور پر ختم ہو گئی اور دونوں ممالک کے درمیان شدید بے اعتمادی پیدا ہوئی۔ بس سروس، تجارت طیاروں کی آمد و رفت اور دیگر دو طرفہ مذاکرات طویل عرصے کے لیے معطل ہو گئے۔ اس جنگ کے بعد دونوں ممالک نے خطۂ کنٹرول (LoC) پر سال بھر فوجیں تعینات رکھنے کا فیصلہ کیا، جس سے دونوں ممالک کے دفاعی بجٹ پر اضافی بوجھ پڑا اگرچہ 2001ء میں آگرہ سربراہ اجلاس اور 2003ء میں LoC پر سیز فائر معاہدے کے ذریعے تعلقات کو بحال کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن کارگل کے اثرات طویل عرصے تک پاک-بھارت تعلقات پر سایہ فگن رہے

المختصر غیر جانبدارانہ نقطہ نظر سے، کارگل جنگ عسکری لحاظ سے ایک انتہائی سخت اور پیچیدہ معرکہ تھا جس نے ثابت کیا کہ ایٹمی صلاحیت کے باوجود روایتی جنگ کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ پاکستان نے اس کے ذریعے کشمیر کے نکتے کو عالمی سطح پر اجاگر کیا، لیکن سفارتی دباؤ اور داخلی سیاسی بحران اس کا سب سے بڑا نقصان ثابت ہوئے۔ بھارت کے لیے یہ اپنی زمین واپس لینے کا معرکہ تھا، جس کی یاد میں وہ 26 جولائی کو اپنی کامیابی کے طور پر مناتا ہے۔ اب یہ فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ خود اندازہ لگا لیں کہ

اس معرکہ کو شروع کرنے سے اختتام تک زیادہ خسارے میں کون رہا؟؟؟

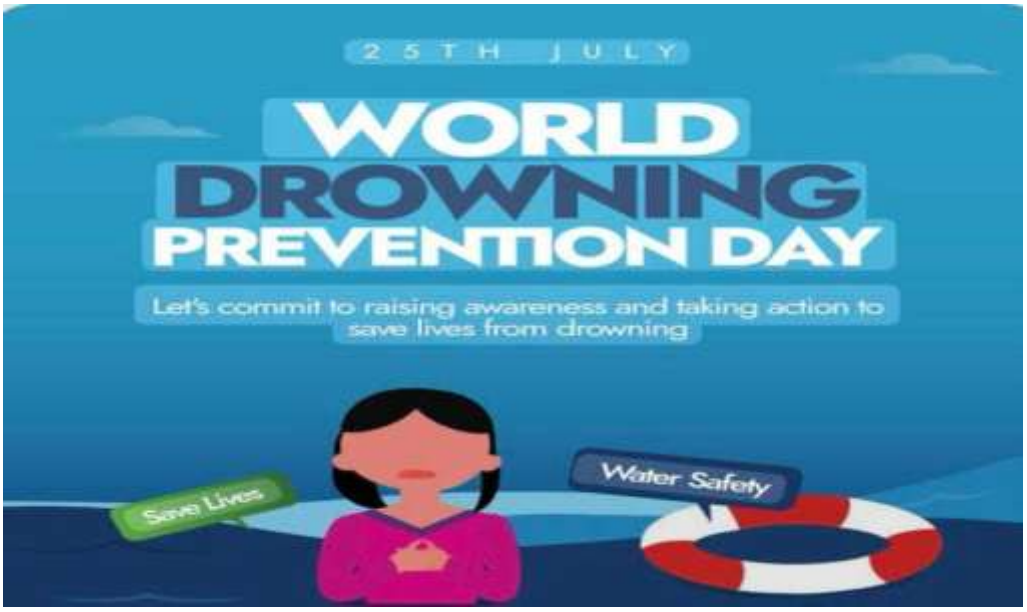

25جولائی۔عالمی یومِ انسدادِ ڈوبنے (World Drowning Prevention Day)اور پاکستان کے تناظر میں احتیاطی تدابیر

ہر سال25جولائی کا دن پانی سے حفاظت اور ڈوبنے سے بچاؤ کی بیداری کے لیے منایا جاتا ہے۔اس دن کو منانے کے حوالہ سے قرارداد کے بنیادی محرک بنگلہ دیش اور آئرلینڈ تھے،اس قرارداد کو ابتدائی طور پر 79 سے 81 دیگر رکن ممالک نے بطورِ معاون (co-sponsor) سمیٹا اور تائید کی تھی۔اور مشترکہ طور پر اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں یہ قرارداد پیش کی۔اس تاریخی قرارداد (A/RES/75/273) کو28اپریل2021 کو منظور کیا گیا جس کے بعد ہر سال25جولائی کو یہ دن منایا جانے لگا۔

اقوام متحدہ کے تمام 193 رکن ممالک اس قرارداد اور اس دن کی تائید کرتے ہیں، اور دنیا بھر میں تمام سرکاری و غیر سرکاری سطح پر 25 جولائی کو پانی میں ڈوبنے سے بچاؤ اور آبی حفاظت (Water Safety) کا شعور اجاگر کرنے کے لیے یہ دن منایا جاتا ہے۔

دنیا بھر میں ہر سال اندازاً 236,000 افراد ڈوبنے کی وجہ سے جان گنوا دیتے ہیں۔ جن میں بچے سب سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں اور یہ بچوں اور نوجوانوں میں حادثاتی موت کی ایک بڑی وجہ بھی ہے۔ 90٪ اموات کم آمدنی والے ممالک کے دیہی علاقوں (دریاؤں، جھیلوں اور نہروں) میں ہوتے ہیں۔ پاکستان میں ہر سال پانی میں ڈوبنے سے ہزاروں افراد جاں بحق ہوتے ہیں، جن میں ایک بڑا حصہ بچوں کا ہے۔ جوہڑوں۔ کھلے میں ہول کی وجہ سے سیوریج کے گٹروں۔ ندی نالوں اور نہاتے ہوئے نہرون میں ڈوبنے کی خبریں اکثر میڈیا میں اتی رہتی ہیں۔ اور سیلاب کے موسم میں سیلابی ریلے بھی کئی زندگیاں نگل جاتے ہیں۔ بسا اوقات سمندر میں کشتی ڈوبنے اور سمندر میں نہاتے ہوئے بھی لہروں کا شکار ہونے جیسے واقعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ مگر پھر بھی اس حوالے سے کوئی باقاعدہ اور متفقہ قومی سالانہ ڈیٹا بیس موجود نہیں۔

تاہم عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق پاکستان جیسے درمیانی اور کم آمدنی والے ممالک میں اس کا تناسب انتہائی زیادہ ہے۔ ان علاقون میں جہاں ان کی شرح معمول سے ہٹ کر ہے۔ ان میں دریائے سندھ اور اس سے جڑی آبی گزرگاہوں، نہروں اور سیلابی علاقوں کے پاس واقع دیہی بستیوں میں بچوں کے ڈوبنے کے واقعات زیادہ ہوتے ہیں۔ پہاڑی علاقے (خیبر پختونخوا اور گلگت بلتستان): سیاحتی سیزن اور مون سون کے دوران سوات، کنہار اور دیگر ندی نالوں میں اچانک طغیانی (فلیش فلڈ) کی وجہ سے تفریح کے لیے آنے والے افراد اور بچوں کے ڈوبنے کا تناسب بڑھ جاتا ہے۔ علاوہ ازیں ہر سال مون سون بارشوں اور سیلاب کے دوران بالخصوص دریائی پٹی کے نچلے علاقے شدید خطرے کی زد میں ہوتے ہیں۔

پاکستان میں پانی میں ڈوبنے سے بچاؤ، حادثات کے فوری تدارک اور محفوظ سیاحت کو یقینی بنانے کے لیے اور ڈوبنے کے بڑھتے ہوئے واقعات کی روک تھام کے لیے حکومتی اور فلاحی سطح پر مختلف اقدامات کیے جاتے ہیں، جن میں ریسکیو ادارے پیش پیش ہیں۔ پنجاب، خیبر پختونخوا اور دیگر صوبوں میں ریسکیو 1122 کی واٹر ریسکیو ٹیمیں نہروں، دریاؤں اور جھیلوں پر الرٹ رہتی ہیں اور حادثے کی صورت میں فوری امداد فراہم کرتی ہیں

مون سون کی بارشوں، طغیانی یا شدید گرمی کے موسم میں ضلعی انتظامیہ کی جانب سے خطرناک دریاؤں، ڈیموں اور سمندری ساحلوں پر نہانے اور جانے پر سخت پابندی عائد کی جاتی ہے اور محکمہ سیاحت اور ضلعی انتظامیہ خطرناک مقامات پر انتباہی بورڈز لگاتی ہے اور میڈیا کے ذریعے "عالمی یومِ انسدادِ ڈوبنا" (25 جولائی) جیسے مواقع پر عوامی شعور بیدار کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ خیبر پختونخوا اور دیگر سیاحتی علاقوں میں ہنگامی معلومات اور رہنمائی کے لیے سیاحتی ہیلپ لائن (جیسے 1422) چوبیس گھنٹے فعال رہتی ہے۔ جہاں حکومتی ادارے اور سماجی تنظیمیں اس خاموش بحران سے نمٹنے کے لئے کوشاں ہیں وہاں عوام کو بھی احتیاطی تدابیر پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے

.ہر کام حکومت ہر وقت نہیں کر سکتی۔ حکومتی اداروں کے پہنچنے سے پہلے نقصان ہو چکا ہوتا ہے..

۔لہٰذا اگر آپ یا آپ کے شناسا کسی سیاحتی مقام (خاص طور پر شمالی علاقہ جات یا ساحلی پٹی) کا رخ کر رہے ہیں تو

جھیلوں یا دریاؤں میں کشتی رانی، رافٹنگ یا واٹر اسپورٹس کے دوران ہمیشہ لائف جیکٹ پہنیں۔

بہاؤ والے دریاؤں، گیلے پتھروں اور آبشاروں کے کناروں پر کھڑے ہو کر سیلفی لینے سے مکمل گریز کریں۔

پہاڑی علاقوں کے ندی نالوں کا پانی توقع سے زیادہ ٹھنڈا اور تیز ہوتا ہے، جس سے جسم سن ہو سکتا ہے، لہذا وہاں نہانے کا خطرہ نہ لیں

سفر پر روانہ ہونے سے پہلے اور دورانِ سفر محکمہ موسمیات کی تازہ ترین ایڈوائزری اور الرٹس لازمی چیک کریں۔

مقامی گائیڈز، پولیس یا ریسکیو اداروں کی جانب سے ممنوعہ قرار دیے گئے مقامات پر جانے کی ضد ہرگز نہ کریں

۔پانی کے قریبی مقامات پر بچوں کو ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا یا اپنی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیں۔

ہو سکتا ہے کہ ان احتیاطی تدابیر پر عمل کر کے کسی کی قیمتی جان بچائی جا سکے۔



24جولائی:"عالمی خود سنبھال دن (International Self-Care Day)"

اپنی صحت، اپنی ذمہ داری

ہر سال24جولائی کو دنیا بھر کے150سے زائد ممالک میں عالمی یوم خود سنبھال (International Self-Care Day) منایا جاتا ہے۔اس دن کا بنیادی مقصد لوگوں میں اس شعور کو فروغ دینا ہے کہ اچھی صحت صرف بیماری کے علاج سے نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں اپنی جسمانی، ذہنی اور سماجی صحت کی مسلسل دیکھ بھال سے حاصل ہوتی ہے

یہ انسانی رویوں کا ایک خاموش المیہ ہے کہ اگر آپ مسکرائیں تو زمانہ آپ کے ساتھ قہقہے لگانے کے لیے سیماب پا ہو جاتا ہے، لیکن جب آنکھوں سے اشک روپوش ہوتے ہیں، تو ویرانی اور تنہائی کے سوا کچھ پاس نہیں ہوتا۔ دکھ اور درد کبھی مشترکہ نہیں ہوتے، جس دل پر گزرتی ہے، سا ہی اسے سہنی پڑتی ہے۔

میرے ایک دوست کا کہنا کس قدر سچ ہے کہ ادھیڑ عمری میں اپنے گھر والوں کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ انسان ان پر بوجھ نہ بنے۔ اپنے پیاروں کے لیے معاشی بوجھ اٹھانا پھر بھی ممکن ہوتا ہے، مگر کسی کی مسلسل تیمار داری اور دائمی بیماری کا بوجھ اچھے سے اچھے رشتوں کا امتحان لے لیتا ہے اور اکثر رشتے اس موڑ پر آکر ٹوٹ جاتے ہیں۔

اور بسا اوقات نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ تیمار داری کے لئے آنے والوں کو اہل خانہ یہ کہ رہے ہوتے ہیں کہ

دعا کریں۔۔۔ اللہ پردہ رکھے اور سفر آخرت آسان کرے۔۔۔

یہی وجہ ہے کہ اپنی صحت کی حفاظت سے بڑھ کر کوئی 'خود انحصاری' نہیں ہو سکتی۔ انہی رویوں کے پیشِ نظر اہل دل نے اس طرف توجہ دی۔

اس دن کا آغاز 2011ء میں برطانیہ میں قائم انٹرنیشنل سیلف کیئر فاؤنڈیشن (International Self-Care Foundation - ISF) نے کیا۔ اگرچہ یہ دن اقوامِ متحدہ (UN) کا باضابطہ منظور شدہ عالمی دن نہیں، تاہم عالمی ادارۂ صحت (WHO) اور متعدد بین الاقوامی صحت کے ادارے صحت مند طرزِ زندگی، بیماریوں کی روک تھام اور ذمہ دارانہ خود نگہداشت کے فروغ کی بھرپور حمایت کرتے ہیں۔

24 جولائی (7/24) کی تاریخ کا انتخاب ایک خوبصورت اور بامعنی پیغام کی علامت ہے کہ اپنی صحت کا خیال رکھنا ہفتے کے ساتوں دن اور دن کے چوبیس گھنٹے ہماری مستقل ذمہ داری ہے، نہ کہ صرف بیماری کے وقت۔

۔ سیلف کیئر سے مراد وہ مثبت عادات اور ذمہ دارانہ اقدامات ہیں جن کے ذریعے ہر فرد اپنی جسمانی، ذہنی، جذباتی اور سماجی صحت کو بہتر بنا سکتا ہے۔ اس میں متوازن غذا، باقاعدہ ورزش، مناسب نیند، ذہنی دباؤ پر قابو پانا، صفائی ستھرائی، بروقت طبی معائنہ، حفاظتی ٹیکہ جات، تمباکو نوشی اور منشیات سے اجتناب، اور ادویات کا محفوظ اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق استعمال شامل ہیں۔

۔ پاکستان کے تناظر میں سیلف کیئر کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ پاکستان اس وقت ذیابیطس، بلند فشارِ خون، دل کی بیماریوں، موٹاپے، ذہنی دباؤ، ہیپاٹائٹس، ڈینگی اور دیگر متعدی و غیر متعدی بیماریوں جیسے صحت کے سنگین چیلنجز سے دوچار ہے۔ ان میں سے بہت سی بیماریوں کی روک تھام مناسب سیلف کیئر کے ذریعے ممکن ہے۔ اگر ہر فرد روزانہ چند بنیادی صحت مند عادات اپنا لے تو نہ صرف اپنی زندگی کے معیار کو بہتر بنا سکتا ہے بلکہ خاندان، معاشرے اور قومی صحت کے نظام پر پڑنے والے بوجھ کو بھی نمایاں طور پر کم کیا جا سکتا ہے اور گھر والوں پر بوجھ نہ بن کر خود کو اور دوسروں کو امتحان میں نہ ڈال کر خوشگوار زندگی گزاری جا سکتی ہے۔۔

مؤثر سیلف کیئر کے چند بنیادی اصول جو ماہرین تجویز کرتے ہیں کچھ اس طرح سے ہیں
-متوازن اور غذائیت سے بھرپور خوراک استعمال کریں۔-روزانہ کم از کم 30 منٹ جسمانی سرگرمی یا ورزش کو معمول بنائیں۔-روزانہ 7 سے 8 گھنٹے پر سکون نیند لیں۔-صاف پانی پئیں اور ذاتی صفائی کا خاص خیال رکھیں۔-ذہنی دباؤ کو کم کرنے کے لیے عبادت، مراقبہ، مطالعہ یا مثبت مشاغل اختیار کریں۔-تمباکو نوشی، نسوار، ویپنگ، شراب اور دیگر نشہ آور اشیاء سے مکمل اجتناب کریں۔-بلڈ پریشر، شوگر، کولیسٹرول اور وزن کا وقفے وقفے سے معائنہ کروائیں۔-بیماری کی صورت میں خود علاج کے بجائے مستند ڈاکٹر سے رجوع کریں اور اینٹی بایوٹکس سمیت کسی بھی دوا کا غیر ضروری استعمال نہ کریں

ہمارا اجتماعی عزم عالمی یومِ سیلف کیئر ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ صحت مند زندگی کا آغاز ہماری اپنی روزمرہ عادات سے ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنی صحت کی ذمہ داری خود قبول کریں، احتیاطی تدابیر اختیار کریں اور صحت مند طرزِ زندگی اپنائیں تو نہ صرف اپنی زندگی کو بہتر بنا سکتے ہیں بلکہ ایک صحت مند، باصلاحیت اور خوشحال پاکستان کی تعمیر میں بھی مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں



23جولائی: عالمی شوگرن سنڈروم ڈے (World Sjögren's Day) — خاموش بیماری، بڑا چیلنج، بروقت تشخیص ہی بہتر زندگی کی ضمانت

ہر سال 23 جولائی کو دنیا بھر میں عالمی شوگرن سنڈروم ڈے (World Sjögren's Day) منایا جاتا ہے۔ اس دن کا مقصد شوگرن سنڈروم (Sjögren's Syndrome) کے بارے میں عوامی آگاہی بڑھانا، بروقت تشخیص کی اہمیت اجاگر کرنا، طبی تحقیق کی حوصلہ افزائی کرنا اور اس بیماری کے ساتھ زندگی گزارنے والے لاکھوں افراد سے اظہارِ یکجہتی کرنا ہے۔ اس دن کا انتخاب سویڈن کے ممتاز ماہر امراضِ چشم ڈاکٹر ہنرک شوگرن (Dr. Henrik Sjögren) کی سالگرہ کی مناسبت سے کیا گیا، جنہوں نے 1933ء میں اس بیماری کی علامات کو پہلی مرتبہ ایک منفرد طبی کیفیت کے طور پر بیان کیا۔ شوگرن سنڈروم ایک دائمی آٹو امیون (Autoimmune) بیماری ہے، جس میں جسم کا مدافعتی نظام غلطی سے اپنے ہی نمی پیدا کرنے والے غدود، خصوصاً آنسو اور تھوک کے غدود، پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں مریض کو آنکھوں میں شدید خشکی، جلن، منہ کی خشکی، نگلنے میں دشواری، دانتوں کے مسائل اور مسلسل پیاس جیسی علامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ صرف انہی غدود تک محدود نہیں رہتی بلکہ اسے ایک سسٹمک بیماری سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ جوڑوں، پھیپھڑوں، گردوں، اعصاب، جلد اور دیگر اعضاء کو بھی متاثر کر سکتی ہے، جس سے شدید تھکن، جسمانی درد اور روزمرہ زندگی کے معیار میں نمایاں کمی واقع ہوتی ہے

۔شوگرن سنڈروم کی تشخیص اکثر آسان نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی ابتدائی علامات بڑھتی عمر، پانی کی کمی، بعض ادویات کے مضر اثرات یا دیگر آٹوامیون بیماریوں مثلاً رمیٹی سند شوت (Rheumatoid Arthritis) اور لوپس (Systemic Lupus Erythematosus) سے ملتی جلتی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے مریض برسوں تک مختلف معالجین سے رجوع کرتے رہتے ہیں اور بروقت تشخیص سے محروم رہتے ہیں۔ جدید تشخیص کے لیے خون کے مخصوص ٹیسٹ، آنکھوں کی خشکی کے معائنے، تھوک کے غدود کے ٹیسٹ اور بعض اوقات بایوپسی بھی کی جاتی ہے

۔عالمی سطح پر اندازاً 25 لاکھ سے 40 لاکھ افراد اس بیماری کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں، جبکہ بعض تحقیقی جائزوں کے مطابق یہ دنیا کی تقریباً 0.1 سے 0.6 فیصد آبادی کو متاثر کر سکتی ہے۔ یہ بیماری مردوں کے مقابلے میں خواتین میں کہیں زیادہ پائی جاتی ہے اور تقریباً 90 فیصد مریض خواتین ہوتی ہیں، خصوصاً 40 سے 60 سال کی عمر کے درمیان۔ پاکستان میں شوگرن سنڈروم کے حوالے سے ابھی تک کوئی قومی رجسٹری یا جامع اعداد و شمار موجود نہیں، جس کی وجہ سے اس مرض کے اصل بوجھ کا درست اندازہ لگانا مشکل ہے۔ تاہم پاکستان میں رمیٹولوجی اور امیونولوجی کے ماہرین کے مطابق یہ بیماری موجود ہے مگر اکثر اس کی بروقت تشخیص نہیں ہو پاتی۔ اس کی ایک بڑی وجہ عوامی آگاہی کی کمی، محدود رمیٹولوجی مراکز، خصوصی تشخیصی سہولیات کی عدم دستیابی اور علامات کو عام کمزوری یا عمر رسیدگی سے منسوب کرنا ہے

۔اس صورتحال میں ضروری ہے کہ پاکستان میں آٹوامیون بیماریوں کی رجسٹری قائم کی جائے، طبی عملے کی تربیت کو فروغ دیا جائے اور عوامی آگاہی مہمات کے ذریعے بروقت تشخیص کو ممکن بنایا جائے۔ ابھی تک شوگرن سنڈروم کا کوئی مستقل علاج (Cure) دریافت نہیں ہوا، تاہم جدید طبی تحقیق نے اس کے مؤثر انتظام (Management) میں نمایاں پیش رفت کی ہے۔ علاج کا بنیادی مقصد علامات کو کم کرنا، اعضا کو مزید نقصان سے بچانا اور مریض کے معیارِ زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ اس مقصد کے لیے مصنوعی آنسو، لعاب کے متبادل، مناسب پانی کا استعمال، منہ اور دانتوں کی خصوصی دیکھ بھال، اور ضرورت کے مطابق ہائیڈروکسی کلوروکوئن (Hydroxychloroquine)، میتھوٹریکسیٹ (Methotrexate)، کورٹیکوسٹیرائڈز اور دیگر مدافعتی ادویات استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نئی بایولوجیکل (Biologic) ادویات پر بھی تحقیق جاری ہے، اور Ianalumab جیسی ادویات کو ابتدائی مراحل میں امید افزا نتائج کی بنیاد پر خصوصی ریگولیٹری توجہ حاصل ہوئی ہے۔ عالمی شوگرن سنڈروم ڈے ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ بعض بیماریاں خاموشی سے انسان کی زندگی کو متاثر کرتی ہیں، لیکن بروقت تشخیص، مناسب علاج، تحقیق اور سماجی شعور کے ذریعے ان کے اثرات کو نمایاں حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان سمیت دنیا بھر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ آٹوامیون بیماریوں کے بارے میں آگاہی کو فروغ دیا جائے، تحقیق میں سرمایہ کاری کی جائے اور ایسے مریضوں کو معیاری طبی سہولیات اور معاشرتی تعاون فراہم کیا جائے تاکہ وہ بھی ایک باوقار، صحت مند اور فعال زندگی گزار سکیں۔

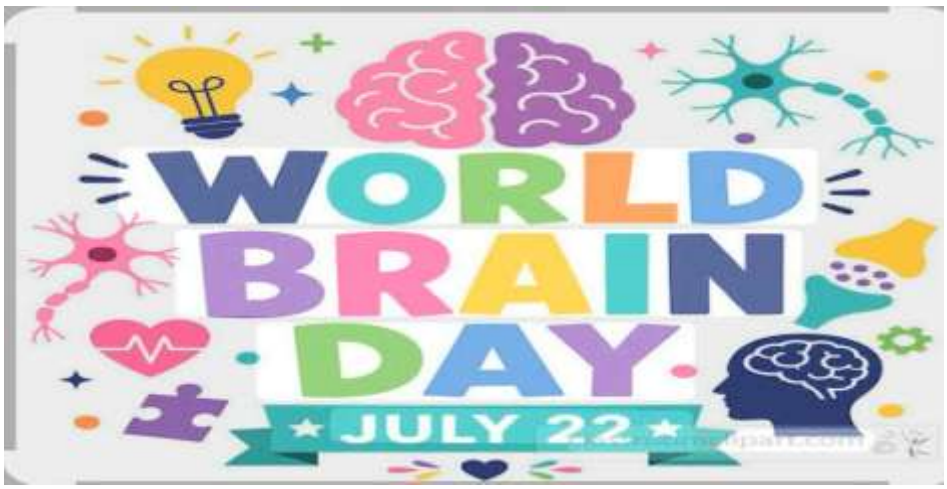

22جولائی: عالمی یومِ دماغ۔صحت مند دماغ، روشن مستقبل—پاکستان میں دماغی صحت کو قومی ترجیح بنانے کا وقت۔(WORLD BRAIN DAY)

ہر سال22جولائی کو دنیا بھر میں عالمی یومِ دماغ (World Brain Day) منایا جاتا ہے۔اس دن کا مقصد دماغی اور اعصابی صحت کی اہمیت کو اجاگر کرنا، دماغی بیماریوں سے متعلق عوامی شعور بیدار کرنا، بروقت تشخیص وعلاج کی ضرورت پر زور دینا اور ہر فرد کو معیاری طبی سہولیات تک رسائی کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے۔ صحت مند دماغ نہ صرف ایک فرد کی بہتر زندگی کی ضمانت ہے بلکہ ایک مضبوط، باشعور اور ترقی یافتہ قوم کی بنیاد بھی ہے۔

عالمی یومِ دماغ منانے کا تصور پہلی مرتبہ 2010 میں معروف ماہرینِ اعصابیات پروفیسر ولادیمیر ہچنسکی، ڈاکٹر تیسا وجے رتنے اور پاکستانی نیورولوجسٹ ڈاکٹر محمد وسیم کے درمیان ہونے والی گفتگو سے سامنے آیا۔ بعد ازاں ورلڈ فیڈریشن آف نیورولوجی (World Federation of Neurology – WFN) کی پبلک اویرنس اینڈ ایڈووکیسی کمیٹی نے 22جولائی کو عالمی یومِ دماغ کے طور پر منانے کی سفارش کی، جسے 2013 میں ورلڈ کانگریس آف نیورولوجی نے منظور کیا اور 2014 میں اس کی باضابطہ منظوری کے بعد پہلی مرتبہ 22 جولائی 2014 کو یہ دن منایا گیا۔22جولائی کا انتخاب بھی ایک تاریخی پس منظر رکھتا ہے، کیونکہ 22جولائی 1957 کو بیلجیئم کے دارالحکومت برسلز میں ورلڈ فیڈریشن آف نیورولوجی کا قیام عمل میں آیا تھا۔

آج یہ دن دنیا کے 120 سے زائد ممالک میں سیمینارز، آگاہی مہمات، طبی کیمپس اور تعلیمی پروگراموں کے ذریعے منایا جاتا ہے، جبکہ ہر سال اس کے لیے ایک خصوصی موضوع (Theme) بھی مقرر کیا جاتا ہے۔ 2026 کا عالمی موضوع

"Brain Health: Access for All""

)دماغی صحت: ہر فرد کے لیے مساوی رسائی"

ہے۔ جو اس حقیقت کی طرف توجہ دلاتا ہے کہ دماغی صحت کسی مخصوص طبقے کی سہولت نہیں بلکہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ بروقت تشخیص، ماہرین تک رسائی، جدید علاج اور بحالی کی سہولیات ہر شہری کو بلا امتیاز دستیاب ہونی چاہئیں۔

عالمی ادارۂ صحت کے مطابق فالج، مرگی، الزائمر، پارکنسن، مائیگرین اور دیگر اعصابی بیماریاں دنیا بھر میں معذوری اور قبل از وقت اموات کی بڑی وجوہات میں شامل ہیں۔ اگرچہ یہ بیماریاں علاج اور دیکھ بھال کے اعتبار سے دنیا کی مہنگی ترین بیماریوں میں شمار ہوتی ہیں، لیکن ان پر تحقیق، آگاہی اور علاج کے لیے وسائل اب بھی ناکافی ہیں

ورلڈ فیڈریشن آف نیورولوجی (WFN) کی رپورٹس کے مطابق اس وقت دنیا کی تقریباً 42 فیصد آبادی (لگ بھگ 3.4 ارب افراد) کسی نہ کسی دماغی یا اعصابی عارضے میں مبتلا ہے۔ عالمی ادارہ صحت (WHO) کے مطابق دنیا میں ہر 7 میں سے 1 شخص کسی ذہنی بیماری کا شکار ہے۔ اور ڈبلیو ایچ او کی گلوبل رپورٹ کے مطابق خطے کے لحاظ سے۔ شمالی و جنوبی امریکہ (15.6 فیصد)، مشرقی بحر الکاہل اور مشرقِ وسطیٰ (14.7 فیصد)، اور یورپ (14.2 فیصد) میں دماغی امراض کی شرح سب سے زیادہ ہے۔

پاکستان میں تقریباً 2 کروڑ 40 لاکھ (24 ملین) افراد کو فوری دماغی یا نفسیاتی علاج کی ضرورت ہے۔ یہ پاکستان کے کل بیماریوں کے بوجھ کا 4 فیصد سے زیادہ بنتا ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں دماغی صحت کے مسائل زیادہ ہیں اور پاکستان ان ممالک میں شامل ہے جہاں شرحِ امراض اور مریضوں کی تعداد کافی بلند ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں فی 360,000 افراد پر صرف 1 ماہر نفسیات (Psychiatrist) دستیاب ہے، جبکہ ڈبلیو ایچ او کے معیار کے مطابق فی 100,000 افراد پر 1 ماہر ہونا چاہیے۔

پاکستان میں دماغی اور اعصابی بیماریوں کا بوجھ مسلسل بڑھ رہا ہے،

مگر بدقسمتی سے عوامی آگاہی، ماہرین کی تعداد اور علاج کی سہولیات اس رفتار سے ترقی نہیں کر سکیں۔ فالج (Stroke) پاکستان میں معذوری اور اموات کی بڑی وجوہات میں شامل ہے۔ ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، تمباکو نوشی، کولیسٹرول اور غیر متحرک طرزِ زندگی اس کے اہم اسباب ہیں۔ اندازاً 20 لاکھ سے زائد پاکستانی مرگی (Epilepsy) کا شکار ہیں، لیکن معاشرتی غلط فہمیوں اور توہمات کی وجہ سے بہت سے مریض بروقت طبی علاج سے محروم رہتے ہیں۔ الزائمر اور دیگر یادداشت کی بیماریاں بڑھتی عمر کے ساتھ تیزی سے بڑھ رہی ہیں، مگر انہیں اکثر بڑھاپے کا معمول سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

علاوہ ازیں 24 کروڑ آبادی کے مقابلے میں نیورولوجسٹ (ماہرینِ اعصاب) کی تعداد انتہائی کم ہے، اور ان کی اکثریت صرف بڑے شہروں تک محدود ہے۔ دیہی علاقوں میں اعصابی امراض کی تشخیص اور علاج کی سہولیات نہ ہونے کے برابر ہیں۔ MRI، CT Scan اور اعصابی بیماریوں کی ادویات عام آدمی کی مالی استطاعت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں

۔ سڑک حادثات میں ہیلمٹ استعمال نہ کرنے کی وجہ سے سر کی شدید چوٹیں مستقل معذوری اور اموات کا ایک بڑا سبب بن رہی ہیں۔ یہ تمام حقائق اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ دماغی صحت کو قومی صحت کی پالیسی میں نمایاں مقام دیا جائے۔ بنیادی مراکزِ صحت میں اعصابی بیماریوں کی تشخیص کی سہولت فراہم کی جائے، نیورولوجسٹ اور متعلقہ عملے کی تعداد میں اضافہ کیا جائے، اور عوامی آگاہی کو قومی مہم کی شکل دی جائے۔ عالمی یومِ دماغ کے بنیادی مقاصد دماغی صحت کے بارے میں عوامی شعور بیدار کرنا۔ قابلِ علاج اعصابی بیماریوں کی بروقت تشخیص اور روک تھام کو فروغ دینا۔ معیاری علاج، بحالی اور معاون ٹیکنالوجی تک مساوی رسائی یقینی بنانا۔ تعلیم، تحقیق اور جدید طبی سہولیات کو فروغ دینا۔ حکومتوں، طبی اداروں اور معاشرے کو مشترکہ اقدامات کے لیے متحرک کرنا۔

ماہرین نے صحت مند دماغ کے لیے چند آسان مگر مؤثر عادات پر زور دیا ہے جن میں روزانہ کم از کم 7 تا 8 گھنٹے پر سکون نیند لینا۔ ہفتے میں کم از کم پانچ دن باقاعدہ ورزش یا تیز چہل قدمی کرنا۔ متوازن غذا جس میں سبزیاں، پھل، دالیں، مچھلی، خشک میوہ جات اور صحت بخش چکنائیاں شامل ہوں استعمال کرنا۔ بلڈ پریشر، شوگر اور کولیسٹرول کو قابو میں رکھنا۔ تمباکو نوشی اور منشیات سے مکمل اجتناب اور۔ سونے سے کم از کم دو گھنٹے پہلے موبائل، ٹی وی اور دیگر اسکرینوں کا استعمال محدود کرنا۔ چائے، کافی اور دیگر کیفین والی اشیاء رات کے وقت کم استعمال کرنا۔ ڈپریشن، بے چینی یا یادداشت میں کمی کی صورت میں فوری طور پر مستند ڈاکٹر سے رجوع کرنا۔ موٹر سائیکل چلاتے وقت ہیلمٹ اور گاڑی میں سیٹ بیلٹ کا استعمال ہمیشہ یقینی بنانا۔ شامل ہیں

ایک صحت مند دماغ ہی صحت مند خاندان، مضبوط معاشرے اور ترقی یافتہ پاکستان کی بنیاد ہے۔ اگر ہم آج دماغی صحت کو اپنی ترجیح بنالیں، بروقت تشخیص، احتیاط اور علاج کو فروغ دیں اور معاشرتی غلط فہمیوں کا خاتمہ کریں تو نہ صرف لاکھوں زندگیاں بچائی جاسکتی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کو بھی ایک زیادہ صحت مند، باصلاحیت اور روشن مستقبل فراہم کیا جاسکتا ہے۔

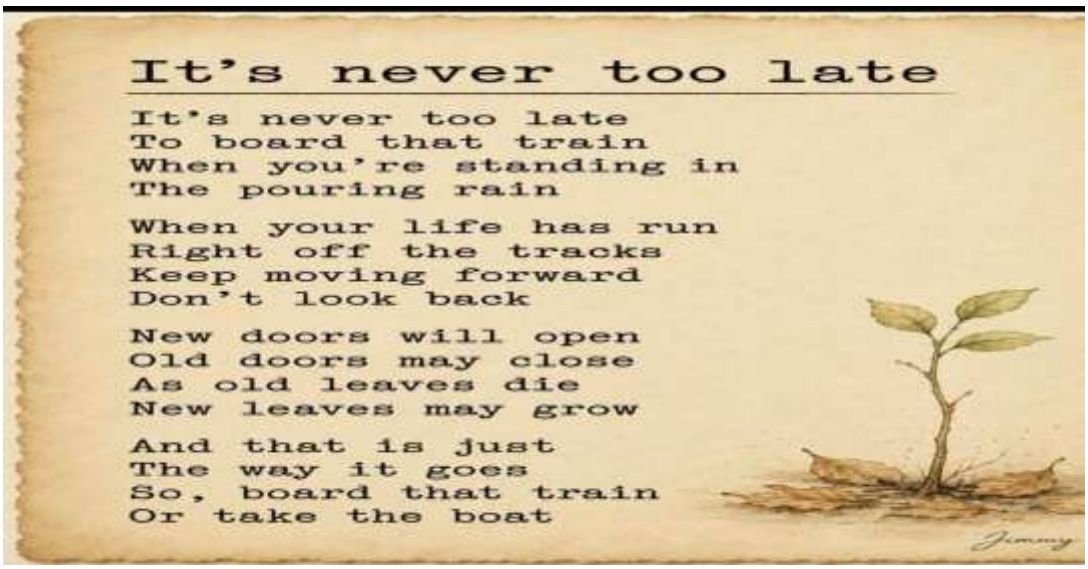

IT IS NEVER TOO LATE
(Urdu translation from the collection of Nasir Mehmood Khosa sb)

کبھی بہت دیر نہیں ہوتی

کبھی بہت دیر نہیں ہوتی

اس ٹرین میں سوار ہونے کے لیے

جب تم کھڑے ہو

تیز برستی بارش میں

جب تمہاری زندگی کی گاڑی
پٹڑی سے بالکل اتر چکی ہو
تب بھی آگے بڑھتے رہو
پیچھے مڑ کر مت دیکھو
نئے دروازے کھل جائیں گے
پرانے دروازے شاید بند ہو جائیں
جیسے پرانے پتے مرجھا کر گرتے ہیں
اور نئے پتے کھل اٹھتے ہیں
اور زندگی کا چلن بس یہی تو ہے
اس لیے، سوار ہو جاؤ اس ٹرین میں
یا پھر کوئی کشتی تھام لو
(کیونکہ آغازِ سفر کے لیے کبھی بہت دیر۔ نہیں ہوتی)



20جولائی شطرنج کا عالمی دن۔ کھیل کی دلچسپ تاریخ، ترقی کے تدریجی مراحل اور اس سے جڑے حقائق پاکستان کے پس منظر میں۔

شطرنج کا عالمی دن ہر سال20جولائی کو منایا جاتا ہے۔اس کا آغاز1966ء میں عالمی شطرنج فیڈریشن (FIDE) کے قیام کی یاد میں ہوا تھا۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ20جولائی1924ء کو پیرس، فرانس میں 'انٹرنیشنل چیس فیڈریشن (FIDE) 'قائم کی گئی تھی۔اس عالمی ادارے کی بنیاد کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے یونیسکو (UNESCO) نے1966ء میں یہ دن منانے کا آغاز کیا۔دسمبر2019ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے باقاعدہ طور پر ایک قرارداد منظور کر کے اس دن کو "عالمی یومِ شطرنج" کے طور پر تسلیم کر لیا۔اس سے قبل بھی یہ کھیل مسابقت کی بنیادون پر کھیلا جاتا رہا ہے اور اس سلسلہ میں پہلی باقاعدہ ورلڈ چیس چیمپئن شپ امریکہ کے شہروں نیویارک، سینٹ لوئس اور نیو اورلینز میں کھیلی گی۔ولہیم اسٹائنز Wilhelm) (Steinitz پہلے سرکاری عالمی شطرنج چیمپئن تھے۔ان کا تعلق آسٹریا سے تھا(بعد میں انہوں نے امریکی شہریت بھی اختیار کی)۔انہوں نے1886ء میں جوہانس زوکر تورٹ کو شکست دے کر عالمی اعزاز حاصل کیا۔

1948ء سے عالمی چیمپئن شپ کا انتظام اور نگرانی FIDE کر رہی ہے۔جولائی2026ء تک مردوں کے کلاسیکل عالمی شطرنج چیمپئن گوکیش ڈی (Gukesh Dommaraju) ہیں۔ان کا تعلق بھارت سے ہے۔انہوں نے2024ء کی عالمی چیمپئن شپ جیت کر تاریخ کے کم عمر ترین کلاسیکل عالمی چیمپئن بننے کا اعزاز حاصل کیا۔ایف ڈی ائی ایف کے ذریعے ہر عالمی چیمپئن شپ کے ایف لیے میزبان شہر یا ملک الگ منتخب کیا جاتا ہے۔چیلنجر کا انتخاب عموماً FIDE Candidates Tournament کے ذریعے کیا جاتا ہے، پھر وہ موجودہ عالمی چیمپئن کے خلاف فائنل میچ کھیلتا ہے۔

شطرنج اس وقت 190 سے زائد ممالک میں کھیلی جاتی ہے۔ Chess Olympiad ہر دو سال بعد منعقد ہونے والا دنیا کا سب سے بڑا بین الاقوامی ٹیم شطرنج مقابلہ ہے، جس میں درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں ممالک شرکت کرتے ہیں

پاکستان میں شطرنج کے کھیل کی سرکاری سرپرستی روایتی طور پر محدود رہی ہے، تاہم چس فیڈریشن آف پاکستان کے زیرِ انتظام ملکی سطح پر مقابلے اور ٹیمیں تشکیل دی جاتی ہیں۔ قومی ٹیم باقاعدگی سے بین الاقوامی ایونٹس میں شرکت کرتی ہے۔

حکومتِ پاکستان کی جانب سے پاکستان سپورٹس بورڈ اور فیڈریشن کے نئے عہدیداروں نے کھیل کو فروغ دینے کے لیے تعلیمی اداروں اور نجی شعبے کے اشتراک سے اقدامات تیز کیے ہیں۔ پاکستان سپورٹس کمپلیکس میں منعقد ہونے والی 34 ویں قومی مینز شطرنج چیمپئن شپ میں ایچ ای سی (HEC) کے زمان سہیل نے پہلی پوزیشن حاصل کی جبکہ ویمنز کیٹیگری میں پنجاب کی فریحہ صدیق فاتح رہیں۔ پاکستانی ٹیم باقاعدگی سے اولمپیاڈ میں حصہ لیتی ہے۔ 45 ویں ورلڈ چیس اولمپیاڈ جو کہ بوڈاپیسٹ، ہنگری میں کھیلا گیا، میں پاکستان نے بھی 190 ممالک کے ساتھ شرکت کی۔ اس عالمی ایونٹ میں پاکستانی کھلاڑیوں مومن فیضان اور 12 سالہ آیت عصمی نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بالترتیب 'کینڈیڈیٹ ماسٹر (CM) 'اور 'ویمن کینڈیڈیٹ ماسٹر (WCM) 'کے بین الاقوامی ٹائٹل جیتے۔

شطرنج کی تاریخ نہ صرف عجیب ہے بلکہ بہت دلچسپ بھی ہے۔ شطرنج کا موجد سِسام (Sissa ibn Dahir) نامی ایک ہندوستانی ریاضی دان کو مانا جاتا ہے، جس نے یہ کھیل پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی میں گپتا سلطنت کے دوران ایجاد کیا

اس کھیل سے جڑی مشہورِ زمانہ انعام کی کہانی "چاول کے دانے اور شطرنج کا بورڈ (Wheat and chessboard problem) " کے نام سے جانی جاتی ہے جب سِسام نے بادشاہ کو شطرنج پیش کی، تو بادشاہ اس کھیل سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے موجد سے اپنی مرضی کا انعام مانگنے پر سِسام نے کہا کہ مجھے سونے یا چاندی کی بجائے صرف چاول کے دانے چاہئیں، لیکن ایک خاص حساب سے۔ شطرنج کے پہلے خانے میں 1 دانہ، دوسرے میں 2، تیسرے میں 4، چوتھے میں 8 اور اسی طرح ہر خانے میں پچھلے خانے سے دگنے دانے رکھے جائیں۔ بادشاہ نے فوراً یہ شرط منظور کر لی، لیکن جب حساب لگایا گیا تو پوری سلطنت کا اناج بھی کم پڑ گیا۔ کل دانوں کی تعداد $2^{64} - 1$ (یعنی 18,446,744,073,709,551,615) بنتی تھی۔ یہ اتنی بڑی تعداد ہے کہ اگر آج پوری دنیا میں چاول اگایا جائے تب بھی اس تعداد کو پورا کرنے میں ہزاروں سال لگ جائیں گے

شطرنج کا کھیل شروع میں "چتورنگا (Chaturanga) " کہلاتا تھا، جس کا مطلب "فوج کے چار حصے "(پیدل، گھوڑے، ہاتھی اور رتھ) تھا۔

ہندوستان سے یہ کھیل فارس (ایران) پہنچا جہاں اسے "شطرنج "کا نام ملا۔ مسلمانوں کی اندلس (اسپین) کی فتح کے بعد یہ یورپ میں پھولا پھلا۔

شطرنج ایک دلچسپ اور حیرت انگیز کھیل ہے اس کا نقطہ اختتام "Checkmate" ہے جو دراصل فارسی کے "شاہ مات" سے نکلا ہے، جس کا مطلب ہے "بادشاہ بے بس یا مر گیا"

شطرنج کے بورڈ پر کل 64 خانے اور دونوں کھلاڑیوں کے پاس 16, 16 مہرے ہوتے ہیں۔ ہر مہرے کی چال منفرد ہوتی ہے

:پیادہ :(Pawn) یہ پہلی چال میں دو خانے، ورنہ صرف ایک خانہ آگے چلتا ہے اور مہرے کو ہمیشہ ترچھا کاٹتا ہے

۔گھوڑا :(Knight) یہ واحد مہرہ ہے جو دوسرے مہروں کے اوپر سے کود سکتا ہے۔ یہ ہمیشہ "L" کی شکل میں (دو خانے سیدھے، ایک خانہ دائیں یا بائیں) چلتا ہے

۔فیلہ / اونٹ :(Bishop) یہ صرف ترچھا (Diagonal) چل سکتا ہے

،اپنے رنگ والے خانوں پر۔ رخ / ہاتھی :(Rook) یہ صرف سیدھا (آگے، پیچھے، دائیں، بائیں) جتنے چاہے خانے چل سکتا ہے

۔وزیر / ملکہ :(Queen) یہ بورڈ کا سب سے طاقتور مہرہ ہے۔ یہ سیدھا اور ترچھا دونوں طرح چلنے کی صلاحیت رکھتا ہے

۔بادشاہ :(King) یہ کھیل کا سب سے اہم مہرہ ہے لیکن یہ ہر سمت میں صرف ایک خانہ چل سکتا ہے۔ اس کو گھیرنا اور بے بس کرنا ہی کھیل کا اصل مقصد ہے۔

شطرنج صدیوں پرانا کھیل ہے، اس لیے اس کے اصول و ضوابط دنیا بھر کی زبانوں میں مختلف کہاوتوں اور محاوروں کا حصہ بن چکے ہیں۔ ذیل میں شطرنج سے ماخوذ دنیا کے مقبول ترین محاورے اور ان کے معنی دیے گئے ہیں:

چیک میٹ :(Check Mate) یہ شطرنج کی آخری چال ہے جس میں بادشاہ کو بچایا نہیں جا سکتا۔ عام زندگی میں اس کا مطلب حریف کو مکمل طور پر شکست دینا یا کسی معاملے کا فیصلہ کن انجام ہے۔

اسٹیل میٹ :(Stalemate) یہ شطرنج کی ایسی صورتحال ہے جہاں کھلاڑی کے پاس کوئی قانونی چال نہیں بچتی اور کھیل برابر (ڈرا) ہو جاتا ہے۔ عام زندگی میں اسے ایسی تعطل کی کیفیت یا ڈیڈلاک (Deadlock) کہا جاتا ہے جہاں مزید پیش رفت ممکن نہ ہو۔

مہرہ بن جانا :(Pawn in the game) شطرنج میں پیادہ (Pawn) سب سے چھوٹا مہرہ ہوتا ہے جسے اکثر بڑے مقاصد کے لیے قربان کر دیا جاتا ہے۔ زندگی میں اس کا مطلب کسی بڑے انسان یا ادارے کے ہاتھوں استعمال ہونا یا بے وقعت کردار ادا کرنا ہے۔ بادشاہ سلامت :(Grandmaster) شطرنج کا سب سے بڑا ٹائٹل۔ عام زندگی میں کسی بھی شعبے میں انتہائی اعلیٰ مہارت اور قابلیت رکھنے والے شخص کو اس نام سے پکارا جاتا ہے۔

چال چلنا :(Making a move) شطرنج میں حکمت عملی کے تحت اگلا قدم اٹھانا۔ عام زندگی میں اس کا مطلب کسی منصوبے پر عمل درآمد کے لیے پہلا قدم اٹھانا یا فیصلہ کرنا ہے سوچنا :(Thinking several moves ahead) شطرنج کے ماہرین ہمیشہ حریف سے کئی چالیں آگے کی سوچتے ہیں۔ عام زندگی میں اس کا مطلب مستقبل کی منصوبہ بندی کرنا ہے



19جولائی1848ء:سینیکافالزکانفرنس—وہ پہلی صدا جس نے خواتین کے حقوق کی تاریخ کا رخ موڑ دی

تاریخ میں بعض دن محض ایک واقعہ نہیں ہوتے بلکہ وہ ایک نئے عہد کی بنیاد بن جاتے ہیں۔19جولائی1848ء بھی ایسا ہی ایک تاریخی دن تھا،جب امریکہ کی ریاست نیویارک کے قصبے سینیکافالز (Seneca Falls) میں منعقد ہونے والی ایک کانفرنس نے خواتین کے بنیادی انسانی، سماجی اور سیاسی حقوق کی جدوجہد کو ایک منظم تحریک کی شکل دی۔یہی وجہ ہے کہ اس اجتماع کو امریکہ میں خواتین کے حقوق کی پہلی باقاعدہ کنونشن اور جدید تحریکِ حقوقِ نسواں کا نقطۂ آغاز قرار دیا جاتا ہے۔انیسویں صدی کے وسط میں امریکی خواتین شدید قانونی اور سماجی پابندیوں کا شکار تھیں۔شادی کے بعد ان کی آزاد قانونی حیثیت تقریباً ختم ہو جاتی تھی۔وہ اپنی جائیداد کی مکمل مالک نہیں بن سکتی تھیں،ووٹ دینے کے حق سے محروم تھیں،اعلیٰ تعلیم اور روزگار کے مواقع محدود تھے،اور بیشتر اہم فیصلوں میں ان کی آواز کو اہمیت نہیں دی جاتی تھی

۔اس تاریخی تحریک کی بنیاد دو جری خواتین، الزبتھ کیڈی اسٹینٹن (Elizabeth Cady Stanton) اور لوکریشیا موٹ (Lucretia Mott) نے رکھی۔ اس تحریک کی اصل چنگاری 1840ء میں لندن میں منعقد ہونے والی عالمی غلامی مخالف کانفرنس (World Anti-Slavery Convention) سے بھڑکی، جہاں خواتین مندوبین کو نہ صرف خطاب کرنے سے روکا گیا بلکہ انہیں مرکزی اجلاس سے الگ، پردے کے پیچھے بٹھا دیا گیا۔ اس امتیازی سلوک نے اسٹینٹن اور موٹ کو یہ احساس دلایا کہ اگر غلامی کے خلاف آواز اٹھانے والے خود خواتین کو مساوی انسان نہیں سمجھتے، تو خواتین کو اپنے حقوق کے لیے خود منظم ہونا ہو گا

۔اسی احساس نے آٹھ برس بعد 19 اور 20 جولائی 1848ء کو سینیکا فالز کے ویسلین چیپل (Wesleyan Chapel) میں تقریباً 300 مرد و خواتین کو ایک چھت تلے جمع کیا۔ اس موقع پر الزبتھ کیڈی اسٹینٹن نے "اعلامیۂ جذبات " (Declaration of Sentiments) پیش کیا، جو امریکی اعلانِ آزادی سے متاثر تھا۔ اس کا سب سے مشہور اور انقلابی جملہ تھا: "تمام مرد اور عورتیں برابر پیدا کیے گئے ہیں۔" اسی کانفرنس میں پہلی مرتبہ خواتین کے حقِ رائے دہی (Women's Suffrage) کا مطالبہ بھی پیش کیا گیا، جسے اس دور میں نہایت جرات مندانہ اور متنازع تصور کیا گیا۔ سینیکا فالز کانفرنس نے ایک ایسی تحریک کو جنم دیا جس کے اثرات پوری دنیا میں محسوس کیے گئے

۔ مسلسل جدوجہد کے بعد بالآخر 1920ء میں، یعنی تقریباً 72 برس بعد، امریکی خواتین کو آئینی طور پر ووٹ کا حق حاصل ہوا۔ اس تحریک نے برطانیہ، نیوزی لینڈ اور دیگر ممالک میں بھی حقِ رائے دہی کی تحریکوں کو نئی توانائی بخشی، جبکہ خواتین کے جائیداد کے حقوق، بہتر عائلی قوانین، اعلیٰ تعلیم اور ملازمت کے مواقع کی راہیں بھی بتدریج ہموار ہوئیں۔ بعد ازاں 1948ء میں اقوامِ متحدہ کے عالمی منشورِ انسانی حقوق (Universal Declaration of Human Rights) میں مرد و عورت کی مساوات کے جس تصور کو تسلیم کیا گیا، اس کی فکری بنیادوں میں سینیکا فالز جیسی تاریخی تحریکوں کا بھی اہم کردار شامل تھا

۔اگرچہ اس کانفرنس کے فوری اثرات برصغیر پر ظاہر نہیں ہوئے، کیونکہ اس وقت یہ خطہ نو آبادیاتی نظام کے تحت مختلف سماجی وسیاسی حالات سے گزر رہا تھا، تاہم اس کی فکری گونج آہستہ آہستہ یہاں بھی پہنچی۔ خواتین کی تعلیم، سماجی کردار اور قومی زندگی میں ان کی شمولیت کے حوالے سے اصلاحی سوچ نے فروغ پایا۔ بعد میں سرسید احمد خان، علامہ محمد اقبال اور دیگر مصلحین نے خواتین کی تعلیم کی اہمیت پر زور دیا، جبکہ محترمہ فاطمہ جناح، بیگم رعنا لیاقت علی خان اور بیگم شائستہ اکرام اللہ جیسی رہنماؤں نے تحریکِ پاکستان اور قومی تعمیر میں خواتین کے فعال کردار کو نمایاں کیا

۔پاکستان اس لحاظ سے خوش قسمت ممالک میں شمار ہوتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی خواتین کو حقِ رائے دہی تسلیم کر لیا گیا، اور 1973ء کے آئین کے آرٹیکل 25 نے مرد و عورت کی قانونی برابری کو آئینی تحفظ فراہم کیا۔ آج پاکستان میں خواتین کے حقوق کے لیے کام کرنے والی مختلف تنظیمیں اور سماجی تحریکیں بھی اسی عالمی فکر کی توسیع ہیں، جس کا ایک اہم سنگِ میل سینیکا فالز کانفرنس تھی.

19 جولائی 1848ء کا سینیکا فالز اجتماع محض امریکہ کی ایک مقامی کانفرنس نہیں تھا بلکہ انسانی وقار، مساوات اور انصاف کی عالمی جدوجہد کا ایک تاریخی باب تھا۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ جب اصول، حوصلہ اور اجتماعی شعور یکجا ہو جائیں تو تاریخ کا دھارا بدل جاتا ہے۔ آج بھی یہ واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ ایک منصفانہ معاشرہ وہی ہے جہاں خواتین اور مرد، دونوں کو مساوی احترام، مساوی مواقع اور مساوی حقوق حاصل ہوں۔



18۔جولائی: یومِ نیلسن منڈیلا (Nelson Mandela International Day)

18 جولائی کو نیلسن منڈیلا کے یومِ پیدائش کی مناسبت سے عالمی سطح پر ان کا دن منایا جاتا ہے۔ اس دن کا بنیادی مقصد نسل پرستی (Apartheid) کے خلاف ان کی طویل جدوجہد، امن، مفاہمت اور انسانی حقوق کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنا ہے۔ منڈیلا کی جدوجہد نیلسن منڈیلا نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ — جس میں ۲۷ سال کی طویل قید بھی شامل ہے — جنوبی افریقہ میں سیاہ فام باشندوں کے خلاف روا رکھے جانے والے امتیازی اور نسل پرستانہ نظام کے خلاف جدوجہد کرتے ہوئے گزارا۔ 1990ء میں رہائی کے بعد وہ جنوبی افریقہ کے پہلے جمہوری طور پر منتخب صدر بنے اور ملک میں امن، مفاہمت اور مساوات کے فروغ کے لیے تاریخی کردار ادا کیا۔ بعد ازاں انہوں نے ایک عالمی امن ساز کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں، جن میں افریقی خطے کے تنازعات کے پرامن حل کے لیے کوششیں بھی شامل تھیں

اس دن کا باقاعدہ آغاز نومبر 2009ء میں ہوا، جب اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ نومبر ۲۰۰۹ء کو قرارداد A/RES/64/13 منظور کر کے جنوبی افریقہ کے تعاون سے ۱۸ جولائی کو باقاعدہ طور پر "نیلسن منڈیلا انٹرنیشنل ڈے" قرار دیا۔ اس قرارداد میں منڈیلا کی تنازعات کے حل، نسلی ہم آہنگی، انسانی حقوق کے تحفظ، مفاہمت، صنفی مساوات اور پسماندہ طبقات کی فلاح کے لیے خدمات کو خاص طور پر سراہا گیا۔

اس عالمی دن کا افتتاحی جشن سب سے پہلے ۱۸ جولائی ۲۰۰۹ء کو منایا گیا تھا، جسے بعد میں اسی سال اقوامِ متحدہ کی باقاعدہ منظوری حاصل ہوئی

اس دن کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ اور نیلسن منڈیلا فاؤنڈیشن دنیا بھر کے لوگوں سے اپیل کرتی ہیں کہ وہ منڈیلا کی 67 سالہ عوامی خدمت کی علامت کے طور پر 67 منٹ نکال کر اپنی مقامی کمیونٹی کی فلاح و بہبود یا رضاکارانہ کاموں میں حصہ لیں۔ یہ 67 سال ان کی سیاسی و سماجی جدوجہد کے عرصے کی نمائندگی کرتے ہیں، جو ۱۹۴۴ء میں افریقن نیشنل کانگریس میں شمولیت سے شروع ہوئی

پاکستان میں نیلسن منڈیلا کو ہمیشہ ایک ایسے عالمی رہنما کے طور پر یاد کیا جاتا رہا ہے جنہوں نے ظلم، ناانصافی اور رنگ و نسل کی بنیاد پر امتیاز کے خلاف اپنی جان کی پروا کیے بغیر آواز بلند کی۔ پاکستان کی حکومت اور عوام نے ہمیشہ جنوبی افریقہ کی نسل پرستی مخالف تحریک کی حمایت کی، اور منڈیلا کی رہائی و جمہوری کامیابی کو دنیا بھر کے مظلوم طبقات کے لیے امید کی کرن قرار دیا۔ پاکستان میں ۱۸ جولائی کے موقع پر تعلیمی اداروں، سول سوسائٹی تنظیموں اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے آگاہی مہمات، مذاکرے اور رضاکارانہ سرگرمیاں منعقد کی جاتی ہیں، جن میں طلبہ و عوام کو منڈیلا کے پیغام — یعنی برداشت، مفاہمت اور خدمتِ خلق — سے روشناس کرایا جاتا ہے

۔منڈیلا کا یہ قول کہ "تعلیم دنیا کو بدلنے کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے"

پاکستان کے تعلیمی اور سماجی حلقوں میں بھی اکثر حوالے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مزید برآں، پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک میں، جہاں غربت، عدم مساوات اور سماجی ناانصافی جیسے مسائل موجود ہیں، منڈیلا کا فلسفہ — کہ ایک فرد بھی معاشرے میں مثبت تبدیلی لا سکتا ہے — نوجوان نسل کے لیے ایک اہم تحریک کا باعث بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ 67 منٹ کی رضاکارانہ خدمت کا تصور پاکستان میں بھی مختلف سماجی تنظیموں کی جانب سے فروغ دیا جاتا ہے۔